صالح اور مصلح

خیرالقرون اور سلف صالحین کے منہج پر
تزکیہ نفس اور اصلاح احوال کا پروگرام



ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

مکتبہ رحمۃ للعالمین

نام کتاب: صالح اور مصلح

مصنف: ڈاکٹر حافظ محمد زبیر

تہذیب وٹائیٹل: ابوالحسن علوی

ناشر: مکتبہ رحمۃ للعالمین

صفحات: 510

قیمت: 750روپے

طبع اول: مارچ، 2016ء

ملنے کا پتہ:

☆ عبدالمتین مجاہد: 36-K، ماڈل ٹاؤن، لاہور۔ 0300-4199099

☆ مجلس تحقیق اسلامی، 99-J، ماڈل ٹاؤن، لاہور۔ 042-35839404

☆ قرآن اکیڈمی، یسین آباد، فیڈرل بی ایریا، کراچی۔ 021-36337361

مصنف کی دیگر کتب:

☆ اسلام اور مستشرقین

☆ مولانا وحید الدین خان: افکار و نظریات

☆ فکر غامدی: ایک تحقیقی و تجزیاتی مطالعہ

☆ عصر حاضر میں تکفیر، خروج، جہاد اور نفاذ شریعت کا منہج

☆ چہرے کا پردہ: واجب، مستحب یا بدعت؟

☆ اسلام میں زوجین کے حقوق

جملہ کتب کے پی ڈی ایف ورژن کا ڈاؤن لوڈ لنک:

http://kitabosunnat.com/musannifeen/muhammad-zubair-temi.html

صالح اور مصلح

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر
اسسٹنٹ پروفیسر، کامساٹس انسٹی ٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی، لاہور
ریسرچ فیلو، مجلس تحقیق اسلامی، ماڈل ٹاؤن، لاہور
ریسرچ فیلو، شعبہ تحقیق اسلامی، قرآن اکیڈمی، لاہور

مکتبہ رحمۃ للعالمین


بسم الله الرحمن الرحيم
In The Name Of Allah, The Most Beneficent, The Most Merciful

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا﴾

[الشمس: 9-10]

”تحقیق اس نے فلاح پائی کہ جس نے نفس کا تزکیہ کیا اور وہ نامراد ہوا کہ جس نے نفس کو بھلا دیا۔“

انتساب

پیارے بچوں عبداللہ' رجاء اور عروۃ کے نام
کہ جن کے بارے خواہش اور دعا ہے کہ وہ "عبادالرحمٰن" اور "اہل اللہ" میں شامل ہوں۔

فہرست مضامین

مقدمہ

موضوع کا تعارف

خیر القرون اور سلف صالحین کے منہج پر تزکیہ نفس اور اصلاح احوال کے بارے یہ کتاب مرتب کی گئی ہے۔ صحابہ ،تابعین، تبع تابعین اور ائمہ دین رحمہم اللہ کے زمانے میں تزکیہ نفس اور اصلاح احوال کا طریق کار بہت ہی سادہ اور آسان تھا کہ فطری بنیادوں پر جو انسانی تعلقات اور رشتے استوار ہوتے تھے، وہ ایک دوسرے کی اصلاح کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ استاذ اپنے شاگردوں، والدین اپنی اولاد، پڑوسی اپنے پڑوسیوں، ساتھی اپنے ساتھیوں اور دوست اپنے دوستوں کی اصلاح کا بہت بڑا ذریعہ تھے۔ اسلاف میں صالحین ایسے بزرگ نہیں تھے جو اپنی وضع قطع اور لباس سے معاشرے میں خلائی مخلوق (alians) محسوس ہوتے ہوں، ان سے ملنے کے لیے آپ کو جھکنا پڑے، قطار میں لگنا پڑے، انتظار کرنا پڑے، بلکہ وہ نیکی کا شوق رکھنے والے، نیکی کی ترغیب دینے والے اور معاشرے میں عام لوگوں کی طرح گھل مل کر رہنے والے تھے۔

تعلیم اور تزکیہ دونوں کی بنیاد کتاب وسنت اور صحبت ہے۔ تعلیم کی اصل اعتصام بالکتاب والسنۃ ہے تو تزکیہ کی اصل اتباع بالکتاب والسنۃ ہے۔ تعلیم میں کتاب وسنت کا گہرا فہم رکھنے والے علماء کی صحبت اور تزکیہ میں کتاب وسنت پر احسان کی کیفیت کے ساتھ عمل کرنے والے صالحین کی صحبت ضروری ہے۔ اور صالحین میں سے بھی آپ کے والدین، رشتہ دار، پڑوسی، استاذ اور وہ دوست کہ جو نیکی کا شوق رکھتے ہوں اور نیکی کی ترغیب دیتے ہوں۔ پس اپنے ارد گرد کے ان صالحین کی صحبت سے آپ اپنی اصلاح کیسے کر سکتے ہیں، یہ اس کتاب کا موضوع ہے۔ اگر آپ "بزرگ" بننا چاہتے ہیں تو یہ کتاب آپ کے لیے ہر گز مفید نہیں ہے اور اگر آپ "بندہ" بننا چاہتے ہیں تو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں کہ یہی اس کتاب کا اصل موضوع ہے۔

تالیف کا پس منظر اور مقصد

محدث فورم انٹرنیٹ پر اردو زبان میں روایت پسند مذہبی طبقے کا ایک نمائندہ فورم

ہے۔ راقم کئی سالوں تک اس فورم پر اپنے قلمی نام ابوالحسن علوی کی پہچان سے کچھ نہ کچھ لکھتا رہا ہے۔ یہ لکھنا لکھانا زیادہ تر اصلاحی موضوعات پر ہوتا تھا اور دوستوں کی طرف سے ان تحریروں پر تبصرے بھی موصول ہوتے تھے کہ کچھ لوگ پسند کرتے تو کچھ تصحیح فرماتے۔ اسی طرح کامساٹس یونیورسٹی میں بھی خطبہ جمعہ کی ذمہ داری سابقہ تین برسوں سے میرے پاس ہی ہے اور اسی سلسلے میں ہر جمعہ کو کسی اصلاحی موضوع پر مواد جمع کر لیتا تھا۔ بعض اوقات بعض سامعین جمعہ کے خطبہ کے بعد مجھ سے تقریر کے نکات وغیرہ مانگتے تو وہ چونکہ عربی میں ہوتے تھے لہذا عوام الناس کے لیے مفید نہ تھے۔ پس ایک احساس تھا کہ یہ مرتب ہو جائیں تو شاید بہت سے لوگوں کے لیے اصلاح کا ذریعہ بن جائیں۔ علاوہ ازیں معروف دینی اسکالر جناب احمد جاوید صاحب کی جمعہ کے دن مغرب کے بعد کی اصلاحی مجلس میں تسلسل سے شرکت کا موقع ملا تو ان سے اس موضوع پر نہ صرف کافی کچھ سیکھنے کو ملا بلکہ اس موضوع کے بیان میں اپنے اسلوب بیان کو بہتر بنانے میں بھی معاونت ملی۔ پس یہ احساس شدت پکڑ گیا کہ عام لوگوں کے لیے عام فہم انداز میں اصلاح نفس کے موضوع پر کوئی کتاب مرتب کرنی چاہیے۔ اور خاص طور یہ بھی فکر تھی کہ اپنی اولاد اور خاندان کے لیے کوئی ایسی تحریر مرتب کر جاؤں کہ جو ان کی اصلاح اور میرے لیے صدقہ جاریہ بن جائے۔

پس اسی خیال سے فورم پر موجود اپنی تحریروں اور خطبات جمعہ کے نوٹس کو تصحیح واضافے کے ساتھ ایک کتاب کی صورت مرتب کیا ہے۔ اس کتاب میں، میں نے کتاب وسنت کی اتباع کے حوالے سے اپنے ساتھیوں اور دوستوں کے ان احوال، واقعات اور اقوال کو جمع کیا ہے کہ جن سے اپنے نفس کی اصلاح اور تربیت میں مجھے فائدہ ہوا۔ اللہ عزوجل اس محنت کو قبول فرمائے اور راقم کے ان اساتذہ، ساتھیوں اور دوستوں کے درجات بلند فرمائے کہ جن کی تعلیم وارشاد سے یہ اصلاحی نکات مرتب ہو سکے ہیں۔

آمین یا رب العالمین۔

اس کتاب کی تیاری میں، میں نے کافی محنت کی ہے۔ میں نہ تو یہ سمجھتا ہوں کہ

اصلاح نفس کے موضوع پر یہ کوئی اخیر کتاب ہے اور نہ ہی میرا یہ خیال ہے کہ یہ کتاب لکھ کر میں نے پڑھنے والوں کا پیسہ اور وقت ضائع کیا ہے۔ میں اس کتاب کے مقدمے میں کسی ایسی مصنوعی عاجزی کا اظہار بھی نہیں کرنا چاہتا کہ جیسے احقر العباد، ننگ خلائق، فقیر الی اللہ، حقیر پر تقصیر نے یہ کتاب لکھ کر کوئی گناہ کا کام کیا ہو۔ اور نہ ہی میں اپنے قارئین کو یہ تاثر دینا چاہتا ہوں کہ میں کوئی "بزرگ" اور "بابا" ہوں کہ جسے فرشتہ سمجھ کر لوگ قریب ہو جائیں اور پھر انسان سمجھ کر دور ہو جائیں۔ البتہ یہ خواہش ضرور رہتی ہے کہ ایسے لوگوں سے دوستی کروں کہ جو نیکی کا شوق رکھنے والے ہوں کہ یہی لوگ ہیں کہ جن سے مجھے کچھ فائدہ ہو سکتا ہے۔

بات تو صرف اتنی سی ہے کہ میں ایک محقق اور ریسرچر ہوں اور مختلف موضوعات پر لکھتا رہتا ہوں اور اصلاح نفس کے موضوع پر کوئی ایسی تحریر اردو زبان میں نظر سے نہیں گزری تھی جو اسلاف کے منہج پر ہو تو سو یہ کتاب اس امید پر مرتب کر دی کہ اللہ عزوجل اسے قبول فرمائے، اور میرے اور میرے آباء واجداد کے لیے صدقہ جاریہ بنائے، خاص طور ہمارے اعوان قبیلہ کے جد امجد حضرت علی رضی اللہ عنہ اور قطب شاہ اعوان رحمہ اللہ اور ان کی نسل اور ذریت کے لیے، اور اسی طرح جمیع مسلمان مردوں اور عورتوں، مومن مردوں اور عورتوں کے لیے بھی صدقہ جاریہ بنائے۔

کتاب کے مطالعہ کا طریق کار

اس کتاب سے صحیح معنوں میں تربیتی فائدہ اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جبکہ آپ اسے ایک نشست میں ختم کرنے کی بجائے اس کے دو چار صفحات کے مطالعہ کو روزانہ کا معمول بنائیں۔ اور پھر ان صفحات میں موجود حکمت کی باتوں کو اپنے عمل کا حصہ بنانے کے لیے کچھ دن مجاہدہ کریں۔ اور دوسری بات اگر ممکن ہو سکے کہ جن دو چار صفحات کا مطالعہ کریں تو اس گہرائی اور غور وفکر سے کریں کہ ان سے ایسے نئے نئے نکات پیدا ہوں کہ جو آپ کی اصلاح میں مدد ومعاون ہوں۔ جب آپ کسی متن کو پڑھ کر ان معانی کو سیکھ لینے کی صلاحیت پیدا کر لیں گے کہ جو الفاظ کے لباس میں نہیں ہیں تو آپ اس

متن کو اس سطح پر سمجھنا شروع کر دیں گے کہ جس سطح پر مصنف بیان کر رہا ہے کیونکہ ہر غور و فکر کرنے والے مصنف کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ اپنے لا محدود تصورات کو محدود الفاظ میں بیان کرے۔ اس کتاب میں یہ کوشش کی گئی ہے کہ ہمارے دوستوں نے کتاب و سنت کی نصوص کو سمجھ کر جو نئے نئے معانی اور احوال پیدا کیے ہیں، ہم انہیں جمع کر دیں تا کہ اس اسلوب پر کتاب و سنت میں غور و فکر کرنے کی تربیت بھی پیدا ہو۔ میرا اپنا بھی یہی ارادہ ہے کہ اس کتاب کو مسلسل اپنے مطالعہ میں رکھوں کہ اس میں کتاب و سنت کی ایسی نصوص ایک جگہ جمع ہو گئی ہیں کہ جن سے عمل میں بہت ترغیب (motivation) ملتی ہے۔

اگر پڑھنے کے بعد آپ کو یہ کتاب اچھی اور مفید معلوم ہو تو اس کا ایک نسخہ اپنی مسجد، مدرسہ، اسکول، کالج اور یونیورسٹی کی لائبریری میں رکھ کر اپنے لیے صدقہ جاریہ کا سامان بنا لیں۔ اور آپ یہ کتاب اپنے ان رشتہ داروں، پڑوسیوں اور دوستوں کو بھی گفٹ کر سکتے ہیں کہ جن کی اصلاح کے آپ خواہش مند ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ ان کی اصلاح کیسے کریں؟

منہج بحث و تحقیق

اقتباسات کے ضمن میں حوالہ جات کے درج کرنے میں "دی شکاگو مینوئل آف اسٹائل" (The Chicago Manual of Style) سے رہنمائی لی گئی ہے اور انہیں ہر صفحہ کے نیچے حواشی میں درج کیا گیا ہے۔ پہلی دفعہ کسی کتاب کا حوالہ مکمل نقل کیا گیا ہے کہ جس میں اس کتاب کے مصنف کا مکمل نام، کتاب کا مکمل نام، پبلشر کا نام، مقام اشاعت، سن اشاعت اور جلد اور صفحہ نمبر شامل کیا گیا ہے۔ اور اس کے بعد اس کتاب کا حوالہ نقل کرتے ہوئے اس کے مختصر نام اور متعلقہ جلد اور صفحہ نمبر کے بیان پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔

ہم نے اس کتاب میں اہتمام کیا ہے کہ صرف وہی احادیث نقل کی جائیں جو صحیح احادیث ہیں۔ احادیث کی صحت و ضعف میں علامہ البانی رحمہ اللہ کے حکم پر اعتماد کیا گیا

ہے۔ پس احادیث کی کتب کے ان محقق نسخوں سے احادیث نقل کی گئی ہیں کہ جو علامہ البانی رحمہ اللہ اور دیگر معاصر عرب محقق علماء کی تحقیق کے ساتھ شائع ہوئے ہیں۔ اور اگر کسی حدیث کی صحت میں علامہ البانی رحمہ اللہ کو متقدمین سے اختلاف تھا تو وہاں ان ائمہ محدثین کا ذکر کر دیا ہے کہ جنہوں نے اس روایت کو "مقبول" قرار دیا ہے۔ اقتباسات میں بریکٹ میں جو عبارت ہے، وہ مصنف کی طرف سے اضافہ ہے اور اِس کا مقصود قارئین کے لیے اقتباس کی تفہیم کو آسان بنانا ہے۔

اس کتاب میں کوشش کی گئی ہے کہ مشکل اردو الفاظ کے استعمال سے ممکن حد تک اجتناب کیا جائے لیکن پھر جہاں ناگزیر ہوا وہاں مشکل الفاظ کا انگریزی ترجمہ دے دیا گیا ہے کہ ہماری نوجوان نسل اب اردو سے اتنی واقفیت نہیں رکھتی ہے۔ اور جہاں ہماری زبان میں انگریزی لفظ زیادہ معروف ہے تو وہاں اردو کی بجائے انگریزی لفظ ہی نقل کر دیا گیا ہے کہ اصل مقصود تو تفہیم ہے نہ کہ کسی قسم کی ادبی گفتگو کرنا۔

اظہار تشکر

میں آخر میں ریکٹر کامساٹس پروفیسر ڈاکٹر ایس ایم جنید زیدی صاحب، ڈائریکٹر لاہور کیمپس پروفیسر ڈاکٹر قیصر عباس صاحب اور ہیڈ آف ہیومینیٹیز ڈیپارٹمنٹ ڈاکٹر مدثر محمود صاحب کا بھی انتہائی شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے یونیورسٹی میں بحث اور تحقیق کے لیے مطلوبہ وسائل اور ماحول کی فراہمی میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رکھی ہے۔ اور میں جناب شیخ ابن بشیر الحسینوی حفظہ اللہ تعالی کا بھی شکر گزار ہوں کہ جنہوں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا اور اپنے قیمتی مشوروں سے نوازا۔ اور آخر میں، میں اپنی اہلیہ محترمہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ جن کے تعاون اور حوصلہ افزائی سے یہ کتاب پایہ تکمیل کو پہنچ پائی۔

جزاکم اللہ خیرا

ابوالحسن علوی

باب اول

اصلاح نفس

اس باب میں اصلاح نفس کے ضمن میں صحبت صالحین، مجاہدہ نفس، موت کی یاد، سوچ وبچار، لباس کے کردار اور نماز کی اہمیت پر بحث کی گئی ہے۔

صالح اور مصلح

صالح اسے کہتے ہیں جو اپنی اصلاح کے لیے فکر مند ہو اور مصلح وہ ہے جو دوسروں کی اصلاح میں مصروف ہو۔ کبھی کبھار یہ احساس غالب ہونے لگتا ہے کہ شاید ہم اپنی اصلاح سے زیادہ دوسروں کی اصلاح کے لیے فکر مند رہتے ہیں۔ ہم صالح کم اور مصلح زیادہ ہوتے ہیں۔ احساس یہ ہے کہ صالح شخص کی عبادات و مناجات یا اوراد واشغال زیادہ ہوں گے جبکہ مصلح کے کام میں دعوت و تبلیغ یا درس وتدریس کا غلبہ ہو گا۔ اگر ہماری دینی سرگرمیوں میں درس وتدریس یا دعوت و تبلیغ کا پہلو ذکر و تلاوت اور عبادت وریاضت پر غالب ہو گا تو ہم صالح کم اور مصلح زیادہ کہلائیں گے۔

بلاشبہ صالح اور مصلح ہونا دونوں خیر کے کام ہیں لیکن اس کے باوجود دل ودماغ میں ایک کشمکش جاری رہتی ہے۔ دل چاہتا ہے کہ صالح ہونا مصلح ہونے کی صفت پر غالب آ جائے لیکن ذہن کہتا ہے کہ مصلح ہونے کو ترجیح دو۔ جدید انسان کی مشینی زندگی میں اب اتنا وقت نہیں رہا کہ وہ اپنی شخصیت کے دونوں پہلوؤں کی تکمیل کے لیے بقدر ضرورت وقت نکال سکے۔ اسے یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ اس نے اپنی شخصیت کے ان دو میں سے ایک پہلو کو دوسرے پر ترجیح دینا ہے اور اس سے دوسرے کو کسر ضرور لگنی ہے۔

دل کہتا ہے کہ دوسروں کی اصلاح کا کیا فائدہ جبکہ اپنا بیڑا غرق ہو رہا ہے اور ذہن کہتا ہے کہ یہ تو خود غرضی ہوئی کہ اپنی ذات کو دوسروں پر ترجیح دو۔ صالح ہونے کی صفت جب غالب آنے لگتی ہے تو اصلاح سے دل اچاٹ ہو جاتا ہے، دعوت و تبلیغ اور درس وتدریس مارے باندھے کی اطاعت معلوم ہوتی ہے، مجلس کی نسبت تنہائی اچھی لگنے لگتی ہے، دنیا سے بے رغبتی اور پہاڑوں سے دلچسپی بڑھ جاتی ہے۔

ایسے وقت میں گوشہ نشینی کی طرف مائل دل کو ذہن قائل کرتا ہے کہ نبی اور رسول کے معانی میں بھی اصلاح ہی کا مفہوم پوشیدہ ہے۔ نبی، خبر دینے والے کو کہتے ہیں اور رسول پیغام پہنچانے والا ہے۔ پس نبیوں اور رسولوں کی زندگی کا غالب پہلو اصلاح ہی تھا کہ ان کا وہ وقت جو اللہ کے بندوں کے تزکیہ اور اصلاح کے لیے مجلس میں گزرتا تھا، وہ

اس وقت سے زیادہ ہوتا تھا جو پروردگار کے ساتھ تنہائی کی عبادت اور مناجات کے لیے مخصوص تھا۔

ذہن کہتا ہے کہ نبی کے نقش قدم پر چل نہ کہ صوفی کے کہ جسے دوسروں کی نسبت اپنی اصلاح کی زیادہ فکر ہوتی ہے۔ دل کہتا ہے کہ ایسی اصلاح کا بھی کیا فائدہ کہ مصلح صاحب فیس بک پر چار لائنیں لکھنے کے بعد ہر دو گھنٹے میں پسندیدگیوں (likes) کی تعداد دیکھتے رہتے ہیں۔ ذہن کہتا ہے کہ ساری زندگی اپنے نفس کے رذائل (vices) شمار کرنے میں ہی گزار دینا بھی کون سی عقلمندی ہے؟ وعلی ہذاالقیاس یہ مکالمہ جاری رہتا ہے۔ اور دل اور دماغ دونوں طرف سے دلائل آتے رہتے ہیں....

مبلغین، واعظین، مدرسین اور تحریکی کارکنان کے لیے صالح اور مصلح کے اس فرق کو سمجھنا بہت ضروری ہے کہ اس کو ملحوظ نہ رکھنے کے سبب ہی بعض اوقات ان میں ذاتی اصلاح کے لیے کوششیں مفقود نظر آتی ہیں۔ بعض اوقات یوں بھی دیکھنے میں آیا کہ غلبہ دین کے لیے کچھ علماء کی میٹنگ ہو رہی تھی، ادھر سے اذان ہوئی لیکن میٹنگ جاری رہی یہاں تک کہ جماعت کی نماز فوت ہو گئی۔ سیرت کانفرنس ہو رہی تھی، ہزار افراد شریک تھے، ظہر کی اذان ہوئی اور صرف تین افراد نماز کے لیے اٹھے۔ یہ وہ پہلو ہے کہ جس کی طرف ہم یہ کہہ کر متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ بعض اوقات ہم دوسروں کی اصلاح کے غم میں اس قدر محو ہو جاتے ہیں کہ اپنی ذات کی اصلاح تک بھول جاتے ہیں۔

اسی طرح رمضان کے مہینہ میں یہ دیکھنے میں آیا کہ ایک تحریکی کارکن رات گئے تک تراویح کے ساتھ قرآن مجید کا ترجمہ اور مختصر تشریح بیان کرنے میں مصروف رہے۔ اب رات کو جب قرآن مجید کی درس وتدریس سے دیر سے فارغ ہوئے اور دن بھر ملازمت کی مصروفیت بھی رہی تو صبح سحری کے لیے بروقت آنکھ نہ کھل سکی بلکہ بعض اوقات تو فجر کی جماعت اور بعض اوقات نماز بھی قضا ہوتی رہی۔ ہمیں یہ نہیں کہنا کہ ایسی صورت میں ہمیں رمضان کی بابرکت راتوں میں قرآن مجید کے بیان کا بابرکت عمل ترک کر دینا چاہیے کہ جس سے بلاشبہ سینکڑوں لوگوں کی اصلاح ہو رہی ہوتی ہے

بلکہ ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اس قسم کے حالات میں ہمیں اپنے درس وتدریس کے اوقات میں کمی کر لینی چاہیے کہ ہم قرآن مجید کا ترجمہ نصف رات بیان نہ کریں بلکہ ایک تہائی رات تک بیان کر لیں یا ایک دو گھنٹے بیان کر لیں تا کہ ہمارے اپنے فرائض میں کسی قسم کی کوتاہی نہ ہو۔

دوسری طرف یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ خود والد صاحب تو تہجد گزار بھی ہیں لیکن بچے فرض نماز تک نہیں پڑھتے اور والد صاحب ان کو پڑھنے کو کہتے بھی نہیں ہیں۔ اسی طرح والد صاحب اپنی نظروں کی تو خوب حفاظت کرتے ہیں لیکن اپنی بیٹی کے بارے کوئی فکر نہیں ہے کہ کس قسم کا لباس پہن کر یونیورسٹی جا رہی ہے۔ تو یہ بہت بڑی غفلت اور کوتاہی ہے کیونکہ والدین کی یہ ذمہ داری بلکہ فرض ہے کہ وہ اپنی اولاد کو نیکی کرنے کی نصیحت اور برائی سے بچنے کی تلقین کرتے رہیں۔ اور ان سے قیامت والے دن اپنی اولاد کے بارے پوچھ گچھ ہو گی جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

«كُلُّكُمْ رَاعٍ، وَكُلُّكُمْ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، الإِمَامُ رَاعٍ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالرَّجُلُ رَاعٍ فِي أَهْلِهِ وَهُوَ مَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ فِي بَيْتِ زَوْجِهَا وَمَسْئُولَةٌ عَنْ رَعِيَّتِهَا، وَالخَادِمُ رَاعٍ فِي مَالِ سَيِّدِهِ وَمَسْئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ»[1]

”تم میں سے ہر ایک شخص نگران ہے اور اس سے قیامت والے دن ان کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ جن کا وہ نگران بنایا گیا تھا۔ حکمران سے اس کی رعیت کے بارے سوال کیا جائے گا۔ اور والد سے اس کی اولاد اور اہل خانہ کے بارے سوال کیا جائے گا۔ اور بیوی سے اس کے شوہر کے گھر کے بارے سوال کیا جائے گا کہ جو گھر اس کے شوہر نے اس کے حوالے کیا تھا۔ اور خادم سے اپنے مالک کے اس مال کے بارے سوال کیا جائے گا کہ جس پر اس نے اسے نگران بنایا تھا۔“

[1] البخاري، محمد بن إسماعيل أبو عبد الله الجعفي (المتوفى: 256هـ)، صحيح بخاري، كِتَابُ الجُمُعَةِ، بَابُ الجُمُعَةِ فِي القُرَى وَالمُدُنِ، دار طوق النجاة، مصر، 1422هـ، 5/2

قرآن مجید نے یہ حکم دیا ہے کہ اپنی ذات کے ساتھ اپنی اولاد اور اہل خانہ کو بھی جہنم کی آگ سے بچانے کی کوشش کرو اور ایسا کرنا دینی فرض ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ﴾ [التحریم: 6]

"اے اہل ایمان! اپنے آپ کو اور اپنے اہل خانہ کو اس آگ سے بچاؤ کہ جس کا ایندھن لوگ اور پتھر ہیں۔ اس آگ پر ایسے سخت اور تند خو فرشتے مقرر ہیں کہ جو اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم انہیں دیا جاتا ہے، اس کو پورا کرتے ہیں۔"

تو اصلاح کی ترتیب بھی یہی ہے کہ اپنی ذات سے اصلاح شروع کی جائے۔ اس کے بعد اپنے بیوی بچوں اور اس کے بعد اپنے بہن بھائیوں اور دیگر رشتہ داروں کی اصلاح کی کوشش کرے۔ اس کے بعد اپنے پڑوس، گلی اور محلے کی مسجد سے ابتداء کرے اور اس کے بعد اگر موقع ملے تو شہر بھر یا دوسرے شہروں میں بھی دعوت اور تبلیغ کی کوششیں کریں۔ لیکن یہ متوازن رویہ نہیں ہے کہ اپنی ذات اور اپنے گھر کی اصلاح کی طرف تو خاک بھر بھی توجہ نہیں ہے اور دوسرے شہر میں تبلیغی دوروں پر دورے ہو رہے ہیں۔

کچھ دیندار لوگوں کی زندگی میں صالح ہونے کا پہلو غالب ہوتا ہے اور کچھ کی زندگی میں مصلح ہونے کا پہلو۔ دونوں ہی صراط مستقیم پر ہیں جب تک کہ بہت زیادہ عدم توازن نہ ہو، نیت خالص ہو اور اللہ کی خشیت اور احسان کی کیفیت حاصل رہے۔ حدیث جبرئیل کے مطابق احسان کا معنی یہ ہے کہ ہم اللہ کی ایسے عبادت کریں کہ جیسے اللہ کو دیکھ رہے ہوں یا اللہ ہمیں دیکھ رہا ہو۔ اللہ کو دیکھنے سے مراد یہ نہیں ہے کہ اللہ کے بارے کوئی تصور اپنے ذہن میں لایا جائے بلکہ یہ مراد ہے کہ اگر ہم اللہ کے سامنے کھڑے ہو کر اللہ کو دیکھ رہے ہوتے تو خشیت کی جو کیفیت ہوتی تو اس کیفیت کے ساتھ اللہ کی عبادت کرنی چاہیے۔

اور احسان کی کیفیت جس طرح کہ نماز میں ہونی چاہیے، اسی طرح درس قرآن

دیتے ہوئے بھی ہونی چاہیے۔ قرآن مجید پڑھتے ہوئے اور قرآن مجید پڑھاتے ہوئے دونوں صورتوں میں ہمیں احسان کی کیفیت حاصل کرنے کا حکم ہے۔ پس اگر اصلاح کے عمل کے دوران اخلاص، خشیت اور احسان کی کیفیات حاصل رہتی ہیں تو مصلح ہر طور صالح سے بہتر ہے کہ احادیث کے مطابق عالم کو عابد پر فضیلت حاصل ہے۔ لیکن اصلاح کے عمل کے دوران ان کیفیات کا حاصل ہونا اسی صورت ممکن ہے جبکہ آپ دوسروں کی اصلاح سے پہلے اپنے صالح ہونے پر خوب محنت کر چکے ہوں۔ قرآن مجید میں صالح انہیں کہا گیا ہے جو ایمان لانے کے بعد صالح عمل بھی کریں۔ ارشاد باری ہے:

﴿وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَنُدْخِلَنَّهُمْ فِي الصَّالِحِينَ﴾ [العنکبوت: 9]

"اور جو لوگ ایمان لے کر آئے اور انہوں نے نیک اعمال کیے تو ہم لازما ان کو صالحین میں شمار کریں گے۔"

اس آیت مبارکہ میں ایمان لانے کے بعد صالح عمل کرنے والوں کو اللہ تعالی نے صالحین میں شامل ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دیا ہے۔ اسی طرح مصلحین یعنی دوسروں کی اصلاح کرنے والوں کے بارے فرمایا کہ کسی قوم میں ان کی موجودگی اتنی بڑی رحمت ہے کہ ان کے ہوتے ہوئے اس قوم پر عذاب نازل نہیں ہوتا۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَى بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ﴾ [هود: 117]

"اور آپ کا رب بستیوں کو ظلم کے سبب سے تباہ کرنے والا نہیں ہے جبکہ ان میں رہنے والے اصلاح کرنے والے بھی ہوں۔"

یہ واضح رہے کہ اصلاح کا کام بھی ایک اعتبار سے عمل صالح ہی ہے۔ اللہ عزوجل ہمارا شمار ان صالحین میں فرمائے جو مصلحین بھی ہیں۔ اور ایسے لوگوں کی صفات جو کہ صالح بھی ہوں اور مصلح بھی، قرآن مجید کی نظر میں درج ذیل ہیں:

﴿مِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ أُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَتْلُونَ آيَاتِ اللَّهِ آنَاءَ اللَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ ﴿113﴾ يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ فِي الْخَيْرَاتِ وَأُولَئِكَ مِنَ الصَّالِحِينَ﴾ [آل عمران: 114]

”اہل کتاب میں ایک گروہ ایسا ہے جو راتوں کو کھڑے رہتے ہیں اور اللہ کی آیات کی رات کے مختلف اوقات میں تلاوت کرتے ہیں اور وہ راتوں کو سجدہ کرتے ہیں۔ وہ اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے منع کرتے ہیں۔ اور نیکی کے کاموں میں جلدی کرتے ہیں۔ یہی لوگ صالحین میں سے ہیں۔“

رات کو قرآن مجید کی آیات کے ساتھ نماز تہجد میں طویل قیام اور لمبے سجدے صالح بننے اور دن میں قرآن مجید کی آیات کے ساتھ دعوت و تبلیغ کا کام مصلح بننے کی قرآنی بنیاد ہے۔ قرآن مجید میں ایک مقام پر حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک بہت ہی خوبصورت دعا نقل ہوئی ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَى وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَدْخِلْنِي بِرَحْمَتِكَ فِي عِبَادِكَ الصَّالِحِينَ﴾ [النمل: 19]

”اے میرے پروردگار! مجھے اس بات کی توفیق دے کہ میں آپ کی ان نعمتوں کا شکر ادا کروں جو آپ نے مجھ پر انعام کی ہیں اور ان نعمتوں کا بھی شکر ادا کروں جو آپ نے میرے والدین پر انعام کی ہیں۔ اور مجھے اس بات کی بھی توفیق دیں کہ میں ایسے نیک کام کروں جو آپ کو پسند ہوں۔ اور آپ مجھے اپنی رحمت سے اپنے صالح بندوں میں شامل فرمائیں۔“

ہمیں چاہیے کہ ہم اس دعا کو اپنی نماز میں تشہد وغیرہ میں یا اپنے اذکار میں شامل کریں۔ یہ عمل صالح اور مصلح بننے کی بنیاد بن جائے گا، ان شاءاللہ!

تزکیہ اور تعلیم: تخلیہ اور تحلیہ

قرآن مجید میں چار مقامات پر اللہ کے رسول ﷺ کا یہ فرض بیان ہوا ہے کہ آپ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین پر قرآن مجید کی آیات کی تلاوت فرماتے، انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے اور ان کا تزکیہ کرتے ہیں۔

سورۃ البقرۃ آیت 129 میں بیان ہوا کہ ابو الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا کی

تھی کہ اللہ سبحانہ وتعالی ان کے بیٹے حضرت اسمعیل علیہ السلام کی نسل میں ایک ایسا نبی بھیجیں جو ان پر اللہ عزو جل کی آیات کی تلاوت کریں، انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیں اور ان کا تزکیہ کریں۔اس دعا کے الفاظ یہ ہیں:

﴿رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ﴾ [البقرة: 129]

"اے پروردگار! ان میں ایک رسول انہی میں سے بھیجیں جو ان پر تیری آیات کی تلاوت کریں، انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیں اور ان کا تزکیہ کریں۔ بے شک آپ غالب حکمت والے ہیں۔"

اس دعا میں تعلیم کا ذکر پہلے ہے جبکہ تزکیہ کا بعد میں ہے۔اس کے برعکس بقیہ تین مقامات سورہ بقرۃ آیت 151، سورۃ آل عمران آیت 164، سورۃ الجمعۃ آیت 2 میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بھیجنے کا جو مقصد بیان ہوا ہے، وہاں ان چاروں باتوں کا ذکر تو ہے لیکن تزکیہ کا ذکر پہلے ہے اور تعلیم کا بعد میں۔ارشاد باری تعالی ہے :

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ﴾ [الجمعة:2]

"وہی ذات ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں اپنا ایک رسول بھیجا جو انہی کی قوم میں سے ہے۔اور وہ رسول ان پر اللہ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں اور ان کا تزکیہ کرتے ہیں۔انہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔اور بے شک وہ قوم اس سے پہلے کھلی گمراہی میں مبتلا تھی۔"

کیا تعلیم (education) اور تزکیہ (development) ایک ہی چیز ہیں؟ یہ ایک اہم سوال ہے اور اس کا جواب نفی میں ہے۔ تعلیم اور تزکیہ دو علیحدہ اصطلاحات ہیں۔ تعلیم کا معنی تحلیہ ہے یعنی کسی کو آراستہ کرنا اور تزکیہ کا معنی تخلیہ ہے یعنی کسی کو خالی کرنا۔ مثلاً کسی شخص کو اخلاق حسنہ سے آراستہ کرنا مقصود ہو تو تعلیم ہو گی اور رذائل (vices) سے پاک کرنا مطلوب ہو تو تزکیہ کہلائے گا۔ گویا کہ تعلیم اور تزکیہ دراصل

انسانی شخصیت کی تعمیر (personality grooming) کے دو رخ ہیں کہ ان دونوں کی اہمیت اپنی جگہ تسلیم شدہ ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ پہلے تعلیم ہونی چاہیے یا تزکیہ؟ قرآن مجید میں تین مقامات پر جہاں اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں بیان ہوا کہ وہ صحابہ کی تربیت کے لیے کیا کچھ کر رہے ہیں تو اس میں پہلے تزکیہ کا ذکر ہے اور بعد میں تعلیم کا جبکہ ایک مقام پر جہاں ابراہیم علیہ السلام کی اللہ کے رسول ﷺ کے بارے میں دعا کا ذکر ہے تو ان کی دعا میں پہلے تعلیم کا ذکر ہے اور بعد میں تزکیہ کا۔ بظاہر قرآنی اسلوب سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ تزکیہ کو تعلیم پر مقدم کرنا چاہیے کیونکہ آپ ﷺ کا منہج یہی بیان ہوا ہے۔ واللہ اعلم

اگر صوفیاء کی بات کریں تو ان میں دونوں نقطہ ہائے نظر پائے جاتے ہیں۔ چشتیہ کا موقف یہ ہے کہ تخلیہ کو تحلیہ پر مقدم کیا جائے یعنی پہلے نفس کو رذائل سے پاک کیا جائے اور پھر تسبیحات ونوافل پر لگایا جائے جبکہ نقشبندیہ کا موقف یہ ہے کہ تحلیہ کو تخلیہ پر مقدم کیا جائے یعنی پہلے نفس کو نوافل اور تسبیحات کی عادت ڈالی جائے، پھر رذائل سے پاک کرنے کی طرف توجہ دی جائے۔ کچھ صوفیاء کا کہنا ہے کہ دونوں ساتھ ساتھ ہونے چاہییں۔[1]

اللہ عزوجل نے تلاوت آیات کے ساتھ تزکیہ کا ذکر کیا ہے جبکہ تعلیم کتاب کے ساتھ حکمت کا۔ تلاوت آیات کے فوراً بعد تزکیہ کا ذکر کرنے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ تلاوت آیات ہی تزکیہ کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں۔ جناب ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کا یہی نکتہ نظر تھا اور انہوں نے تزکیہ کے اسی طریقہ کار یعنی "تزکیہ نفس بذریعہ تلاوت قرآن مجید" کو اپنی تنظیم میں اصلاح نفس کی بنیاد بنایا۔ تزکیہ نفس بذریعہ تلاوت میں اگر ایک اور چیز شامل کر لی جائے یعنی صحبت صالحین تو صحیح معنوں میں اس منہج کا اثر نمایاں ہو گا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو تلاوت آیات کے ساتھ اللہ کے رسول ﷺ کی صحبت بھی

---

[1] اشرف علی تھانوی، مولانا، شریعت وطریقت، مرتب مولانا محمد دین چشتی، ادارہ اسلامیات، لاہور، ص 82

حاصل تھی۔ یہ صحبت ان کے قلوب میں وہ مادہ پیدا کرتی تھی جو آیات کی تلاوت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ایمانی اور روحانی اثرات کو جذب کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔

ایک دوست کا کہنا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ پر جو پہلی وحی نازل ہوئی تھی وہ پڑھنے سے متعلق تھی لہذا تعلیم کو تزکیہ پر مقدم کرنا چاہیے۔ ہماری رائے یہ ہے کہ قراءت اور تعلیم میں فرق ہے۔ پڑھنا لکھنا ایک فن ہے نہ کہ علم لہٰذا پڑھنے اور لکھنے کے فن کو علم قرار دینا درست نہیں ہے۔ پس پہلی وحی کے پہلے لفظ سے فن کی ابتداء ہوئی ہے اور علم بعد میں دیا گیا ہے۔ اسی لیے اللہ کے رسول ﷺ کا لقب **"أمي"** ہے کہ آپ پڑھنا لکھنا نہیں جانتے تھے لیکن عالم سب سے بڑے تھے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کا تزکیہ تو ان کے بچپن میں ہی کر دیا گیا تھا لہذا آپ ﷺ کا تزکیہ پہلے ہوا اور تعلیم بعد میں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَتَاهُ جِبْرِيلُ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَهُوَ يَلْعَبُ مَعَ الْغِلْمَانِ، فَأَخَذَهُ فَصَرَعَهُ، فَشَقَّ عَنْ قَلْبِهِ، فَاسْتَخْرَجَ الْقَلْبَ، فَاسْتَخْرَجَ مِنْهُ عَلَقَةً، فَقَالَ: «هَذَا حَظُّ الشَّيْطَانِ مِنْكَ، ثُمَّ غَسَلَهُ فِي طَسْتٍ مِنْ ذَهَبٍ بِمَاءِ زَمْزَمَ، ثُمَّ لَأَمَهُ، ثُمَّ أَعَادَهُ فِي مَكَانِهِ، وَجَاءَ الْغِلْمَانُ يَسْعَوْنَ إِلَى أُمِّهِ - يَعْنِي ظِئْرَهُ - فَقَالُوا إِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ قُتِلَ، فَاسْتَقْبَلُوهُ وَهُوَ مُنْتَقِعُ اللَّوْنِ، قَالَ أَنَسٌ وَقَدْ كُنْتُ أَرَى أَثَرَ ذَلِكَ الْمِخْيَطِ فِي صَدْرِهِ.»[1]

"حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس حضرت جبریل علیہ السلام اس وقت تشریف لائے جبکہ آپ بچوں کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ انہوں نے آپ کو پکڑ کر نیچے لٹایا اور آپ کا سینہ چیر کر دل باہر نکالا۔ اور اس دل میں سے خون کا ایک لوتھڑا باہر نکالنے کے بعد کہا کہ یہ شیطان کا حصہ تھا۔ انہوں نے آپ کا دل سونے کی رکابی میں زمزم کے پانی سے دھویا۔ پھر انہوں نے آپ کے دل کو اپنی جگہ رکھ دیا اور سینے کو سی دیا۔ بچوں نے جب یہ

[1] مسلم بن الحجاج النيسابوري (المتوفى: 261هـ)، صحيح مسلم، كتاب الإيمان، بَابُ الْإِسْرَاءِ بِرَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِلَى السَّمَاوَاتِ، دار إحياء التراث العربي، بيروت، 147/1

معاملہ دیکھا تو آپ کی والدہ یعنی رضاعی ماں کو بتلانے کے لیے دوڑے اور کہنے لگے کہ محمد ﷺ کو قتل کر دیا گیا۔ پس آپ کے رضاعی والدین آپ کی طرف دوڑے اور دیکھا کہ آپ کا رنگ تبدیل ہو چکا تھا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آپ کے سینے میں سیے جانے کے نشانات گویا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔"

ایک سلفی عالم دین دوست نے اس رائے کا اظہار کیا کہ تزکیہ نفس کے باب میں سلفی علماء کو صوفیاء کی آراء نقل نہیں کرنی چاہییں۔ ہمارا کہنا یہ ہے کہ سلفی علماء کے ہاں صوفیاء کی رائے نقل کرنے کا مقصد ان کے اقوال سے استدلال نہیں ہوتا ہے بلکہ کسی موضوع پر تقابلی مطالعہ میں اضافہ کی خاطر ایسا کیا جاتا ہے۔ اور دوسری اور اہم تر بات یہ ہے کہ ضروری نہیں ہے کہ سلفیہ کے فریق مخالف کی ہر بات ہی غلط ہو بلکہ صوفیاء نے بھی بہت سی باتیں ایسی بیان کی ہیں جو کہ کتاب وسنت کے مطابق ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بعض سلفی علماء اپنے فتاوی میں اہل الظاہر، جعفریہ، زیدیہ اور اباضیہ وغیرہ تک کی آراء بھی ذکر کر دیتے ہیں۔ یا سلفی اہل علم اپنی عقیدہ کی کتب میں جہمیہ، معتزلہ، مرجئہ اور قدریہ وغیرہ کا موقف بھی ذکر کرتے ہیں۔ اسی طرح علم اخلاق بھی ایک میدان ہے کہ جس میں صوفیاء کی آراء موجود ہیں اور ان کی رائے بیان کر دینے میں سلفیہ کو کوئی وحشت محسوس نہیں ہونی چاہیے جبکہ استدلال کی بنیاد کتاب وسنت ہو۔

کتاب سے تربیت

تجربہ شاہد ہے کہ تزکیہ نفس کے لیے کتاب سے کہیں زیادہ مفید "صحبت" ہے یعنی ایسے لوگوں کی صحبت کہ جن کا تزکیہ ہو چکا ہو۔ صحبت سے احوال منتقل ہوتے ہیں جبکہ کتاب سے صرف معلومات منتقل ہوتی ہیں سوائے کتاب وسنت کے کہ جو علم کے ساتھ احوال بھی منتقل کرتے ہیں۔ مثلاً جب آپ برف کے پاس بیٹھیں گے تو اس کی ٹھنڈک آپ کو پہنچے گی اور اگر آپ آگ کے گرد ہوں تو آپ تک اس کی حرارت منتقل ہو گی۔ پس اسی طرح صاحب ایمان کی صحبت میں بیٹھنے سے ایمان منتقل ہوتا ہے بلکہ ایمان کے

علاوہ احوال اور کیفیات بھی منتقل ہوتی ہیں۔

اس کو یوں سمجھیں کہ ایک ہے عاجزی کے موضوع کا کتب میں مطالعہ کرنا اور ایک ہے کہ کسی ایسے شخص کی صحبت میں بیٹھنا کہ جس میں واقعتاً عاجزی ہو۔ اگر آپ ایسے شخص کی صحبت میں ایک عرصہ تک بیٹھیں اور آپ کو اس سے نسبت بھی ہو تو عاجزی کے احوال اس سے آپ میں منتقل ہوں گے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنے تزکیہ کے لیے قرآن مجید کے علاوہ جو سب سے بڑا موقع حاصل تھا، وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا تھا۔ اور صحبت کا تزکیہ کے لیے مفید ہونا واضح امر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم جب آپ کی مجلس سے اٹھ جاتے تھے تو اپنے ایمان کی کیفیت میں اس قدر تبدیلی پاتے کہ انہیں اپنے منافق ہونے کا شبہ ہونے لگتا تھا۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي مُوسَى، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: «إِنَّمَا مَثَلُ الْجَلِيسِ الصَّالِحِ، وَالْجَلِيسِ السَّوْءِ، كَحَامِلِ الْمِسْكِ، وَنَافِخِ الْكِيرِ، فَحَامِلُ الْمِسْكِ: إِمَّا أَنْ يُحْذِيَكَ، وَإِمَّا أَنْ تَبْتَاعَ مِنْهُ، وَإِمَّا أَنْ تَجِدَ مِنْهُ رِيحًا طَيِّبَةً، وَنَافِخُ الْكِيرِ: إِمَّا أَنْ يُحْرِقَ ثِيَابَكَ، وَإِمَّا أَنْ تَجِدَ رِيحًا خَبِيثَةً»[1]

"حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ اچھے اور برے ساتھی کی مثال ایسی ہی ہے جیسا کہ عطر (perfume) اٹھانے والے اور بھٹی میں پھونک مارنے والے کی۔ عطر والا شخص یا تو تمہیں اپنے پرفیوم میں سے کچھ ہدیہ کر دے گا یا تم اس سے کچھ خرید لو گے یا دونوں صورتیں نہ ہوں تو کم از کم پرفیوم کی خوشبو تو تمہیں پہنچ ہی جائے گی۔ اور بھٹی میں پھونک مارنے والا یا تو تمہارے کپڑے جلا دے گا یا یہ نہ بھی ہو تو کم از کم تمہیں اس کی بدبو تو ضرور پہنچے گی۔"

تزکیہ نفس اور تربیت پر لکھی گئی کتب پڑھ لینے یا اس موضوع پر تحقیقی مضامین مرتب کر لینے سے تزکیہ یا تربیت نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے لیے نیک لوگوں کی صحبت

[1] صحیح مسلم، كتاب البر والصلة والآداب، باب استحباب مجالسة الصالحين، 2026/4

میں اٹھنا بیٹھنا بھی ضروری ہے۔ اور نیک لوگوں سے ہماری مراد "گدی نشین پیر" یا "خلیفہ مجاز فقیر" نہیں بلکہ والدین اور وہ رشتہ دار، دوست، محلے دار اور مسجد کے نمازی ہیں جنہیں آپ نیکی میں اپنے سے بہتر خیال کریں۔

ذرا غور کریں کہ اس شخص سے بڑا بدنصیب کون ہو گا کہ جس کے گھر میں بوڑھے والد کی صورت میں اس کی جنت موجود ہو اور وہ کسی پیر کی جوتیاں سیدھی کرنے کے لیے سینکڑوں کلومیٹر کا سفر طے کرنے کو اپنے لیے اعزاز سمجھ رہا ہو۔ اللہ کے رسول ﷺ تو اس کے والد کو اس کے لیے جنت کا دروازہ قرار دیں اور یہ جنت بہشتی دروازے میں تلاش کر رہا ہو۔ تعجب ہے اس رویے پر! ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«الْوَالِدُ أَوْسَطُ أَبْوَابِ الْجَنَّةِ، فَأَضِعْ ذَلِكَ الْبَابَ أَوِ احْفَظْهُ»[1]

"والد جنت میں داخل ہونے والے دروازوں میں سے سب سے بہترین دروازہ ہے۔ پس چاہو تو اس دروازے کو [اہمیت نہ دے کر] ضائع کر دو اور چاہو تو اس کی حفاظت کر لو۔"

احمد جاوید صاحب کا کہنا ہے کہ جس کی پیاس جھوٹی ہو تو وہ دریا سے بھاگتا ہے اور سراب کی طرف دوڑتا ہے۔ پس جس کی طلب سچی نہیں ہے، وہ اپنی جنت کے یقینی رستوں کو چھوڑ کر جھوٹی امیدوں کی طرف دوڑے گا۔ پروردگار نے اس کی جنت عقیدہ توحید پر زندگی گزارنے، ارکان اسلام پر عمل پیرا ہوانے، ماں کی خدمت کرنے اور والد کی جوتیاں سیدھی کرنے میں رکھی ہے جبکہ یہ اسے پیر کے قدموں اور مرشد کی جوتیوں میں تلاش کرتا پھر رہا ہے۔

تزکیہ نفس کے موضوع پر کتابیں تو بہت سی ہیں اور سب سے اہم خود قرآن مجید ہے۔ عربی زبان اور دینی علوم میں اگر اتنی استعداد (capability) ہو کہ براہ راست قرآن مجید کی تلاوت سے اس کا مفہوم دل پر اترتا محسوس ہو تو اس سے بہتر تزکیہ کی کتاب کوئی نہیں ہے۔ اس کے بعد ریاض الصالحین اچھی کتاب ہے جو اخلاق ورذائل

---

[1] ابن ماجة، أبو عبد الله محمد بن يزيد القزويني، (المتوفى: 273هـــ)، سنن ابن ماجه، كِتَابُ الْأَدَبِ، بَابُ بِرِّ الْوَالِدَيْنِ، دار إحياء الكتب العربية، فيصل عيسى البابي الحلبي، 1208/2

(morals and vices) کی احادیث کا مجموعہ ہے۔ علاوہ ازیں احادیث کی دیگر کتب میں بھی آداب ورقائق کے نام سے ابواب (chapters) ہوتے ہیں، ان کا مطالعہ بھی بہت مفید ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگیوں پر لکھی گئی کتب کو بھی پڑھیں۔ علاوہ ازیں اس موضوع پر امام احمد بن حنبل، امام عبد اللہ بن مبارک اور امام ابن قیم رحمۃ اللہ علیہم وغیرہ کی تحریروں کا مطالعہ کریں۔

شیخ اور استاذ کا فرق

اللہ کے رسول ﷺ کے قرآن مجید میں کئی مقامات پر چار فرائض بیان ہوئے ہیں، جن میں ایک تعلیم کتاب اور دوسرا تزکیہ نفس ہے۔ آپ ﷺ بیک وقت معلم (teacher) بھی تھے اور مربی (mentor) بھی اور یہی معاملہ صحابہ کا بھی تھا۔ بعد کے زمانوں میں جب اتنی جامعیت نہ رہی تو معلم اور مربی کی تقسیم پیدا ہوئی۔ تابعین ہی کے زمانے میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ تقسیم شروع ہو چکی تھی مثلاً سعید بن مسیب اور حسن بصری رحمۃ اللہ علیہما کی عوامی مجالس میں باہمی فرق کو ہم علمی اور اصلاحی مجالس کی اصطلاحات سے واضح کر سکتے ہیں۔

ماضی قریب کی مثال لینی ہے تو شیخ الکل حضرت نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ کا اپنے شاگرد عبد اللہ غزنوی رحمہ اللہ کے بارے یہ قول ہے کہ عبد اللہ نے مجھ سے بخاری سیکھی اور میں نے اس سے نماز۔[1] اسی طرح شاہ اسمعیل شہید رحمہ اللہ نے سید احمد شہید بریلوی رحمہ اللہ سے اصلاحی تعلق قائم کیا اور معروف معنوں میں ان کے مرید کہلائے جبکہ سید احمد شہید رحمہ اللہ نے شاہ اسمعیل شہید رحمہ اللہ سے علم حاصل کیا اور معروف معنوں میں ان کے شاگرد قرار پائے۔ مجاہدین کی یہ تحریک جب پشاور پہنچی تو وہاں یہ دیکھنے میں آیا کہ فجر کی نماز کے بعد سید احمد بریلوی شہید رحمہ اللہ کی اصلاحی مجلس ہوتی تھی جس میں مسند پر تو سید احمد شہید رحمہ اللہ ہوتے جبکہ شاہ اسمعیل شہید رحمہ اللہ سامنے ایک طالب کی حیثیت سے موجود ہوتے تھے۔ اور ظہر کے بعد درس حدیث کی علمی مجلس ہوتی تھی کہ جس میں

---

[1] ابوبکر غزنوی سید، داود غزنوی، فاران اکیڈمی، لاہور، 1994ء، ص 14

مسند پر تو شاہ اسمعیل شہید رحمہ اللہ تشریف فرماتے جبکہ سید احمد شہید رحمہ اللہ ایک شاگرد کی حیثیت سے سامنے بیٹھے ہوتے تھے۔[1]

ہم میں سے ہر شخص کو استاذ کے علاوہ ایک شیخ کی بھی ضرورت ہے۔ احمد جاوید صاحب کا کہنا ہے کہ معلم (teacher) ہمارے ذہن کی نشوونما کرتا ہے جبکہ مربی (mentor) قلب کی اصلاح۔ استاذ اختلاف کی استعداد بڑھاتا ہے تاکہ حرکت پیدا ہو جبکہ شیخ اتفاق کی طرف کھینچتا ہے تاکہ سکون کی طرف لائے۔ معلم ذہن کا محافظ ہے جبکہ شیخ قلب کا مالی۔ استاذ چلاتا ہے جبکہ شیخ روکتا ہے۔ استاذ اپنے سے اختلاف پر ابھارتا ہے تاکہ کند ذہن نہ رہے اور تخلیق کا باعث بنے جبکہ شیخ اختلاف کو دباتا ہے تاکہ تجدد کی راہوں پر نہ نکل جائے۔

عام طور لوگوں کا خیال ہے کہ حرکت میں ہی کل زندگی ہے لیکن کبھی پودوں اور درختوں پر غور کریں تو احساس ہو گا کہ ان کے برگ و بار اور پھل و پھول ان کے سکون ہی کا نتیجہ ہیں۔ اگر درخت ساکن نہ ہو تو پھل نہ دے اور پودے حرکت کرنے لگیں تو پھول پیدا نہ ہوں۔ حرکت و سکون ہماری زندگی کے دو پہلو ہیں اور دونوں کے ملنے سے ہی جمال اور توازن پیدا ہوتا ہے۔

یہاں استاذ سے ہماری مراد "باعمل عالم دین" ہے لیکن تربیت، تعلیم کے علاوہ ایک میدان ہے جس کے اپنے رجال کار ہیں، یہ بات مجھے کافی عرصہ بعد سمجھ آئی۔ پہلے میری رائے بھی یہی تھی کہ تعلیم ہی تربیت کا دوسرا نام ہے اور معلم (teacher) ہی مربی (mentor) بھی ہوتا ہے لیکن کچھ مربی حضرات کی مجالس میں بیٹھنے کے بعد یہ رائے تبدیل ہو گئی۔

اب شدت سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ انسان کی عملی اصلاح میں جو کردار شیخ ادا کر سکتا ہے، وہ استاذ کے حصے میں بہت کم آتا ہے۔ اور انسان کی ذہنی تربیت میں جو کردار

---

[1] ابو الحسن علوی ندوی سید، سیرت سید احمد شہید، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنو، نواں ایڈیشن، 2011ء، حصہ دوم، ص 234

استاذ کا ہے، وہ شیخ کا میدان نہیں ہے۔ ایک عالم دین، نیک ہو سکتا ہے لیکن عموماً وہ مربی نہیں ہوتے یعنی تربیت کرنے کے فن سے آگاہ نہیں ہوتے۔ اگر کسی عالم دین ہی میں یہ دونوں چیزیں جمع ہو جائیں یعنی وہ اچھا استاذ اور اچھا مربی بھی ہو تو بہت خوب! اور کیا چاہیے؟ استاذ مجلس میں بنتا ہے اور مربی تنہائی میں۔ تنہائی میں جس کا رونا زیادہ ہو، مجلس میں اس کی بات میں اثر زیادہ ہوتا ہے۔

تربیت اور اصلاح کے حوالے سے تصوف اور اصلاحی تحریکوں کے لٹریچر کو کھنگالا تو اس سے یہ ذہن بنا کہ تربیت، تعلیم کے علاوہ ایک مستقل ضرورت ہے اور مدرس عام طور اس ضرورت کو پورا نہیں کرتے۔ کسی عالم دین کا رات تہجد میں قیام کرنا یا اعلیٰ اخلاق سے متصف ہونا مربی ہونے کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ مربی تو وہ ہے جو اپنے زیر تربیت افراد کو نیکی کی اس سطح پر یا اس کے قریب قریب لے آئے کہ جس پر وہ خود کھڑا ہے۔

فرشتے اس شخص کے حق میں مغفرت کی دعا کرتے ہیں جو صرف علم منتقل نہ کرے بلکہ اپنے علم (knowledge) کو لوگوں کے لیے خیر (good) بنا دے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«إِنَّ اللَّهَ وَمَلَائِكَتَهُ وَأَهْلَ السَّمَوَاتِ وَالأَرَضِينَ حَتَّى النَّمْلَةَ فِي جُحْرِهَا وَحَتَّى الحُوتَ لَيُصَلُّونَ عَلَى مُعَلِّمِ النَّاسِ الخَيْرَ»[1]

"یقیناً اللہ عزوجل، اس کے فرشتے، زمینوں اور آسمانوں کی جمیع مخلوقات یہاں تک کہ چیونٹیاں اپنی بلوں میں اور مچھلیاں تک اس شخص کے لیے رحمت کی دعا کرتی ہیں جو لوگوں کو خیر کی تعلیم دیتا ہے۔"

یہ کتنی بڑی فضیلت ہے لیکن ہر عالم کے لیے نہیں بلکہ اس عالم کے لیے ہے جس نے اپنے علم کو لوگوں کے لیے خیر بنا دیا یعنی اپنے علم سے لوگوں کو خیر کے رستے پر ڈال دیا اور ان کی تربیت کر کے دکھا دی۔ اور انبیاء کی جماعت وہ پہلی جماعت ہے جس نے اپنے علم سے اپنے اصحاب کی تربیت کر کے دکھا دی۔

---

[1] الترمذي، محمد بن عيسى (المتوفى: 279هـ)، سنن الترمذي، أبواب العلم، باب ما جاء في فضل الفقه على العلم، مطبعة مصطفى البابي الحلبي، مصر، 1975ء، 50/5

اس حدیث میں ہمارے لیے عمل کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ کتنی بڑی کوتاہی ہے کہ جس کے لیے پروردگار اور فرشتے دعا کریں اور ہم اس کے لیے دعا نہ کریں۔ اسی لیے ہمیں سجدے کی حالت میں ان اصحاب علم کے لیے خاص طور دعا کا اہتمام کرنا چاہیے کہ جن کا علم لوگوں کے لیے خیر بن جاتا ہے۔ ہمیں عموماً سجدے کی حالت میں یہ دعا کرنی چاہیے: أللهم اغفر لمعلمي الناس الخير۔ ترجمہ: اے اللہ! انھیں اپنی رحمت کی آغوش میں لے لے کہ جو اپنے علم سے لوگوں کو خیر کے رستے پر ڈال دیتے ہیں۔

شیخ سے مراد یہ ہے کہ جس طرح ہم کسی کو استاذ بنا کر اس سے دین کا علم حاصل کرتے ہیں، اسی طرح ہمیں اللہ کے کسی ایسے نیک بندے سے اصلاحی تعلق بھی قائم کرنا چاہیے جو اصلاح قلب اور تزکیہ نفس میں ہماری رہنمائی اور معاونت کر سکے۔ پس اللہ کے کسی ولی کی مجلس یا صحبت میں کچھ وقت گزاریں اور اس کی رہنمائی میں اپنی اصلاح کریں۔ اور کوشش کریں کہ یہ ولی آپ کو اپنے والد، رشتہ دار، دوست، رفیق (colleague)، دینی جماعت کے نیک کارکن، محلے کی مسجد کے بزرگ نمازی یا قریبی مدرسہ کے عالم دین کی صورت میں میسر آ جائیں۔

جبکہ پیری مریدی، گدی نشینی، خانقاہیں اور بیعت کا نظام مل کر جو ایک انسٹی ٹیوٹ بن چکا ہے، ہمارے نزدیک اس کے پورے اسٹرکچر کا زمین بوس ہو جانا دین اسلام کا بنیادی تقاضا ہے۔ ہم تزکیہ نفس کے نام پر اس ظالمانہ اور استحصالی نظام [exploitative system] کے حق میں ہرگز نہیں ہیں۔

تزکیہ کے لیے راہنما کی ضرورت

ہمارے ایک انتہائی قابل احترام عالم دین دوست کا کہنا ہے کہ تزکیہ نفس کے لیے راہنما ضروری ہے۔ تو اس اصولی بات میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ تزکیہ نفس کے لیے راہنما ضروری ہے۔ اصل جھگڑا یہ ہے کہ راہنما بنے گا کون؟

درباروں کے گدی نشین یہ کہتے ہیں کہ یہ راہنما ہم ہیں جبکہ ایک عامی کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ دین اور اخلاق کے معاملے میں خود ان گدی نشینوں کو رہنمائی لینے کی

ضرورت ہے چہ جائیکہ کہ یہ کسی کی راہنمائی کریں۔اسی طرح کسی سلسلے میں بیعت لینے والے پیر اور مرشد یہ دعوی کرتے ہیں کہ یہ راہنما ہم ہیں جبکہ بہت سارے لوگوں کو ان کے نظریات اور اخلاقی رویوں سے بہت سے اختلاف ہیں۔

معاصر صوفیاء کی ایک جماعت کی شدید خواہش ہے کہ اصلاح نفس کی کرسی ان کے لیے خالی کر دی جائے حالانکہ ان کی یہ خواہش یہی بتلاتی ہے کہ یہ حب جاہ کے پجاری ہیں اور ان کی طرف تزکیہ کے لیے رجوع نہیں کرنا چاہیے۔اب جو خود مدعی ہو کہ اس کے پاس تزکیہ نفس کے لیے جایا جائے تو اسے خود تزکیہ نفس کی اشد ضرورت ہے نہیں کیا؟ قرآن مجید تو اپنے تزکیہ تک کا دعوی کرنے سے بھی منع فرماتا ہے چہ جائیکہ کہ دوسروں کو تزکیہ کے سرٹیفکیٹ جاری کرنے کے لیے پیری مریدی کا سلسلہ شروع کیا جائے۔ارشاد باری تعالی ہے:

﴿فَلَا تُزَكُّوا أَنفُسَكُمْ هُوَ أَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقَىٰ﴾ [النجم: 32]

"اور اپنے آپ کو پاک صاف مت جتلاؤ کہ پروردگار خوب جانتا ہے کہ تم میں سے کون متقی ہے؟"

اگر صرف دعوی کرنے سے کوئی راہنما بن جاتا ہے تو یہ دعوی کوئی بھی شخص کر سکتا ہے کہ تمام صوفیوں اور گدی نشینوں کو چاہیے کہ اپنے تزکیہ نفس کے لیے اس سے راہنمائی لیں۔

باقی کسی شخص کے دل میں کتنا تقوی اور ایمان ہے؟ کس کا اللہ کے ہاں کیا مقام اور مرتبہ ہے؟ اللہ کے ہاں مرشد کا مقام بلند ہے یا اس کے مرید کا؟ استاذ اللہ کے زیادہ مقرب ہے یا شاگرد؟ تو یہ سب قیامت والے دن ہی معلوم ہو گا کہ جس دن بڑے بڑے برج الٹ جائیں گے۔ارشاد باری تعالی ہے:

﴿إِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ﴿1﴾ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ﴿2﴾ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ﴾ [القیامۃ: 3]

"جب واقع ہو گی، واقع ہونے والی [یعنی قیامت]۔اس کے واقع ہونے کو کوئی جھٹلانہ سکے گا۔وہ کسی کو پست کر دے گی اور کسی کو بلند کر دے گی۔"

پس قیامت والے دن بہت سے ایسے لوگ بلند ہوں گے جو کہ دنیا میں پست شمار ہوتے تھے۔ اور قیامت والے دن بہت سے ایسے لوگ پست ہوں گے کہ جنھیں دنیا میں بلند سمجھا جاتا تھا۔ پس قیامت کا وقوع لوگوں کی پستی اور بلندی، چھوٹے اور بڑے، افضل اور مفضول ہونے کے بہت سے دنیاوی تصورات کو الٹ دے گا۔

میرے مرشد، میرے حضرت

بعض دوستوں کا کہنا ہے کہ آپ اصلاح نفس پر لکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس بات کو بہت اہمیت دیتے ہیں کہ نیک لوگوں کی صحبت اختیار کریں۔ تو یہ لوگ کون ہیں کہ جن کی صحبت ہماری اصلاح میں اہم کردار ادا کر سکتی ہے؟

آج میں دو ایسے اکابر مرشدین کا تعارف کروانا چاہ رہا ہوں کہ جو ہماری اصلاح میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ یہ مرشد ایسے ہیں کہ اگر آپ کو نصیب ہو جائیں تو پھر آپ کو کسی بیعت یا خانقاہ کی ضرورت نہیں رہتی۔

یہ دو مرشد ہمارے سچے دوست اور اہلیہ ہیں۔ بلاشبہ کسی بھی شخص کو اس کے سچے دوست اور اہلیہ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا لہذا وہ اس کی اصلاح میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔ اہلیہ کو مرشد بنانے کا ہر گز یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کی بیعت کر لی جائے یا اسے گھر کا منتظم (administrator) بنا لیا جائے بلکہ اس معنی میں مرشد کہ خاوند اس سے اپنی اصلاح میں رہنمائی لے سکے۔

ایک دن ایک صاحب اپنی اہلیہ کے ساتھ خوشگوار موڈ میں گھر میں موجود تھے کہ ان سے کہا: آپ دنیا میں مجھے سب سے زیادہ جانتی ہوں گی، مجھے بتائیں کہ مجھ میں کیا خامی ہے؟ اور تنقید برائے تنقید نہ ہو کہ مجھے یہ نہیں ملا، یا گھر میں یہ نہیں ہے بلکہ ایسی بات کہیں جو میری اصلاح میں اہم کردار ادا کر سکے۔ اہلیہ نے کہا: آپ متکبر ہیں۔ انھیں ایک جھٹکا لگا کیونکہ وہ اپنے جاننے والوں میں متواضع اور منکسر المزاج معروف تھے لیکن انھوں نے بات جاری رکھی۔ انھوں نے کہا: کیسا تکبر محسوس کرتی ہیں؟ اہلیہ نے کہا: آپ کو اپنے علم اور نیکی دو چیزوں کا تکبر ہے۔

ان پر اس وقت یہ تبصرہ بہت گراں گزر رہا تھا، وہ بحث کر سکتا تھے اور اپنی عاجزی کو ثابت کرنے کے لیے شہادتوں کے انبار لگا سکتے تھے۔ یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ بیوی تو فریق مخالف ہوتی ہے، اس نے تو ایسے کہنا ہی ہے، کہاں میاں بیوی میں اختلافات نہیں ہیں؟ لڑائی جھگڑے ہر جگہ ہوتے ہیں؟ بیوی اپنے شوہر کے معاملے میں متعصب (biased) ہوتی ہے، تم کن چکروں میں پڑ گئے ہو، کسی غیر جانبدار شخص ہی کو مرشد بنا لیتے، بیوی کہاں غیر جانبدار ہوتی ہے وغیرہ وغیرہ۔

لیکن انھوں نے اپنے نفس کو سمجھایا کہ یہی کڑا مرحلہ ہے۔ اس بات کو حقیقت سمجھ کر مان لو۔ بھلے اب دنیا تمہیں عاجز کہے، تم متواضع نہیں ہو۔ جب کافی کشمکش کے بعد نفس نے اس عیب کو مان لیا تو اب اس کی اصلاح کی طرف توجہ دی۔ اور وہ یہ دعوی نہیں کرتے کہ انھوں نے اپنی اصلاح کر لی ہے یا ان کا تزکیہ ہو گیا ہے لیکن اس تسلیم پر اللہ نے انھیں جو انعامات دیے، ان میں چند ایک ضرور سامنے رکھنا چاہوں گا:

① اہلیہ کے اس تبصرے کو تسلیم کرنے کے بعد اللہ عزوجل نے عاجزی کے احوال کھول دیے یعنی عاجزی پہلے کتابوں میں پڑھتے تھے، اب اسے محسوس کرنا شروع کر دیا۔

② اب اگر کوئی متکبر کہے تو کچھ ملال نہیں ہوتا بلکہ دل میں خیال آتا ہے کہ صحیح ہی تو کہہ رہا ہے۔ اور دل اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے کہ اے مالک! آپ ہی اصلاح بھی فرمائیں اور درگزر بھی کریں۔ پس تکبر کے الزام یا طعن پر ردعمل پیدا نہیں ہوتا بلکہ اپنے متکبر ہونے کا احساس ندامت پیدا ہوتا ہے اور زبان توبہ استغفار کی طرف مائل ہوتی ہے۔ اب معلوم نہیں یہ کیفیت کب تک باقی رہتی ہے۔

③ اب رہ رہ کے یہ حدیث یاد آتی ہے کہ جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہے، وہ جنت میں نہیں جائے گا۔ اور دل میں یہ خیال آتا ہے کہ ان کے دل میں تو رائی کے دانے کے برابر تکبر تو لازماً موجود ہے کیونکہ رائی کا دانہ

تو بہت چھوٹا ہوتا ہے اور اتنے کم تکبر سے بچاؤ کیسے ممکن ہے کیونکہ دل میں اپنے نفس کی بڑائی آ ہی جاتی ہے۔

④ اہلیہ کی بات سے ایک اور حال پیدا ہوا اور وہ یہ کہ رہ رہ کے یہ خیال ستانے لگا کہ آج تم مصنف ہو، خطیب ہو، مدرس ہو، بہت سے لوگ تم سے استفادہ کرتے ہیں۔ تمہاری درس وتدریس، وعظ ونصیحت، تحریر وتصنیف سے فائدہ اٹھانے والے اگر میدان حشر میں تم سے آگے کھڑے ہوں تو وہ تمہارے بارے کیا سوچیں گے؟ یا جنہیں تم اپنی تنقید سے غلط ثابت کرتے رہے، اگر قیامت والے دن وہی تم سے زیادہ سر خرو نکلے تو کہاں اپنا منہ چھپاؤ گے؟ اب ایسے محسوس ہوتا ہے کہ ان کا ہر مقتدی (follower)، سامع (listener) اور قاری (reader) دین میں ان سے بہتر ہے۔

اس تحریر کا مقصد یہ ہے کہ اہلیہ نے اپنے خاوند کی اصلاح میں کیسے کردار ادا کیا۔ آپ بھی اپنی اہلیہ سے اصلاح لیں۔ اسی طرح بیوی اگر اپنے شوہر سے اس معنی میں اصلاح لے لے تو وہ بھی بہت مفید ہے۔ نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے:

«الْمُؤْمِنُ مِرْآةُ الْمُؤْمِنِ، وَالْمُؤْمِنُ أَخُو الْمُؤْمِنِ، يَكُفُّ عَلَيْهِ ضَيْعَتَهُ، وَيَحُوطُهُ مِنْ وَرَائِهِ»[1]

"ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا آئینہ اور ایک مومن دوسرے مومن کا بھائی ہے۔ مسلمان اپنے بھائی کو نقصان سے بچاتا ہے اور اس کی پشت پیچھے اس کا دفاع کرتا ہے۔"

بعض دوستوں نے بیوی کو مرشد بنانے کی تجویز کو ہنسی مزاح میں لیا۔ ہنسی مزاح اپنی جگہ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ آپ کی ذاتی زندگی کے بارے جتنا آپ کی بیوی جانتی ہے، اتنا وہ مرشد نہیں جن سے آپ اصلاح کے لیے بیعت ہوئے ہوں۔

سر پر ٹوپی رکھے، سفید شلوار قمیص میں، شیخ بیعت کے سامنے سر جھکائے تو ہر شخص

---

[1] أبو داود، سليمان بن الأشعث السِّجِسْتاني (المتوفى: 275هـ)، سنن أبي داؤد، كتاب الأدب، باب في النصيحة والحياطة، المكتبة العصرية، بيروت، 280/4

فرشتہ معلوم ہوتا ہے لیکن بیوی کو پتہ ہے کہ اس معصوم فرشتے کی فجر کتنے دن ادا ہوتی اور کتنے دن قضا، غصے کی حالت میں کیا ملفوظات منہ سے ارشاد فرماتے ہیں اور رات کا کتنا حصہ پاکیزہ فلمیں دیکھتے ہوئے گزرتا ہے۔

اس لیے آپ اگر اپنی حقیقی اصلاح چاہتے ہیں تو پہلے اپنی بیوی سے اپنے نفس میں موجود شر کے بارے معلوم کر لیں اور پھر اس شر کی اصلاح کریں۔ آپ کے نفس کے رذائل کے بارے آپ کی بیوی سے بہتر کوئی نہیں جانتا، معذرت کے ساتھ، صاحب بیعت شیخ اور مرشد بھی نہیں۔ نقشبندیہ سلسلے کے ایک بزرگ حضرت مظہر جان جاناں رحمہ اللہ نے اپنے بعض ملفوظات میں تزکیہ میں بیوی کے کردار کی اہمیت کو اجاگر کیا ہے۔

مجاہدہ نفس کے چار اصول

بعض صوفیاء نے کم کھانے، کم سونے، کم گفتگو کرنے اور لوگوں سے کم میل جول رکھنے کو مجاہدہ قرار دیا ہے جسے وہ قلت طعام، قلت منام، قلت کلام اور قلت اختلاط مع الانام کا نام دیتے ہیں۔ اہل علم کی رائے میں اس عنوان کو درست کرنے کی ضرورت ہے یعنی معتدل کھانا، معتدل سونا، معتدل گفتگو کرنا اور معتدل میل جول رکھنا۔ اور یہی شریعت کا تقاضا ہے۔

کم کھانا اور زیادہ کھانا دونوں شریعت کا مطلوب (required) نہیں ہیں۔ شریعت اسلامیہ نہ تو کم کھانے کا تقاضا کرتی ہے اور نہ ہی زیادہ کھانے کو پسند کرتی ہے بلکہ اس معاملے میں میانہ روی کا درس دیتی ہے۔ بعض صوفیاء نے کہا کہ آپ کم کھائیں تاکہ اپنی شہوت کی قوت کو توڑ سکیں۔ یہ سوچ درست نہیں ہے۔ ہمیں ایسا مجاہدہ نہیں چاہیے جو ہماری جبلتوں (instincts) کو ہی کمزور کر دے اور ہم اپنے نفس کو مار کر اس پر اپنی فتح کے جھنڈے گاڑیں بلکہ ہمیں ایسا مجاہدہ کرنا ہے جو ہمارے نفس کو زندہ رکھتے ہوئے اسے اپنے قابو میں رکھ کر دکھا دے۔ کسی مریل جسم کی بجائے کسی صحت مند وجود پر اللہ کی اطاعت کا جھنڈا لہرانا زیادہ کمال کی بات ہے۔ اسلام کا تصور فنائے نفس (self-annihilation) کی بجائے ضبط نفس (self-control) کا ہے۔

اسی لیے اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ جس نے ساری زندگی روزہ رکھا، اس نے روزہ ہی نہیں رکھا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے مجھ سے کہا:

«إِنَّكَ لَتَصُومُ الدَّهْرَ، وَتَقُومُ اللَّيْلَ؟»، فَقُلْتُ: نَعَمْ، قَالَ: «إِنَّكَ إِذَا فَعَلْتَ ذَلِكَ هَجَمَتْ لَهُ العَيْنُ، وَنَفِهَتْ لَهُ النَّفْسُ، لاَ صَامَ مَنْ صَامَ الدَّهْرَ، صَوْمُ ثَلاَثَةِ أَيَّامٍ صَوْمُ الدَّهْرِ كُلِّهِ»، قُلْتُ: فَإِنِّي أُطِيقُ أَكْثَرَ مِنْ ذَلِكَ، قَالَ: «فَصُمْ صَوْمَ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلاَمُ، كَانَ يَصُومُ يَوْمًا وَيُفْطِرُ يَوْمًا، وَلاَ يَفِرُّ إِذَا لاَقَى»[1]

"مجھے یہ معلوم ہوا ہے کہ تم روزانہ روزہ رکھتے ہو اور ساری رات قیام کرتے ہو۔ میں نے کہا: جی ہاں، ایسا ہی ہے۔ آپ نے فرمایا: اگر تم نے ایسا کیا تو تمہاری آنکھیں کمزور ہو جائیں گی اور نفس بوجھل ہو جائے گا۔ اور جس نے روزانہ روزہ رکھا، اس کا کوئی روزہ نہیں ہے۔ مہینے میں صرف تین روزے رکھ لو، اس کا ثواب ایسا ہی ہے کہ جیسے تم نے ہمیشہ روزہ رکھا۔ میں نے کہا: مجھے تین روزوں سے زیادہ کی طاقت حاصل ہے۔ آپ نے فرمایا: تو پھر داود علیہ السلام کا روزہ رکھ لو کہ وہ ایک دن افطار کرتے تھے اور ایک دن روزہ رکھتے تھے اور میدان جنگ سے فرار نہیں ہوتے تھے۔"

پس مسلسل کم کھانا اگر عبادت کی نیت اور طریقے یعنی روزے کے ذریعے سے بھی ہو تو پھر بھی ناپسندیدہ عمل ہے۔ چونکہ لگاتار روزہ رکھنے سے نفس بھوکا رہنے کا عادی ہو جاتا ہے لہذا مجاہدہ یعنی نفس سے کشمکش بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ مجاہدہ تو اس وقت ہوتا ہے جبکہ خواہش برقرار ہو اور جبلت قائم ہو۔ جب آپ نے خواہش ہی کو مار دیا اور جبلت کو ختم کر دیا اور بھوکے رہنے کو عادت بنالیا تو اب کیا مجاہدہ رہا؟

اور اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ نے زیادہ کھانے کو ناپسند فرمایا ہے اور کہا کہ کافر سات آنتوں سے کھاتا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ ایک شخص بہت زیادہ کھانا

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الصوم، بَابُ صَوْمِ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلاَمُ، 40/3

کھاتا تھا، اسلام قبول کرنے کے بعد اس کا کھانا کم ہو گیا۔ جب اللہ کے نبی ﷺ کے سامنے اس کا ذکر کیا گیا تو آپ نے فرمایا:

«إِنَّ المُؤْمِنَ يَأْكُلُ فِي مِعًى وَاحِدٍ، وَالكَافِرَ يَأْكُلُ فِي سَبْعَةِ أَمْعَاءٍ»[1]

"یقیناً مومن ایک آنت سے کھاتا ہے جبکہ کافر سات آنتوں میں کھاتا ہے۔"

اعتدال یہ ہے کہ خواہش کے مطابق بقدر ضرورت کھانا کھائے اور اس پر اللہ کا دل سے شکر ادا کرے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ کسی کو حالات کے تحت خواہش کے مطابق یا بقدر ضرورت کھانا میسر نہ ہو جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ کے ہاں دو دو ماہ چولہا نہیں جلتا تھا۔ تو ایسا واقعاتی طور تھا نہ کہ شرعی تقاضا تھا یعنی آپ اس پر عمل دینی حکم سمجھ کر نہیں کرتے تھے بلکہ تقدیر سمجھ کر صبر فرماتے تھے۔

کم کھانا یہ ہے کہ کھانا میسر ہو اور انسان خواہش یا ضرورت کے بقدر اس میں سے نہ لے تا کہ اپنی شہوت کو توڑ سکے تو ایسے کسی عمل کا ثبوت ہمیں اللہ کے رسول ﷺ کی زندگی سے نہیں ملتا ہے۔ کھانا کم کھا کر اپنی لذت کو توڑنے کی نسبت زیادہ مجاہدہ اس میں ہے کہ کھانا خواہش کے مطابق بقدر ضرورت کھا کر اللہ کا شکر ادا کرے۔ اگر ہمیں دل سے شکر ادا کرنا آ جائے تو پھر شاید کم کھانے سے جو کیفیات حاصل ہوتی ہیں، تو معتدل طریقے سے کھانا کھا کر شکر ادا کرنے سے حاصل ہونے والے احوال ان پر غالب آ جائیں۔ اگر انسان کھانا کھانے کے بعد اللہ کا دل سے شکر ادا کرے گا تو اللہ سے مزید بہتر کھانا طلب کرے گا تا کہ اللہ کا اور بھی شکر گزار بندہ بن سکے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے:

«إِذَا أَكَلَ أَحَدُكُمْ طَعَامًا فَلْيَقُلْ: اللَّهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيهِ، وَأَطْعِمْنَا خَيْرًا مِنْهُ، وَإِذَا سُقِيَ لَبَنًا فَلْيَقُلْ: اللَّهُمَّ بَارِكْ لَنَا فِيهِ، وَزِدْنَا مِنْهُ»[2]

"جب تم میں سے کوئی شخص کھانا کھائے تو یہ کہے: اے اللہ! ہمارے اس کھانے میں برکت ڈال دے اور ہمیں اس سے بھی بہتر کھانا کھلا۔ اور جب کسی

[1] صحيح البخاري، كتاب الأطعمة، بَابٌ: المُؤْمِنُ يَأْكُلُ فِي مِعًى وَاحِدٍ، 72/7

[2] سنن أبي داود، كتاب الأشربة، بَابُ مَا يَقُولُ إِذَا شَرِبَ اللَّبَنَ، 339/3

کو دودھ پلایا جائے تو وہ یہ کہے: اے اللہ! ہمارے لیے اس دودھ میں برکت ڈال دے اور ہمیں اور بھی زیادہ عطا فرما۔“

اسی طرح سونے میں بھی افراط و تفریط نہیں بلکہ اعتدال مطلوب ہے اور ضرورت کے بقدر سونا چاہیے۔ ایک عام آدمی کے لیے اطباء کے نزدیک سات گھنٹے کی نیند لینا معتدل نیند کہلاتا ہے۔ باقی عمر، پیشے، کاروبار، صحت اور حالات کی نسبت اس میں کمی بیشی بھی ہو سکتی ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے نماز کی حالت میں اونگھ طاری ہونے پر امت کو یہ حکم دیا ہے کہ پہلے نیند پوری کرو اور پھر نماز پڑھو۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«إِذَا نَعَسَ أَحَدُكُمْ فِي الصَّلَاةِ فَلْيَنَمْ، حَتَّى يَعْلَمَ مَا يَقْرَأُ»[1]

”جب تم میں سے کوئی شخص نماز میں اونگھے تو اسے چاہیے کہ وہ پہلے سو جائے اور اس وقت نماز پڑھے جبکہ اسے معلوم ہو کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے۔“

گویا کہ نماز جیسی عبادت بھی نیند کی ضرورت پوری کیے بغیر مطلوب نہیں رہتی۔ اب یہ علیحدہ امر ہے کہ ایک شخص کو نیند ہی کم آتی ہے تو اسے ہمیں قلت منام نہیں کہیں گے۔ قلت منام یہ ہے کہ آپ اپنی ضرورت کی نیند کو اپنے نفس پر جبر کر کے کم کریں تا کہ آپ اس وقت کو اللہ کی عبادت میں گزار سکیں تو یہ دین میں مطلوب (required) نہیں ہے جیسا کہ روایت اوپر گزر چکی اور اس معنی میں کئی ایک اور روایات بھی موجود ہیں۔

جہاں تک قلت کلام کی بات ہے تو نہ تو زیادہ کلام کرنا ممنوع (prohibited) ہے اور نہ ہی کم گفتگو کرنا مطلوب ہے۔ اصل چیز خیر و شر ہے۔ اگر کوئی صاحب خیر، نیکی، تقوی کے بیان میں زیادہ گفتگو کرتے ہیں تو وہ کم گفتگو کرنے والے سے افضل ہیں۔ اسی طرح شر اور برائی کے ساتھ زیادہ اور کم دونوں طرح گفتگو کرنا ممنوع ہے۔ تو نہ تو زیادہ گفتگو ممنوع ہے اور نہ ہی کم گفتگو مستحسن ہے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ کا کہنا ہے کہ مجھے یہ امید ہے کہ قیامت والے دن وہ عالم افضل ہو گا جو اپنے علم سے زیادہ

[1] صحيح البخاري، كتاب الوضوء، بَابُ الوُضُوءِ مِنَ النَّوْمِ، 53/1

وقت کلام کرتا تھا بنسبت اس عالم کے جو اپنے علم کے ساتھ زیادہ دیر خاموش رہتا تھا۔

اللہ کے رسول ﷺ نے ایک شخص ابو اسرائیل کو دھوپ میں کھڑے دیکھا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ اس کا کیا معاملہ ہے؟ انہوں نے کہا کہ اس شخص نے یہ منت مانی ہے کہ کسی سے گفتگو نہیں کرے گا اور سائے میں نہیں بیٹھے گا اور مسلسل روزے سے رہے گا۔ تو آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کہا:

«مُرْهُ فَلْيَتَكَلَّمْ وَلْيَسْتَظِلَّ وَلْيَقْعُدْ، وَلْيُتِمَّ صَوْمَهُ»[1]

"اس شخص سے کہو کہ یہ بات چیت کرے۔ اور سائے میں بیٹھے۔ اور اپنا روزہ کھول دے۔"

ایک روایت کہ جسے علامہ البانی رحمہ اللہ نے "حسن" کہا ہے، کے الفاظ ہیں:

«رحم الله عبدا قال فغنم، أو سكت فسلم»[2]

"اللہ تعالی اس بندے پر رحم فرمائے کہ جس نے خیر کی بات کی اور فائدہ حاصل کیا یا شر کی بات کرنے سے خاموش رہا اور بچا رہا۔"

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

«إملاء الخير خير من الصمت، والصمت خير من إملاء الشر»[3]

"خیر کا پھیلانا، خاموش رہنے سے بہتر ہے اور خاموش رہنا، شر کو عام کرنے سے بہتر ہے۔"

اسی طرح میل جول زیادہ یا کم رکھنا اصل نہیں ہے جبکہ اصل وہ رویے اور اخلاق (behaviors and attitudes) ہیں جنہیں میل جول میں ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے زیادہ اختلاط کو کم اختلاط کی نسبت پسند فرمایا ہے۔ ایک روایت میں آپ ﷺ نے فرمایا:

«الْمُؤْمِنُ الَّذِي يُخَالِطُ النَّاسَ، وَيَصْبِرُ عَلَى أَذَاهُمْ، أَعْظَمُ أَجْرًا مِنَ

[1] صحيح بخاري، كِتَابُ الأَيْمَانِ وَالنُّذُورِ، بَابُ النَّذْرِ فِيمَا لاَ يَمْلِكُ وَفِي مَعْصِيَةٍ، 143/8

[2] الألباني، محمد ناصر الدين، بن الحاج نوح بن نجاتي بن آدم الأشقودري، سلسلة الأحاديث الصحيحة وشيء من فقهها وفوائدها، مكتبة المعارف للنشر والتوزيع، الرياض، 1995ء، 510/2

[3] الجاحظ، عمرو بن بحر الليثي، البيان والتبيين، دار ومكتبة الهلال، بيروت، 1423 ھ، 78/2

الْمُؤْمِنِ الَّذِي لَا يُخَالِطُ النَّاسَ، وَلَا يَصْبِرُ عَلَى أَذَاهُمْ»[1]

"وہ مومن جو لوگوں سے میل جول رکھتا ہے اور ان کی طرف سے اذیت پہنچنے پر اس پر صبر کرتا ہے تو وہ اجر و ثواب میں اس مومن سے افضل ہے جو لوگوں سے میل جول نہیں رکھتا اور ان کی طرف سے اذیت ملنے پر صبر نہیں کرتا۔"

اللہ کے رسول ﷺ نے لوگوں سے اذیت ملنے کی صورت میں اگرچہ اجازت دے دی ہے کہ ان سے میل جول ترک کر دیا جائے لیکن اسے مستحسن (preferred) قرار نہیں دیا۔ مستحسن امر یہی ہے کہ لوگوں سے اختلاط رکھا جائے، چاہے اس میل جول کے نتیجے میں ان کی طرف سے اذیت ہی کیوں نہ پہنچتی ہو لیکن ان رویوں کے ساتھ کہ جو شریعت میں مطلوب ہیں۔

قبرستان کی زیارت

شہروں میں تو خیر اتنا رواج نہیں رہا لیکن دیہی علاقوں میں اب بھی کسی حد تک یہ معمول (practice) جاری ہے کہ لوگ ہفتے یا مہینے میں ایک بار قبرستان میں اپنے پیاروں کی قبروں کی زیارت (visit) کو ضرور جاتے ہیں۔ ایک دفعہ قبرستان میں ایک نوجوان بے خودی کے عالم میں ایک قبر کے سرہانے کھڑے روتے، دعا کرتے اور خود کلامی (soliloquy) کر رہا تھا۔ قبرستان اگرچہ بڑا تھا لیکن اس وقت اس میں تقریباً ہُو کا عالم تھا۔ قبرستان سے ایک پکی سڑک کے گزرنے کے سبب سے کوئی مسافر یا راہگیر کبھی کبھار پاس سے گزر جاتے تھے۔ اس نوجوان کی آواز پر کان دھرنے والوں کے لیے اس میں عجب نصیحت تھی۔ اگرچہ مجھے اس نوجوان کے بعینہ الفاظ تو یاد نہیں لیکن ذیل میں عبارت کی روانی اور سلاست برقرار رکھنے کے لیے ان کا مفہوم بیان کر رہا ہوں۔

اے میرے قبر کے ساتھیو! ہاں، تمہیں اپنا ساتھی نہ کہوں تو کسے کہوں؟ تم ہی تو حقیقی ساتھی ہو۔ کچھ دنوں ہی کی تو بات ہے کہ میں بھی تمہارے پاس یہاں آنے والا ہوں۔ یہیں کہیں، ادھر ادھر، میری بھی قبر بن جائے گی۔ دنیا والوں کا ساتھ تو عارضی

[1] سنن ابن ماجة، کتاب الفتن، بَابُ الصَّبْرِ عَلَى الْبَلَاءِ، 1338/2

ہے اور تمہارے ساتھ تو ایک لمبا عرصہ گزارنا ہے۔ پروردگار تمہاری مغفرت فرمائے۔ اے میرے قبر کے ساتھیو! مالک تمہیں معاف فرمائے۔ میں تمہیں نہیں جانتا، بس اتنا ہی تعارف ہے کہ ہم سب انسان ہیں اور انسان خطاکار ہے۔ پروردگار تمہیں بھی معاف فرمائے اور ہمیں بھی جبکہ ہم تم سے آملیں۔ دیکھو! میں تو تمہارے لیے اپنے پروردگار سے دعا ہی کر سکتا ہوں۔ وہ قبول کرلے تو اس کی عطا ہے۔

مجھے یہ معلوم ہے کہ اگر تمہارے حق میں میری یہ دعا قبول ہوگئی جو میں اخلاص اور گریہ کے ساتھ کر رہا ہوں تو تمہیں بہت خوشی ہوگی۔ ہو سکتا ہے کہ جب میں اس دنیا کو چھوڑ کر تمہیں آملوں تو تم سب اہل قبرستان مجھے خوش آمدید کہو۔ جب تمہارے رشتہ دار تمہیں بھلا چکے تھے تو ایک اجنبی نے تمہیں یاد رکھا، اس خواہش پر کہ شاید اسے بھی کوئی یاد رکھے۔

میں نے کیا کیا؟ کچھ نہیں کیا، صرف دعا ہی تو کی ہے۔ اور اللہ کی قسم! تم مجھ سے بہتر تھے۔ میری دعا کا اگر تمہیں کچھ فائدہ پہنچے تو وہ اس لیے نہیں کہ میں نیک ہوں بلکہ اس لیے کہ پروردگار کو تمہارا بھلا مقصود تھا کہ اس خطار کار کی دعا کو تمہاری مغفرت اور درجات کی بلندی کا ذریعہ بنا دیا۔ سب کام تو مالک کے ہی ہیں۔ ہم تو ذریعہ ہیں بلکہ ہم تو ذریعہ بھی اس کی مشیئت کے بغیر نہیں بن سکتے۔

اے پروردگار! میری والدہ کی مغفرت فرما۔ یہ وہی تو ہیں جو مجھے اپنے والد کی قبر کی زیارت کے لیے بھیجتی ہیں۔ بہت عرصے بعد ابا جان کی قبر پر آنا ہوا، شاید سالوں بعد۔ چاہے میں قبر پر نہیں آیا لیکن میں نے دعا ضرور کی ہے۔ ہر نماز میں دعا کی بلکہ ہر کسی کو یہ نصیحت کی کہ اپنے والدین کے لیے نماز میں تشہد کی حالت میں ضرور دعا کریں:

﴿رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا﴾ [الإسراء: 24]

”اے میرے رب! میرے والدین پر ایسے ہی رحم فرما جیسا کہ انہوں نے مجھے بچپن میں پالا پوسا۔“

اے میرے قبر کے ساتھیو! دنیا بہت ظالم ہے، اس کی روشنیاں نگاہوں کو خیرہ

کرنے والی اور رونقیں دلوں کو غافل کر دینے والی ہیں۔ شہروں کی طرح قبرستانوں کی آبادی بھی آئے روز بڑھ رہی ہے۔ یہ ایسی کالونی ہے کہ کوئی یہاں رہنا نہیں چاہتا لیکن پھر بھی اسے یہاں کا مکین بننا ہے۔ یہ ایسے شہر ہیں کہ کوئی انہیں دیکھنا نہیں چاہتا لیکن یہ ان کی قیامت تک کی آرام گاہیں ہیں۔ اے میرے قبر کے ساتھیو! میں نے تو تمہارے لیے اپنے مالک سے مغفرت مانگی ہے اور اپنے لیے تو میں پروردگار سے عاجزی کا طلبگار ہوں۔

یہاں تو زندہ ایک دوسرے کو دعا نہیں دیتے تو مردے کیا کریں گے؟ اللہ ہم سب کو معاف فرمائے۔ اے میرے قبر کے ساتھیو! اللہ تمہیں بھی فرمائے۔ اے میرے قبر کے ساتھیو! میں تمہیں بھولا نہیں ہوں۔ بھلا دینے سے بڑھ کر بھی کوئی بے وفائی ہو گی؟ میں بے وفا نہیں ہوں۔ تم ہی تو اُس شہر کے مکین ہو کہ جس میں، میں رہنے جا رہا ہوں۔ دیکھو! جو میں کر سکتا تھا، دعا، سو وہ میں نے کر دی، اب اللہ معاف فرمائے۔ تمہیں بھی اور ہم سب کو بھی۔ اے میرے قبر کے ساتھیو! اللہ تمہیں معاف فرمائے۔

اس نوجوان کی یہ خود کلامی ابھی جاری تھی کہ میں نے چپکے سے اپنے گھر کی راہ لی۔ اور اس کا ایک جملہ آج بھی میرے کانوں میں گونجتا ہے اور وہ جملہ ہے: ”اے میرے قبر کے ساتھیو“۔ ہمارے اصل ساتھی تو وہ ہیں جو قبرستانوں میں مدفون ہیں کہ جن کے ساتھ عالم برزخ میں ایک لمبا عرصہ ہم نے گزارنا ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: زَارَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَبْرَ أُمِّهِ، فَبَكَى وَأَبْكَى مَنْ حَوْلَهُ، فَقَالَ:... «فَزُورُوا الْقُبُورَ فَإِنَّهَا تُذَكِّرُ الْمَوْتَ»[1]

”حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اپنی والدہ محترمہ کی قبر کی زیارت کی۔ پس آپ اتنا روئے کہ آس پاس والوں کو بھی رلا دیا۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے کہا:... قبروں کی زیارت کیا کرو کیونکہ یہ موت یاد کرواتی ہیں۔“

---

[1] صحیح مسلم، كِتَابُ الْجَنَائِزِ، بَابُ اسْتِئْذَانِ النَّبِيِّ رَبَّهُ عَزَّ وَجَلَّ فِي زِيَارَةِ قَبْرِ أُمِّهِ، 671/2

سچا واعظ

آج کل بہت کم واعظ ایسے ہیں کہ جن کا وعظ انسان کی باطنی زندگی کو تبدیل کرنے میں کوئی کردار ادا کرے۔ لیکن خالق نے جس طرح ہر بستی کو ایک ہادی (guide) عنایت فرمایا، اسی طرح ہر شخص کو ایک سچا واعظ (preacher) بھی دیا ہے۔ یہ واعظ ایسا ہے کہ جس نے جب بھی اس کا وعظ سنا، اس نے اس کے دل کو نرم اور آنکھوں کو نم کر دیا۔ اس واعظ کا وعظ مجلس میں ہو یا تنہائی میں، اس سے پیدا ہونے والی کیفیات اور احوال ہمیشہ سچے ہوتے ہیں۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ واعظ اپنے قول میں سچا ہے۔ یہ جو بات کرتا ہے، سچ کرتا ہے۔

اس نے جب بھی جسے وعظ کیا، وہ رو پڑا۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ یہ وعظ کرے اور دل پر اثر نہ ہو۔ کبھی کبھار ایسا بھی ہوتا ہے کہ ہم اس کا وعظ سننا ہی نہیں چاہتے کیونکہ ہم اپنے اندر کی تبدیلی سے ڈر رہے ہوتے ہیں کیونکہ اس کے وعظ کا محض سن لینا ہی گویا ہماری تبدیلی کو میرا مقدر بنا دیتا ہے۔ اگر ہمارے جی میں اپنے آپ کو تبدیل کرنے کا عزم پیدا ہو جائے اور ہم اس واعظ کی باتوں پر کان دھرنے لگ جائیں تو تزکیہ ہماری تقدیر بن جائے۔ یہ واعظ کون ہے؟ یہ "موت کا واعظ" ہے۔ اس نے جب بھی کسی کو وعظ کیا، خوب رلایا۔

یہ کبھی ہماری تنہائیوں میں ہمارے پاس آتا ہے، جب ہم رات گئے اپنے بستر پر آنکھیں بند کیے لیٹے ہوتے ہیں، کسی کو اس کے آنے کی خبر نہیں ہوتی، بیوی بچوں کو بھی نہیں۔ یہ ہم سے سرگوشیاں کرتا ہے، ہمیں ہماری منزل دکھاتا ہے، قبر کی منزل۔ اور کبھی کبھار ہم اس کے وعظ کے لیے کچھ زیادہ وقت نکال پائیں تو ہمیں یہ بھی دکھا دیتا ہے کہ تمہارے عالم برزخ میں منتقل ہو جانے کے ایک آدھ ماہ بعد ہی ہمارے والدین، بہن بھائی، بیوی بچے اور دوست احباب ہمارے بارے کیا سوچتے اور باتیں کرتے ہوں گے؟ ان کی کیا سرگرمیاں (activities) ہوں گی؟ دنیا میں ہمارا تذکرہ کس قدر باقی رہ جائے گا؟

کبھی کبھار جبکہ ہم بہت خوش ہوں تو اس کی آمد پر جھلا اٹھتے ہیں۔ ہم اسے کہتے ہیں بھئی! یہ دنیا بہت خوبصورت ہے، ہمیں زندہ رہنا ہے، اور نہ سہی ہم اپنے پروردگار کے لیے زندہ رہنا چاہتے ہیں۔ جہاد زندگانی کا مزامت خراب کرو۔ وہ ہماری بات کا برا نہیں مناتا، البتہ ہم اس کی اس اذیت کو محسوس کر سکتے ہیں جو شاید کسی اپنے کی بیوقوفی پر ہوتی ہے۔ ہمارے اس ردعمل پر وہ اپنے وعظ کو پھر کسی وقت تک کے لیے موخر کر دیتا ہے لیکن ہمیں معلوم ہے کہ اسے ہم سے محبت ہے اور اس کی محبت سچی ہے اور اسی محبت کو سچ کر دکھانے کے لیے وہ ایک دن ہمارے نہ چاہتے ہوئے بھی ہمیں اپنے ساتھ لے جائے گا، ایک دوسرے عالم میں، ایک دوسری دنیا میں، جسے ہم عالم برزخ کہتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے:

«كَفَى بِالْمَوْتِ وَاعِظًا، وَكَفَى بِالْيَقِينِ غِنًى، وَكَفَى بِالْعِبَادَةِ شُغُلًا»[1]

"موت واعظ ہونے کے اعتبار سے، یقین غنی کے اعتبار سے اور عبادت مصروفیت کے اعتبار سے کافی ہے۔"

اپنائیت کی سوچ

عموماً لوگ اپنی پرانی ملازمت کو چھوڑ کر نئی تقرری (joining) سے لطف اندوز (enjoy) ہوتے ہیں لیکن اپنے پرانے گھر سے نئے گھر یا پرانے شہر سے نئے شہر میں منتقلی انسان کو اداس کر دیتی ہے۔ اگر ہم غور کریں تو محسوس ہو گا کہ کچھ چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے بارے ہمارا احساس یہ ہوتا ہے کہ وہ ہماری اپنی ہیں جیسا کہ گھر، شہر یا پالتو جانور وغیرہ۔ ان چیزوں سے ایسی مانوسیت پیدا ہو جاتی ہے کہ نیا گھر اگرچہ پرانے گھر سے بہتر ہی کیوں نہ ہو لیکن پھر بھی ایک وقت تک تعلق پرانی چیز سے ہی قائم ہی رہتا ہے جبکہ اس کے برعکس کچھ چیزیں ایسی ہیں کہ جن کے بارے ہمارا احساس یہ نہیں ہوتا کہ یہ ہماری اپنی ہیں جیسا کہ ملازمت۔ ملازمت میں ہم ملازم ہوتے ہیں اور خدمات فراہم کرتے ہیں لہذا ملازمت چھوڑتے ہوئے کسی شخص کو اپنے ادارے سے، چاہے اس میں

[1] عبد الله بن المبارك الحنظلي، الزهد والرقائق لابن المبارك، دار الكتب العلمية، بيروت، 37/2

دس سال ملازمت کی ہو، وہ اداسی نہیں ہوتی جو اسے اپنا وہ گھر چھوڑنے سے ہوتی ہے کہ جس میں اس نے دس سال گزارے ہوں۔

یہی حال اس دنیا کا بھی ہے۔ جب ہم اسے اپنا سمجھنا شروع کر دیتے ہیں تو موت کا سامنا مشکل لگتا ہے بلکہ اس سے ڈر لگنے لگتا ہے۔ یہاں سے دوسری دنیا میں منتقلی کا احساس ہی اداسی پیدا کر دیتا ہے۔ اگر دنیا کے ساتھ ہمارا تعلق ویسا قائم ہو جائے جیسا کہ ہمارا اس ادارے سے قائم ہوتا ہے، جس میں ہم ملازمت کرتے ہیں تو شاید اس دنیا کو چھوڑنے پر ہمیں اداسی کی کیفیت نہ ہو۔ واللہ اعلم۔ اور ایسا تعلق ضرورت کا تعلق کہلاتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

«كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ»[1]

”دنیا میں ایسے رہو جیسے کہ تم مسافر ہو یا راہگیر۔“

احادیث کی کتابوں میں ”الرقاق“ کے عنوان کے تحت جتنی احادیث بیان ہوتی ہیں، ان کا خلاصہ ترکِ دنیا نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ دنیا سے ضرورت کا تعلق قائم رکھو۔ ٹشو پیپر ایک ضرورت کی اور استعمال کی معمولی شیء ہے۔ اگر ضائع ہو جائے تو افسوس نہیں ہوتا اور اگر کوئی مانگ لے گا تو اسے دیتے ہوئے تکلیف نہیں ہوتی کہ بہت ہی معمولی شیء ہے۔ پس دنیا کی حیثیت بھی مومن کے دل میں اتنی ہی ہوتی ہے کہ جتنی ایک عام انسان کی نظر میں ٹشو پیپر کی حیثیت ہوتی ہے۔

ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ ایک چٹائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ جب اٹھ کر بیٹھے تو آپ کے پہلو پر چٹائی کے نشانات تھے۔ یہ دیکھ کر بعض صحابہ نے آپ کے لیے ایک نرم بستر بنانے کی اجازت طلب کی تو آپ ﷺ نے فرمایا:

«مَا لِي وَلِلدُّنْيَا، مَا أَنَا فِي الدُّنْيَا إِلاَّ كَرَاكِبٍ اسْتَظَلَّ تَحْتَ شَجَرَةٍ ثُمَّ رَاحَ وَتَرَكَهَا»[2]

”مجھے اس دنیا سے کیا لینا دینا۔ میرا تو اس دنیا سے صرف اتنا ہی تعلق ہے جتنا کہ

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الرقاق، بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ «كُنْ فِي الدُّنْيَا كَأَنَّكَ غَرِيبٌ أَوْ عَابِرُ سَبِيلٍ»، 89/8

[2] سنن الترمذي، أبواب الزهد، 588/4

ایک گھڑ سوار کا کسی درخت سے کہ جس نے اس درخت کے سائے میں کچھ دیر آرام کیا ہو اور پھر آگے چل پڑا ہو۔"

ٹوپی

ٹوپی کی کئی قسمیں ہیں مثلاً بنگالی ٹوپی، ترکی ٹوپی، افریقی ٹوپی، سندھی ٹوپی، جالی دار ٹوپی، جناح کیپ وغیرہ۔ شاید ٹوپی کی جتنی قسمیں ہیں، اتنی ہی باتیں اس کے فوائد اور نقصانات کے بارے بھی کی جاسکتی ہیں۔

ٹوپی پہننا ایک صاحب کا معمول تھا لیکن ان کی اہلیہ کو پسند نہ تھا اور وہ ان کی ٹوپی غائب کر دیتی تھیں۔ اس عمل سے انھیں کافی چڑان (irritation) ہوتی تھی کیونکہ انھیں مدرسہ اور دینی حلقوں میں درس وتدریس کرنی ہوتی تھی اور مدرسہ وتحریک اسلامی کے ماحول میں استاذ اور مبلغ کے سر پر ٹوپی نہ ہونا باعث عار سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے اس مسئلے میں اہلیہ سے الجھنا مناسب نہ سمجھا، وہ ٹوپیاں غائب کرتی گئیں اور وہ خریدتے چلے گئے۔ اس طرح ٹوپی پہننے کے عمل کو مجاہدہ سمجھ کر ایک مہینے میں تین تین ٹوپیاں بھی خریدتے رہے۔

ایک وقت آیا کہ انھوں نے اپنے آپ سے سوال کیا کہ میں ٹوپی کیوں پہنتا ہوں؟ تو یہ جواب ملا کہ ان کا اٹھنا بیٹھنا دیندار حلقوں میں ہوتا ہے جہاں سب یا اکثر نے ٹوپی پہنی ہوتی ہے۔ وہاں کا مذہبی رواج ٹوپی پہننے کا تقاضا کرتا ہے اور ان کا ٹوپی نہ پہننا انھیں اس ماحول میں اجنبی بنا دیتا ہے۔ اور یہ اجنبیت ایسی تھی جسے لوگ ناپسند کرتے تھے اور بعض تو اس کا اظہار بھی کر دیتے کہ آپ ٹوپی کیوں نہیں پہنتے یا نصیحت کرنے والے اگر عمر میں بڑے ہوتے تو ٹوپی پہننے کو سنت قرار دیتے ہوئے اس سنت پر عمل کی تاکید بھی فرما دیتے۔ بہر حال اب کافی سوچ وبچار کے بعد انھیں ٹوپی پہننے یا نہ پہننے میں کوئی حساسیت نہیں ہے۔ پہننا اس لیے درست سمجھتے ہیں کہ دین دار لوگوں کا عرف ہے اور نہ پہننا اس لیے مفید کہ اصلاح نفس میں اس کا بڑا کردار ہے۔

ٹوپی پہننا تو شاید مذہبی لوگوں کی سمجھ میں آسانی سے آجائے لیکن ٹوپی نہ پہننا انسان

کی اصلاح کا کیسے ذریعہ بن سکتا ہے؟ یہ مذہبی طبقے کو سمجھانا واقعتاً مشکل کام ہے۔ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اللہ عزوجل نے جسے بھی زبان وبیان کی کچھ صلاحیت دی ہو اور وہ کہیں درس قرآن کا حلقہ قائم کریں یا اصلاحی مجلس لگائیں یا کوئی عربی کلاس لینا شروع کریں تو ان کے ارد گرد آہستہ آہستہ ایک حلقہ بننا شروع ہو جاتا ہے۔ ان میں سے چند ایک تو مدرس اور خطیب کے مرید بھی بن جاتے ہیں اور کسی مدرس، مصلح یا خطیب کو بگاڑنے کے لیے ایک مرید بھی کافی ہوتا ہے۔ ان مریدوں میں سے کوئی آپ کی جوتیاں سیدھی کرنا شروع کر دیتا ہے اور کوئی آپ کے وعظ وتدریس کی تعریف وتوصیف میں مبالغہ آمیز باتیں کہنا شروع کر دیتا ہے۔ کوئی آپ کو نمونہ بنانا (idealize) شروع کر دیتا ہے اور کوئی آپ کے افکار کا مبلغ بلکہ "جیالا" بننے کو تیار بیٹھا ہوتا ہے۔

ایسے حالات میں کسی کو بطور مدرس یا مبلغ یہ احساس ہو سکتا ہے کہ اب وہ صاحب اپنی چرب زبانی سے کوئی علیحدہ مخلوق لگنا شروع ہو گئے ہیں۔ اور لوگوں کی نظر میں شیخ اور مرشد بن گئے ہیں۔ پس ایسے میں ہمیں اپنا حلیہ مذہبی نظر آنے والے لوگوں کی بجائے عام مسلمانوں جیسا اختیار کرنا چاہیے تاکہ لوگ ہمیں وہی سمجھیں جو ہم حقیقت میں ہوں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہم عام لوگوں کے جیسے انھی میں سے ایک ہیں۔ میں نے یہ عجب محسوس کیا ہے کہ اگر استاذ یا شیخ، واعظ یا خطیب اپنے مریدین کے حلقے میں ٹوپی اتار دے تو یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ اس نے اپنے نفس پر پڑی تقدس کی چادر اتار دی ہے اور اگر آپ شلوار قمیص کی بجائے سوٹ پہن لیں تو پھر تو لوگ شاید آپ کے نیک ہونے میں بھی شبہ کرنا شروع کر دیں۔

ہماری اس تحریر پر دوستوں کی طرف سے مختلف قسم کے رد عمل ملے۔ بعض نے کہا کہ ڈاڑھی بھی تو مذہبی حلیہ ہے تو کیا اس کو بھی ترک کر دیں؟ تو ہماری رائے یہ ہے کہ ڈاڑھی رکھنا ایک دینی حکم ہے اور اس حلیے کو دینی حلیہ کہنا چاہیے۔ اس کے علاوہ ایک حلیہ ایسا ہے کہ جو دینی تو نہیں لیکن مذہبی لوگوں نے اسے اختیار کیا ہوا ہے مثلاً پاکستان میں اہل حدیث سر پر سرخ رومال رکھتے ہیں یا چوغہ اوڑھتے ہیں۔ تبلیغی جماعت اور تصوف

کے حلقوں میں عمامہ باندھتے ہیں یا سفید کرتا پہنتے ہیں وغیرہ۔ اس قسم کے مذہبی حلیے کے بارے ہمارے ذہن میں یہ بات آتی تھی کہ لوگوں کے نزدیک تقوی کا معیار یہی ظاہری حلیہ بن چکا ہے جبکہ تقوی کا اصل مقام انسان کا دل ہے۔

اب اسی پر غور کر لیں کہ ایک شخص شلوار کرتا پہن کر، سفید عمامہ باندھ کر، موزے پہن کر اور جیب میں مسواک رکھ کر اچھا خاصا عالم دین یا ولی اللہ معلوم ہوتا ہے جبکہ واسطہ پڑنے پر معلوم ہوتا ہے کہ وہ نہ تو عالم دین ہے اور نہ ہی اللہ کا ولی۔ کیا یہ دھوکہ نہیں ہے کہ آپ اپنے ظاہر سے اتنے نیک معلوم ہوں جو آپ حقیقت میں نہ ہوں؟ اس لیے بعض لوگ یہ پسند نہیں کرتے کہ وہ عمامہ باندھ کر عام لوگوں میں اللہ کا ولی دکھائی دیں۔

عرب معاشرے میں تو عمامہ ایک رواج تھا لہذا وہاں نہ باندھنے والا اجنبی تھا۔ پس لباس کے مسائل میں جہاں دین کا کوئی واضح حکم موجود نہیں ہے تو وہاں مسلم معاشروں کے رواج کا لحاظ رکھنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اور جہاں دین کا کوئی واضح حکم موجود ہو تو وہاں حکم پر عمل ہو گا اور معاشرے کے رواج کی پرواہ نہ ہو گی۔ یہ ایک سوچ ہے جو غلط بھی ہو سکتی ہے۔ ہمیں اس بارے دوسری رائے پر بھی غور کرتے رہنا چاہیے۔

اور اہم تر بات یہ ہے کہ کسی معاشرے میں کسی قسم کے لباس اور حلیے مروج ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک شرفاء کا لباس ہوتا ہے جبکہ دوسرا صلحاء کا۔ ہمیں شرفاء کا لباس ضرور اختیار کرنا چاہیے کہ یہ دینی اور اخلاقی ذمہ داری ہے لیکن صلحاء کا لباس اختیار کرتے وقت پہلے یہ دیکھ لینا چاہیے کہ کیا میں اس لباس کے اہل بھی ہوں یا نہیں؟ کیا کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ میں صلحاء کا لباس اختیار کر کے زیادہ صالح نظر آنے کی لاشعوری کوشش کر رہا ہوں؟ ان سب باتوں پر غور کرنا ایک دینی ذمہ داری ہے کہ روایات میں شہرت کا لباس پہننے سے منع کیا گیا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَنْ لَبِسَ ثَوْبَ شُهْرَةٍ أَلْبَسَهُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثَوْبَ مَذَلَّةٍ»[1]

---

[1] سنن ابن ماجه، كِتَابُ اللِّبَاسِ، بَابُ مَنْ لَبِسَ شُهْرَةً مِنَ الثِّيَابِ، 1192/2

”حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ جس نے شہرت کا لباس پہنا تو اللہ تعالی قیامت والے دن اسے ذلت کا لباس پہنائیں گے۔“

اور شہرت کے لباس سے مراد ہر وہ لباس ہے کہ جس کے پہننے سے مقصود دنیاوی شہرت ہو یا دینی۔ یعنی دنیا کے معاملے میں لوگوں پر اس لباس کے ذریعے فخر کرے کہ اس جیسا قیمتی اور نایاب لباس کسی کا نہیں ہے یا دین کے معاملے میں اس لباس کے ذریعے شہرت حاصل کرے کہ لوگ اس کے لباس کے سبب اسے مفتی، فقیہ، قاضی، پیر اور مرشد سمجھیں۔

ایک اور اہم تربات یہ ہے کہ مذہبی طبقے میں کسی کی نیکی اور تقوی کو ماپنے کے کل معیارات ڈاڑھی اور حجاب بن چکے ہیں۔ بلاشبہ ڈاڑھی اور حجاب کسی کی نیکی ماپنے کا ایک معیار تو ہے لیکن کل معیار نہیں ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ایمان کی ستر سے اوپر شاخیں بیان فرمائی ہیں کہ جس کا معنی ہے کہ ایمان ستر سے زائد صورتوں میں کسی شخص میں پایا جاسکتا ہے۔ اب ایمان کا کل معیار اگر ڈاڑھی اور حجاب کو بنالیا جائے گا تو اس سے دین کا تصور مسخ ہو جائے گا۔ ہم روزمرہ زندگی میں بہت سے ایسے مردوں اور عورتوں کو ملتے ہیں یا جانتے ہیں کہ جن کے ڈاڑھی نہیں ہے یا حجاب نہیں ہے لیکن ان میں ایمان اور عمل صالح کی بہت سی ایسی شاخیں اور صورتیں پائی جاتی ہیں جو ڈاڑھی اور حجاب والوں میں نہیں ہوتی ہیں۔ مثلاً ایسے لوگوں میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی محبت ہو گی اور یہ بہت ہی قیمتی متاع ہے کہ جس کی قدر کرنی چاہیے۔ بعض میں بہت زیادہ صدقہ، خیرات کرنے کی عادت ہو گی اور بعض نماز، روزے کے بہت پابند ہوں گے وغیرہ۔

ٹوپی اتار کر اپنی اصلاح کرنا ایک عام شخص سے متعلق نہیں ہے بلکہ شیخ یا واعظ کے لیے ہے۔ بعض اوقات کچھ افراد ہمارے کسی درس یا وعظ سے متاثر ہو کر ہمیں نمونہ بنانا (idealize) شروع کر دیں تو ہمیں اپنے دل میں بہت ندامت ہونی چاہیے کہ معلوم

نہیں یہ ہمیں کیا سمجھے جا رہے ہیں؟ ایک مدرس کا کہنا ہے کہ ایسے میں مجھے سمجھ نہیں آتی کہ انھیں کیسے سمجھاؤں کہ میں وہ نہیں ہوں جو تم سمجھ رہے ہو۔ انھوں نے اپنی اہلیہ سے مشورہ کیا تو اہلیہ نے کہا کہ جو آپ کی تعریف میں مبالغہ کرے تو اسے کہہ دیں کہ میں گناہ گار آدمی ہو۔ انھوں نے کہا کہ میں خواہ مخواہ اپنے عیوب لوگوں کو کیوں بتلاتا پھروں، یہ تو الٹا فساد ہے۔ البتہ حدیث میں ہے کہ اس کے منہ میں مٹی ڈال دو جو تمھاری تعریف تمھارے سامنے کرے۔ اور اس کی ہمت نہیں ہوتی کہ اس کے لیے بڑا ایمان چاہیے جو کہ میرے پاس نہیں ہے۔ اور اس میں رکاوٹ یہ بھی ہے کہ بعض اوقات تعریف کرنے والے آپ سے مقام یا عمر یا کسی بھی اعتبار سے بڑے ہوتے ہیں۔

تو ان مدرس کو اس کا حل یہی سوجھا کہ عام لوگوں جیسے حلیے میں رہا کروں تاکہ لوگ انھیں کسی آزمائش میں نہ ڈالیں۔ واللہ اعلم۔ انھوں نے اس کا حل یہ بھی نکالا کہ اگر کوئی تعریف میں مبالغہ کرے تو یہ کہہ دیا کہ بھائی! میں اتنا ہی متقی اور پرہیزگار ہوں کہ جتنا میری بیوی مجھے سمجھتی ہے۔ اس سے بڑھ کر اگر کوئی تعریف کرے تو وہ اس کا وہم اور گمان ہے، اور میں اس بارے یہی کہتا ہوں کہ اللہ اس کے وہم اور گمان کو سچ کر دکھائے کہ مجھے ایسا بنا دے۔ ہمارے ایک دوست کا کہنا یہ ہے کہ لوگ فرشتہ سمجھ کر قریب ہوتے ہیں اور انسان سمجھ کر دور ہو جاتے ہیں۔ لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس میں کچھ قصور لوگوں کا ہے اور کچھ مدرس اور واعظ کا بھی ہے کہ اس نے اپنے بارے ایسا تاثر عام ہونے ہی کیوں دیا کہ لوگ اسے فرشتہ سمجھنا شروع ہو گئے۔ اور یہ تاثر عام طور مدرس اور واعظ کے ظاہری حلیے سے پھیلتا ہے۔

پس ابھی تو معمول یہی ہے کہ کبھی ٹوپی پہن لی اور کبھی اتار لی جیسے کہ کوئی مباح کام کبھی کسی ضرورت سے کر لیا اور کبھی کسی وجہ سے نہ کیا۔ کبھی ریسٹورنٹ میں جاتے ہوئے اس سوچ سے پہن لی کہ نظروں میں حیاء رہے اور کبھی مسجد میں یہ سوچتے ہوئے پہن کر نہ گئے کہ لوگ امامت کے لیے مصلے پر نہ کھڑا کر دیں۔ اور کبھی اس کے برعکس بھی ترتیب رہتی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«إِنَّ اللهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى أَجْسَادِكُمْ، وَلَا إِلَى صُوَرِكُمْ، وَلَكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ، وَأَشَارَ بِأَصَابِعِهِ إِلَى صَدْرِهِ»[1]

"یقیناً اللہ عزوجل تمہارے جسموں کی طرف نہیں دیکھتے اور نہ ہی تمہاری صورتیں دیکھتے ہیں۔ لیکن وہ تمہارے دلوں کو دیکھتے ہیں۔ اور اللہ کے نبی ﷺ نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا۔"

حضرت مسیح ابن مریم علیہ السلام نے بھی یہود کے علماء پر اس پہلو سے شدید تنقید کی تھی کہ وہ اپنے ظاہری مذہبی لباس کا تو بہت دھیان رکھتے تھے لیکن باطن کی اصلاح کی طرف توجہ نہ دیتے تھے۔ معاصر انجیل میں ہے:

"اس وقت یسوع یعنی حضرت عیسی علیہ السلام نے بھیڑ سے اور اپنے شاگردوں سے یہ باتیں کیں کہ فقیہ اور فریسی، موسی علیہ السلام کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ پس جو کچھ وہ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن انکے سے کام نہ کرو کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں... وہ اپنے سب کام لوگوں کو دکھانے کو کرتے ہیں کیونکہ وہ اپنے تعویذ بڑے بناتے اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے ہیں۔ اور ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلی درجہ کی کرسیاں۔ اور بازاروں میں سلام اور آدمیوں سے ربی کہلانا پسند کرتے ہیں... اے ریاکارو فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ پودینہ اور سونف اور زیرہ پر تو 'دہ یکی' دیتے ہو، پر تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف اور رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے۔ لازم تھا کہ یہ بھی کرتے اور وہ بھی نہ چھوڑتے۔ اے اندھے راہ بتانے والو! جو مچھر چھانتے ہو اور اونٹ نگل جاتے ہو... اے ریاکارو فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ تم سفیدی پھیری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو

[1] صحيح مسلم، كتاب الْبِرِّ وَالصِّلَةِ وَالْآدَابِ، بَابُ تَحْرِيمِ ظُلْمِ الْمُسْلِمِ، وَخَذْلِهِ، وَاحْتِقَارِهِ وَدَمِهِ، وَعِرْضِهِ، وَمَالِهِ، 4/1986

مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہو۔"[1]

گناہ کا اعلان

سوشل میڈیا پر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ بعض لوگوں کی یہ عادت ہے کہ وہ اپنے گناہوں کا مجلس میں اظہار کرتے ہیں اور اس پر شرمندگی بھی محسوس نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو دنیادار طبقہ ہے اور وہ اپنے گناہ پر فخر کرنے کے لیے مجلس میں ان کا اعلان کرتے ہیں کہ میں نے فلاں کے ساتھ ایسا کیا یا یہ کیا یا وہ کیا وغیرہ۔ اور دوسرا مذہبی طبقہ ہے جو اپنے گناہ گار ہونے کے احساس کو دوسروں سے شیئر کرنے کے لیے ایسا کرتے ہیں۔ تصوف کی تاریخ میں بھی ایک فرقہ ایسا پیدا ہوا تھا کہ جو اپنی نیکیوں کو چھپاتے اور اپنے گناہوں کا اعلانیہ اظہار کرتے تھے اور انہیں "ملامتیة" کہا جاتا تھا کہ ان کا اس سے مقصود اپنے نفس کو ملامت کرنا تھا۔ اس فرقے کی نسبت حمدون القصار متوفی 271ھ کی طرف کی جاتی ہے۔

مذہبی طبقے کی طرف سے اس قسم کے اعلان کے دو قسم کے اثرات مرتب ہوتے ہیں: مثبت اور منفی۔ مثبت اثر تو یہ ہے کہ اس قسم کا اقرار انسان کی شخصیت سے تقدس کی مصنوعی چادریں اتار کر اسے ایک عام انسان کے درجے پر لے آتا ہے۔ اور منفی یہ ہے کہ چھپ کر گناہ تو اکثر لوگ کر ہی رہے ہوتے ہیں یا کم از کم گناہ کی خواہش رکھتے ہیں، لیکن کرنے والے نادم ہوتے ہیں اور خواہش رکھنے والے منتظر۔ اب جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلاں حضرت بھی ایسے ہیں کہ فلم دیکھ لیتے ہیں تو دیکھنے والوں کی ندامت رخصت ہونا شروع ہو جاتی ہے اور جو دیکھنے میں ہچکچاہٹ کا شکار ہوتے ہیں، اُن کی ہچکچاہٹ دور ہو جاتی ہے۔ پس اپنی معصیت اور گناہ کے اعلان سے اگر کوئی روحانی فائدہ ہوتا بھی ہو تو صرف اعلان کرنے والے کو ہو سکتا ہے جبکہ معاشرے کے لیے اس اعلان میں نقصان ہی نقصان ہے کہ گناہ اور معصیت پر لوگوں کی ہچکچاہٹ ختم ہو گی اور جرات بڑھ جائے گی۔ پس گناہ کا اعلان کرنا کسی طور درست نہیں ہے، چاہے گناہ کی ترغیب دینے کی غرض

---

[1] متی کی انجیل: باب: 23، آیت: 3-1، بائبل سوسائٹی، انار کلی، لاہور

سے ہو، چاہے اپنے نفس کو ملامت کرنے کی نیت سے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«كُلُّ أُمَّتِي مُعَافًى إِلَّا المُجَاهِرِينَ، وَإِنَّ مِنَ المُجَاهَرَةِ أَنْ يَعْمَلَ الرَّجُلُ بِاللَّيْلِ عَمَلًا، ثُمَّ يُصْبِحَ وَقَدْ سَتَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ، فَيَقُولَ: يَا فُلَانُ، عَمِلْتُ البَارِحَةَ كَذَا وَكَذَا، وَقَدْ بَاتَ يَسْتُرُهُ رَبُّهُ، وَيُصْبِحُ يَكْشِفُ سِتْرَ اللَّهِ عَنْهُ»[1]

"میری امت کے ہر گناہ گار کے لیے معافی ہے سوائے ایسے گناہ گار کے کہ جو اپنے گناہ کا اعلان کرتا ہے۔ یہ ایسا شخص ہے جو رات کو گناہ کرتا ہے اور اللہ تعالی اس کا گناہ چھپا لیتے ہیں لیکن وہ صبح ہوتے ہی کسی کو خود ہی بتلا دیتا ہے کہ میں نے رات کو فلاں فلاں کام کیا ہے۔ پس اس کی رات تو اس حال میں گزری کہ اس کے رب نے اس کے گناہ کو چھپا لیا تھا لیکن اس نے صبح اس حال میں گزاری کہ اس نے اپنے گناہ کا پردہ خود ہی چاک کر دیا۔"

خورد بینی

نفس کی کمزوریوں اور کوتاہیوں پر غور ضرور کرنا چاہیے کہ اسی طرح ان کی اصلاح ممکن ہے لیکن اگر یہ غور وفکر حد سے بڑھ جائے تو خود ایک روحانی بیماری ہے کہ جسے احمد جاوید صاحب خورد بینی کا نام دیتے ہیں۔

احمد جاوید صاحب کا کہنا ہے کہ اگر خورد بینی نظر سے ہم اپنے سامنے پڑے ہوئے کھانے سے اٹھائے جانے والے نوالے کو بھی دیکھیں گے تو زمین پر گرا دیں گے کہ اس میں ہمیں عمومی نظر میں نہ دکھائی دینے والے ہزاروں بیکٹیریاز نظر آنے لگیں گے۔ اسی طرح کی مثال نفس انسانی کی بھی ہے۔ نفس انسانی تو کمزوریوں اور کوتاہیوں کا انسائیکلوپیڈیا ہے لہذا اگر انسان اپنے رذائل ہی کو ہر وقت خورد بینی نگاہ سے دیکھنے لگ جائے گا تو اس کے سامنے نفس میں موجود خرابیوں کی ایک لامتناہی فہرست مرتب ہو کر آتی رہے گی اور وہ اسی فہرست میں ہی گم ہو کر رہ جائے گا۔ کچھ عرصہ تو شاید اسے فائدہ ہو

[1] صحيح البخاري، كِتَابُ الأَدَبِ، بَابُ سَتْرِ المُؤْمِنِ عَلَى نَفْسِهِ، 20/8

لیکن ایک وقت ایسا آئے گا کہ اس کا یہی عمل اس کے تکبر کا ذریعہ بن جائے گا کہ دیکھو میں نے اپنے نفس کی وہ برائیاں دیکھ لی ہیں جو کسی کو نظر نہ آئیں یا مجھے اپنے نفس کی شرارتوں کا اتنا علم ہے جو کسی کو بھی اپنے نفس کے بارے نہیں ہے وغیرہ۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿إِن تَجْتَنِبُوا كَبَائِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَنُدْخِلْكُم مُّدْخَلًا كَرِيمًا﴾ [النساء: 31]

"اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے اجتناب کرو گے کہ جن سے تمہیں منع کیا جاتا ہے تو ہم تمہاری چھوٹی چھوٹی خطائیں خود سے ہی معاف کرتے رہیں گے اور تمہیں باعزت مقام میں جگہ دیں گے۔"

اس لیے ابتدائی سطح میں نفس کی اصلاح میں مناسب حد تک توجہ دیں اور موٹی موٹی چیزوں کی اصلاح کر لیں۔ ضرورت سے زیادہ توجہ اس کے بگاڑ میں تو کوئی کردار ادا کر سکتی ہے لیکن تعمیر میں نہیں۔ اللہ سمجھ عطا فرمائے۔

جنت الفردوس کے وارث

قرآن مجید میں سورۃ المؤمنون کی شروع کی گیارہ آیات میں اللہ عزوجل نے مومنین کی چھ صفات بیان کی ہیں۔ جن لوگوں میں یہ چھ صفات ہوں تو قرآن مجید انہیں نہ صرف مومن ہونے کا سرٹیفکیٹ دیتا ہے بلکہ ان کے جنت الفردوس میں جانے کی بشارت بھی اسی دنیا میں سنا دیتا ہے۔ یہ چھ صفات کسی بندہ مومن کی شخصیت کے ارتقاء اور نمو (personality development) کے لیے بھی بہت ضروری ہیں۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿قَدْ أَفْلَحَ الْمُؤْمِنُونَ ﴿1﴾ الَّذِينَ هُمْ فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ ﴿2﴾ وَالَّذِينَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ ﴿3﴾ وَالَّذِينَ هُمْ لِلزَّكَاةِ فَاعِلُونَ ﴿4﴾ وَالَّذِينَ هُمْ لِفُرُوجِهِمْ حَافِظُونَ ﴿5﴾ إِلَّا عَلَىٰ أَزْوَاجِهِمْ أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُهُمْ فَإِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُومِينَ ﴿6﴾ فَمَنِ ابْتَغَىٰ وَرَاءَ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْعَادُونَ ﴿7﴾ وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ ﴿8﴾ وَالَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَوَاتِهِمْ يُحَافِظُونَ ﴿9﴾ أُولَٰئِكَ هُمُ

الْوَارِثُونَ ﴿10﴾ الَّذِينَ يَرِثُونَ الْفِرْدَوْسَ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ﴾
[المؤمنون: 11]

"یقیناً وہ لوگ کامیاب ہیں کہ جو مومن ہیں۔ اور مومن وہ لوگ ہیں کہ جو اپنی نمازوں میں خشوع کرنے والے ہیں۔ اور لغویات سے دور رہنے والے ہیں۔ اور اپنی جان اور مال کا تزکیہ کرنے والے ہیں۔ اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ سوائے اپنی بیویوں اور لونڈیوں کے اور ان کے بارے ان پر کوئی ملامت نہیں ہے۔ لیکن جو کوئی ان دو کے علاوہ اپنی خواہش پوری کرنا چاہے گا تو وہی لوگ حد سے تجاوز کرنے والے ہیں۔ اور جو لوگ اپنی امانتوں اور وعدوں کی پاسداری کرنے والے ہیں۔ اور جو لوگ اپنی نمازوں کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ تو یہی لوگ وارث ہیں۔ جنت الفردوس کے وارث کہ جس میں یہ ہمیشہ ہمیش رہیں گے۔"

ان آیات میں اللہ عزوجل نے مومن کا عنوان (title) ان کو عطا کیا ہے کہ جن میں مذکورہ بالا چھ صفات ہوں۔ ان میں سے پہلی صفت یہ ہے کہ وہ اپنی نماز میں خشوع وخضوع کرنے والے ہوں یعنی نماز میں ان کی کامل توجہ اللہ کی ذات کی طرف مرکوز رہے اور نماز میں دھیان اِدھر اُدھر نہ جائے۔ اس بارے ہم آگے چل کر مستقل گفتگو کریں گے کہ نماز میں خشوع سے کیا مراد ہے اور یہ کیسے حاصل کیا جا سکتا ہے؟

مومنین کی دوسری صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ فضول باتوں اور لغو کاموں سے اعراض کرنے والے ہوتے ہیں۔ وہ اپنا وقت بے ہودہ باتوں اور بے کار کاموں میں ضائع نہیں کرتے۔ وہ اپنے وقت کی قدر کرتے ہیں اور اُس کے استعمال کو قیمتی بناتے ہیں۔ وہ تاش، وڈیو گیمز، فلم بینی، براؤزنگ، میسجنگ، چیٹنگ وغیرہ میں اپنا وقت ضائع نہیں کرتے بلکہ سنجیدہ، بامقصد اور تعمیری سرگرمیوں میں اپنا وقت استعمال کرتے ہیں۔

مومنین کی تیسری صفت یہ ہے کہ وہ تزکیہ کرتے رہتے ہیں۔ اپنے نفس کا بھی اور اپنے مال کا بھی۔ نفس کا تزکیہ یہ ہے کہ ہر وقت اس سوچ وبچار میں رہے کہ اپنے اخلاق اور رویوں میں موجود خرابیوں اور کوتاہیوں کو کسی طرح دور کر سکتا ہوں اور ان کو دور

کرنے کے لیے مجاہدہ بھی کرے۔اور مال کا تزکیہ یہ ہے کہ اپنے مال میں سے اللہ کی راہ میں زکوۃ اور صدقات نکالتا رہے۔

اور چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ بدکاری اور زنا سے بچتے ہیں۔اور خواہش پوری کرنے کے جو جائز رستے ہیں یعنی بیویاں اور لونڈیاں تو اُن دو کے علاوہ وہ کہیں اور منہ نہیں مارتے۔اپنی خواہش کو قابو میں رکھتے ہیں اور بے حیائی کے ایسے کاموں کے قریب بھی نہیں پھٹکتے کہ جو زنا اور بدکاری کی طرف لے کر جانے والے ہوں۔

اور پانچویں صفت یہ ہے کہ جب ان کے پاس کوئی امانت رکھوائی جائے تو اس میں خیانت نہیں کرتے اور اگر کسی سے وعدہ کر لیں تو اسے پورا کرتے ہیں۔امانت صرف یہی نہیں ہے کہ کسی نے آپ کے پاس کچھ رقم رکھوادی اور آپ نے اس کو بعینہ واپس کر دی بلکہ سرکاری عہدہ بھی ایک قسم کی امانت ہے۔کسی سرکاری عہدے میں اختیارات کا ناجائز استعمال بھی امانت میں خیانت (corruption) کے مترادف ہے۔ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: «مَنْ جُعِلَ قَاضِيًا بَيْنَ النَّاسِ، فَقَدْ ذُبِحَ بِغَيْرِ سِكِّينٍ»[1]

”حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جسے لوگوں کے مابین فیصلہ کرنے کے لیے قاضی کا عہدہ دیا گیا تو اس کی مثال ایسے ہے جیسے اسے بغیر چھری کے ذبح کیا گیا ہو۔“

اسی طرح وعدہ صرف وہی نہیں ہوتا کہ جس میں آپ باقاعدہ یہ الفاظ بولیں کہ میں آپ سے وعدہ کر رہا ہوں بلکہ اگر آپ نے کسی سے طے (commitment) کیا ہے کہ آپ اس کا قرض ایک ماہ تک واپس کر دیں گے تو یہ بھی وعدہ میں شامل ہے۔اور مومن کبھی اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا ہے۔ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «أَرْبَعٌ مَنْ كُنَّ فِيهِ كَانَ مُنَافِقًا خَالِصًا، وَمَنْ كَانَتْ فِيهِ خَلَّةٌ مِنْهُنَّ

[1] سنن ابن ماجة، كِتَابُ الْأَحْكَامِ، بَابُ ذِكْرِ الْقُضَاةِ، 774/2

كَانَتْ فِيهِ خَلَّةٌ مِنْ نِفَاقٍ حَتَّى يَدَعَهَا: إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ، وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ، وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ، وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ»[1]

"حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس میں یہ چار خصلتیں ہوں تو وہ تو پکا منافق ہے۔ اور جس میں ان چار میں سے کوئی خصلت ہو تو اس میں نفاق کی ایک خصلت ہے یہاں تک کہ وہ اُس کو چھوڑ دے۔ اور وہ خصلتیں یہ ہیں کہ جب بولے، جھوٹ بولے۔ اور جب معاہدہ (contract) کرے تو غداری کرے۔ اور جب وعدہ (promise) کرے تو توڑ دے۔ اور جب جھگڑا کرے تو پھٹ پڑے۔"

اور کامیاب ہونے والے مومنوں کی چھٹی صفت یہ ہے کہ وہ نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں یعنی نماز کو ضائع نہیں ہونے دیتے۔ نماز جماعت سے ادا کرتے ہیں اور وقت پر ادا کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ دو دو نمازیں جمع کر رہے ہوں، یا دن میں چار نمازیں پڑھ لی اور ایک ضائع کر دی، یا ہفتے میں چار دن پڑھ لی اور تین دن چھٹی کر لی۔ نماز کی حفاظت سے مراد نماز کو اپنے وقت میں ادا کرنا ہے۔ اور اس میں بھی کوشش کرے کہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کرے اور اگر کسی مجبوری سے جماعت نہ مل سکے تو نماز کو اس کے مقررہ وقت سے مؤخر نہ کرے۔

ان چھ صفات میں سے پہلی اور آخری صفت کا تعلق نماز سے ہے۔ پہلی صفت نماز کی باطنی کیفیت کے بارے ہے کہ اُس کو خشوع کی کیفیت سے ادا کرے۔ اور دوسری صفت نماز کی ظاہری صورت کے بارے ہے کہ نماز اپنے وقت پر ادا کرے۔ بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ اگر مومن اپنی نماز کے ظاہر اور باطن کی اصلاح کر لے گا تو اللہ عزوجل نماز کی اصلاح کی برکت سے درمیان کی چار صفات از خود اس میں پیدا فرما دیں گے۔ پس اصلاح نفس کے اس قرآنی پروگرام میں نماز کی ظاہری اور باطنی اصلاح کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «أَتَانِي

---

[1] صحیح مسلم، كِتَابُ الْإِيمَانَ، بَابُ بَيَانِ خِصَالِ الْمُنَافِقِ، 78/1

اللَّيْلَةَ رَبِّي تبَارَكَ وَتَعَالَى فِي أَحْسَنِ صُورَةٍ، - قَالَ أَحْسَبُهُ فِي الْمَنَامِ - فَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ هَلْ تَدْرِي فِيمَ يَخْتَصِمُ المَلَأُ الأَعْلَى؟ قَالَ: قُلْتُ: لَا، قَالَ: «فَوَضَعَ يَدَهُ بَيْنَ كَتِفَيَّ حَتَّى وَجَدْتُ بَرْدَهَا بَيْنَ ثَدْيَيَّ» أَوْ قَالَ: فِي نَحْرِي، فَعَلِمْتُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الأَرْضِ، قَالَ: يَا مُحَمَّدُ، هَلْ تَدْرِي فِيمَ يَخْتَصِمُ المَلَأُ الأَعْلَى؟ قُلْتُ: نَعَمْ، فِي الكَفَّارَاتِ، وَالكَفَّارَاتُ المُكْثُ فِي المَسَاجِدِ بَعْدَ الصَّلَاةِ، وَالْمَشْيُ عَلَى الْأَقْدَامِ إِلَى الْجَمَاعَاتِ، وَإِسْبَاغُ الوُضُوءِ فِي المَكَارِهِ، وَمَنْ فَعَلَ ذَلِكَ عَاشَ بِخَيْرٍ وَمَاتَ بِخَيْرٍ، وَكَانَ مِنْ خَطِيئَتِهِ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ، وَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ، إِذَا صَلَّيْتَ فَقُلْ: اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ فِعْلَ الخَيْرَاتِ، وَتَرْكَ الْمُنْكَرَاتِ، وَحُبَّ المَسَاكِينِ، وَإِذَا أَرَدْتَ بِعِبَادِكَ فِتْنَةً فَاقْبِضْنِي إِلَيْكَ غَيْرَ مَفْتُونٍ، قَالَ: وَالدَّرَجَاتُ إِفْشَاءُ السَّلَامِ، وَإِطْعَامُ الطَّعَامِ، وَالصَّلَاةُ بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ»[1]

”حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رات اللہ عزوجل میرے خواب میں بہترین صورت میں میرے پاس آئے اور مجھ سے سوال کیا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ کو معلوم ہے کہ اعلی مجلس کے فرشتے کن باتوں میں اختلاف کرتے ہیں؟ تو میں نے کہا کہ مجھے نہیں معلوم۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ عزوجل نے اپنا ہاتھ میرے کندھوں کے درمیان رکھا یہاں تک میں نے اُس کی ٹھنڈک اپنے سینے میں محسوس کی اور زمین وآسمان میں جو کچھ ہے، وہ سب میرے سامنے روشن ہو گیا۔ اب اللہ عزوجل نے پھر سوال کیا: اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم! کیا آپ کو معلوم ہے کہ اعلی مجلس کے فرشتے کن باتوں میں اختلاف کرتے ہیں؟ تو میں نے کہا جی ہاں، مجھے معلوم ہے کہ وہ اس میں اختلاف کر رہے ہیں کہ کون سے نیک اعمال ایسے ہیں کہ جو گناہوں کا کفارہ بن جاتے ہیں۔ اور وہ نیک اعمال کہ جو انسان کے گناہوں کو مٹا

[1] سنن الترمذي، أَبْوَابُ تَفْسِيرِ الْقُرْآنِ، بَابٌ وَمِنْ سُورَةِ ص، 5/366-367۔ اس روایت کو امام ترمذی، امام بخاری، امام ابن عبد البر، امام بغوی، امام ابن تیمیہ، امام منذری، امام ابن حجر، علامہ ابن العربی، علامہ ابن جوزی، شیخ احمد شاکر اور علامہ البانی رحمہم اللہ نے "حسن" قرار دیا ہے۔

دیتے ہیں، ان میں سے ایک نماز باجماعت کے لیے مسجد کی طرف پیدل چل کر جانا ہے۔ اور دوسرا نماز باجماعت کے بعد مسجد میں کچھ دیر تک بیٹھے رہنا ہے۔ اور تیسرا مشکلات [یعنی گرمیوں میں گرم اور سردیوں میں ٹھنڈے پانی] میں اہتمام سے وضو کرنا ہے۔ اور جس نے یہ تین کام کر لیے تو اس کی زندگی خیر پر گزری اور اس کا خاتمہ بھی خیر پر ہوگا۔ اور وہ گناہوں سے ایسا پاک ہو جائے جیسا کہ پیدا ہونے والا بچہ گناہوں سے پاک ہوتا ہے۔ اور اللہ عزوجل نے یہ بھی کہا کہ اے محمد ﷺ! جب آپ نماز پڑھیں تو یہ دعا کریں: اے اللہ! مجھے نیک کام کرنے، برائی سے بچنے اور غریبوں سے محبت کرنے کی توفیق عطا فرما۔ اے پروردگار! اور جب آپ اپنے بندوں کو کسی آزمائش میں ڈالنے کا ارادہ کریں تو مجھے اس آزمائش سے پہلے ہی اس دنیا سے اٹھالیں۔ اور آپ ﷺ نے فرمایا کہ درجات کو بلند کرنے والے اعمال یہ ہیں: سلام کو عام کرنا، غریبوں کو کھانا کھلانا اور رات کو اس وقت نماز پڑھنا جبکہ لوگ سو رہے ہوں۔"

جن مومنین میں یہ چھ صفات پیدا ہو جائیں تو انہیں قرآن مجید نے جنت الفردوس کا وارث کہا ہے۔ جنت کے ایک سو درجات ہیں اور ان میں سب سے بلند درجہ جنت الفردوس کا ہے۔ آپ ﷺ نے اپنی امت کو تلقین کی ہے کہ جب بھی اللہ سے دعا مانگو تو جنت الفردوس مانگو۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے سنا ہے کہ آپ نے فرمایا:

«الْجَنَّةُ مِائَةُ دَرَجَةٍ، كُلُّ دَرَجَةٍ مِنْهَا مَا بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ، وَإِنَّ أَعْلَاهَا الْفِرْدَوْسُ، وَإِنَّ أَوْسَطَهَا الْفِرْدَوْسُ، وَإِنَّ الْعَرْشَ عَلَى الْفِرْدَوْسِ، مِنْهَا تُفَجَّرُ أَنْهَارُ الْجَنَّةِ، فَإِذَا مَا سَأَلْتُمُ اللَّهَ فَسَلُوهُ الْفِرْدَوْسَ»[1]

"جنت کے سو درجات ہیں۔ ایک درجے سے دوسرے درجے کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہے کہ جتنا زمین اور آسمان کے مابین ہے۔ اور سب سے اعلیٰ اور سب

[1] سنن ابن ماجة، كِتَابُ الزُّهْدِ بَابُ صِفَةِ الْجَنَّةِ، 1448/2

سے بہترین جنت، جنت الفردوس ہے۔ اور اللہ کا عرش جنت الفردوس کے اوپر ہے۔ جنت الفردوس ہی سے جنت کی تمام نہریں جاری ہوتی ہیں لہذا جب بھی تم اللہ سے دعا مانگو تو جنت الفردوس کا سوال ضرور کرو۔"

جنت کا سب سے آخری درجہ بھی اتنا بڑا ہو گا کہ اس دنیا سے دس گنا بڑی جنت اس شخص کو ملے گی کہ جو سب سے آخر میں جنت میں داخل ہو گا۔ اور نہ صرف دنیا سے دس گنا بڑی جنت بلکہ اس دنیا سے دس گنا نعمتیں بھی اس جنت میں ہوں گی یعنی وہ ایک مزین (furnished) جنت ہو گی۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنِّي لَأَعْلَمُ آخِرَ أَهْلِ النَّارِ خُرُوجًا مِنْهَا، وَآخِرَ أَهْلِ الْجَنَّةِ دُخُولًا الْجَنَّةَ، رَجُلٌ يَخْرُجُ مِنَ النَّارِ حَبْوًا، فَيَقُولُ اللهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى لَهُ: اذْهَبْ فَادْخُلْ الْجَنَّةَ، فَيَأْتِيهَا فَيُخَيَّلُ إِلَيْهِ أَنَّهَا مَلْأَى، فَيَرْجِعُ فَيَقُولُ: يَا رَبِّ، وَجَدْتُهَا مَلْأَى، فَيَقُولُ اللهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى لَهُ: اذْهَبْ فَادْخُلِ الْجَنَّةَ، قَالَ: فَيَأْتِيهَا، فَيُخَيَّلُ إِلَيْهِ أَنَّهَا مَلْأَى، فَيَرْجِعُ فَيَقُولُ: يَا رَبِّ، وَجَدْتُهَا مَلْأَى، فَيَقُولُ اللهُ لَهُ: اذْهَبْ فَادْخُلْ الْجَنَّةَ، فَإِنَّ لَكَ مِثْلَ الدُّنْيَا وَعَشَرَةَ أَمْثَالِهَا - أَوْ إِنَّ لَكَ عَشَرَةَ أَمْثَالِ الدُّنْيَا -، قَالَ: فَيَقُولُ: أَتَسْخَرُ بِي - أَوْ أَتَضْحَكُ بِي - وَأَنْتَ الْمَلِكُ؟، قَالَ: لَقَدْ رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ضَحِكَ حَتَّى بَدَتْ نَوَاجِذُهُ»[1]

"میں اس شخص کو جانتا ہوں کہ جو سب سے آخر میں جہنم سے نکلے گا اور سب سے آخر میں جنت میں داخل ہو گا۔ یہ شخص گھٹنوں کے بل گھسٹتا ہوا جہنم سے نکلے گا تو اللہ تعالی اس سے کہیں گے کہ جا، جنت میں داخل ہو جا۔ وہ شخص جنت کے دروازے پر آئے گا تو اسے محسوس ہو گا کہ شاید جنت بھر چکی ہے [اور اس کے لیے اس میں جگہ نہیں ہے]۔ وہ واپس اپنے پروردگار کے پاس آئے گا اور کہے گا کہ اے میرے رب! جنت تو بھری ہوئی ہے۔ اللہ عزوجل اسے دوبارہ کہیں گے کہ جا، اور جنت میں داخل ہو جا۔ پس وہ جنت کے دروازے پر آئے گا

---

[1] صحیح مسلم، كِتَابُ الْإِيمَانَ، بَابُ آخِرِ أَهْلِ النَّارِ خُرُوجًا، 173/1

تواسے دوبارہ محسوس ہو گا کہ شاید جنت بھر چکی ہے [اور اس کے لیے اس میں جگہ نہیں ہے]۔ پس وہ دوبارہ واپس اپنے پروردگار کے پاس آئے گا اور کہے گا کہ اے میرے رب! جنت تو بھری ہوئی ہے۔ تو اللہ عزوجل اس سے کہیں گے جا، اور جنت میں داخل ہو جا۔ ہم نے تجھے دنیا جتنی بڑی جنت دی بلکہ دنیا سے دس گنا بڑی جنت دی۔ تو وہ شخص کہے گا کہ اے میرے رب! آپ تو بادشاہ ہیں لیکن اپنے بندے کا مذاق تو نہ اڑائیں [یعنی اس شخص کو یہ یقین ہی نہیں آئے گا کہ اسے اتنی بڑی جنت مل سکتی ہے اور وہ اپنے رب کی اس بات کو مذاق سمجھ لے گا]۔ راوی کہتے ہیں کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو دیکھا کہ یہ بات بیان کرتے ہوئے آپ اس قدر ہنسے کہ آپ کی داڑھیں نظر آنا شروع ہو گئیں۔"

آج ہم اس غلط فہمی میں ہیں کہ جب مولوی صاحب کہتے ہیں کہ جنت ملے گی تو یہ خیال آتا ہے کہ شاید ڈیفنس یا بحریہ ٹاؤن میں کوئی دس مرلے کا پلاٹ نکل آئے گا یعنی جنت کو ہم نے اتنی حقیر نعمت سمجھ رکھا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ احادیث کی کتابوں سے جنت کے ابواب کا خاص طور مطالعہ کریں تا کہ اس کی خواہش اور طلب میں اضافہ ہو۔ اور پھر یہی خواہش اور طلب ہماری اصلاح کا ذریعہ بن جائے۔

۞۞۞۞۞۞۞

باب دوم

اصلاح احوال

اس باب میں اصلاح أحوال کے ضمن میں انسانی مزاج، کیفیات، نفسیات، جذبات اور قرآن مجید کے کردار کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

تلون مزاجی

عصر حاضر کے انسان کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ وہ ہر چیز میں تیزی سے حاصل ہونے والی تبدیلی کا خواہاں ہے۔ انسان کی طبیعت ایسی ہے کہ وہ یکسانیت سے اکتاہٹ محسوس کرتی ہے اور تبدیلی کی طرف مائل رہتی ہے۔ انسانی مزاج کا یہ وصف اس کی خوبی بھی ہے اور کمزوری بھی۔ اگر یہ مزاج نہ ہو تو زندگی سے حرکت ہی ختم ہو جائے اور انسان جمود (inertia) کا شکار ہو جائے اور دوسری صورت میں اگر یہ مزاج حد سے بڑھ جائے تو اسے "تلون مزاجی" کہتے ہیں۔ پس تبدیلی کی طرف مائل رہنے والا مزاج نہ رکھنا جمود پیدا کرتا ہے اور ہر قدم پر تبدیلی کی طرف مائل مزاج تلون مزاجی پیدا کرتا ہے اور یہ دونوں مطلوب نہیں ہیں۔

متلون مزاج (temperamental) سے مراد ایسا مزاج ہے جس میں ٹھہراؤ نہ ہو اور جلد تبدیل ہو جانے والا ہو۔ تبدیلی انسانی زندگی بلکہ اس کے مزاج کا حصہ ہے اور انسان تبدیلی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ تبدیلی نہ ہونے کا مطلب دنیا کا خاتمہ ہے لیکن آئے روز تبدیلی کی خواہش ایک کمزوری ہے کیونکہ زندگی حرکت اور سکون دونوں کے توازن کا نام ہے۔ ہم میں سے ہر شخص تبدیلی چاہتا ہے، اپنے لباس میں، رہن سہن میں، عادات واطوار میں حتی کہ زندگی کی ہر اس چیز میں جو اس سے متعلق ہو۔ لوگ اپنے موبائل، لیپ ٹاپ، گاڑی، گھر، ملازمت، کاروبار، پیشہ، مدرسہ، یونیورسٹی، تنظیم، جماعت حتی کہ شریک حیات تک سے اکتا جاتے ہیں۔

مدرسہ اور یونیورسٹی کے طالب علم ہی کی مثال لے لیں۔ کسی مدرسہ اور یونیورسٹی میں دو سال لگانے کے بعد اکثر وبیشتر طلباء میں دوسرے مدرسہ اور یونیورسٹی میں داخلہ لینے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ ایک گاڑی لینے کے بعد ہمیں بہتر گاڑی کی خواہش محسوس ہوتی ہے حالانکہ پہلی گاڑی ہماری ضرورت پوری کر رہی ہوتی ہے۔ شوہر اپنی بیوی سے اکتا جاتے ہیں حالانکہ وہ یہ تبصرہ بھی کر رہے ہوتے ہیں کہ اگر دوسری بھی لے آئیں گے تو وہ ہرگز پہلی سے بہتر نہ ہو گی کیونکہ نوع تو ایک ہی ہے۔ اور بیوی کو اپنی سہیلی

اور پڑوسن کا شوہر آئیڈیل معلوم ہوتا ہے حالانکہ اسے اچھی طرح معلوم ہے کہ اس کی شادی اس آئیڈیل شوہر کے ساتھ بھی ہو جاتی، تو وہاں بھی اس کے کچھ نہ کچھ مسائل باقی رہنے تھے۔ لوگ ایک جگہ ملازمت چھوڑ کر دوسری جگہ جوائن کرنے کو انجوائے کرتے ہیں حالانکہ دوسری جگہ میں بعض اوقات انہیں کوئی زیادہ فوائد حاصل نہیں ہو رہے ہوتے ہیں۔

بعض لوگ اعلی دنیاوی تعلیم کے بعد دین کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں، وہ اپنی زندگیاں دین کے لیے وقف کرنے کی بات کرتے ہیں حالانکہ ان میں بھی اکثر کے ہاں اصل محرک (motive) ان کے مزاج کا تلون ہوتا ہے نہ کہ کوئی عزم واستقلال۔ ایسے لوگ دنیا سے دین کی طرف آکر دوبارہ دنیا کی طرف جلد چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح بعض لوگ آئے روز کاروبار تبدیل کرتے رہتے ہیں کہ انہیں ایک ہی قسم کے کاروبار میں سکون نہیں ملتا۔

جو لوگ متلون مزاج ہوتے ہیں، ان میں یہ کمزوری بھی ہوتی ہے کہ وہ جو اچھا لگے، اسے کر گزرنے کی سوچتے ہیں حالانکہ ان میں وہ کچھ کرنے کی استطاعت نہیں ہوتی ہے۔ تلون مزاجی انسان کے اوقات اور صلاحیتوں دونوں کو برباد کر دیتی ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ جو بھی کام کرے، چاہے دنیا کا ہو یا دین کا، اس میں ٹھہراؤ پیدا کرے۔ کم از کم پانچ سال سے پہلے اپنی زندگی کے بارے کوئی بڑا فیصلہ نہ کرے الا یہ کہ کوئی بہت ہی مجبوری ہو۔

کہیں ملازمت اختیار کی ہے تو پانچ سال وہاں رہے۔ کوئی کاروبار شروع کیا ہے تو پانچ سال تک جیسے تیسے چلائے۔ گاڑی لی ہے تو کم از کم پانچ سال بعد اسے تبدیل کرے۔ کسی مدرسہ یا یونیورسٹی میں طالب علم ہے تو چار پانچ سال سے پہلے وہاں سے نکلنے کا نہ سوچے۔ ایک استاذ کو چاہیے کہ وہ ایک کورس کم از کم پانچ سال تک پڑھائے اور ہر سال یا سمسٹر میں نیا کورس نہ لے۔ ان شاء اللہ! اس تدبیر سے انسان کی زندگی میں ٹھہراؤ اور کام میں پختگی آجائے گی۔

بعض اوقات تبدیلی کی خواہش زیادہ زور اس وقت پکڑتی ہے جبکہ انسان یہ سمجھتا ہو کہ یہ تبدیلی اسے آگے لے کر جانے والی ہے۔ ہم میں سے ہر شخص ذاتی ارتقاء اور نمو (personal grooming) چاہتا ہے۔اور بعض دیندار لوگ اپنی ذات کا تعارف اس لیے چاہتے ہیں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری ذات دین کے تعارف کا ایک ذریعہ ہے لہذا اگر ہم اپنی ذات کے تعارف پر توجہ دیتے ہیں تو یہ دین ہی کی ایک خدمت ہے۔اس سوچ میں اخلاص بھی ہو سکتا ہے اور اپنے آپ سے دھوکا بھی لیکن اس وقت یہ ہمارا موضوع نہیں ہے۔

ہمارا مقصود اس وقت صرف یہ ہے کہ دین کے نام پر بعض اوقات ہم اپنی شخصیت کے نمو اور ارتقاء میں بہت زیادہ گم ہوتے چلے جاتے ہیں اور کم وقت میں بہت کچھ بننے کے لیے تلون مزاجی کا شکار ہو جاتے ہیں جس سے باعتبار نتیجہ کچھ حاصل نہیں ہوتا جیسا کہ دنیادار شخص کو راتوں رات کروڑپتی بننے کے خواب میں سوائے ڈیپریشن کے اور کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ تلون مزاجی کا ایک اور بہترین حل قناعت بھی ہے جس پر ہم ان شاء اللہ علیحدہ سے گفتگو کریں گے۔

تلون مزاجی سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کے مزاج میں ٹھہراؤ ہو اور ٹھہراؤ یا تو پیدائشی ہوتا ہے کہ انسان کی مٹی اور خمیر میں داخل ہو یا پھر بعد میں پیدا ہوتا ہے۔ اور جو ٹھہراؤ بعد میں پیدا ہو تو وہ عقل اور وقت سے آتا ہے۔ انسان جس قدر سمجھدار ہو گا، اس کی بات چیت، اٹھنے بیٹھنے اور کام کرنے میں اسی قدر ٹھہراؤ ہو گا۔ اور انسان جس قدر بے وقوف ہو گا اسی قدر عجلت پسند ہو گا۔ سمجھداری کے علاوہ ٹھہراؤ وقت کے ساتھ بھی آتا ہے کہ بڑی عمر میں انسان جلد باز نہیں رہ جاتا۔ عموماً وہ نوجوان کہ جوانی میں ان میں جلد بازی ہوتی ہے، تو بڑی عمر میں جا کر ٹھہراؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اور وجہ شاید یہ بھی ہے کہ عمر گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان کا تجربہ بڑھنے سے اس کی عقل بھی بڑھتی جاتی ہے اور عقل بڑھنے سے اس کے مزاج میں ٹھہراؤ آتا جاتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم اس صفت کے لیے چالیس سال کی عمر کا انتظار کریں بلکہ

ہمیں اس سے پہلے بھی اپنے مزاج میں ٹھہراؤ پیدا کرنے کی شعوری کوشش کرنی چاہیے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ قبیلہ عبد القیس کے لوگ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں ملاقات کے لیے تشریف لائے تو آپ ان کے استقبال کے لیے گئے۔ تمام لوگ آپ ﷺ کو دیکھتے ہیں اپنی سواریوں سے اترے اور آپ ﷺ کی طرف لپکے جبکہ ان کے سردار اشج عبد القیس رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی سواری کو باندھا اور اس کے بعد اپنے سفر والے کپڑوں کی جگہ دوسرا لباس پہنا اور پھر آپ ﷺ کی طرف بڑھے تو آپ نے فرمایا:

«إِنَّ فِيكَ لَخَصْلَتَيْنِ يُحِبُّهُمَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ، قَالَ: مَا هُمَا؟ قَالَ: الْأَنَاةُ وَالْحِلْمُ، قَالَ: شَيْءٌ جُبِلْتُ عَلَيْهِ أَوْ شَيْءٌ أَتَخَلَّقُهُ؟ قَالَ: لَا بَلْ جُبِلْتَ عَلَيْهِ، قَالَ: الْحَمْدُ لِلَّهِ»[1]

”تم میں دو خصلتیں ایسی ہیں کہ جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو محبوب ہیں۔ تو انہوں نے کہا کہ وہ کون سی خصلتیں ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ سمجھداری اور ٹھہراؤ۔ انہوں نے کہا کہ کیا یہ خصلتیں مجھ میں پیدائشی ہیں یا میں نے بعد میں اختیار کی ہیں۔ تو آپ نے فرمایا کہ نہیں، یہ خصلتیں تم میں پیدائشی ہیں۔ انہوں نے کہا کہ اس پر اللہ کا شکر ہے۔“

خشیت کے آنسو

آنسو دو قسم کے ہیں: ایک مجلس کے دوسرے تنہائی کے۔ اہم بات یہ ہے کہ عموماً دونوں ہوتے کچھ ہیں اور نظر کچھ آتے ہیں، مجلس والے اہل مجلس کی نظر میں اور تنہائی والے اپنی نظر میں۔ ایک صاحب کو نماز باجماعت میں بہت رونا آیا۔ ساتھ کھڑے نمازیوں کو یہ تاثر ملا کہ شاید خشیت الہی سے رو رہے ہوں حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ رونے کا سبب کوئی دنیاوی آزمائش تھی جس میں انھیں صبر نہیں آ رہا تھا۔ اس آزمائش کے سبب دل بھر آیا ہوا تھا، اور آنکھیں نمناک تھیں لہذا جیسے ہی نماز میں داخل ہوئے تو زار و قطار

[1] محمد بن حبان بن أحمد بن حبان البُستي (المتوفى: 354هـ)، صحيح ابن حبان بترتيب ابن بلبان، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الثانية، 1414هـ – 1993ء، 178/16

رونا شروع کر دیا۔

بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ نماز میں کوئی ایسا خیال آیا کہ آنسو جاری ہو گئے۔ مثلاً بچہ بیمار تھا، نماز میں اس کے بچھڑ جانے کا خیال آیا اور اس کے ساتھ ہی آنسو جاری ہو گئے۔ یہ آنسو اگرچہ خشیت الٰہی کے نہیں ہوتے لیکن انسان کا بعض اوقات ایسے آنسوؤں پر اختیار بھی نہیں ہوتا۔ البتہ رونے والے کو یہ سوچ کر ذہنی کوفت ہو سکتی ہے کہ لوگ خواہ مخواہ اس کے بارے متقی، پرہیزگار معلوم نہیں کیا کیا سوچ رہے ہوں گے؟

اب سوال یہ ہے کہ مجلس کے ایسے آنسو ریاکاری تو نہیں ہیں لیکن کیا نیکی ہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات طے شدہ ہے کہ یہ آنسو دل کی نرمی کے بعد جاری ہوتے ہیں۔ اور اگر محض دل کی نرمی نیکی ہے تو شاید یہ نیکی کے آنسو کہلائے جا سکیں؟ یہ آنسو انسان کے اپنے لیے تو واضح ہوتے ہیں لیکن لوگوں کے لیے دھوکہ ہیں۔

دوسری قسم کے آنسو تنہائی کے ہیں۔ بعض اوقات انسان کو ان آنسوؤں کے بارے بھی شبہ ہو جاتا ہے کہ یہ جھوٹے ہیں اور ان کی آمد شیطان کی طرف سے ہوئی ہے۔ احمد جاوید صاحب کا کہنا ہے کہ تنہائی کے احوال وکیفیات بھی جھوٹی ہو سکتی ہیں۔ اور اس کی پہچان یہ ہے کہ اگر تنہائی کے رونے کے نتیجے میں اپنے نفس میں عاجزی محسوس ہو تو یہ رونا رحمان کی طرف سے ہے اور اگر اس رونے کے بعد اپنی بڑائی کا کسی بھی قسم کا احساس پیدا ہو تو یہ آنسو شیطان کی طرف سے ہیں۔

یہ بات درست معلوم ہوتی ہے کہ تنہائی میں جبکہ ہمارے ساتھ کوئی بھی نہیں ہوتا تو اس وقت ریاکاری تو ممکن نہیں ہے لیکن تکبر ممکن ہے۔ ہم تنہائی میں اگر کچھ دیر رونے کے بعد اپنے آپ کو تقویٰ کے کسی درجے پر فائز سمجھیں اور پھر تنہائی سے مجلس میں آ کر لوگوں کو حقیر سمجھنا شروع کر دیں تو محسوس یہی ہوتا ہے کہ تنہائی کا یہ رونا شیطان کی طرف سے ہی تھا۔ واللہ اعلم

بعض دوستوں نے تبصرہ کیا کہ تنہائی کے آنسوؤں میں شک نہیں کرنا چاہیے اور یہ اللہ ہی کی طرف سے ہوتے ہیں۔ ہمیں اس تبصرے سے اتفاق نہیں ہے۔ جس طرح

مجلس میں کسی شخص کے رونے کے اسباب خشیت الٰہی کے علاوہ ہو سکتے ہیں تو تنہائی میں بھی رونے کے اسباب خشیت الٰہی کے علاوہ ہو سکتے ہیں۔ اگر آپ کے رونے میں ریاکاری نہیں ہے تو اس کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ اخلاص ضرور موجود ہے۔

آنسوؤں میں بعض اوقات ریاکاری نہیں ہوتی لیکن اخلاص بھی نہیں ہوتا بلکہ کوئی اور سبب ہوتا ہے اور یہی بات ہم واضح کرنا چاہ رہے ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ جو شخص تنہائی میں اللہ کی خشیت کی وجہ سے رو پڑے تو اسے قیامت والے دن اللہ کے عرش کا سایہ نصیب ہو گا۔[1] اور تنہائی کے رونے میں کبھی ریاکاری نہیں ہو سکتی البتہ یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص تنہائی میں کسی دنیاوی آزمائش یا عارضی ناکامی یا عشق مجازی میں رو رہا ہو۔ لہٰذا تنہائی کے رونے میں بھی وجہ خشیت الٰہی ہونی چاہیے۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

وَالْبُكَاءُ أَنْوَاعٌ. أَحَدُهَا: بُكَاءُ الرَّحْمَةِ وَالرِّقَّةِ. وَالثَّانِي: بُكَاءُ الْخَوْفِ وَالْخَشْيَةِ. وَالثَّالِثُ: بُكَاءُ الْمَحَبَّةِ وَالشَّوْقِ. وَالرَّابِعُ: بُكَاءُ الْفَرَحِ وَالسُّرُورِ. وَالْخَامِسُ: بُكَاءُ الْجَزَعِ مِنْ وُرُودِ الْمُؤْلِمِ وَعَدَمِ احْتِمَالِهِ. وَالسَّادِسُ: بُكَاءُ الْحُزْنِ. وَالْفَرْقُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ بُكَاءِ الْخَوْفِ، أَنَّ بُكَاءَ الْحُزْنِ يَكُونُ عَلَى مَا مَضَى مِنْ حُصُولِ مَكْرُوهٍ أَوْ فَوَاتِ مَحْبُوبٍ، وَبُكَاءُ الْخَوْفِ يَكُونُ لِمَا يُتَوَقَّعُ فِي الْمُسْتَقْبَلِ مِنْ ذَلِكَ، وَالْفَرْقُ بَيْنَ بُكَاءِ السُّرُورِ وَالْفَرَحِ وَبُكَاءِ الْحُزْنِ، أَنَّ دَمْعَةَ السُّرُورِ بَارِدَةٌ وَالْقَلْبُ فَرْحَانُ، وَدَمْعَةُ الْحُزْنِ حَارَّةٌ وَالْقَلْبُ حَزِينٌ...وَالسَّابِعُ: بُكَاءُ الْخَوَرِ وَالضَّعْفِ. وَالثَّامِنُ: بُكَاءُ النِّفَاقِ، وَهُوَ أَنْ تَدْمَعَ الْعَيْنُ وَالْقَلْبُ قَاسٍ، فَيُظْهِرُ صَاحِبُهُ الْخُشُوعَ وَهُوَ مِنْ أَقْسَى النَّاسِ قَلْبًا. وَالتَّاسِعُ: الْبُكَاءُ الْمُسْتَعَارُ وَالْمُسْتَأْجَرُ عَلَيْهِ، كَبُكَاءِ النَّائِحَةِ بِالْأُجْرَةِ، فَإِنَّهَا كَمَا قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ: (تَبِيعُ عَبْرَتَهَا وَتَبْكِي شَجْوَ غَيْرِهَا) وَالْعَاشِرُ: بُكَاءُ الْمُوَافَقَةِ، وَهُوَ أَنْ يَرَى الرَّجُلُ النَّاسَ يَبْكُونَ لِأَمْرٍ وَرَدَ عَلَيْهِمْ فَيَبْكِي مَعَهُمْ، وَلَا يَدْرِي لِأَيِّ شَيْءٍ يَبْكُونَ، وَلَكِنْ يَرَاهُمْ يَبْكُونَ فَيَبْكِي...التَّبَاكِي، وَهُوَ نَوْعَانِ: مَحْمُودٌ وَمَذْمُومٌ، فَالْمَحْمُودُ أَنْ

[1] صحيح البخاري، كتاب الآذان، بابُ مَنْ جَلَسَ فِي الْمَسْجِدِ يَنْتَظِرُ الصَّلَاةَ وَفَضْلِ الْمَسَاجِدِ، 133/1

يُسْتَجْلَبَ لِرِقَّةِ الْقَلْبِ وَلِخَشْيَةِ اللهِ لَا لِلرِّيَاءِ وَالسُّمْعَةِ. وَالْمَذْمُومُ أَنْ يُجْتَلَبَ لِأَجْلِ الْخَلْقِ، وَقَدْ «قَالَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَقَدْ رَآهُ يَبْكِي هُوَ وأبو بكر فِي شَأْنِ أُسَارَى بَدْرٍ: أَخْبِرْنِي مَا يُبْكِيكَ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟ فَإِنْ وَجَدْتُ بُكَاءً بَكَيْتُ، وَإِنْ لَمْ أَجِدْ تَبَاكَيْتُ لِبُكَائِكُمَا، وَلَمْ يُنْكِرْ عَلَيْهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ» وَقَدْ قَالَ بَعْضُ السَّلَفِ: ابْكُوا مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ، فَإِنْ لَمْ تَبْكُوا فَتَبَاكَوْا.[1]

"رونے کی کئی ایک قسمیں ہیں۔ پہلی قسم دل کی نرمی یا کسی پر رحم کی وجہ سے رونا۔ دوسری قسم خوف اور ڈر کی وجہ سے رونا ہے۔ تیسری قسم کسی کی محبت یا شوق میں رونا ہے۔ چوتھی قسم خوشی میں رونا ہے۔ پانچویں قسم کسی مصیبت کے نازل ہونے اور اس کے برداشت نہ کر سکنے کی وجہ سے بے چین ہو کر رونا ہے۔ اور چھٹی قسم غم کا رونا ہے۔ خوف اور غم کے رونے میں فرق یہ ہے کہ غم کا رونا ماضی میں کسی محبوب چیز کے نہ ملنے یا کسی ناپسندیدہ شیء کے ملنے پر ہوتا ہے جبکہ خوف کے رونے کا تعلق مستقبل کے متوقع اندیشوں سے ہوتا ہے۔ خوشی اور غم کے رونے میں فرق یہ ہے کہ خوشی کے آنسو ٹھنڈے ہوتے ہیں اور دل خوش ہوتا ہے جبکہ غم کے آنسو گرم ہوتے ہیں اور دل غمگیں ہوتا ہے...اور ساتویں قسم کمزوری کا رونا ہے۔ آٹھویں قسم نفاق کا رونا ہے اور وہ یہ ہے کہ آنکھیں آنسو بہائیں اور دل سخت ہو۔ رونے والا اپنے خشوع کو ظاہر کرے حالانکہ اس کا دل لوگوں میں سخت تر ہو۔ نویں قسم کرائے کا رونا ہے جیسا کہ نوحہ کرنے والیاں اجرت پر لی جاتی ہیں۔ اور اسی بارے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ وہ اپنے آنسو بیچتی ہیں اور دوسرے کے دکھ پر روتی ہیں۔ اور دسویں قسم موافقت کا رونا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ کوئی شخص کچھ لوگوں کو کسی وجہ سے روتا دیکھے اور ان کے رونے پر خود بھی رونا شروع کر دے۔ اسے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کیوں رو رہے ہیں لیکن ان کے رونے کی

[1] ابن قيم الجوزية، محمد بن أبي بكر بن أيوب (المتوفى: 751ھ)، زاد المعاد في هدي خير العباد، مؤسسة الرسالة، بيروت، 1994ء، 177/1

وجہ سے اسے رونا آ جاتا ہے...اور رونا نہ آئے لیکن رونے کی کوشش کرے تو اس کی دو قسمیں ہیں۔ایک محمود ہے اور دوسری مذموم ہے۔ محمود قسم وہ ہے کہ جس میں دل کی نرمی اور خشیت الٰہی کی وجہ سے رونے کی کوشش کرے نہ کہ ریاکاری اور دکھلاوے کے لیے۔اور مذموم یہ ہے کہ لوگوں کے لیے رونے کی کوشش کرے۔ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ کو غزوہ بدر کے قیدیوں کے بارے نازل شدہ آیات کی وجہ سے روتے دیکھا تو کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے بتائیں کہ آپ کیوں رو رہے ہیں؟ پس اگر میں آپ کو روتے دیکھوں گا تو خود بھی رووں گا۔ اور اگر مجھے رونا نہ بھی آیا تو رونے کی کوشش کروں گا۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا انکار نہیں کیا۔ بعض سلف صالحین کا کہنا ہے کہ اللہ کی خشیت کی وجہ سے رووٗ۔ پس اگر تم رو نہ سکو تو رونے کی کوشش کرو۔"

طربیہ (comedy) اور المیہ (tragedy) انسانی زندگی کے دو پہلو ہیں یا ایسی دو حالتیں ہیں کہ انسان اپنی زندگی کے ہر لمحے میں ان دو میں سے کسی ایک حالت میں ہوتا ہے۔ دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے کہ جو روتا اور ہنستا نہ ہو۔ پس رنج و غم، دکھ درد، تکلیف و آزمائش اور ان کی وجہ سے رونا دھونا ہر انسان کا مقدر ہے لیکن بہترین رونا وہ ہے کہ جو اپنے رب کی خشیت یا محبت میں ہو۔ یعنی اپنے مالک کی ناراضگی کے ڈر سے روئے یا اپنے خالق کی محبت میں روئے۔ حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ سے مروی ہے:

البكاء عشرة أجزاء: جزء لله، وتسعة لغير الله، فإذا جاء الذي لله في العام مرة فهو كثير.[1]

"رونے کی دس قسمیں ہیں، ان دس میں سے ایک اللہ کے لیے ہے اور نو مخلوق کے لیے۔ پس اگر سال میں ایک مرتبہ بھی اللہ کے لیے رونے والی صورت حاصل ہو جائے تو بہت کافی ہے۔"

---

[1] الذهبي، شمس الدين أبو عبد الله محمد بن أحمد بن عثمان بن قَايْماز (المتوفى: 748هـ)، سير أعلام النبلاء، مؤسسة الرسالة، 1985ء، 258/7

حضرت سفیان ثوری رحمہ اللہ نے اپنے اس قول میں انسان کے رونے کے اسباب کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اگر انسان کو دس مرتبہ رونا آئے تو عام طور ان دس میں سے ایک مرتبہ اللہ کے لیے ہوتا ہے اور نو مرتبہ کے اسباب اللہ کی خشیت کے علاوہ ہوتے ہیں۔ دوسری بات جو انہوں نے کہی ہے، وہ یہ ہے کہ خالصتاً اللہ کے لیے رونا اگرچہ یہ نادر ہے لیکن اتنا قیمتی ہے کہ اگر سال میں ایک بار بھی حاصل ہو جائے تو انسان کو اطمینان حاصل ہو جانا چاہیے کہ اسے بہت بڑی نعمت حاصل ہو گئی ہے۔

امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے بھی اس سے ملتی جلتی روایت نقل کی ہے۔[1] اس قول سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے سلف صرف اس بات سے مطمئن نہیں ہو جاتے تھے کہ ہمیں رونا زیادہ آتا ہے بلکہ وہ اپنے رونے کا بھی نفسیاتی تجزیہ کرتے تھے اور گہرائی میں اس کے اسباب تلاش کرتے تھے تاکہ محض آنسو بہا لینا شیطان کی طرف سے اس نفسیاتی تسکین کا موجب نہ بن جائے کہ میں گناہوں سے پاک ہو گیا ہوں۔

ڈر کی نفسیات

عموماً مذہبی طبقہ دین میں کسی گنجائش کا ذکر کرنے میں ڈر کی نفسیات کا شکار رہتا ہے۔ مذہبی لوگوں کی اکثریت شرعی موضوعات پر گفتگو کرتے ہوئے اپنے دماغ کے کسی کونے کھدرے میں یہ خوف رکھتی ہے کہ اگر اس کام کی اجازت دین سے نکل آئی تو یہ ہو جائے گا، وہ ہو جائے، لوگ یہ رخصت نکال لیں گے، وہ کرنا شروع کر دیں گے، یہ بھی کر لیں گے، وہ بھی کر لیں گے وغیرہ وغیرہ۔ لہذا اس کی اجازت نہ ہونا ہی بہتر ہے اور ممانعت ہی کی دلیل تلاش کرو۔

اس ڈر کی نفسیات کو اگر ہم ایک دنیاوی مثال سے سمجھنا چاہیں تو وہ یہ ہے کہ اگر سڑک پر نکلیں گے تو ایکسیڈنٹ ہو جائے گا۔ اور یہ تو ہے کہ ایکسیڈنٹ تو سڑک پر ہی ہوتا ہے، گھر بیٹھے تو نہیں ہو گا۔ لیکن اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ کاروبارِ دنیا چھوڑ دیں،

[1] أحمد بن محمد بن حنبل بن هلال بن أسد الشيباني (المتوفى: 241هـ)، الزهد، دار الكتب العلمية، بيروت، لبنان، 1999م، 185/1

گھر سے باہر نکلنا ختم کر دیں یا کم کر دیں۔ ہم میں سے بعض لوگ کوئی حادثہ دیکھ کر گاڑی چلانا چھوڑ دیتے ہیں کیونکہ وہ انجانے خوف کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لیکن غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کسی شاہراہ پر چلنے والی گاڑیوں میں سے کتنی گاڑیوں کے حادثے ہوتے ہیں؟ ہزار میں سے ایک کا؟ یا کوئی بھی نسبت و تناسب ہو؟ پس یہ خوف اس قابل نہیں ہے کہ اس کا اعتبار کیا جائے۔

بعض خوف ایسے ہوتے ہیں کہ جن کا اعتبار کیا جانا چاہیے، اور یہ وہ ہوتے ہیں جو غالب گمان کے درجے میں ہوں۔ اور بعض خوف ایسے ہوتے ہیں جو وہم کے درجے میں ہوتے ہیں، جن کا اعتبار کرنا زندگی کو مصیبت بنا دیتا ہے۔ اگر مزاج اور رویہ ایسا ہو کہ رات کے کسی وقت میں کھٹکا سن کر ساری رات انسان چور کے انتظار میں گزار دے تو ایسا محتاط مزاج اور رویہ ہماری زندگی کو عذاب بنا دے گا۔ دنیا میں ایسے زندگی گزاریں کہ لگے کہ آپ زندگی گزار رہے ہیں، نہ کہ اس طرح کہ زندگی آپ کو گزار رہی ہے۔

دیندار طبقے پر عموماً یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ جیسے اس طبقے میں زندگی اور حیات نام کی کوئی شیء ہے ہی نہیں۔ زندگی میں کوئی تفریح (entertainment) نہیں ہے، ہلا گلا (enjoyment) نہیں ہے۔ بس ہر طرف ایک پژمردگی (sadness) سی چھائی ہوئی ہے۔ عام آدمی کو یہی شکوہ ہے کہ مذہبی طبقے کے پاس جو دین ہمیں بتلانے کے لیے رہ گیا ہے، وہ یہی ہے کہ یہ بھی نہ کرو، وہ بھی نہ کرو۔ مدرس کے درس، واعظ کے وعظ اور خطیب کے خطبہ میں یہ کبھی سننے کو نہیں ملتا کہ یہ بھی کر سکتے ہو، وہ بھی کرنا جائز ہے وغیرہ۔ دین کی جو تعبیر یا تصور پیش کیا جاتا ہے، اس میں رخصتوں اور سہولتوں کا تو نام نہیں لیکن بیڑیاں اور زنجیریں خوب بتلائی جاتی ہیں۔

ٹھیک ہے شادی بیاہ کے موقع پر فضول خرچی نہ ہو، ڈانس پارٹی نہ ہو، مخلوط معاشرت سے اجتناب کرنا چاہیے لیکن کیا ہمارا دین شادی کے لیے صرف اس قدر خوشی کی اجازت فراہم کرتا ہے کہ جس سے دولہا اور دولہن کے گھر میں ماتم ہونے کا شبہ نہ ہو؟ ہم نے اسکول کے بچوں کی حوصلہ افزائی کے لیے بجائی جانے والی تالیوں اور عید کے

موقع پر گلے ملنے تک کو بدعت قرار دے دیا ہے۔

پس دین میں اگر آپ ایک چیز کے جائز ہونے پر بحث کریں گے تو ممکن ہے کہ کچھ لوگ اسے غلط رخ پر لے جائیں۔ کسی گنجائش کو غلط رخ پر لے جانے والے اس غلطی کے خود ذمہ دار ہیں لیکن اس کا ہرگز مطلب یہ نہیں ہے کہ جس کی اجازت نکلتی ہو، اس پر بھی قدغن لگا دو۔ علماء کا ایک ایسا طبقہ بھی موجود ہے جو خود تو دین کی رخصتوں سے خوب فائدہ اٹھاتے ہیں لیکن عوام کو اس لیے نہیں بتلاتے ہیں کہ عوام میں چونکہ اتنی سوجھ بوجھ نہیں ہے لہذا وہ اس رخصت کو معلوم نہیں کیا سے کیا بنا دیں گے؟ دین میں رخصت اور سہولت کا پہلو لوگوں کو بتلانا کتنا ضروری ہے یہ اسے ہی سمجھ آ سکتا ہے کہ جس نے معاشرے میں نکل کر عام لوگوں میں دعوت کا کام کیا ہو۔

سنن ترمذی کی ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ کسی غزوہ سے واپسی پر ایک کالی کلوٹی لونڈی نے آپ ﷺ سے آ کر کہا کہ میں نے یہ نذر مانی تھی کہ اگر اللہ نے آپ کو فتح دی تو آپ کے سامنے کھڑے ہو کر گیت بھی گاؤں گی اور دف بھی بجاؤں گی۔ آپ نے کہا:

«إِنْ كُنْتِ نَذَرْتِ فَاضْرِبِي وَإِلاَّ فَلاَ»[1]

"اگر تم نے نذر مانی ہے تو ایسا کر لو۔ اور اگر نذر نہیں مانی تھی تو رہنے دو۔"

کیا آج کوئی شیخ الحدیث یا مفتی یا اسلامی تحریک کے لیڈر اپنے شاگردوں یا کارکنوں سے بھری مجلس میں لونڈی جیسی سماجی حیثیت اور ذہنی سطح رکھنے والی کسی عورت کو اپنے سر پر کھڑے ہو کر دف بجانے اور گیت گانے کی اجازت دے سکتے تھے؟ سچ ہے کہ ایک فقیہ اور نبی کے ظرف میں بہت فرق ہوتا ہے؟ ہمارے مذہبی طبقے کو عوام کے لیے گنجائش پیدا کرنے میں نبوی ظرف کی ضرورت ہے۔

ممکن ہے کہ کچھ لوگ یہ سوچیں یا کہیں کہ ابھی دف اور گیت سے شروع ہوئے ہیں تو میوزک کے جواز تک بھی پہنچیں گے۔ اس پر ہم وہی تبصرہ کریں گے کہ جو اس تحریر کا عنوان ہے کہ ہم دراصل ڈر کی نفسیات کا شکار ہیں۔ باقی میوزک اگرچہ جائز نہیں

[1] سنن الترمذي، أَبْوَابُ الْمَنَاقِبِ، بَابٌ فِي مَنَاقِبِ أَبِي حَفْصٍ عُمَرَ بْنِ الخَطَّابِ، 620/5

ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ ہمیں ڈر کی نفسیات سے نکل کر دین اسلام کی وسعتوں اہل اسلام کے لیے جو گنجائشیں موجود ہیں، وہ انہیں ضرور دینی چاہییں۔ اور یہ ان کا دینی حق ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں ہم ڈر کی نفسیات کی بنا پر لوگوں کا دینی حق انہیں نہ دے رہے ہوں اور اس وجہ سے لوگوں کی ایک بڑی تعداد دینی زندگی کو اختیار کرنے میں ہچکچاہٹ کا شکار ہو۔ واللہ اعلم۔

مثلاً کوئی صاحب سکول، کالج یا یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اکثر بچے نماز نہیں پڑھتے ہیں۔ جب بچوں سے نماز نہ پڑھنے کی وجہ پوچھی جائے تو ایک بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ ظہر کی بارہ رکعات ہیں، عشاء کی سترہ رکعات ہیں، اتنی رکعتیں پڑھنا مشکل لگتا ہے۔ نماز نہ پڑھنے والے بچوں کو جب یہ کہا گیا کہ تم پانچ وقت کی نمازوں میں صرف فرض رکعتیں ادا کر لیا کرو تو بہت سے بچوں نے نماز پڑھنا شروع کر دی۔ اور درست بات بھی یہی ہے کہ اللہ تعالی نے نمازوں میں فرائض کو فرض قرار دیا ہے، سنت مؤکدہ، سنت غیر مؤکدہ اور نوافل فرائض میں شامل نہیں ہیں۔ اگر سنتیں اور نوافل پڑھنا بھی لازم ہوتے تو انہیں بھی فرض قرار دیا جاتا۔

پس ایک شخص اگر صرف فرض رکعات ادا کر لیتا ہے تو اس کی نماز کا فرض ادا ہو جاتا ہے لیکن جو سنتیں اور نوافل پڑھتا ہے تو وہ افضل ہے۔ سنتیں اور نوافل پڑھنے کا نفع یہ ہے کہ قیامت والے اگر کسی کے فرائض میں کمی ہوئی تو وہ نوافل سے پوری کر دی جائے گی۔

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے:

«فَإِنْ انْتَقَصَ مِنْ فَرِيضَتِهِ شَيْءٌ، قَالَ الرَّبُّ عَزَّ وَجَلَّ: انْظُرُوا هَلْ لِعَبْدِي مِنْ تَطَوُّعٍ فَيُكَمَّلَ بِهَا مَا انْتَقَصَ مِنَ الفَرِيضَةِ، ثُمَّ يَكُونُ سَائِرُ عَمَلِهِ عَلَى ذَلِكَ»[1]

”پس اگر اس کی فرض نماز کم نکلی تو اللہ تعالی فرشتوں سے کہیں گے کہ اس کی سنتوں اور نوافل کو تلاش کرو اور ان کے ذریعے اس کے فرض مکمل کر دو۔ اسی طرح کی بات نماز کے علاوہ فرائض میں بھی ہو گی۔“

---

[1] سنن الترمذي، أَبْوَابُ الصَّلَاةِ، بَابُ مَا جَاءَ أَنَّ أَوَّلَ مَا يُحَاسَبُ بِهِ العَبْدُ يَوْمَ القِيَامَةِ الصَّلَاةُ 69/2

نماز کے علاوہ فرائض میں جیسا کہ زکوۃ ہے۔ اگر قیامت والے دن کسی کی زکوۃ کم نکلی تو اس کے نفلی صدقہ سے پوری کر دی جائے گی۔ اور اگر کسی کے فرض روزے کم نکلے تو نفل روزوں سے پورے کر دیے جائیں گے۔ لہذا اس پہلو سے نوافل کی اہمیت تسلیم شدہ ہے۔

اب یہاں پھر ڈر کی نفسیات کا شکار مذہبی طبقہ یہ کہنا شروع کر دیتا ہے کہ آپ لوگوں کو سنتوں سے روک رہے ہیں حالانکہ ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ جو سنتیں اور نوافل پڑھ رہے ہیں، انہیں پڑھتے رہنا چاہیے کہ بچوں کو بھی ہم یہ سمجھاتے ہیں کہ ایک امتحان میں پاس ہونا ہے اور ایک اچھا گریڈ لینا ہے تو دونوں میں فرق ہے۔ تو جس نے اچھا گریڈ لینا ہے تو وہ سنتوں اور نوافل کا بھی اہتمام کرے۔ اسی طرح جو نماز نہیں پڑھ رہے تو اب اگر وہ صرف فرض پڑھ لیں تو کیا آپ کے نزدیک صرف فرض پڑھ لینے والا اور بالکل ہی نماز نہ پڑھنے والا دونوں برابر ہیں؟ تو ایسا بالکل بھی نہیں ہے۔ پس ایسے لوگوں کو جو نماز پڑھنے کی طرف نہیں آتے تو انہیں یہ بتلانا چاہیے کہ صرف فرض پڑھ لیں تو آپ کا نماز کا فرض ادا ہو جائے گا۔ اور اس سے ہمارے معاشرے میں نمازیوں کی تعداد دوگنا ہو جائے گی۔

ایک دوست نے تبصرہ کیا کہ "میرے ناقص خیال کے مطابق جس چیز کو موضوع بحث بنایا گیا ہے اس کے لیے 'ڈر کی نفسیات' لفظ مناسب معلوم نہیں ہوا، کیونکہ بندہ مومن سے یہ مطلوب ہے کہ اس کا دل 'تقوی اللہ' سے معمور ہو۔ لوگ اس طرح کے کاموں سے ڈرتے ہیں تو اچھا ہی کرتے ہیں، اس میں کیا خرابی ہے، تقوی کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ مباح چیزوں کو بھی ادنی شبہ کی وجہ سے چھوڑ دیا جائے۔"

اس پر ہم نے یہ تبصرہ کیا کہ آپ کا نکتہ اچھا ہے اور ہمیں اس سے اتفاق ہے کہ صریح حرام سے بچنے کے علاوہ شبہات میں بھی نہیں پڑنا چاہیے۔ لیکن اختلاف صرف اتنا ہے کہ تقوی اپنی ذات کے لیے ہوتا ہے نہ کہ دوسروں کے لیے۔ میں اگر خود سے مباح چیزوں کو ادنی شبہ کی وجہ سے چھوڑ دوں تو یہ میرے تقوی میں شامل ہو گا لیکن میرا

تقوی یہ نہیں ہے کہ میں ادنی شبہ کی وجہ سے دوسروں کو مباح امور سے روکوں۔ ایک خدا کا ڈر وہ ہے جو ہمیں اپنے بارے میں محسوس ہو اور ایک وہ جو دوسروں کے بارے ہو تو دونوں میں فرق ہے۔ تقوی اور شیء ہے اور نہی عن المنکر اور باب ہے اور دونوں کے احکام مختلف ہیں۔ بحثیت قوم ہماری یہ نفسیات بن چکی ہے کہ ہم آئیڈیل تقوی اپنی ذات کی بجائے دوسرے میں دیکھنا چاہتے ہیں اور اسی سے بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ جب کسی صحابی کو کسی علاقے کا گورنر بنا کر بھیجتے تھے تو یہ ہدایت فرماتے:

«بَشِّرُوا وَلَا تُنَفِّرُوا، وَيَسِّرُوا وَلَا تُعَسِّرُوا»[1]

”لوگوں کو خوشخبری والی باتیں بتلانا اور ان میں دین سے وحشت پیدا نہ کرنا۔ اور دین میں آسانی پیدا کرنا اور دین کے معاملے میں تنگی نہ کرنا۔“

جذبات کا اظہار

جذبات، انسانی زندگی کا لازمی حصہ ہے اور ان کے بغیر تو انسان کے انسان ہونے کا تصور بھی ممکن نہیں ہے۔ انسان کوئی روبوٹ تھوڑے ہیں کہ جذبات کا اظہار نہ کریں۔ اور دنیا کا عالمی معاشی نظام کیپٹلزم اس وقت چاہتا یہی ہے کہ انسان کو روبوٹ بنا دے۔ سماجی اور انسانی علوم (Humanities and Social Sciences) میں جس قدر ریسرچ ہو رہی ہے، اس کا ایک بڑا حصہ اسی مقصد کے لیے وقف ہے کہ انسان کے اخلاق اور رویوں کو بھی مشینی بنا دیا جائے۔ مثلاً فلاں موقع پر آپ نے یوں جواب (response) دینا ہے اور اس موقع پر یوں رد عمل کا اظہار (react) کرنا ہے یہ سب کچھ انسان کو اس طرح سکھایا جاتا ہے جیسے کہ سرکس کے گھوڑے کو کرتب کرنا (perform) سکھایا جاتا ہے۔

جدید دور میں آئیڈیل یا سپر ہیرو انسان کیسا ہو گا؟ پہلے سے نصب شدہ ہدایات (installed instructions) کا پابند کہ جس کا کوئی رد عمل (response) فطری نہ ہو بلکہ پہلے سے طے شدہ (programmed) ہو جیسا کہ کمپیوٹر پروگرامنگ

[1] صحیح مسلم، كِتَابُ الْجِهَادِ، وَالسِّيَرِ بَابٌ فِي الْأَمْرِ بِالتَّيْسِيرِ وَتَرْكِ التَّنْفِيرِ، 1358/3

کے ذریعے لمبی چوڑی ہدایات جاری کر دی جاتی ہے،اسی طرح سے اب جدید انسان کے ساتھ بھی کمپیوٹر کی طرح ایک روبوٹ کا سا معاملہ اختیار کیا جا رہا ہے کیونکہ جس قدر انسان ربورٹ بنے گا اسی قدر اس کو چلانا یا دوسرے الفاظ میں کنٹرول کرنا ان کے لیے آسان ہوگا۔ انہیں بس مشینی سوسائٹی (robotic society) چاہیے۔ اور سماجی اور انسانی علوم (Humanities and Social Sciences) روبوٹ ہی تو تیار کر رہے ہیں؟ وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ ساری دنیا کے انسان بھیڑیں بن جائیں۔ دی میٹرکس (The Matrix) کا آئیدیا کس نے دیا؟ ان کی اپنی سوسائٹی کے لوگوں نے۔ انہیں بھیڑیں بھی نہیں بلکہ روبوٹ چاہییں کیونکہ بھیڑوں میں بھی جذبات ہوتے ہیں۔

ہمیں اس آئیڈیا سے اتفاق نہیں ہے جو کہ اسٹیون ہاکنگ (Stephen Hawking) نے پیش کیا ہے کہ ایک دور میں انسان کی تخلیق کردہ مشینیں اتنی طاقتور ہو جائیں گی کہ اس دنیا پر قبضہ کر لیں گی اور انسان کو غلام بنا لیں گی۔ آپ مصنوعی ذہانت (artificial intelligence) میں بھلے جتنی ترقی کر لیں اور دنیا کے ذہین ترین کمپیوٹر اور روبوٹ بنا لیں لیکن اللہ کی بنائی ہوئی ذہانت کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں یعنی انسان کا۔ البتہ یہ ممکن ہے بلکہ یہ انہوں نے کر کے دکھا دیا ہے کہ انسانوں کو مشین بنا دیں اور یہ ربورٹ کی طرح آپ کی بات مانیں۔

فلاں جذباتی انسان ہے؟ یہ جملہ ایک طعن بن چکا ہے اور ہر شخص یہ کہتا پھرتا ہے کہ جذباتی بات نہ کریں' جذباتی بات نہ کریں۔ اس جملے کا ایک پہلو درست ہے کہ جذبات ہی ہر وقت انسان پر غالب نہ رہیں۔ لیکن جذبات بالکل ہی ختم ہو جائیں اور ہر انسانی عمل اور رد عمل میں عقل شریف کا ہی عمل دخل رہ جائے تو پھر اس قسم کے کریکٹر کے لیے مشرقی روایت میں بے غیرت کی اصطلاح موجود ہے جو کہ خوش قسمتی سے دنیا کے ہر کلچر اور زبان میں بھی موجود ہے۔ کیا جذبات کے بغیر بھی انسان ہو سکتا ہے؟ غم و غصہ اور محبت و پیار وغیرہ یہ سب جذبات ہی تو ہیں۔ اور تو اور ایمان بھی ایک جذبہ ہی ہے۔

آپ مذہبی معاشرے پر ان کے جذباتی ہونے کی بنا پر طعن کرتے ہیں، آپ اپنی زبان کے سارے نامور شعراء اٹھا کر دیکھ لیں، اور کسی ایک کے بارے ہی بتلادیں کہ اس کا کلام جذباتی نہیں ہے۔ آپ اپنا قومی ادب اور لٹریچر دریا برد کر دیں کہ یہ جذبات کی دنیا ہے۔ آپ اپنی فلم انڈسٹری پر پابندی لگا دیں کہ سب جذباتی اور رومانوی باتیں ہیں۔ کیا کوئی ایسی فلم آپ آج تک بنا سکے ہیں کہ جس میں جذبات نہ ہوں۔ جسے دیکھ کر آنکھیں نم نہ ہوں یا چہروں پر مسکراہٹ رقص نہ کرے۔

اگر محض جذباتیت کوئی خوبی نہیں ہے تو عقل محض بھی کوئی خیر نہیں ہے۔ حسن ان دونوں کے توازن میں ہے۔ اللہ نے انسان کو جذبات اور عقل دونوں عطا کیے ہیں اور اسی لیے دیے ہیں کہ کہیں جذبات کا اظہار کرے اور کہیں عقل سے کام لے۔ بہترین انسان وہی ہے کہ جس میں عقل اور جذبات دونوں کا اظہار اپنے اپنے محل اور مقام پر نظر آئے۔ اور یہی اعتدال ہے۔

روایات میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بنو ہشام کی بیٹی کے لیے نکاح کا پیغام بھیجا۔ ابو جہل کا تعلق بنو ہشام خاندان سے تھا اور فتح مکہ کے موقع پر ابو جہل کے دو بھائی اور ایک بیٹے اور اس کے علاوہ اس خاندان کے کچھ لوگوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ تو بنو ہشام نے اپنی بیٹی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے نکاح میں دینے سے پہلے اس بارے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت طلب کی جبکہ اس سے پہلے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بتلا چکی تھیں کہ علی رضی اللہ عنہ دوسرا نکاح کرنا چاہتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر کھڑے ہو کر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

«إِنَّ بَنِي هِشَامِ بْنِ المُغِيرَةِ اسْتَأْذَنُوا فِي أَنْ يُنْكِحُوا ابْنَتَهُمْ عَلِيَّ بْنَ أَبِي طَالِبٍ، فَلاَ آذَنُ، ثُمَّ لاَ آذَنُ، ثُمَّ لاَ آذَنُ، إِلَّا أَنْ يُرِيدَ ابْنُ أَبِي طَالِبٍ أَنْ يُطَلِّقَ ابْنَتِي وَيَنْكِحَ ابْنَتَهُمْ، فَإِنَّمَا هِيَ بَضْعَةٌ مِنِّي، يُرِيبُنِي مَا أَرَابَهَا، وَيُؤْذِينِي مَا آذَاهَا»[1]

"ہشام بن مغیرہ کے بیٹوں نے مجھ سے اجازت چاہی ہے کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح

[1] صحيح بخاري، كِتَابُ النِّكَاحِ، بَابُ ذَبِّ الرَّجُلِ عَنِ ابْنَتِهِ فِي الغَيْرَةِ وَالإِنْصَافِ، 37/7

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے کرنا چاہتے ہیں۔ پس میں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ میں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ میں اس کی اجازت نہیں دوں گا۔ البتہ علی رضی اللہ عنہ چاہیں تو میری بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دے دیں اور اس کے بعد بنو ہشام کی بیٹی سے نکاح کر لیں۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا میرے جگر کا ٹکڑا ہے۔ جس چیز سے اس کو قلق پہنچتا ہے' اس سے مجھے قلق پہنچتا ہے۔ اور جس چیز سے اس کو تکلیف پہنچتی ہے' اس سے مجھے بھی تکلیف پہنچتی ہے۔"

چونکہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی والدہ اور ان کی بہنیں بھی فوت ہو چکی تھیں لہٰذا ان کی دلجوئی کرنے والا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ پس آپ ان کے ان حالات کے پیش نظر ان کے جذبات کا خصوصی دھیان رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی زندگی میں دوسری شادی نہیں کی اور ان کی وفات کے بعد پھر آٹھ شادیاں کی ہیں اور ان کی ازواج میں ام بنین بنت حزام' لیلیٰ بنت مسعود' اسماء بنت عمیس' ام حبیب بنت ربیعہ' امامہ بنت ابی العاص' خولہ بنت جعفر' ام سعید بنت عروۃ اور محیاۃ بنت امرئ القیس رحمھن اللہ شامل ہیں۔[1] حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا سے جو نسل آگے چلی ہے تو وہ سید کہلاتے ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی دیگر بیویوں سے جو نسل آگے چلی ہے تو وہ اعوان اور علوی کہلاتے ہیں۔

قرآنی اُحوال

احوال، حال کی جمع ہے اور حال وہ کیفیت ہے کہ جو انسان کے پورے وجود پر طاری ہو جیسا کہ جسم پر لرزہ طاری ہونا۔ مرکزی انجمن خدام القرآن کے بانی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کے نزدیک دور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم میں قرآن مجید ہی تزکیہ کی واحد اور اکیلی بنیاد تھا۔ ان کے نزدیک قرآن مجید سے تزکیے کا اعلی اور فوری طریقہ تہجد میں لمبے قیام میں قرآن مجید کو ترتیل کے ساتھ سمجھ کر پڑھنا ہے جیسا کہ سورۃ المزمل میں اس کا بیان ہے۔ قیام

---

[1] الطبري، محمد بن جرير بن يزيد الآملي، أبو جعفر، (المتوفى: 310ھ)، تاريخ الطبري = تاريخ الرسل والملوك، وصلة تاريخ الطبري، دار التراث، بيروت، الطبعة الثانية، 1387 ھ، 154/5

بالقرآن کی وہ بہت زیادہ ترغیب دیتے تھے۔ شروع کی قرآنی تربیت گاہوں کے جو احوال ان کی تحریروں میں ملتے ہیں، ان میں یہ بات بھی ہے کہ ستر کی دہائی میں ہونے والی قرآنی تربیت گاہ میں شریک ہونے والے رفقاء نے اجتماعی قیام اللیل میں آٹھ دنوں میں قرآن مجید مکمل کیا۔[1]

ڈاکٹر صاحب کے اکثر رفقاء قرآن مجید سے ایسی محبت رکھتے ہیں جیسا کہ کسی مجسم چیز سے محبت کی جاتی ہے۔ قرآن مجید کا ادب، احترام، اس کو سینے سے لگانا، اس کو چومنا، سفر وحضر میں اس کا پاکٹ سائز نسخہ اپنے ساتھ رکھنا، اس کی تلاوت سے سکینت حاصل کرنا وغیرہ۔ یہ سب باتیں ان کی جماعت کے رفقاء میں عام ہے اور ان کے خواص کی کیفیت تو یہ ہے کہ وہ قرآن مجید کے ساتھ زندہ رہنے والے لوگوں میں سے ہیں، ان کا جینا، مرنا، نماز اور قربانی، قرآن مجید بن چکا ہے۔

ان کے ایک شاگرد کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ لوگوں کو تو قرآن مجید سناتا ہوں، صاحب کلام کو بھی سنا دوں۔ تو انہوں نے اس غرض سے مسجد میں روزانہ ایک پارہ تہجد کی نماز میں پڑھنا شروع کیا۔ اور سترہویں دن کے بعد ان کی کیفیت یہ تھی کہ تہجد کے اشتیاق میں نیند اڑی جاتی تھی اور تہجد کے قیام میں کیفیت وہی ہوتی تھی جو سورۃ نور میں بیان ہوئی:

﴿مَثَلُ نُورِهِ كَمِشْكَاةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ الْمِصْبَاحُ فِي زُجَاجَةٍ الزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُوقَدُ مِن شَجَرَةٍ مُّبَارَكَةٍ زَيْتُونَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُّورٌ عَلَىٰ نُورٍ﴾ [النور: 35]

"اللہ کے نور کی مثال [مومن کے دل میں] ایسی ہی ہے جیسا کہ ایک طاقچے میں ایک چراغ ہو۔ اور وہ چراغ کسی قندیل میں ہو اور قندیل ایسے ہو جیسے کوئی بہت ہی روشن ستارہ۔ اور یہ چراغ زیتون کے ایک ایسے بابرکت درخت کے

---

[1] اسرار احمد، ڈاکٹر، دعوت رجوع الی القرآن کا منظر وپس منظر، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، 1990ء، ص 226

تیل سے روشن ہو کہ جو درخت نہ شرقی ہو نہ غربی۔ اور زیتون کا وہ تیل از خود بھڑکنے کو تیار ہو، چاہے اسے کسی آگ نے نہ بھی چھوا ہو۔ اور یہ نور پر نور ہے۔"

قرآن مجید ہی سے تزکیہ کا حصول صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت کے بعد ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کا خاصہ معلوم ہوتا ہے۔ واللہ اعلم۔ تصوف کے ابتدائی مصادر دیکھ لیے جائیں جیسا کہ الرسالة القشيرية، عوارف المعارف، التعرف، كشف المحجوب وغیرہ یا متاخرین مثلاً مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ دہلوی، حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، رشید احمد گنگوہی، حکیم الامت اشرف علی تھانوی، مولانا عبدالقادر رائے پوری رحمہم اللہ وغیرہ کی کتب اور سوانح کا مطالعہ کر لیا جائے یا معاصرین مثلاً ڈاکٹر عبد الحی، مولانا اللہ یار خان، خواجہ شمس الدین عظیمی، مولانا ذوالفقار نقشبندی وغیرہ کے ملفوظات کا مطالعہ کر لیں تو احساس ہو گا کہ کسی بھی زمانے یا سلسلے میں اصلاح نفس میں قرآن مجید سے احوال پیدا کرنے کو وہ مقام حاصل نہیں رہا ہے جو سماع، مثنوی یا مراقبہ وغیرہ جیسے ذرائع کو حاصل رہا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کو اس بات کا نہ صرف یقین کامل حاصل تھا بلکہ اصرار بھی تھا کہ اللہ عزوجل سے اس نوعیت کا قرب کہ جیسا انبیاء علیہم السلام اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو حاصل تھا، اس کے کلام کے علاوہ کسی ذریعے سے حاصل نہیں ہو سکتا اور یہی یقین انہوں نے اپنے شاگردوں میں بھی پیدا کر دکھایا۔ اس یقین میں ڈاکٹر اسرار رحمہ اللہ اور ان کے قریبی رفقاء واقعتاً منفرد ہیں۔

ان کے بعض رفقاء کا کہنا ہے کہ ہم قرآن ہی سے اپنا تزکیہ کریں گے اور اصلاح نفس میں اسی کو اپنا شیخ بنائیں گے۔ اسی سے جمیع احوال پیدا کریں گے۔ اگر نہ بھی ہوں تو ہم مجاہدہ کریں گے کہ ہم اسی کے مکلف ہیں۔ اور اگر قرآن مجید سے احوال نصیب نہ ہوں تو ہم اپنے پروردگار کے سامنے روئیں گے کہ ہمیں اس سے وہ احوال نصیب فرمائے جو انبیاء علیہم السلام اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو ملے تھے۔ اور ایسے ہی رونے والے پیدا کریں گے جو اس بات پر ہی

مصر ہوں گے کہ ان کے جمیع احوال قرآن مجید ہی سے پیدا ہوں یہاں تک کہ وہ اپنے پروردگار سے اسی حال میں جاملیں اور کسی اور ذریعہ کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہ دیکھیں۔

اور ڈاکٹر صاحب کے رفقاء میں بہت ہیں کہ جو قرآن مجید ہی کو اپنے تزکیہ کا واحد ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اور انہیں اگرچہ وہ احوال نصیب نہ بھی ہوں جو صوفیاء کو ہوتے ہیں، لیکن امید کی جاسکتی ہے کہ یہ قیامت والے دن اپنے مجاہدے اور اتباع سنت کے بدلے پروردگار سے زیادہ قریب ہوں گے۔ واللہ اعلم۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «إِنَّمَا أَجَلُكُمْ فِي أَجَلِ مَنْ خَلاَ مِنَ الأُمَمِ، كَمَا بَيْنَ صَلاَةِ العَصْرِ، وَمَغْرِبِ الشَّمْسِ، وَمَثَلُكُمْ وَمَثَلُ اليَهُودِ وَالنَّصَارَى، كَمَثَلِ رَجُلٍ اسْتَعْمَلَ عُمَّالًا، فَقَالَ: مَنْ يَعْمَلُ لِي إِلَى نِصْفِ النَّهَارِ عَلَى قِيرَاطٍ، فَعَمِلَتِ اليَهُودُ، فَقَالَ: مَنْ يَعْمَلُ لِي مِنْ نِصْفِ النَّهَارِ إِلَى العَصْرِ عَلَى قِيرَاطٍ، فَعَمِلَتِ النَّصَارَى، ثُمَّ أَنْتُمْ تَعْمَلُونَ مِنَ العَصْرِ إِلَى المَغْرِبِ بِقِيرَاطَيْنِ قِيرَاطَيْنِ، قَالُوا: نَحْنُ أَكْثَرُ عَمَلًا وَأَقَلُّ عَطَاءً، قَالَ: «هَلْ ظَلَمْتُكُمْ مِنْ حَقِّكُمْ؟» قَالُوا: لاَ، قَالَ: «فَذَاكَ فَضْلِي أُوتِيهِ مَنْ شِئْتُ»[1]

"اللہ کے نبی ﷺ سے مروی ہے کہ میری امت کی عمر پچھلی امتوں کے مقابلے میں اتنی ہی ہے جتنا کے عصر سے مغرب کے درمیان کا وقت ہے۔ اور میری امت اور یہود و نصاری کی مثال ایسی ہی ہے جیسا کہ ایک شخص نے کچھ لوگوں کو مزدوری پر رکھا۔ تو اس نے کہا کہ کون ہے کہ جو صبح سے زوال کے وقت تک ایک قیراط پر مزدوری کرے گا تو یہود نے کہا کہ ہم کریں گے۔ پس یہود نے صبح سے زوال تک ایک قیراط کے عوض مزدوری کی۔ پھر اس شخص نے کہا کہ کون ہے کہ جو زوال سے عصر کے وقت تک ایک قیراط پر مزدوری کرے تو نصاری نے ظہر سے عصر تک ایک قیراط پر مزدوری کی۔ پھر اس شخص نے کہا کہ کون ہے جو عصر سے مغرب تک دو قیراط پر مزدوری کرے۔ تو مسلمانوں نے عصر سے مغرب تک دو قیراط پر مزدوری کی۔ اس پر یہود

[1] صحيح البخاري، كِتَابُ فَضَائِلِ القُرْآنِ، بَابُ فَضْلِ القُرْآنِ عَلَى سَائِرِ الكَلاَمِ، 191/6

ونصاری نے کہا کہ ہم نے کام زیادہ کیا ہے لیکن ہماری مزدوری کم ہے۔ تو اس شخص نے کہا کہ کیا میں نے جو مزدوری تم سے طے کی تھی، اس میں کوئی کمی کی ہے تو انہوں نے کہا کہ نہیں۔ تو اس شخص نے کہا کہ پھر یہ اضافہ میری طرف سے ہدیہ ہے کہ جس کو چاہوں میں دوں۔"

اس روایت سے معلوم ہوا کہ آخرت میں جو مقام اور مرتبہ ملے گا اس کی بنیاد یہ نہیں ہو گی کہ کس نے کتنی محنت یا عبادت کی ہے بلکہ یہ کہ کس کی محنت کو اللہ نے کس قدر شرف بخشا ہے۔ اور عین ممکن ہے کہ دنیا میں جنہوں نے نیکی کا کام زیادہ کیا ہو، آخرت میں وہ لوگ ان سے آگے ہوں کہ جنہوں نے ان کے جتنا نیک عمل نہ کیا ہو لیکن اللہ عزوجل کو ان کا تھوڑا کام پسند بہت آیا ہو۔

اور احوال کا کیا ہے، وہ تو قوالی اور میوزک سے بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اور سماع اور رقص وسرود سے بھی انسان وجد میں آجاتا ہے۔ میر وغالب کی شاعری بھی احوال پیدا کر دیتی ہے اور المیہ وطربیہ سے بھی کیفیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ بعض ڈرامے ایسے ہوتے ہیں کہ جن کو دیکھتے ہوئے آہ وبکاء کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور دامن آنسوؤں سے تر ہو جاتا ہے حالانکہ انسان جانتا ہے کہ یہ ڈرامہ ہے، حقیقت نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اس پر گریہ کی کیفیات طاری ہوتی ہیں۔

احوال تو شیطان کی طرف سے بھی ہوتے ہیں اور خود نفس کی طرف سے بھی اور سچے بھی ہوتے ہیں اور جھوٹے بھی لیکن قرآن سے جو بھی حال پیدا ہو گا، وہ سچا ہو گا۔ اور بقیہ ذرائع سے جو احوال پیدا ہوتے ہیں، ان پر زیادہ سے زیادہ مباح احوال کا حکم لگ سکتا ہے، اور نیکی تو اس مباح حال کے نتیجے میں کیے جانے والے عمل پر ملے گی جبکہ قرآنی احوال میں قرآن کا حال بذاتہ خود ہی ایک نیکی ہے، چاہے اس کے نتیجے میں کوئی نیکی عمل میں نہ بھی آئے۔ یہ اس بارے ایک اہم نکتہ ہے۔

سماع، میوزک، مراقبہ، شاعری اور المیہ سے کیفیات حاصل ہونے کے نتیجے میں وجد میں آنا یا آنسوؤں کا جاری ہونا کوئی نیکی نہیں ہے لیکن قرآن مجید کی تلاوت کے نتیجے میں

آنسو جاری ہونا نیکی ہے۔ ڈاکٹر صاحب سے رمضان کے مہینے میں کئی مرتبہ قرآن مجید براہ راست سننے کا اتفاق ہوا اور میں ان کے قریب ہی بیٹھتا تھا۔ اور عام طور محسوس کیا کہ قرآن مجید کے بیان میں ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری ہوتی تھی۔ اسی طرح نماز میں کئی مرتبہ ان کے ساتھ یا پیچھے کھڑے ہونے کا اتفاق ہوا اور شاید ہی کبھی ایسا ہوا ہو کہ میں نے انہیں قرآن مجید کی تلاوت کے سماع کے نتیجے میں وجد میں آکر دائیں بائیں جھومتے نہ دیکھا ہو۔ وہ آگے پیچھے نہیں جھومتے تھے جیسا کہ ہمارے ہاں عام طور حفظ کے طلباء دوران حفظ آگے پیچھے حرکت کرتے ہیں اور اس کی ایک وجہ وہ یہود کی مخالفت بتلاتے تھے کہ یہودی تورات کی تلاوت کرتے ہوئے آگے پیچھے جھومتے ہیں۔ ان کی سب سے بڑی کرامت یہی تھی کہ وہ فرائض اور مستحبات کا اہتمام اور محرمات اور شبہات سے اجتناب کرنے والے تھے۔ اور اس میں خوب مجاہدے سے کام لینے والے تھے۔ قرآن اکیڈمی میں قیام کے دوران ان کے گھر سے مسجد کے درمیان میں میرا رہائشی کمرہ تھا، اگر کبھی صبح کی جماعت سے سوتا رہتا تو نماز باجماعت کے لیے جاتے ہوئے کھڑکی سے نظر ڈالتے اور ڈانٹ کر اٹھا دیتے۔

قرآن اکیڈمی میں قیام کے دوران جب بھی ڈاکٹر صاحب سے ان کے آفس وغیرہ میں ملاقات ہوئی تو اس میں ایک خاص کیفیت حاصل ہوئی یا صوفیاء کی اصطلاح میں ایک حال حاصل ہوا کہ جسے "سکینت" کا عنوان دیا جا سکتا ہے اور یہ بہت غالب اور نمایاں حال ہوتا تھا کہ جسے ان کا ہر رفیق محسوس کرتا تھا اور اس کی وجہ ان کا "صاحب قرآن" ہونا تھا۔ بلاشبہ جو بھی "صاحب قرآن" ہو گا، اس کی ذات سکینت کے نزول کا مرکز ہو گی اور اس کا ہر ساتھی اس کی صحبت میں اس سکینت اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والے قلبی سکون، اطمینان اور ایمان میں اضافے کو اسی طرح محسوس کر سکتا تھا جیسا کہ برف کی سِل کے پاس ٹھنڈک اور آگ کے الاؤ کے پاس حرارت کا احساس۔

ڈاکٹر صاحب کی صحبت سے جتنے بھی احوال پیدا ہوتے تھے، وہ قرآنی احوال تھے اور ایک لفظ میں ان جمیع احوال کا خلاصہ سکینت ہے۔ الحمد للہ! یہ احوال ایسے تھے کہ ان کے

اللہ ہی کی طرف سے ہونے کی دلیل قرآن مجید اور سنت رسول ﷺ دونوں میں موجود ہے۔ ایمان پر استقامت اختیار کرنے کی صورت میں فرشتوں کے نزول کا بیان قرآن مجید میں ﴿تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلَائِكَةُ﴾ اور قرآن مجید کی تلاوت کرنے کی صورت میں سیکنت کے نازل ہونے کا بیان سنت میں «نزلت علیهم السکینة» کے الفاظ میں موجود ہے۔

یہ کہا جا سکتا ہے کہ متصوفانہ مزاج رکھنے والے صلحاء کی صحبت سے جو کیفیات دل میں پیدا ہوتی ہیں، ان کی نوعیت میں گہرائی ہوتی ہے جبکہ قرآنی مزاج رکھنے والے اصحاب قرآن کی صحبت سے جو احوال دل میں پیدا ہوتے ہیں، وہ اپنی نوعیت میں گیرائی اور وسعت رکھتے ہیں۔ صلحاء اور زہاد کی صحبت سے قلب میں خشوع کی کیفیت عام طور پیدا ہوتی ہے جیسے ﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّـهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ﴾ کی کیفیت جبکہ اصحاب قرآن کی صحبت سے ﴿أَلَا بِذِكْرِ اللَّـهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ﴾ کی کیفیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلی آیت میں ذکر سے مراد ذکر الٰہی اور دوسری میں ذکر سے مراد قرآن مجید ہو جیسا کہ ﴿إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ﴾ میں ذکر سے مراد قرآن مجید ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے بعض رفقاء کا کہنا ہے کہ آج اگر کوئی ہم میں اس بات کا اہتمام کر لے کہ اپنے گھر میں کسی کمرہ میں کسی وقت مثلاً مغرب تا عشاء کے درمیانی وقت کو قرآن مجید کی تلاوت کے لیے مختص کر لیا جائے کہ سب گھر والے جمع ہو کر تلاوت کریں اور اس میں ناغہ نہ کریں اور اس کمرے میں کوئی لغو کام بھی نہ ہو مثلاً بچوں کا کارٹون وغیرہ دیکھنا تو ایک ہی ہفتے کے بعد جو احوال اس مخصوص جگہ میں مخصوص اوقات میں تلاوت کرنے سے حاصل ہوں گے، وہی ڈاکٹر اسرار احمد رحمہ اللہ کی مجلس میں حاصل ہوتے تھے اور یہی سکینت کے احوال ہیں۔

دین میں اعتدال

حسن اور خوبصورتی اعتدال ہی کا دوسرا نام ہے۔ اسلام ہمیں دین کے معاملے میں

افراط و تفریط (extreems) سے اجتناب اور اعتدال کو اختیار کرنے کا حکم دیتا ہے۔
اللہ تعالی کو اپنے بندوں سے زیادہ عمل نہیں بلکہ خوبصورت عمل مطلوب ہے۔ اور
خوبصورت عمل وہ ہے کہ جس میں اعتدال اور میانہ روی ہو۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا وَهُوَ الْعَزِيزُ الْغَفُورُ﴾ [الملك: 2]

"اللہ نے موت اور حیات کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ تمہاری اس بارے آزمائش کرے کہ تم میں سے کون ہے جو بہترین عمل کرنے والا ہے۔ اور اللہ تعالی غالب ہے، بخشنے والا ہے۔"

بعض اوقات مذہبی ذہن کی نفسیات یہ بن جاتی ہے کہ وہ نیکی کو گننا شروع کر دیتے ہیں اور کثرت اعمال کو نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے اتنی نفلیں پڑھ لی ہیں یا اتنی بار درود شریف پڑھ لیا ہے یا اتنا صدقہ کر دیا ہے وغیرہ جبکہ دین میں کیفیت (quality) مطلوب ہے نہ کہ گنتی (quantity)۔ اذکار میں زیادہ سے زیادہ گنتی کا جو ذکر ہے وہ سو کے عدد کا ہے۔ اور اس میں بھی اصل مقصود ایک خاص تعداد میں ذکر کے ذریعے یاد الہی کی کیفیت میں بہتری لانا ہے۔

اور مزاج میں اعتدال ہو گا تو نیک اعمال میں کیفیت کو گنتی پر ترجیح حاصل ہو گی۔ پس جس مزاج میں اعتدال نہیں ہو گا تو وہ گنتی کو کیفیت پر ترجیح دے گا اور معتدل مزاج کیفیت کو گنتی پر اہمیت دے گا۔ اور مزاج میں اعتدال اسی وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ انسان طرفین اور جانبین سے واقف ہو۔ اگر انسان کا مطالعہ صرف خیر کا ہو تو امکان ہے کہ وہ خیر کے معاملے میں غلو کا شکار ہو جائے اور اگر اسے خیر کے ساتھ شر کا بھی علم ہو گا تو خیر کے معاملے میں معتدل رویہ اختیار کرنے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔

دین میں سختی، غلو کی ایک قسم ہے اور غلو، اعتدال کے منافی ہے۔ جہاں غلو ہو گا، وہاں اعتدال نہیں ہو سکتا اور جہاں اعتدال ہو گا، وہاں غلو نہیں ہو سکتا۔ پس نیکی اور دین کے معاملے میں غلو اور انتہا پسندی سے بچنا چاہیے اور میانہ روی اختیار کرنی چاہیے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«إِنَّ الدِّينَ يُسْرٌ، وَلَنْ يُشَادَّ الدِّينَ أَحَدٌ إِلَّا غَلَبَهُ، فَسَدِّدُوا وَقَارِبُوا، وَأَبْشِرُوا، وَاسْتَعِينُوا بِالْغَدْوَةِ وَالرَّوْحَةِ وَشَيْءٍ مِنَ الدُّلْجَةِ»[1]

''دین آسان ہے۔اور جو بھی دین کے معاملے میں سختی کرے گا تو دین اس پر غالب آجائے گا۔پس تم میانہ روی اختیار کرو اور کمال کو نہ بھی پا سکو تو اس کے قریب پہنچنے کی کوشش کرو۔اور خوشخبری حاصل کرو۔اور صبح، شام اور رات کے ایک حصے میں عبادت پر اکتفا کر لیا کرو۔''

ہمدردی اور احترام

فیملی کے ساتھ ایک ریسٹورنٹ میں کھانا کھانے آیا تھا کہ پارکنگ میں گاڑی لگاتے ہوئے احساس ہوا کہ دائیں طرف ایک بائیک کھڑی ہے اور درمیان میں فاصلہ بہت کم ہے لہذا بہت احتیاط سے گاڑی پارک کرنی ہو گی۔اچانک نظر پڑی کہ پارکنگ میں کھڑی بائیک پر کوئی لگ بھگ تیس سال کی عمر کا ایک شخص بیٹھا ہوا ہے۔

وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا تھا اور پریشان دکھائی دیتا ہے۔اس کے بیٹھنے کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ بائیک اس کی اپنی نہیں ہے۔ایک طرف تو یہ دل کیا کہ ہارن دے کر اسے متنبہ کروں کہ بائیک تھوڑی اُدھر کر لے۔پھر یہ سوچا کہ میں خود ہی کچھ ہمت کر کے گاڑی جیسے تیسے کھڑی کر لوں، اس بیچارے کو تکلیف نہ ہی دوں تو اچھا ہے کہ معلوم نہیں کس پریشانی میں ہے۔

بہر حال گاڑی کھڑی کر کے ریسٹورنٹ میں داخل ہوئے۔کھانے کا آڈر دیا اور کھانا لگائے جانے سے پہلے اس شخص کو میں نے دوبارہ ریسٹورنٹ کے ایک کونے میں ایک میز پر کسی گہری سوچ میں نظریں جھکائے بیٹھے دیکھا۔اس کے ہاتھ اس کی گود میں تھے اور سر جھکا ہوا تھا۔کپڑے بس مناسب سے تھے جیسے کسی درمیانے درجے کے ریسٹورنٹ میں کام کرنے والے ملازمین کے ہوتے ہیں اور چہرے پر پریشانی بلکہ کرب کے آثار معلوم ہوتے تھے۔سب سے اہم بات یہ کہ وہ اپنی پوزیشن میں ساکت تھا

[1] صحيح البخاري، كِتَابُ الإِيمَانِ، بَابٌ: الدِّينُ يُسْرٌ، 16/1

جیسے کہ اس کے وجود میں کوئی حرکت نہ ہو۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اس کے حلیے نے مجھے مجبور کر دیا کہ میں اس کی طرف بار بار دیکھوں۔ اسی دوران میں نے غور کیا کہ ریسٹورنٹ میں کام کرنے والے ملازمین میں سے ایک دو نے ایک دو بار اسے مخاطب کر کے کچھ کہا بھی۔ جس سے یہ معلوم ہوا کہ شاید وہ یہاں ملازم ہو لیکن وہ گاہکوں کے سامنے کھانا نہیں لگا رہا تھا۔

کھانا کھانے کے دوران اس نے ایک آدھ بار نظریں اٹھا کر ہماری طرف یا شاید کھانے کی طرف دیکھا۔ اس سے احساس پیدا ہوا کہ شاید اسے بھوک لگ رہی ہے۔ چونکہ اس ریسٹورنٹ میں پردے کے کچھ بہتر انتظامات ہونے کی وجہ سے فیملی کے ساتھ اکثر آنا جانا رہتا تھا لہذا اس کے عملے سے میں بخوبی واقف تھا۔ اس لیے اگر اس شخص کا تعلق ریسٹورنٹ کے عملے سے بھی تھا تو یہ ایک نیا اضافہ تھا۔ اب دل میں یہ خیال آیا کہ اس کا تعلق ریسٹورنٹ کے عملے سے معلوم ہوتا ہے لہذا کھانا تو اسے یہاں سے مل ہی جاتا ہو گا، چاہے گاہکوں کا بچا کچھا ہو جبکہ اس کا مسئلہ کچھ اور ہے۔ وہ مسئلہ کیا ہو سکتا ہے؟ دھیان کھانے سے زیادہ اس کے بارے غور کرنے میں مصروف تھا۔

اچانک ذہن میں یہ بات آئی ہم میں ہر دوسرے شخص کا مسئلہ پیسہ ہے یا اگر پیسہ نہیں بھی ہے تو پیسہ ایک ایسی چیز ہے جو اس کا مسئلہ حل کر سکتی ہے۔ اس سوچ کے ذہن میں آتے ہی خوشی ہوئی کہ میں نے اس کے غم کا علاج معلوم کر لیا ہے۔ اب اس پر غور کرنے لگا کہ اسے پیسے کیسے دوں؟ ایک دفعہ ذہن میں آیا کہ کھانا کھا کر واپس جاتے چپکے سے اس کے ہاتھ میں کچھ رقم پکڑا دوں گا۔ پھر معاً یہ خیال ذہن میں آیا کہ اگر اس کا مسئلہ پیسہ نہ ہوا تو اس طرح اسے رقم دینے سے اس کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچے گی۔ اب تو نفس میں گویا ایک کشمکش سی شروع ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ اسے کچھ رقم دینے کے لیے آمادہ کرتا تھا اور اس کے احترام کا جذبہ اس میں رکاوٹ بن جاتا تھا کیونکہ وہ سوالی بہر حال نہیں تھا۔ بہر حال فیملی نے کھانا کھایا اور میں اسی کشمکش کے ساتھ ریسٹورنٹ سے گھر کی طرف روانہ ہوا اور کافی دیر یہی سوچتا رہا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے لیکن

کوئی جواب نہ بن پڑا۔

مہینے بعد پھر اسی ریسٹورنٹ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ پھر اسی شخص کو اسی کیفیت میں اسی میز پر اسی انداز میں بیٹھے دیکھا تو ہمدردی کا جذبہ ایک دفعہ پھر شدت سے بیدار ہو گیا۔ لیکن احترام کے جذبے نے کوشش کے باوجود ہمت نہیں پڑنے دی کہ میں اسے کچھ رقم دے سکتا۔ ریسٹورنٹ سے کھانے کھا کر باہر نکلے، گاڑی میں بیٹھے تو گاڑی اسٹارٹ کرنے سے پہلے میں نے اپنے بیٹے، جو کہ آٹھ سال کا ہے، کے ہاتھ میں کچھ رقم رکھی اور کہا کہ چپکے سے اندر جا کر اس شخص کے ہاتھ میں رکھ کر واپس آ جاؤ۔ میں ابھی اپنے بیٹے کو اس کام سے بھیج ہی رہا تھا کہ اہلیہ نے یہ بات سن لی جو گاڑی میں ابھی بیٹھ ہی رہی تھیں۔ وہ کہنے لگیں: کیا کرتے ہیں، اسی طرح کسی کو کیوں تکلیف (hurt) دیتے ہیں؟ معلوم نہیں کس پریشانی میں ہے؟ اس طرح پیسے دینا اسے اچھا بھی لگے یا نہیں؟ اہلیہ کی یہ بات سن کر میں ایک دفعہ پھر سوچوں میں گم ہو گیا۔ اس کی ہمدردی کا جذبہ جو غالب آ چکا تھا، وہ اس بات پر پھر مغلوب ہو گیا اور اس کے احترام کا جذبہ غالب آ گیا۔

مقصد یہ ہے کہ کسی مسلمان بھائی کی مدد کرتے ہوئے اس کے احترام اور وقار کو پیش نظر رکھنا چاہیے مثلاً اگر کسی عزیز رشتہ دار کو زکوۃ کی رقم دینی ہے تو اسے یہ بتلانا نہیں چاہیے کہ یہ زکوۃ کی رقم ہے کہ اس سے اس کے جذبات مجروح ہو سکتے ہیں۔ بس جب آپ نے اس کے حالات سے یہ اندازہ لگا لیا کہ وہ زکوۃ کا مستحق ہے تو آپ اسے یہ بتلائے بغیر کہ یہ زکوۃ کی رقم ہے، زکوۃ ادا کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی کی مدد کرنی ہو تو کوشش کرے کہ اس طرح غیر محسوس انداز میں ہو کہ اگلا اس کا احسان مند نہ رہے۔ ہمارے ایک استاذ صاحب نے کلاس میں اگر کسی غریب طالب علم کی مدد کرنی ہوتی تھی تو اس سے سبق سنتے تھے اور سبق سنانے پر تعریف کرتے ہوئے جیب سے پیسے نکالتے اور بطور انعام کے شاباش کے طور پر طالب علم کو پکڑا دیتے تھے۔

اسی طرح یہ بھی کہنا ہے کہ کسی کا احترام اس قدر غالب نہ آ جائے کہ آپ اس کے احترام کے نتیجے میں اس سے نیکی کرنے سے ہی رہ جائیں۔ یہ توازن نہیں ہے جیسا کہ اس

واقعے میں میرے ساتھ ہوا ہے۔احترام ضروری ہے لیکن اس سے زیادہ ضروری نیکی کرنا ہے۔آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے فلاں رشتہ دار ضرورت مند ہیں لیکن ساتھ میں یہ خیال بھی ہے کہ اگر براہ راست ان کے ہاتھ میں کچھ رقم پکڑادی تو محسوس کریں گے تو ایسی صورت میں غیر محسوس انداز میں رقم دینے کا کوئی طریقہ سوچیں اور اگر نہیں بن پڑتا تو رقم دے کر نیکی ضرور کریں اور بعد میں اس پر استغفار کرلیں کہ اگر ان کی کوئی دل آزاری ہوئی ہے تو اللہ معاف فرمائے۔اللہ عزوجل قرآن مجید میں اپنے نیک بندوں کی صفات بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

﴿وَالَّـذِينَ يُؤْتُونَ مَـا آتَوا وَّقُلُوبُهُمْ وَجِلَـةٌ أَنَّهُمْ إِلَىٰ رَبِّهِمْ رَاجِعُونَ﴾ [المؤمنون: 60]

"اور یہ وہ لوگ ہیں جو وہ اللہ کی راہ میں دے سکتے ہیں، دیتے ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے دل اس بات سے ڈرتے رہتے ہیں کہ انہیں اپنی رب کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔"

تو اللہ کے بندے تو وہی ہیں کہ جو صدقہ کرتے ہوئے بھی ڈرتے رہتے ہیں کہ نہ معلوم اللہ اس نیک عمل میں کسی کمی کوتاہی پر ہی نہ پکڑ لے۔ایک ہی شخص کے بارے بعض اوقات ہم ایک سے زائد قسم کی سوچ اور جذبات رکھتے ہیں یا ان میں مبتلا ہوتے ہیں جس کا اثر ان کے بارے ہماری ذات سے جنم لینے والے رویوں پر پڑتا ہے۔اور یہ جذبات ہی ہیں کہ جو ہمیں کچھ کام کرنے پر آمادہ کرتے ہیں اور یہی جذبات ہیں کہ جو کسی کام کے کرنے میں رکاوٹ بھی بن جاتے ہیں۔لہذا ان جذبات کی اصلاح اور ان میں اعتدال پیدا کرنا بہت ضروری ہے اور دل میں پیدا ہونے والے مختلف جذبات کو ہم نے اس کتاب کے دسویں باب میں موضوع بحث بنایا ہے۔

نیکی میں کمال

درجہ احسان نیکی کر لینے کا نام نہیں ہے بلکہ نیکی میں کمال پیدا کرنے کو احسان کہتے ہیں۔اللہ عزوجل کے مقرب ترین بندے وہی شمار ہوتے ہیں کہ جو اپنی نیکی میں کمال

پیدا کر لیں۔ نیکی کر لینا کوئی بڑی بات نہیں ہے اور نیکی میں کمال پیدا کرنا تو یہ بہت بڑی بات ہے۔ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «سَبْعَةٌ يُظِلُّهُمُ اللَّهُ فِي ظِلِّهِ، يَوْمَ لاَ ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ: الإِمَامُ العَادِلُ، وَشَابٌّ نَشَأَ فِي عِبَادَةِ رَبِّهِ، وَرَجُلٌ قَلْبُهُ مُعَلَّقٌ فِي المَسَاجِدِ، وَرَجُلاَنِ تَحَابَّا فِي اللَّهِ اجْتَمَعَا عَلَيْهِ وَتَفَرَّقَا عَلَيْهِ، وَرَجُلٌ طَلَبَتْهُ امْرَأَةٌ ذَاتُ مَنْصِبٍ وَجَمَالٍ، فَقَالَ: إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ، وَرَجُلٌ تَصَدَّقَ، أَخْفَى حَتَّى لاَ تَعْلَمَ شِمَالُهُ مَا تُنْفِقُ يَمِينُهُ، وَرَجُلٌ ذَكَرَ اللَّهَ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ»[1]

"حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سات شخص ایسے ہیں کہ جنہیں قیامت والے اللہ تعالی اپنے عرش کے سایے میں جگہ دے گا کہ اس دن اس سایے کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہو گا۔ان میں پہلا شخص وہ حکمران ہے جو کہ عدل وانصاف کرنے والا ہو۔اور دوسرا وہ نوجوان ہے کہ جس کی جوانی اپنے رب کی عبادت میں گزری ہو۔اور تیسرا وہ شخص ہے کہ جس کا دل مسجد میں اٹکا ہوا ہو۔اور چوتھا وہ دو شخص ہیں جو صرف اللہ کے لیے ایک دوسرے سے محبت رکھتے ہیں اور اللہ ہی کے لیے ملتے ہیں اور اللہ ہی کی خاطر جدا ہوتے ہیں۔اور پانچواں وہ شخص کہ جسے کسی حسب نسب والی حسین وجمیل عورت نے برائی کی دعوت دی ہو اور اس نے جواب میں یہ کہا ہو کہ میں اللہ سے ڈرتا ہوں۔اور چھٹا وہ شخص کہ جس نے اس طرح چھپا کر صدقہ کیا ہو کہ اگر دائیں ہاتھ سے کیا تو بائیں کو بھی علم نہ ہوا۔اور ساتواں وہ شخص کہ جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔"

اگر اس روایت میں غور کیا جائے تو یہ ساتوں وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے اپنی نیکی میں کمال پیدا کیا ہے۔عام آدمی تو عدل کرتا ہی ہے لیکن حکمران کا عادل ہونا تو یہ "اختیار میں کمال" کا درجہ ہے۔اسی طرح عبادت تو بہت سے لوگ کرتے ہیں لیکن جوانی کی عبادت میں "عبادت کا کمال" ہے۔اور مسجد میں جانے والے بھی بہت ہوتے ہیں لیکن

[1] صحيح بخاري، كِتَابُ الأَذَانِ، بَابُ مَنْ جَلَسَ فِي المَسْجِدِ يَنْتَظِرُ الصَّلاَةَ وَفَضْلِ المَسَاجِدِ، 133/1

مسجد میں اس قدر دل لگنا کہ ایک نماز کے بعد دوسری کے انتظار میں رہے تو یہ "بندگی میں کمال" ہے۔اور محبت تو بہت سے لوگ آپس میں کرتے ہیں لیکن اللہ کے لیے محبت کرنا کہ اللہ ہی کے لیے ملاقات کرے اور اللہ ہی کے لیے جدا ہو تو یہ "معاشرت میں کمال" ہے۔اور برائی کی دعوت تو کسی طوائف کی طرف سے بھی ہو سکتی ہے لیکن کسی خاندانی اور حسین و جمیل عورت کی طرف سے برائی کی دعوت کو رد کرنا تو یہ "تقوی میں کمال" ہے۔اور صدقہ تو بہت سے لوگ کرتے ہیں لیکن ایسے کرنا کہ بائیں ہاتھ کے علم میں بھی نہ ہو کہ دائیں ہاتھ نے کیا صدقہ کیا ہے تو یہ "صدقہ میں کمال" ہے۔اور اللہ کے سامنے رونے والے تو بہت ہیں لیکن تنہائی میں رونا در اصل "اخلاص میں کمال" ہے۔تو بہت سی نیکیاں کرنے سے بہتر ہے کہ ایک نیکی کریں اور اس میں کمال پیدا کریں تو یہی نیکی قیامت والے دن نہ صرف ہماری نجات بلکہ مقربین میں سے ہونے کا ذریعہ بن جائے گی۔

توبہ کا حال

توبہ یہ نہیں ہے کہ استغفار کی تسبیح کے ہزار دانے صبح گرا دیے اور ہزار شام کو بلکہ توبہ تو ایک ایسا حال ہے جو پہلے انسان کے دل پر طاری ہوتا ہے، پھر اس کی آنکھوں سے جھانکتا ہے اور پھر اس کے پورے وجود کو سمیٹ لیتا ہے۔توبہ یہ ہے کہ پہلے دل میں اپنی کوتاہی اور نافرمانی پر شرمندگی اور ندامت کا احساس پیدا ہو، پھر اسی احساس سے آنکھیں نم ہو جائیں، اور بالآخر انسان اپنے وجود کو اس احساس کے ساتھ اللہ کے سامنے سجدے میں ڈال دے کہ پروردگار! جب اسے آپ کے سامنے جھکا دیا تو اب جھکائے ہی رکھوں گا۔

ہمارے ہاں توبہ استغفار رسم بن چکی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم توبہ استغفار کرتے ہوئے اس کے معانی پر کماحقہ غور و فکر نہیں کرتے۔توبہ محض گناہوں کی معافی طلب کرنے کا نام نہیں بلکہ یہ تو اللہ سے اس کی رحمت کا مطالبہ بھی ہے۔استغفار کا لفظ مغفرت سے نکلا ہے اور مغفرت عربی زبان میں ڈھانپ لینے کو کہتے ہیں۔پس استغفار کرنے والا شخص اپنے پروردگار سے یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ اے میرے پروردگار! مجھے اپنی

رحمت سے ڈھانپ لیں کہ جس طرح ایک مرغی چیل کو دیکھ کر اپنے بچوں کو اپنے پروں میں چھپا لیتی ہے تو اے میرے پروردگار! مجھے بھی شیطان مردود اور نفس کی شرارتوں سے اپنی رحمت کی آغوش میں لے لیں۔

اللہ کے رسول ﷺ کے بارے روایات میں ملتا ہے کہ آپ ایک مجلس میں سو مرتبہ استغفار کر لیتے تھے۔ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنِ ابْنِ عُمَرَ، قَالَ: إِنْ كُنَّا لَنَعُدُّ لِرَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي الْمَجْلِسِ الْوَاحِدِ مِائَةَ مَرَّةٍ: «رَبِّ اغْفِرْ لِي، وَتُبْ عَلَيَّ، إِنَّكَ أَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ»[1]

"حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم اللہ کے رسول ﷺ کی مجلس میں بیٹھ کر باقاعدہ شمار کیا کرتے تھے کہ آپ ایک مجلس میں سو مرتبہ یہ کلمات پڑھ لیتے تھے کہ اے میرے رب! مجھے اپنی رحمت سے ڈھانپ لے، اور اپنی رحمت کے ساتھ مجھ پر رجوع فرما، اور بے شک آپ اپنے بندوں پر بہت زیادہ رجوع کرنے والے اور رحم کرنے والے ہیں۔"

توبہ کا معنی بھی لوٹنے اور رجوع کرنے کا ہے۔ بندے کی توبہ کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنے رب کی طرف لوٹ جائے کہ جیسے کوئی بچہ اپنے والدین سے لڑ جھگڑ کر یا روٹھ کر گھر چھوڑ گیا تھا لیکن بعد میں والدین کے احسانات یاد آنے پر واپس گھر لوٹ آیا۔ پس بندے نے غفلت، لاعلمی، یا خواہش کی وجہ سے اپنے مالک سے جو منہ موڑ لیا تھا تو واپس اسی کی طرف اپنا منہ کر لے۔ سچی توبہ ایک ایسا حال ہے جو سلوک کی منازل طے کرتے ہوئے کبھی نیچے گر جانے پر فوراً وہاں ہی پہنچا دیتا ہے کہ جہاں سے انسان گرا ہو۔ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«التَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ، كَمَنْ لَا ذَنْبَ لَهُ»[2]

"گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہی ہے کہ جیسے اس نے گناہ کیا ہی نہ ہو۔"

---

[1] سنن أبي داود، بَابُ تَفْرِيعِ أَبْوَابِ الْوِتْرِ، بَابٌ فِي الِاسْتِغْفَارِ، 85/2

[2] سنن ابن ماجة، كِتَابُ الزُّهْدِ، بَابُ ذِكْرِ التَّوْبَةِ، 1419/2

دنیا میں کوئی گاڑی ایسی نہیں ہے کہ جسے زیرو میٹر کنڈیشن میں واپس لایا جا سکے لیکن توبہ انسان کو واپس اسی حالت میں لے جاتی ہے کہ جبکہ وہ گناہوں سے بالکل پاک تھا، ایک معصوم بچہ تھا۔ اگر انسان کی پرانی گاڑی اپنی زیرو میٹر کنڈیشن میں واپس ہو جائے تو اس کے لیے کس قدر خوشی کا باعث ہو گی، اسی طرح توبہ بھی بندہ مومن کے لیے ایسی ہی دلی خوشی کا باعث بن جاتی ہے۔ احمد جاوید صاحب کا کہنا ہے کہ ہر انسان کے دل میں اللہ نے ایک پودا لگایا ہے۔ اگر ہم غور کریں تو توبہ کرنے سے یہ پودا کھل اٹھتا ہے اور انسان خوش ہو جاتا ہے۔ اور توبہ نہ کرنے سے یہ پودا مرجھا جاتا ہے اور انسان مایوسی اور بے چینی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اندر کی خوشی اور باطنی سکون نہ تو آپ کو دنیا کی آسائشوں سے مل سکتا ہے اور نہ ہی سائیکالوجسٹ دے سکتے ہیں۔ یہ خوشی نہ تو یوگا سے حاصل ہونے والی ہے، نہ ہی میڈی ٹیشن سے اور نہ ہی ترکِ دنیا سے۔ اور ان رستوں سے جو خوشیاں حاصل بھی ہوتی ہیں، وہ جھوٹی، بناوٹی اور عارضی خوشیاں ہیں۔ اصل خوشی تو اپنے رب کے سامنے اپنے گناہوں پر شرمندگی کے اظہار، اپنی آنکھوں کو نم کرنے اور اپنی پیشانی کو زمین پر رکھ دینے سے حاصل ہوتی ہے کیونکہ توبہ ایک ایسا عمل ہے کہ پروردگار کو بھی اس سے خوشی ہوتی ہے۔ اور جب رب اپنے بندے سے خوش ہوتا ہے تو وہ اسے خوشی عطا بھی کرتا ہے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لَلَّهُ أَشَدُّ فَرَحًا بِتَوْبَةِ عَبْدِهِ حِينَ يَتُوبُ إِلَيْهِ، مِنْ أَحَدِكُمْ كَانَ عَلَى رَاحِلَتِهِ بِأَرْضِ فَلَاةٍ، فَانْفَلَتَتْ مِنْهُ وَعَلَيْهَا طَعَامُهُ وَشَرَابُهُ، فَأَيِسَ مِنْهَا، فَأَتَى شَجَرَةً، فَاضْطَجَعَ فِي ظِلِّهَا، قَدْ أَيِسَ مِنْ رَاحِلَتِهِ، فَبَيْنَا هُوَ كَذَلِكَ إِذَا هُوَ بِهَا، قَائِمَةً عِنْدَهُ، فَأَخَذَ بِخِطَامِهَا، ثُمَّ قَالَ مِنْ شِدَّةِ الْفَرَحِ: اللهُمَّ أَنْتَ عَبْدِي وَأَنَا رَبُّكَ، أَخْطَأَ مِنْ شِدَّةِ الْفَرَحِ»[1]

”جب بندہ اللہ کی جناب میں توبہ کرتا ہے تو اللہ کو اس سے بھی زیادہ خوشی ہوتی ہے کہ جتنی ایک ایسے شخص کو جو اپنی سواری پر کسی صحراء میں سفر کر رہا تھا کہ

---

[1] صحیح مسلم، کتاب التَّوْبَةِ، بَابٌ فِي الْحَضِّ عَلَى التَّوْبَةِ وَالْفَرَحِ بِهَا، 2104/4

وہ [کہیں سستانے کے لیے رکا اور وہ] سواری اس سے گم ہو گئی جبکہ اس کا کھانا پینا اسی سواری پر تھا۔ پس جب وہ اس کی تلاش سے مایوس ہو گیا تو ایک درخت کے سائے میں لیٹ گیا۔ پس اسی مایوسی کی حالت میں تھا کہ اچانک اس کی سواری اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ اس نے اس کی لگام پکڑی اور اس قدر خوش ہوا کہ کہنے لگا: اے اللہ! تو میرا بندہ اور میں تیرا رب۔ پس خوشی کی شدت کی اس قدر تھی کہ اس نے غلط جملہ بول دیا۔"

سواری کے اچانک مل جانے پر اس کی خوشی کی شدت اس قدر تھی کہ اسے یہ معلوم ہی نہ ہوا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ پس توبہ اگر دل میں خوشی کی کیفیت پیدا نہ کرے تو اس توبہ سے بھی توبہ کرنے کی ضرورت ہے کہ سچی توبہ ہمیشہ دل میں خوشی پیدا کرتی ہے۔

بعض اوقات انسان کسی گناہ کا عادی ہو جاتا ہے اور وہ عادتِ بد اس سے چھوٹتی نہیں ہے۔ پس ایک دفعہ اس پر توبہ کرتا ہے اور گناہ نہ کرنے کا عزم کرتا ہے۔ پھر اپنا عزم توڑتا ہے اور اسی گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پھر توبہ کر لیتا ہے اور دوبارہ گناہ نہ کرنے کا عزم کر لیتا ہے۔ پھر اپنا عزم توڑتا ہے اور اسی گناہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اور اس طرح ایک وقت ایسا آتا ہے کہ شیطان انسان کو وسوسہ ڈالتا ہے کہ یہ گناہ تو تجھ سے چھوٹنے والا نہیں لہذا ایسی توبہ کا کیا فائدہ کہ کل پھر گناہ کرنا ہو۔ اس طرح انسان سے گناہ تو چھوٹتا نہیں لیکن شیطان توبہ بھی چھڑوا دیتا ہے۔ بھلے گناہ نہ چھوٹے لیکن کسی صورت توبہ کرنا نہیں چھوڑنا چاہیے۔ یہ عقلمندی نہیں ہے کہ گناہ نہ چھوٹ رہا ہو تو میں نیکی کرنا بھی چھوڑ دوں اور توبہ کرنے سے بڑھ کر نیکی کا عمل کیا ہو گا۔

اللہ کے رسول ﷺ نے یہ بتلایا ہے کہ گناہ کرنے کے بعد کوئی نیکی کر لیا کرو تو وہ گناہ کے اثرات کو کم کر دے گی۔ اور توبہ بھی ایک نیکی ہے، صدقہ بھی نیکی ہے، دو نفل پڑھنا بھی نیکی ہے، قرآن مجید کی تلاوت کرنا بھی نیکی ہے، عمرہ کرنا بھی نیکی ہے، ان میں سے کچھ بھی کر لینا چاہیے۔ روایت کے الفاظ ہیں:

«وَأَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الحَسَنَةَ تَمْحُهَا»[1]

”اور گناہ کے پیچھے نیکی کو لگا دو تو وہ اس گناہ کو مٹا دے گی۔“

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ گناہ کو ہلکا سمجھ لے کہ گناہ کر لیا، اب بعد میں نیکی کر لوں گا بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض لوگ گناہ کر کے اتنے پریشان ہو جاتے ہیں کہ اللہ کی رحمت سے بھی مایوس ہو جاتے ہیں تو انھیں کہا گیا کہ یہ ایک دوسری انتہا ہے لہذا اس سے بھی بچو۔ تمہارے گناہ کتنے ہی بڑے اور زیادہ کیوں نہ ہوں لیکن اللہ کی رحمت سے بڑے اور زیادہ نہیں ہو سکتے۔ اور رہی متوازن بات تو وہ یہی ہے کہ مومن کبھی بھی اپنے گناہ کو ہلکا نہیں سمجھتا اور کبھی بھی اللہ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوتا۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«إِنَّ المُؤْمِنَ يَرَى ذُنُوبَهُ كَأَنَّهُ قَاعِدٌ تَحْتَ جَبَلٍ يَخَافُ أَنْ يَقَعَ عَلَيْهِ، وَإِنَّ الفَاجِرَ يَرَى ذُنُوبَهُ كَذُبَابٍ مَرَّ عَلَى أَنْفِهِ»[2]

”مومن اپنے گناہوں کو یوں دیکھتا ہے کہ جیسے وہ پہاڑ کے نیچے ہے کہ جو اس پر گرنے والا ہے۔ اور فاسق وفاجر اپنے گناہوں کو یوں دیکھتا ہے جیسے کوئی مکھی تھی جو اس کی ناک پر سے گزر گئی۔“

اب ناک پر سے مکھی گزرنے پر بھی الجھن تو ہوتی ہے اور فاسق وفاجر کو گناہ کر کے بس اتنی ہی پریشانی ہوتی ہے اور مومن کی پریشانی گناہ کے بعد بہت زیادہ ہوتی ہے لیکن جتنی پریشانی ہوتی ہے، توبہ سے اتنی ہی خوشی بھی حاصل ہوتی ہے۔ پس توبہ ہر حال میں کرنی چاہیے کہ انسان گناہ گار ہے۔ اور گناہ صرف یہ نہیں ہے کہ زنا کر لیا، قتل کر دیا، شراب پی لی، شرک کر لیا بلکہ جھوٹ بولنا بھی گناہ ہے، غیبت کرنا بھی گناہ ہے، حسد کرنا بھی گناہ ہے، گالی دینا بھی گناہ ہے، غیر محرم عورت کو شہوت کی نگاہ سے دیکھنا بھی گناہ ہے، اللہ کی نعمتوں پر اس کا شکر ادا نہ کرنا بھی گناہ ہے، کسی کو حقیر سمجھنا بھی گناہ ہے، لوگوں کا رستہ روک لینا بھی گناہ ہے وغیرہ۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

[1] سنن الترمذي، أَبْوَابُ البِرِّ وَالصِّلَةِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي مُعَاشَرَةِ النَّاسِ، 355/4

[2] صحيح البخاري، كِتَابُ الدَّعَوَاتِ، بَابُ التَّوْبَةِ، 67/8

«كُلُّ بَنِي آدَمَ خَطَّاءٌ، وَخَيْرُ الْخَطَّائِينَ التَّوَّابُونَ»[1]

”تمام کے تمام انسان بہت زیادہ گناہ کرنے والے ہیں لیکن بہترین گناہ کرنے والے وہ ہیں جو بہت زیادہ توبہ کرنے والے بھی ہیں۔“

اللہ عزوجل نے اپنی کتاب قرآن مجید میں متقی ان لوگوں کو نہیں کہا کہ جن سے گناہ نہ ہوتے ہیں کیونکہ جن سے گناہ نہ ہوں تو وہ تو انبیاء اور رسولوں کی جماعت ہے۔ پس قرآن کی نظر میں وہ لوگ متقی ہیں کہ جن سے گناہ ہوں تو انھیں فوراً شرمندگی کا احساس ہو اور توبہ کرلیں۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَسَارِعُوا إِلَىٰ مَغْفِرَةٍ مِّن رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ ﴿133﴾ الَّذِينَ يُنفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿134﴾ وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَن يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَىٰ مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿135﴾ أُولَـٰئِكَ جَزَاؤُهُم مَّغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَجَنَّاتٌ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ﴾ [آل عمران: 136]

”اور تم توبہ استغفار کی طرف دوڑ لگاؤ اور اس جنت کی طرف بھی دوڑ لگاؤ کہ جس کی چوڑائی زمین اور آسمانوں کے برابر ہے۔ اور یہ جنت متقی لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ اور متقی وہ ہیں جو تنگی میں بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور خوشحالی میں بھی، اور وہ غصے کو پی جانے والے ہیں، اور وہ لوگوں سے در گزر کرنے والے ہیں، اور اللہ عزوجل ایسے محسنین سے محبت رکھتے ہیں، اور متقی وہ ہیں کہ جب وہ کوئی بے حیائی کا کام یا اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھیں تو فوراً اللہ کو یاد کریں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگیں، اور اللہ کے سوا کون ہے کہ جو گناہوں کو معاف کرنے والا ہے۔ اور متقی وہ ہیں کہ جو اپنے گناہوں پر اڑ نہیں جاتے جبکہ وہ علم بھی رکھتے ہیں۔ اور یہی وہ لوگ ہیں کہ ان کا بدلہ یہ ہے کہ اللہ

[1] سنن ابن ماجة، كِتَابُ الزُّهْدِ، بَابُ ذِكْرِ التَّوْبَةِ، 1420/2

عزوجل ان کو معاف فرمائے گا اور انھیں ایسے باغات عطا فرمائے گا کہ جن کے بیچ میں نہریں جاری ہوں گی، اور کیا ہی خوب اجر ہے عمل کرنے والوں کا۔"

پس تقوی کی علامت یہ ہے کہ گناہ ہوا نہیں اور ندامت اور شرمندگی شروع ہو گئی۔ پس توبہ کی نیکی چھوڑ دینے کے معاملے میں شیطان کے وسوسہ میں ہرگز نہ آئے۔

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ عَبْدًا أَصَابَ ذَنْبًا - وَرُبَّمَا قَالَ أَذْنَبَ ذَنْبًا - فَقَالَ: رَبِّ أَذْنَبْتُ - وَرُبَّمَا قَالَ: أَصَبْتُ - فَاغْفِرْ لِي، فَقَالَ رَبُّهُ: أَعَلِمَ عَبْدِي أَنَّ لَهُ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَيَأْخُذُ بِهِ؟ غَفَرْتُ لِعَبْدِي، ثُمَّ مَكَثَ مَا شَاءَ اللَّهُ ثُمَّ أَصَابَ ذَنْبًا، أَوْ أَذْنَبَ ذَنْبًا، فَقَالَ: رَبِّ أَذْنَبْتُ - أَوْ أَصَبْتُ - آخَرَ، فَاغْفِرْهُ؟ فَقَالَ: أَعَلِمَ عَبْدِي أَنَّ لَهُ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَيَأْخُذُ بِهِ؟ غَفَرْتُ لِعَبْدِي، ثُمَّ مَكَثَ مَا شَاءَ اللَّهُ، ثُمَّ أَذْنَبَ ذَنْبًا، وَرُبَّمَا قَالَ: أَصَابَ ذَنْبًا، قَالَ: قَالَ: رَبِّ أَصَبْتُ - أَوْ قَالَ أَذْنَبْتُ - آخَرَ، فَاغْفِرْهُ لِي، فَقَالَ: أَعَلِمَ عَبْدِي أَنَّ لَهُ رَبًّا يَغْفِرُ الذَّنْبَ وَيَأْخُذُ بِهِ؟ غَفَرْتُ لِعَبْدِي ثَلَاثًا، فَلْيَعْمَلْ مَا شَاءَ»[1]

"ایک بندے نے ایک گناہ کیا اور کہا: اے میرے رب! میں نے گناہ کیا ہے، آپ مجھے معاف فرمادیں۔ تو اللہ عزوجل نے کہا: میرے بندے کو معلوم ہے کہ اس کا ایک رب بھی ہے جو گناہ معاف بھی کرتا ہے اور گناہوں پر پکڑتا بھی ہے۔ پس میں نے اپنے بندے کو معاف کر دیا۔ پھر جتنی دیر اللہ نے چاہا، وہ شخص گناہ سے رکا رہا اور پھر ایک گناہ کر لیا۔ اور اس شخص نے پھر کہا: اے میرے رب! میں نے ایک اور گناہ کر لیا، آپ یہ بھی معاف فرمادیں۔ تو اللہ عزوجل نے کہا: میرے بندے کو معلوم ہے کہ اس کا ایک رب بھی ہے جو گناہ معاف بھی کرتا ہے اور گناہوں پر پکڑتا بھی ہے۔ میں نے اپنے بندے کو معاف کر دیا۔ پھر جتنی دیر اللہ نے چاہا، وہ شخص گناہ سے رکا رہا اور پھر ایک اور گناہ کر لیا۔ اور اس شخص نے پھر کہا: اے میرے رب! میں نے ایک اور گناہ کر لیا،

[1] صحیح بخاري، كِتَابُ التَّوْحِيدِ، بَابُ قَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى: يُرِيدُونَ أَنْ يُبَدِّلُوا كَلَامَ اللَّهِ، 145/9

آپ یہ بھی معاف فرمادیں۔ تو اللہ عزوجل نے کہا: میرے بندے کو معلوم ہے کہ اس کا ایک رب بھی ہے جو گناہ معاف بھی کرتا ہے اور گناہوں پر پکڑتا بھی ہے۔ پس میں نے اپنے بندے کو تیسری بار بھی معاف کر دیا اور اب وہ جو چاہے عمل کرلے۔"

اس سے مراد یہ ہے کہ جب تک میرا بندہ گناہوں سے توبہ کرتا رہے گا تو اس وقت تک وہ جو چاہے کرلے، اس کا نقصان نہیں ہو گا۔ یہ توبہ کی برکت ہے، اس کی عظمت ہے، اس کا مقام ہے۔ سچی توبہ کے ساتھ گناہ کا ضرر ختم ہو جاتا ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ سچی توبہ انسان کو اللہ کے مزید قریب کر دیتی ہے اور اللہ کے ہاں اس کا درجہ پہلے سے بڑھ جاتا ہے۔

سچ کا حال

سچ بندہ مومن کی پہچان ہے کہ ایمان اور جھوٹ کا جمع ہونا محال ہے۔ بندہ مومن ہمیشہ سچ کے حال میں ہوتا ہے، وہ سچ کے احوال میں زندگی گزارتا ہے۔ سچا انسان وہ ہے کہ جس کے دشمن بھی اس کے بارے گواہی دیں کہ یہ جھوٹ نہیں بولتا۔ اور یہی وہ شخص ہے کہ سچ اس کا حال اور پہچان بن جاتا ہے، اور یہی وہ شخص ہے کہ جو اللہ کے ہاں صدیق کے مرتبہ کو پہنچ جاتا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ عَبْدِ اللهِ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «عَلَيْكُمْ بِالصِّدْقِ، فَإِنَّ الصِّدْقَ يَهْدِي إِلَى الْبِرِّ، وَإِنَّ الْبِرَّ يَهْدِي إِلَى الْجَنَّةِ، وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَصْدُقُ وَيَتَحَرَّى الصِّدْقَ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللهِ صِدِّيقًا، وَإِيَّاكُمْ وَالْكَذِبَ، فَإِنَّ الْكَذِبَ يَهْدِي إِلَى الْفُجُورِ، وَإِنَّ الْفُجُورَ يَهْدِي إِلَى النَّارِ، وَمَا يَزَالُ الرَّجُلُ يَكْذِبُ وَيَتَحَرَّى الْكَذِبَ حَتَّى يُكْتَبَ عِنْدَ اللهِ كَذَّابًا»[1]

"حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سچ کو لازم پکڑو کیونکہ سچ نیکی کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور نیکی جنت کی

---

[1] صحيح مسلم، كتاب الْبِرِّ وَالصِّلَةِ وَالْآدَابِ، بَابُ قُبْحِ الْكَذِبِ وَحُسْنِ الصِّدْقِ وَفَضْلِهِ، 2013/4

طرف لے کر جاتی ہے۔ اور ایک شخص سچ بولتا رہتا ہے اور سچ کی کوشش میں رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے ہاں اسے صدیق لکھ دیا جاتا ہے۔ اور جھوٹ سے بچو کہ جھوٹ فسق و فجور کی طرف لے کر جاتا ہے اور فسق و فجور جہنم کی طرف لے جاتا ہے۔ اور ایک شخص جھوٹ بولتا رہتا ہے اور جھوٹ کی کوشش میں رہتا ہے یہاں تک کہ اللہ کے ہاں کذاب لکھ دیا جاتا ہے۔"

انسان کو اپنے رب کے ساتھ بھی سچا ہونا چاہیے، مخلوق کے ساتھ بھی سچا ہو اور اپنے آپ سے بھی سچ بولے۔ رب کے ساتھ سچا ہونے سے مراد یہ ہے کہ اللہ سے جو وعدے کیے ہیں، وہ پورے کرے۔ مخلوق کے ساتھ سچا ہونے سے مراد یہ ہے کہ کسی بھی حال میں ان سے جھوٹ نہ بولے۔ اور اپنے آپ سے سچا ہونے سے مراد یہ ہے کہ اپنے آپ کو اپنے بارے جانتے بوجھتے کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ کرے۔ اسی طرح انسان اپنی سوچ میں سچا ہو، اپنے قول میں سچا ہو اور اپنے عمل میں سچا ہو تو یہ ایسا شخص ہے کہ سچ اس کا حال بن چکا ہے۔ سوچ میں سچائی یہ ہے کہ جھوٹ کے بارے سوچنا بھی اسے ناگوار گزرے۔ اور قول میں سچائی یہ ہے کہ جب بات کرے تو اس کا مخالف اور دشمن بھی اس کی بات کو سچ سمجھے۔ اور عمل کی سچائی یہ ہے کہ جب کوئی اسے دیکھے تو اس کے بارے سچا انسان ہونے کا تصور ذہن میں آئے۔

جھوٹ صرف یہی نہیں ہے کہ آپ واقعہ کے خلاف بیان کریں بلکہ جھوٹ یہ بھی ہے کہ آپ حق کو چھپا لیں اور کافر کا جھوٹ یہی ہے کہ اس نے حق کو چھپا لیا کہ اس دنیا کی سب سے بڑی حقیقت خدا کا موجود ہونا اور وحدہ لا شریک ہونا ہے۔ اور جھوٹ صرف بدی کے احوال میں نہیں ہوتا بلکہ جھوٹ نیکی کے احوال میں بھی ہوتا ہے۔ اگر ایک شخص کے دل میں اتنی عاجزی نہیں ہے کہ جتنی عاجزی کا اظہار وہ اپنے قول اور فعل سے کر رہا ہے، تو یہ بھی جھوٹ بول رہا ہے۔ ایک شخص اتنا نیک نہیں ہے کہ جتنا اس کے لباس سے اس کے نیک ہونے کا تاثر مل رہا ہے، تو یہ شخص بھی جھوٹ بول رہا ہے۔ اگر آپ کو بھوک لگ رہی ہے اور کوئی شخص آپ سے کھانے پینے کے بارے تکلفاً پوچھتا ہے

تو اسے یہ کہنا کہ مجھے بھوک نہیں ہے، یہ بھی جھوٹ ہی ہے۔ آپ ہنسی مزاح میں ہی کوئی خلاف حق بات بیان کرتے ہیں، تو یہ بھی جھوٹ ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

«أَنَا زَعِيمٌ بِبَيْتٍ فِي رَبَضِ الْجَنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ الْمِرَاءَ وَإِنْ كَانَ مُحِقًّا، وَبِبَيْتٍ فِي وَسَطِ الْجَنَّةِ لِمَنْ تَرَكَ الْكَذِبَ وَإِنْ كَانَ مَازِحًا وَبِبَيْتٍ فِي أَعْلَى الْجَنَّةِ لِمَنْ حَسَّنَ خُلُقَهُ»[1]

''میں اس شخص کو جنت کے کنارے گھر کی ضمانت دیتا ہوں کہ جو جھگڑا چھوڑ دے، چاہے اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہو۔ اور اس شخص کو جنت کے وسط میں گھر کی بشارت دیتا ہوں کہ جو جھوٹ چھوڑ دے، چاہے مزاح میں ہی کیوں نہ ہو۔ اور اس شخص کو جنت کے اعلی درجات میں گھر کی ضمانت دیتا ہوں کہ جو اپنے اخلاق کو بہترین بنا لے۔''

اس روایت میں اللہ کے رسول ﷺ اس شخص کو قیامت کے دن اللہ عز وجل سے جنت کے وسط میں گھر لے کر دینے کی ضمانت دے رہے ہیں کہ جو ہنسی مزاح میں بھی جھوٹ نہ بولے اور یہ بہت بڑی ضمانت ہے کہ نبی کریم ﷺ کی ضمانت ہے۔ اور آپ ﷺ اس شخص کو جنت کے کنارے اللہ عز وجل سے گھر لے کر دینے کی بشارت دے رہے ہیں کہ جو جھگڑا چھوڑ دے، چاہے اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہو کہ جھگڑے کے طول پکڑنے کی اکثر وجہ یہی ہوتی ہے کہ فریقین میں سے ہر کوئی اپنے آپ کو حق پر سمجھ رہا ہوتا ہے۔ پس اپنے آپ کو حق پر سمجھنے کے باوجود اگر جھگڑا چھوڑ دے اور صلح کر لے تو اس حدیث کو اپنے لیے اللہ کے رسول ﷺ کی طرف سے جنت کی رسید سمجھے کہ قیامت والے دن نبی کریم ﷺ کو اس حدیث کا حوالہ دے کر انھیں اپنی جنت کے حصول کے لیے اللہ کے حضور ضامن بنا لے۔

---

[1] سنن أبي داود، كِتَاب الْأَدَبِ، بَابٌ فِي حُسْنِ الْخُلُقِ، 253/4

عبادالرحمن کے احوال

قرآن مجید میں سورۃ الفرقان کے آخری رکوع میں اللہ نے اپنے نیک بندوں کی دس صفات بیان فرمائی ہیں۔اور جن بندوں میں یہ دس صفات ہوں تو انہیں ”عبادالرحمن“ کا لقب دیا ہے۔ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَعِبَادُ الرَّحْمَـٰنِ الَّذِينَ يَمْشُونَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا وَإِذَا خَاطَبَهُمُ الْجَاهِلُونَ قَالُوا سَلَامًا﴿63﴾ وَالَّذِينَ يَبِيتُونَ لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَقِيَامًا ﴿64﴾ وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا عَذَابَ جَهَنَّمَ إِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿65﴾ إِنَّهَا سَاءَتْ مُسْتَقَرًّا وَمُقَامًا ﴿66﴾ وَالَّذِينَ إِذَا أَنفَقُوا لَمْ يُسْرِفُوا وَلَمْ يَقْتُرُوا وَكَانَ بَيْنَ ذَٰلِكَ قَوَامًا ﴿67﴾ وَالَّذِينَ لَا يَدْعُونَ مَعَ اللَّـهِ إِلَـٰهًا آخَرَ وَلَا يَقْتُلُونَ النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّـهُ إِلَّا بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُونَ وَمَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ يَلْقَ أَثَامًا ﴿68﴾يُضَاعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَيَخْلُدْ فِيهِ مُهَانًا ﴿69﴾ إِلَّا مَن تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَأُولَـٰئِكَ يُبَدِّلُ اللَّـهُ سَيِّئَاتِهِمْ حَسَنَاتٍ وَكَانَ اللَّـهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿70﴾ وَمَن تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَإِنَّهُ يَتُوبُ إِلَى اللَّـهِ مَتَابًا ﴿71﴾ وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا ﴿72﴾ وَالَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا ﴿73﴾ وَالَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ أَزْوَاجِنَا وَذُرِّيَّاتِنَا قُرَّةَ أَعْيُنٍ وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِينَ إِمَامًا ﴿74﴾أُولَـٰئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا وَيُلَقَّوْنَ فِيهَا تَحِيَّةً وَسَلَامًا﴿75﴾ خَالِدِينَ فِيهَا حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَمُقَامًا﴾ [الفرقان:76]

”رحمٰن کے (سچے) بندے وہ ہیں جو زمین پر عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں اور جب جاہل لوگ ان سے (جاہلانہ) باتیں کرتے ہیں تو وہ سلام کہہ کر چلے جاتے ہیں۔ اور وہ اپنے رب کے سامنے سجدے اور قیام کرتے ہوئے راتیں گزار دیتے ہیں۔ اور وہ یہ دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم سے دوزخ کا عذاب دور رکھ، کیونکہ اس کا عذاب تو ہلاک کر دینے والا ہے۔ بے شک جہنم ٹھہرنے اور رہنے کے لحاظ سے بدترین جگہ ہے۔ اور وہ لوگ خرچ

کرتے وقت بھی نہ تو اسراف کرتے ہیں اور نہ ہی بخیلی، بلکہ ان دونوں کے درمیان معتدل طریقے پر خرچ کرتے ہیں۔ اور وہ لوگ اللہ کے ساتھ کسی دوسرے معبود سے دعائیں نہیں کرتے اور کسی ایسے شخص کو قتل نہیں کرتے کہ جسے قتل کرنا اللہ تعالی نے منع کر دیا ہو سوائے حق کے، اور نہ وہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اور جو کوئی یہ گناہ کرے گا تو وہ اپنے اوپر سخت وبال لائے گا۔ اسے قیامت کے دن دوہرا عذاب دیا جائے گا اور وہ ذلت و خواری کے ساتھ ہمیشہ اسی میں رہے گا۔ سوائے ان لوگوں کے جو توبہ کریں اور ایمان لائیں اور نیک کام کریں، ایسے لوگوں کے گناہوں کو اللہ تعالیٰ نیکیوں سے بدل دیتا ہے، اور اللہ تعالی بخشنے والا مہربانی کرنے والا ہے۔ اور جو شخص توبہ کرے اور نیک عمل کرے تو اس نے اللہ تعالی کی طرف ایسا رجوع کیا جیسا کہ رجوع کا حق تھا۔ اور وہ لوگ جھوٹی گواہی نہیں دیتے اور جب کسی لغو چیز پر ان کا گزر ہوتا ہے تو وقار سے گزر جاتے ہیں۔ اور جب انہیں ان کے رب کی آیات سنا کر نصیحت کی جاتی ہے تو وہ ان سے اندھے بہرے ہو کر نہیں رہ جاتے۔ اور وہ یہ دعا کرتے رہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! تو ہمیں ہماری بیویوں اور اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں پرہیزگاروں کا پیشوا بنا۔ یہی وہ لوگ ہیں جنہیں ان کے صبر کے بدلے بلند و بالا محلات دیئے جائیں گے جہاں ان کا دعا اور سلام کے ساتھ استقبال ہو گا۔ وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، کیا ہی خوب وہ جگہ ہے، ٹھہرنے کے لیے اور رہائش کے لیے۔“

اللہ عز و جل نے اپنے نیک بندوں کے لیے قرآن مجید میں جو اصطلاحات استعمال کی ہیں، وہ صدیقین، شہداء، مسلمین، مومنین، محسنین، صالحین، مصلحین، متقین، صادقین، خاشعین، قانتین، مقربین، ربانیین، مہتدین، عابدین، مفلحین، اولیاء اللہ، عباد الرحمن وغیرہ جیسی اصطلاحات ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے ان اصطلاحات میں ”أهل الله“ اور ”أصحاب القرآن“ جیسی اصطلاحات کا اضافہ کیا ہے۔ اور صوفیاء کے ہاں معروف اصطلاحات غوث، قطب،

ابدال، اوتاد اور قلندر وغیرہ نہ تو قرآن مجید میں موجود ہیں اور نہ ہی ان کا ذکر کسی صحیح حدیث میں نقل ہوا ہے اور نہ ہی ان کے مقام اور مرتبے کے بارے کوئی مستند شیء روایت کی گئی ہے لہذا ان اصطلاحات کی حیثیت چند ناموں سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

تزکیہ نفس کے سلفی منہج میں قرآن مجید کی مذکورہ بالا اصطلاحات کو سامنے رکھتے ہوئے ان کا اہل بننے کے لیے مجاہدہ کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید نے کئی ایک مقامات پر ان اصطلاحات کے ضمن میں ان کے حاملین کی صفات بھی بیان فرمائی ہیں جیسا کہ عباد الرحمن ان بندوں کو کہا گیا ہے کہ جن میں درج ذیل دس صفات پائی جاتی ہوں۔ اور ان کا مرتبہ بھی قرآن مجید ہی میں بیان کر دیا گیا ہے اور جنت میں بلند و بالا محلات ہیں۔

درج بالا آیات میں رحمان کے بندوں کی پہلی صفت یہ بیان ہوئی کہ وہ زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں۔ عاجزی صرف ان کے دل میں نہیں ہوتی بلکہ ان کی گفتگو، ان کا اٹھنا بیٹھنا اور ان کا چلنا پھرنا بھی عاجزی کے احوال کے ساتھ ہوتا ہے۔ ان کے دلوں میں اس قدر عاجزی ہوتی ہے کہ اس کا اظہار ان کے اعضاء سے بھی ہو رہا تھا۔ اور عاجزی سے چلنے سے مراد یہ نہیں ہے کہ مریضوں کی طرح چلے بلکہ یہ کہ چال میں تکبر نہ ہو۔ عاجزی پر مزید گفتگو ہم نے کتاب کے آخری باب میں "عاجزی کے احوال" کے عنوان کے تحت کی ہے۔

ایسی چال کہ جس میں تکبر ہو، بہت ناپسندیدہ ہے جیسا کہ سینہ تان کر چلنا، گردن اکڑا کر چلنا، زمین پر زور سے پاؤں مار کر چلنا، ایک کندھا گرا کر چلنا۔ قرآن مجید میں سورۃ بنی اسرائیل میں ایک اور مقام پر کہا گیا ہے کہ اگر تم خدا کی زمین میں اکڑ کر چل بھی لوگے تو کیا کر لوگے ؟، نہ تو تم زمین پر زور سے پاؤں مار کر اسے پھاڑ سکتے ہو، اور نہ ہی تم اپنی گردن اکڑا اکڑا اتنی لمبی کر سکتے ہو کہ پہاڑوں کی بلندی کو پہنچ سکو، تو پھر کسی چیز کی اکڑ؟

رحمان کے بندوں کی دوسری صفت یہ بیان ہوئی کہ جب جاہل اور جذباتی لوگوں سے ان کا واسطہ پڑتا ہے تو وہ ان کے ساتھ الجھتے نہیں ہیں بلکہ سلام کہہ کر رخصت ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی شخص ان کے ساتھ بات چیت میں جذباتی (emotional) ہو

جائے اور گالم گلوچ پر اتر آئے تو ان کا رویہ یہ نہیں ہوتا کہ دو کے جواب میں چار سنا دیں بلکہ وہ لعن طعن کا جواب سلام سے دیتے ہوئے رخصت ہو جاتے ہیں۔ رحمان کے بندوں کے رویوں اور اخلاق میں پختگی (maturity) ہوتی ہے کہ وہ جاہلوں کے ساتھ جاہل نہیں بن جاتے۔ اس بارے ہم نے مزید گفتگو پانچویں باب میں "رستے کی اخلاقیات" کے عنوان کے تحت کی ہے، وہاں دیکھی جاسکتی ہے۔

رحمان کے بندوں کی تیسری صفت یہ ہے کہ وہ تہجد کی نماز کا اہتمام کرتے ہیں۔ وہ فرض نماز تو ادا کرتے ہی ہیں جبکہ تہجد بھی ان کے معمولات میں شامل ہوتا ہے۔ اور تہجد میں بھی رات کا اچھا خاصا حصہ اللہ کے سامنے سجدے اور قیام کی حالت میں گزرتا ہے کہ قرآن مجید نے تو کہا ہے کہ ان کی راتیں سجدے اور قیام کی حالت میں ہی گزرتی ہیں۔ سلوک کی منازل تہجد کی نماز میں طے ہوتی ہیں نہ کہ مراقبہ میں۔ اور یہی سلفی اور صوفی منہج تربیت کا بنیادی فرق ہے۔ تزکیہ نفس کے سلفی منہج کے ذرائع نماز، قرآن مجید، دعا، تہجد، سجدہ، ذکر و فکر اور صدقہ وغیرہ ہیں جبکہ اصلاح نفس کے صوفی منہج میں مراقبہ، لطائف، ذکر جہری، پاس انفاس، تصور شیخ اور سماع وغیرہ کو بنیادی ذرائع کی حیثیت حاصل ہے۔

آج کل شہروں میں جو لائف اسٹائل بن چکا ہے کہ ہمارے نوجوان راتوں کو جاگتے ہیں اور دن میں سوتے ہیں تو تہجد پڑھنا مشکل نہیں رہا۔ اور تہجد کی کم از کم نماز دو رکعت ہے اور زیادہ سے زیادہ آٹھ رکعت ہے۔ جو دو رکعت پڑھ لے تو یہ بھی تہجد گزار ہے اور جو روزانہ ایک سیپارہ تہجد میں تلاوت کرے تو کیا ہی کہنے۔ اور اگر روزانہ ایک تہائی رات تہجد پڑھے تو یہ وہ تہجد کی نماز ہے جو اللہ کے رسول ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پڑھا کرتے تھے۔

رحمان کے بندوں کی چوتھی صفت یہ بیان فرمائی ہے کہ وہ جہنم سے اللہ کی پناہ مانگتے رہتے ہیں۔ ان کی دن رات کی عبادت ان میں یہ زعم نہیں پیدا کر دیتی کہ وہ جنتی ہیں بلکہ وہ اس قدر عبادت کے باوجود جہنم کے عذاب سے ڈرتے رہتے ہیں۔ ایمان تو ہوتا ہی امید

اور خوف مابین ہے۔ اگر کوئی شخص صرف پر امید ہو کہ میں جنت میں جاؤں ہی جاؤں تو یہ بھی ایمان کے منافی ہے۔ اور اگر کوئی شخص صرف خوف میں مبتلا رہتا ہو کہ میرا رب تو مجھے جہنم میں ڈالے ہی ڈالے تو یہ بھی ایمان کے منافی ہے۔ ایمان یہ ہے کہ کبھی دل کی کیفیت یہ ہو کہ امید غالب ہو کہ میرا رب مجھے معاف کر دے گا اور جنت میں داخل کرے گا۔ اور کبھی دل پر خوف غالب ہو کہ میرا رب مجھے جہنم میں نہ ڈال دے۔ جنت کی آیات سن کر دل خوش ہو جائے اور جہنم کی آیات سن کر دل غمگین ہو جائے تو انہی دو کیفیات کا آنا جانا ہی ایمان ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«الجَنَّةُ أَقْرَبُ إِلَى أَحَدِكُمْ مِنْ شِرَاكِ نَعْلِهِ، وَالنَّارُ مِثْلُ ذَلِكَ»[1]

”تمہاری جنت تمہارے جوتے کے تسمے سے بھی زیادہ تم سے قریب ہے۔ اور تمہاری جہنم بھی تمہارے جوتے کے تسمے سے بھی زیادہ تم سے قریب ہے۔“

اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ آخر وقت میں جبکہ سانسیں اکھڑ رہی ہوں اور انسان اس دنیا سے دوسری دنیا میں جا رہا ہو تو اس وقت امید کا پہلو غالب ہونا چاہیے کہ اللہ مجھے معاف کرے گا۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«أَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِي بِي وَأَنَا مَعَهُ إِذَا دَعَانِي»[2]

”میں ویسا ہی ہوں جیسا کہ میرے بندے کا میرے بارے گمان ہے۔ اور جب بھی میرا بندہ مجھ سے دعا کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔“

رحمان کے بندوں کی پانچویں صفت یہ بیان ہوئی کہ وہ مال خرچ کرنے میں نہ تو فضول خرچ ہیں کہ اللوں تللوں میں مال خرچ کریں اور نہ ہی کنجوس ہیں کہ جہاں ضرورت ہو، وہاں بھی خرچ نہ کریں۔ نیکی ہمیشہ دو انتہاؤں کے مابین ہوتی ہے۔ اور مال خرچ کرنے میں بھی دو انتہائیں موجود ہیں۔ ایک یہ کہ جہاں ضرورت نہیں ہے، وہاں بھی خرچ کرے یا جہاں جتنی ضرورت ہے، اس سے زائد خرچ کرے۔ اور دوسری انتہاء یہ ہے کہ جہاں ضرورت ہو، وہاں بھی خرچ نہ کرے اور جمع کر کر کے خوش ہوتا رہے۔

---

[1] صحيح البخاري، كِتَابُ الرِّقَاقِ، بَابٌ الجَنَّةُ أَقْرَبُ إِلَى أَحَدِكُمْ مِنْ شِرَاكِ نَعْلِهِ، 102/8

[2] سنن الترمذي، أَبْوَابُ الزُّهْدِ بَابُ مَا جَاءَ فِي حُسْنِ الظَّنِّ بِاللَّهِ، 596/4

اگر شادی بیاہ کے موقع پر چھ لاکھ کا عروسی جوڑا تیار ہوگا اور دو لاکھ میں دلہن کا میک اپ ہوگا تو یہ فضول خرچی نہیں تو اور کیا ہے؟ اور وہ جوڑا اور میک اپ ایک دن بھی نہیں بلکہ چند گھنٹوں کے لیے ہوتا ہے۔ اور کنجوس آدمی نہ اپنی ذات پر خرچ کرتا ہے اور نہ اپنے گھر والوں پر، نہ اپنے رشتہ داروں پر اور نہ ہی اپنے دوستوں پر۔ فضول خرچ کو سب لوگ باتیں بناتے ہیں، چاہے باتیں بنانے کی وجہ یہی ہو کہ وہ خود اتنی فضول خرچی کی استطاعت نہیں رکھتے اور کنجوس آدمی سے بھی سب ناراض رہتے ہیں۔ لہذا رحمان کے بندے اپنے خرچ کرنے میں معتدل رویہ اختیار کرتے ہیں کہ جہاں خرچ کرنا ہے، وہاں خرچ کرتے ہیں اور جہاں نہیں کرنا، وہاں نہیں کرتے ہیں۔ رحمان کے بندوں کا دنیا کے معاملات میں خرچ کرنا بھی احسان کی کیفیت کے ساتھ ہوتا ہے کہ قیامت والے دن اس کا بھی حساب ہونا ہے کہ مال کہاں سے کمایا اور کہاں خرچ کیا۔ مال اللہ کی نعمتوں میں سے ایک نعمت ہے اور اللہ کی نعمتوں کے بارے سوال ہوگا کہ ان کا شکر کتنا ادا کیا اور ان کا استعمال کیسے کیا۔

رحمان کے بندوں کی چھٹی صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ تین بڑے گناہوں سے اجتناب کرتے ہیں۔ ہمارے دین میں گناہوں کو چھوٹے اور بڑے گناہوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اور جو کبیرہ اور بڑے گناہ ہیں، ان میں سے بھی بڑے گناہ تین ہیں۔ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانا، کسی جان کو قتل کرنا اور زنا کرنا۔ شرک اتنا بڑا گناہ ہے کہ اللہ عزوجل نے قرآن مجید میں بیان فرمایا کہ میں شرک معاف نہیں کروں گا اور سارے گناہ معاف کر دوں گا۔ اور کسی انسان کو قتل کرنا اتنا بڑا گناہ ہے کہ قرآن مجید نے ایک انسان کے قتل کو پوری نوع انسانی کے قتل کے برابر کا گناہ قرار دیا ہے۔ اور زنا اور بدکاری کرنا بھی کبیرہ گناہوں میں بہت بڑا گناہ ہے۔ ان تین گناہوں کے بارے بیان فرمایا کہ جو ان میں سے کسی ایک گناہ کا بھی ارتکاب کرے گا، وہ دنیا اور آخرت میں اس کا وبال چکھ لے گا۔ آخرت میں تو جو سزا ہے سو ہے لیکن دنیا میں ان گناہوں کی سزا یہ ہے کہ مشرک کو کبھی بھی دل کا اطمینان نصیب نہیں ہوتا، قاتل ہمیشہ اپنے ضمیر کے بوجھ تلے پریشان رہتا

ہے اور زانی ہر وقت بے سکونی کی کیفیت میں رہتا ہے۔ ان لوگوں کے گرد نعمتوں اور آسائشوں کا ڈھیر ہو گا لیکن زندگی میں سکون اور اطمینان نام کی چیز نہ ہو گی۔

ساتھ ہی یہ بھی بیان فرمادیا کہ اگر کسی سے یہ گناہ ہو گئے اور اس نے سچی توبہ کر لی تو اللہ عزوجل نہ صرف اس کے گناہوں کو معاف کر دیں گے بلکہ اس کے گناہوں کو نیکیوں سے بدل دیں گے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي ذَرٍّ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «يُؤْتَى بِالرَّجُلِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، فَيُقَالُ: اعْرِضُوا عَلَيْهِ صِغَارَ ذُنُوبِهِ. قَالَ: فَتُعْرَضُ عَلَيْهِ وَيُخَبَّأُ عَنْهُ كِبَارُهَا، فَيُقَالُ: عَمِلْتَ يَوْمَ كَذَا وَكَذَا كَذَا وَكَذَا، وَهُوَ مُقِرٌّ لَا يُنْكِرُ، وَهُوَ مُشْفِقٌ مِنَ الْكِبَارِ، فَيُقَالُ: أَعْطُوهُ مَكَانَ كُلِّ سَيِّئَةٍ عَمِلَهَا حَسَنَةً قَالَ: فَيَقُولُ: إِنَّ لِي ذُنُوبًا مَا أَرَاهَا. قَالَ: قَالَ أَبُو ذَرٍّ: فَلَقَدْ رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ضَحِكَ حَتَّى بَدَتْ نَوَاجِذُهُ»[1]

”حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت والے ایک شخص کو لایا جائے گا [کہ جس نے دنیا میں اپنے گناہوں سے سچی توبہ کر لی ہو گی]۔ تو اللہ تعالی فرشتوں سے کہیں گے کہ اسے پہلے اس کے صغیرہ گناہ دکھاؤ تو اس شخص کو اس کے چھوٹے گناہ دکھائیں جائیں گے اور بڑے چھپا لیے جائیں گے۔ اور اس سے کہا جائے گا کہ دنیا میں فلاں دن یہ کیا اور فلاں دن وہ کیا، فلاں وقت میں یہ کیا اور فلاں وقت میں وہ کیا۔ وہ شخص اپنے گناہوں کو تسلیم کرے گا اور ان کا انکار نہیں کرے گا۔ اور دل ہی دل میں ڈر رہا ہو گا کہ ابھی تو بڑے گناہ سامنے ہی نہیں آئے۔ تو اس حال میں اللہ تعالی فرمائیں گے کہ میرے بندے کو ہر گناہ کے بدلے ایک نیکی عطا کرو۔ تو وہ شخص فوراً بول پڑے گا کہ اے میرے رب! میرے کچھ گناہ ایسے ہیں جو مجھے یہاں اعمال نامے میں نظر نہیں آرہے۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم یہ بات بیان کرتے ہوئے اس قدر ہنسے کہ آپ کی داڑھیں نظر آنے لگیں۔“

[1] مسند الإمام أحمد بن حنبل: 313/35

رحمان کے بندوں کی ساتویں صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے کہ جھوٹی گواہی کو بہت بڑے گناہوں میں شمار کیا گیا ہے۔ سچی گواہی ضروری نہیں کہ عدالت میں ہی دی جائے، عدالت کے علاوہ بھی اگر میاں بیوی، دو افراد اور دو خاندانوں میں جھگڑا ہو اور ان کے باہمی اختلاف کا فیصلہ کرنے کے لیے خاندان کے کچھ بڑے جمع ہوں اور کچھ لوگوں سے گواہی طلب کی جائے تو وہ سچی گواہی دیں، چاہے وہ ان کے اپنے خلاف جاتی ہو۔ جو شخص دنیا کے معاملات میں سچی گواہی نہیں دیتا تو اللہ کے بارے اس کی گواہی بھی خالص نہ ہو گی بلکہ نفاق کی ملاوٹ کے ساتھ ہو گی۔ اللہ کے بارے گواہی ہم ہر نماز میں دیتے ہیں کہ سورۃ فاتحہ پڑھتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم صرف آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور صرف آپ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔

رحمان کے بندوں کی آٹھویں صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ لغو کاموں میں پڑ کر اپنا وقت ضائع نہیں کرتے۔ اور اگر کسی لغویات اور کام سے ان کا گزر ہو جائے تو بڑے وقار اور سنجیدگی سے گزر جاتے ہیں کہ مداری کا تماشا دیکھنے کھڑے نہیں ہو جاتے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے بہترین اسلام، اس کو قرار دیا ہے کہ انسان لایعنی باتیں اور کام چھوڑ دے۔ لایعنی باتیں اور کام وہ ہیں کہ جن میں نہ آخرت کا بھلا ہو اور نہ دنیا کا فائدہ ہو کہ گھنٹوں بیٹھے بے مقصد براؤزنگ کر رہے ہیں، یا اسمارٹ فون میں سارا دن گیمز میں مشغول ہیں، یا تھڑوں پر بیٹھے تاش کے پتوں میں اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«مِنْ حُسْنِ إِسْلَامِ المَرْءِ تَرْكُهُ مَا لَا يَعْنِيهِ»[1]

”آدمی کے اسلام کا حسن اس میں ہے کہ ہر لایعنی شیء کو چھوڑ دے۔“

رحمان کے بندوں کی نویں صفت یہ بیان ہوئی کہ جب انہیں قرآن مجید کی آیات کے ذریعے نصیحت کی جاتی ہے تو وہ غور سے سنتے ہیں اور پھر اس پر عمل کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ایسا نہیں کرتے کہ اللہ کی آیات سن کر اندھے بہرے بن جائیں کہ سنا ہی نہیں، یا

[1] سنن الترمذي، أَبْوَابُ الزُّهْدِ، 558/4

سنی اَن سنی کر دی، یا ایک کان سے سنا اور دوسرے سے نکال دیا، یا سن کر بھلا دیا، یا سن کر اہمیت نہ دی۔

رحمان کے بندوں کی دسویں صفت یہ بیان ہوئی ہے کہ وہ اللہ سے یہ دعا کرتے رہتے ہیں کہ پروردگار! ہمارے بیوی بچوں کو ہماری آنکھوں کی ٹھنڈک اور متقی بنا۔ انسان کے لیے اس بڑھ کر کیا آزمائش ہو گی کہ اس کی اولاد اس کے سامنے سینہ تان کر کھڑی ہو جائے۔ اس لیے فرمانبرار بیوی اور صالح اولاد اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے کہ جس کے لیے ہمیشہ دعا گو رہنا چاہیے۔ جس شخص کو گھر سے سکون نہ ملا تو اسے دنیا کی کسی جگہ سکون نہیں مل سکتا لہذا اللہ سے دعا کرتے رہنا چاہیے کہ اے پروردگار! کہ جن لوگوں کا آپ نے مجھے ذمہ دار بنایا ہے، ان کو فرمانبردار اور صالح بنانا۔

❁❁❁❁❁❁❁

باب سوم

اصلاح عبادات

اس باب میں اصلاح أحوال کے ضمن میں توحید، نماز، تلاوت، ذکر وفکر، تہجد، دعا اور صدقہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

توحید اور عبادت

عبادت دو چیزوں کا نام ہے، محبت اور عاجزی۔ دل میں پہلے اپنے معبود کے لیے محبت پیدا ہوتی ہیں اور پھر وجود اس کی عظمت کے سامنے جھک جاتا ہے۔ پس عبادت کا معنی اللہ عزوجل سے انتہائی درجے میں محبت رکھنا اور اس کے سامنے انتہائی درجے عاجزی اختیار کرنا ہے۔ عبادت مارے باندھے کی اطاعت کا نام نہیں ہے بلکہ عبادت تو وہ فرمانبرداری ہے کہ جو دل سے ہو۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> وَالْعِبَادَةُ: اسْمٌ يَجْمَعُ غَايَةَ الْحُبِّ لَهُ وَغَايَةَ الذُّلِّ لَهُ فَمَنْ ذَلَّ لِغَيْرِهِ مَعَ بُغْضِهِ لَمْ يَكُنْ عَابِدًا وَمَنْ أَحَبَّهُ مِنْ غَيْرِ ذُلٍّ لَهُ لَمْ يَكُنْ عَابِدًا وَاللَّهُ سُبْحَانَهُ يَسْتَحِقُّ أَنْ يُحَبَّ غَايَةَ الْمَحَبَّةِ؛ بَلْ يَكُونُ هُوَ الْمَحْبُوبَ الْمُطْلَقَ الَّذِي لَا يُحَبُّ شَيْءٌ إلَّا لَهُ وَأَنْ يُعَظَّمَ وَيُذَلَّ لَهُ غَايَةَ الذُّلِّ؛ بَلْ لَا يُذَلُّ لِشَيْءٍ إلَّا مِنْ أَجْلِهِ.[1]
>
> ”اور عبادت انتہائی درجے میں محبت رکھنے اور انتہائی درجے میں عاجزی اختیار کرنے کا نام ہے۔ پس جس نے کسی کے سامنے عاجزی اختیار کی لیکن دل میں اس سے بغض رکھا تو یہ عبادت نہیں ہے۔ اور جس نے کسی سے محبت رکھی لیکن اس کے سامنے عاجزی اختیار نہ کی تو یہ بھی عبادت نہیں ہے۔ اور اللہ عزوجل اس کے مستحق ہیں کہ ہم ان سے انتہائی درجے میں محبت رکھیں بلکہ وہی ہمارے محبوب مطلق ہوں اور ہر شیء کی محبت اُن کی محبت کی وجہ سے ہو۔ اور یہ کہ ہم اللہ عزوجل کی تعظیم کریں اور ان کے سامنے انتہائی درجے میں عاجزی اختیار کریں اور اگر کسی اور کے سامنے عاجزی کا اظہار ہو بھی تو وہ بھی اللہ ہی کے حکم سے ہو۔“

قرآن مجید کا خلاصہ اگر ایک لفظ میں نکالنا چاہیں تو وہ لفظ توحید ہے۔ جتنے انبیاء کی دعوت کا ذکر قرآن مجید میں ہے، تو وہ ایک ہی نقطے کے گرد گھومتی ہے اور وہ نقطہ یہ ہے

---

[1] ابن تيمية، تقي الدين أبو العباس أحمد بن عبد الحليم الحراني (المتوفى: 728ھ)، مجموع الفتاوى، مجمع الملك فهد، المملكة العربية السعودية، 1416ھ/1995م، 162/15

کہ اے میری قوم کے لوگو! اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ عبادت میں توحید نہ ہو تو وہ عبادت، عبادت نہیں شرک ہے۔ عبادت اُسی وقت مقبول قرار پائے گی جبکہ اس میں توحید ہو گی ورنہ تو عبادت یہودی اور عیسائی بھی کرتے ہیں اور اُسی خدا کی کرتے ہیں کہ جس کی ہم کرتے ہیں۔

توحید دو قسم پر ہے۔ ایک دل کی اور دوسری عمل کی، توحید ارادی اور توحید عملی۔ دل کی توحید یہ ہے کہ دل میں اللہ کی محبت کو غالب رکھے اور عمل کی توحید یہ ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی کے سامنے اُس طرح عاجزی کا اظہار نہ کرے کہ جیسے اللہ کے سامنے ہونا چاہیے۔ دل کے شرک کا تعلق انسان کے جذبات سے ہوتا ہے اور عمل کے شرک کا تعلق اس کے افعال سے ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿قُلْ إِنَّمَا أَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوحَىٰ إِلَيَّ أَنَّمَا إِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ فَمَن كَانَ يَرْجُو لِقَاءَ رَبِّهِ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهِ أَحَدًا﴾ [الکھف: 110]

"اے نبی ﷺ! کہہ دیں کہ میں تمہاری طرح کا ایک بشر ہوں۔ (البتہ) میری طرف وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ تو جو اپنے رب سے ملنے کی امید رکھتا ہے، اسے چاہیئے کہ نیک عمل کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے۔"

عبادت کی ابتداء اللہ کی محبت سے ہوتی ہے اور انتہاء اس کے سامنے اپنے وجود کو زمین پر ڈال دینے سے۔ عبادت کی اصلاح کے لیے ضروری ہے کہ پہلے دل کی اصلاح ہو۔ دل کسی اور کا مرید ہو اور عبادت اللہ کی ہو، تو یہ ممکن نہیں ہے۔ توحید ارادی کا مقصود یہ ہے کہ انسان کی اصل مراد اللہ کی ذات بن جائے۔ پس انسان کا دل نہ مال کا مرید ہو، نہ دنیا کا، نہ خواہش کا، نہ شیخ کا، صرف اور صرف اللہ ہی کا مرید ہو۔

توحید میں اصل دل کی توحید ہے اور دل کی توحید یہ ہے کہ دل میں اللہ کی محبت ہر شیء پر غالب رہے۔ جب تک دل میں اللہ کی محبت غالب نہ ہو گی، اس وقت تک عبادت کی اصلاح کی بنیاد نہ پڑے گی۔ اگر دل میں دنیا، مال، مقام، خواہش، عورت اور شیخ وغیرہ

کی محبت اللہ کی محبت پر غالب آگئی تو یہی شرک ہے۔اللہ عزوجل نے دنیا اور مخلوق کی محبت سے منع نہیں فرمایا لیکن یہ ضرور کہا ہے کہ ان سے ویسی محبت نہ رکھو جیسی کہ اللہ سے رکھنی چاہیے یعنی کسی شیء کی محبت بھی اللہ کی محبت کے برابر ہو جائے تو یہ شرک ہے۔ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ اللَّـهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ﴾ [البقرة: 165]

"کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر اور مد مقابل بناتے ہیں اور اُن سے ایسے محبت کرتے ہیں جیسی اللہ سے کرنی چاہیے حالانکہ ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔"

اسی طرح اگر انسان کے دل پر اس کی خواہش کی محبت اس طرح مسلط ہو جائے کہ وہ اللہ کی چاہت پر غالب آ جائے تو قرآن مجید نے اسے خواہش کی پوجا کا نام دیا ہے۔ شرک صرف بتوں کے سامنے سر جھکانے اور قبروں پر سجدہ کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ انسان بتوں اور قبروں کے علاوہ خواہش نفس کو بھی اللہ کا شریک بنالیتا ہے۔ہمارے ہاں کتنے ہی لوگ ہیں کہ جو یورپ کا ویزہ لگوانے کی خاطر کفر کر گزرتے ہیں، محبوب کی خاطر خدا تک کو قربان کرنے کی قسمیں کھاتے ہیں، ملازمت کی خاطر دین اسلام چھوڑ جاتے ہیں۔ارشاد باری تعالی ہے:

﴿أَرَأَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَـٰهَهُ هَوَاهُ أَفَأَنتَ تَكُونُ عَلَيْهِ وَكِيلًا﴾ [الفرقان: 43]

"کیا آپ نے اس شخص کو دیکھا ہے کہ جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا خدا بنالیا ہے؟ تو کیا آپ ﷺ ایسے شخص کی سفارش کریں گے؟"

اور عمل کا شرک یہ ہے کہ کسی اور کے سامنے ویسی ہی عاجزی کا اظہار کرے جیسا کہ اللہ کے سامنے کیا جاتا ہے۔کسی بت، قبر، پیر، شیخ، گدی نشین، مذہبی پیشوا، محبوب اور حکمران کے سامنے ایسے جھکنا کہ جیسے اللہ کے سامنے جھکا جاتا ہے تو یہ عمل کا شرک ہے۔ مزاروں پر جا کر قبروں کا طواف کرنا، ان کے سامنے سجدے میں پڑ جانا یا ان کے سامنے

رکوع کے بل جھک جانا شرک ہے کہ یہ تینوں عبادت ہی کی قسمیں ہیں۔ ہمارے ہاں مزاروں پر جو خرافات ہوتی ہیں تو وہ تمام مسالک اور مکاتب فکر کے جید علماء کی نظر میں ممنوع ہیں لیکن جو کچھ ہو رہا ہے تو وہ جاہل مولویوں کی سرپرستی میں ہو رہا ہے۔ بریلوی مکتبہ فکر کے بانی مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"روضہ انور کا طواف نہ کرو، نہ سجدہ کرو، نہ اتنا جھکنا کہ رکوع کے برابر ہو۔ حضور کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعظیم اُن کی اطاعت میں ہے۔"[1]

اب اس فتویٰ کر پڑھیں اور سوچیں کہ اعلیٰ حضرت تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے روضہ مبارک پر طواف، سجدہ اور رکوع سے منع فرمائیں اور یہاں امتیوں کے مزاروں پر یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ اور طواف، سجدہ اور رکوع کی طرح دعا کرنا بھی عبادت ہی ہے لہذا اللہ کے علاوہ کسی اور کو پکارنا بھی شرک میں داخل ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ فَادْعُوهُمْ فَلْيَسْتَجِيبُوا لَكُمْ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ﴾ [الأعراف: 194]

"یقیناً اللہ کے علاوہ جن سے تم دعائیں کرتے ہو تو وہ تمہاری طرح ہی کے بندے ہیں۔ پس تم ان سے دعائیں کرو تو انہیں چاہیے کہ وہ تمہاری دعائیں قبول بھی کریں، اگر تم سچے ہو۔"

پس جب دعا، عبادت ہی ہے، اور عبادت، اللہ کے علاوہ کسی کے لیے جائز نہیں ہے تو پھر مشکل میں کسی ولی، امام، پیر، فقیر، شیخ اور بزرگ کو پکارنا اس کی عبادت کرنا ہی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«إِنَّ الدُّعَاءَ هُوَ الْعِبَادَةُ»[2]

"یقیناً دعا، عبادت ہی ہے۔"

تمام مسالک اور مکاتب فکر کے جید علماء کا اتفاق ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی سے دعا نہیں کی جا سکتی ہے۔ البتہ کچھ علماء کا کہنا ہے کہ ہم اللہ سے دعا کرتے ہوئے اس کی جناب

---

[1] احمد رضا خان بریلوی، فتاویٰ رضویہ شریف، مطبوعہ جامعہ نظامیہ، لاہور، 769/10

[2] سنن ابن ماجه، كِتَابُ الدُّعَاءِ، بَابُ فَضْلِ الدُّعَاءِ، 1258/2

میں اس کے نیک بزرگوں کو وسیلہ بنا سکتے ہیں جبکہ اللہ کے علاوہ کسی نبی، ولی اور امام سے براہ راست مانگنے کا کوئی بھی جید عالم دین قائل نہیں رہا ہے۔ مولانا احمد رضا خان بریلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> ''حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اولیاء کرام سے استغاثہ اور استعانت مشروط طور پر جائز ہے جبکہ انہیں اللہ تعالیٰ کا بندہ اور اس کی بارگاہ میں وسیلہ جانے...اور اعتماد کرلے کہ بے حکم خدا تعالیٰ ذرہ نہیں ہل سکتا اور اللہ تعالیٰ کے دیئے بغیر کوئی ایک حصہ نہیں دے سکتا۔ ایک حرف نہیں سن سکتا۔ پلک نہیں ہلا سکتا اور بے شک سب مسلمانوں کا یہی اعتقاد ہے۔''[1]

وسیلے کے بارے صحیح رائے یہی ہے کہ اللہ سے دعا مانگتے ہوئے وسیلہ جائز تو ہے لیکن صرف تین چیزوں کا وسیلہ جائز ہے کہ جن کا ذکر کتاب وسنت میں مذکور ہے۔ ایک تو اللہ کے ناموں کا وسیلہ جائز ہے کہ اللہ تعالی نے قرآن مجید میں بیان فرمایا ہے کہ اللہ سے اس کے ناموں کے ذریعے دعا کیا کرو۔ پس دعا کرتے ہوئے یہ کہنا کہ اے اللہ! آپ کو ''حی قیوم'' ہونے کا واسطہ، مجھے صحت عطا فرمائیں اور میرے حالات سنوار دیں، تو یہ بالکل جائز ہے۔ اور دوسرا اپنے نیک اعمال کا وسیلہ جائز ہے جیسا کہ صحیح بخاری میں ایک غار میں تین اشخاص کے زندہ قید ہونے کا قصہ نقل ہوا ہے۔ اس روایت کے مطابق ان تینوں افراد نے اللہ کی جناب میں اپنے نیک اعمال پیش کر کے اللہ سے دعا کی تو اللہ نے ان کی دعا کو قبول فرما کر ان کی آزمائش کو ٹال دیا۔[2] پس اگر یہ کہے کہ اے اللہ! فلاں وقت میں، میں نے یہ نیک کام کیا تھا، آپ کو اس کا واسطہ، آپ میری آزمائش ٹال دیں، تو یہ جائز ہے۔

اسی طرح کسی آزمائش کے وقت اللہ کے کسی نیک بندے کو جو کہ حیات ہوں، اللہ کی جناب میں وسیلہ بنایا جا سکتا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے دور خلافت میں بارش نہ ہونے پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو وسیلہ بنا کر اللہ سے دعا مانگتے تھے جو

---

[1] احمد رضا خان بریلوی، احکام شریعت، مطبوعہ آگرہ، ہندوستان، 4/1

[2] صحيح البخاري، كِتَابُ الإِجَارَةِ بَابُ مَنِ اسْتَأْجَرَ أَجِيرًا فَتَرَكَ الأَجِيرُ أَجْرَهُ، 91/3

قبول ہوتی تھی۔ یہ ایسے ہی ہے جیسا کہ ہم اپنے کسی جاننے والے نیک شخص سے کہتے ہیں کہ بھائی! میرے لیے دعا کرنا۔ اور ان لوگوں کا وسیلہ کہ جو فوت ہو چکے ہوں، تو وہ جائز نہیں ہے۔ اگر فوت شدگان سے وسیلہ جائز ہوتا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ ضرور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو وفات کے بعد بھی وسیلہ بناتے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، أَنَّ عُمَرَ بْنَ الخَطَّابِ رَضِـيَ اللَّهُ عَنْهُ، كَانَ إِذَا قَحَطُوا اسْـتَسْـقَى بِالعَبَّاسِ بْنِ عَبْدِ المُطَّلِبِ، فَقَالَ: «اللَّهُمَّ إِنَّا كُنَّا نَتَوَسَّلُ إِلَيْكَ بِنَبِيِّنَا فَتَسْقِينَا، وَإِنَّا نَتَوَسَّلُ إِلَيْكَ بِعَمِّ نَبِيِّنَا فَاسْقِنَا»، قَالَ: «فَيُسْقَوْنَ»[1]

"حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانے میں جب بھی قحط پڑتا تو حضرت عباس بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ کو نماز استسقاء کے لیے بلواتے اور یہ کہتے: اے اللہ! جب تک اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان موجود تھے تو ہم انہیں آپ کی جناب میں وسیلہ بناتے تھے اور آپ بارش برسا دیتے تھے۔ اور اب ہم اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا کو آپ کی جناب میں وسیلہ بناتے ہیں، پس آپ ہمیں بارش دے دیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس طرح لوگوں کو بارش دے دی جاتی تھی۔"

دنیا میں وہ لوگ تقرب الی اللہ کے درجات جلد طے کر لیتے ہیں اور سلوک کی منازل میں بہت اوپر تک جاتے ہیں کہ جن کا عقیدہ صحیح اور فکر صالح ہو۔ انسان کا عمل اسے اللہ کے اتنا قریب نہیں کرتا جتنا اللہ کے بارے اس کا عقیدہ اسے اللہ کے قریب کر دیتا ہے۔ اور آخرت میں انسان کا عمل اسے جنت میں اتنے بلند درجات عطا نہیں کرے گا جتنا کہ اس کا اللہ کے بارے عقیدہ اسے بلند درجات تک لے جائے گا۔

پس عقیدے کی اصلاح بہت ضروری ہے کہ اللہ کی معرفت ہی تو اصلاح احوال کی بنیاد ہے۔ جیسی اللہ کی معرفت ہو گی، ویسے ہی احوال نصیب ہوں گے۔ اور درست بات یہی ہے کہ احوال سب کو نصیب ہو جاتے ہیں لیکن کچھ شیطانی ہوتے ہیں اور کچھ رحمانی۔

[1] صحيح البخاري، أَبْوَابُ الِاسْتِسْقَاءِ، بَابُ سُؤَالِ النَّاسِ الإِمَامَ الِاسْتِسْقَاءَ إِذَا قَحَطُوا، 27/2

بت اور قبر کو سجدہ کرنے والے کے لیے بھی شیطان اس کے عمل میں لذت اور کیفیت ڈال دیتا ہے۔ جو اپنے خدا ہونے کا دعوی کرتے ہیں، انہیں بھی یہ کہنے میں کچھ نہ کچھ کیفیات حاصل ہو رہی ہوتی ہیں جو کہ شیطان کی طرف سے ہوتی ہیں۔ رحمانی اور شیطانی احوال میں فرق کرنے والی شیء شریعت ہے۔

توحید اسماء وصفات کے باب میں جیسے احوال سلفیت میں حاصل ہو سکتے ہیں، ویسے کسی بھی دوسری فکر میں حاصل نہیں ہو سکتے کہ یہ سلفیت ہی تو ہے کہ جو اسماء وصفات میں جس طرح لغوی معنی جاری کرتی ہے، وہ غیب میں موجود جمال کو ان کے لیے حاضر بنا دیتا ہے۔ وہ دیکھے نہ جا سکنے والے محبوب کو دیکھ لینے کی خواہش پوری کرنے کے رستے نکال دیتا ہے۔ وہ انسانی کے جمالیاتی شعور (aesthetic consciousness) کے بنیادی تقاضے "حضور حقیقت" (presence of reality) کو ممکن بنا دیتا ہے۔

اس کو یوں سمجھیں کہ علماء نے توحید کی تین قسمیں بنائی ہیں۔ پہلی قسم توحید ربوبیت کہلاتی ہے۔ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ کو اس کے افعال میں اکیلا اور وحدہ لاشریک ماننا۔ وہ اکیلا اس دنیا کا خالق ہے، وہ اکیلا اس دنیا کا نظام چلا رہا ہے، وہ اکیلا اس دنیا کا رازق ہے، وہ اکیلا ہے جو سب کو زندگی اور موت عطا کرتا ہے، وہ اکیلا ہے جو ساری دنیا کا مالک ہے وغیرہ۔ اور چند ایک جہلاء کے علاوہ مسلمانوں میں سب فرقے اس کے قائل ہیں۔

دوسری قسم توحید الوہیت کہلاتی ہے۔ اس کا معنی ہے کہ بندوں کا اپنے افعال میں اللہ کو اکیلا اور وحدہ لاشریک ماننا۔ آسان الفاظ میں اللہ کو اس کی عبادت میں اکیلا اور وحدہ لاشریک ماننا اور اس کو توحید عبادت بھی کہتے ہیں۔ وہ اکیلا ہے جو رکوع اور سجدے کے لائق ہے، وہ اکیلا ہے جو طواف اور سعی کے لائق ہے، وہ اکیلا ہے جو دعا اور مناجات کے لائق ہے، وہ اکیلا ہے جو نذر ونیاز اور قربانی کے لائق ہے وغیرہ۔ اور جہلاء کے علاوہ سب مکاتب فکر اس کے قائل ہیں۔

اور تیسری قسم توحید اسماء وصفات ہے۔ کتاب وسنت میں اللہ کے جو نام اور اور اسماء نقل ہوئے ہیں، ان پر اسی طرح ایمان رکھنا کہ جیسے یہ نقل ہوئے ہیں۔ ان کے لغوی

معنی پر ایمان رکھنا جبکہ ان کی کیفیت کو بیان نہ کرنا۔ اللہ کی ذات کا تعارف حاصل کرنے کا ہمارے پاس ایک ہی ذریعہ ہے، اور وہ اس کی اسماء وصفات ہیں۔ تمام مکاتب فکر کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اللہ کے ناموں میں اس کے ظاہری لغوی معنی کو جاری کیا جائے گا۔ اسی طرح تمام مکاتب فکر میں سات صفات کے بارے بھی اتفاق ہے کہ ان میں ظاہری لغوی معنی کو جاری کیا جائے گا اور وہ حیات، علم، قدرت، ارادہ، کلام، سماعت اور بصارت کی صفات ہیں۔

اس کے علاوہ صفات میں اختلاف ہے جیسا کہ قرآن مجید میں اللہ کے چہرے، ہاتھ، عرش پر مستوی ہونے وغیرہ کا ذکر ہے۔ مثال کے طور قرآن مجید میں حضرت آدم علیہ السلام کے بارے اللہ عزوجل نے ارشاد فرمایا کہ میں نے آدم علیہ السلام کو اپنے دو ہاتھوں سے پیدا کیا۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿قَالَ يَاإِبْلِيسُ مَا مَنَعَكَ أَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ [ص: 75]

"اللہ عزوجل نے کہا: اے ابلیس! جس شخص کو میں نے اپنے دو ہاتھوں سے بنایا، اس کے آگے سجدہ کرنے سے تجھے کس چیز نے منع کیا۔"

اب اللہ کے ہاتھ تو ہیں لیکن کیسے ہیں، یہ معلوم نہیں ہے۔ اور اس بارے غور و فکر کرنا کہ اللہ کے ہاتھ کیسے ہیں، بدعت ہیں۔ کچھ لوگوں نے کہا کہ اللہ کے ہاتھوں سے مراد، قدرت ہے۔ اور اسے تاویل کرنا کہتے ہیں، اور یہ بھی بدعت ہے کہ صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ دین تاویل نہیں کرتے تھے۔ دو ہاتھوں کا لفظ عربی زبان میں قدرت کے لیے استعمال نہیں ہوتا اگرچہ ہاتھ کا لفظ قدرت کے معنی میں بھی استعمال ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر اللہ عزوجل نے حضرت آدم علیہ السلام کو بھی اپنی قدرت سے بنایا اور بقیہ مخلوق کو بھی اپنی قدرت ہی سے پیدا کیا ہے تو حضرت آدم علیہ السلام کی کیا خصوصیت ہوئی؟ پس اللہ کے ہاتھوں سے مراد اس کے ہاتھ ہی ہیں، قدرت نہیں۔ البتہ ہم یہ نہیں کہیں گے کہ اللہ کے ہاتھ انسانوں جیسے ہیں کہ یہ تشبیہ ہے اور یہ بھی بدعت ہے۔ ہمیں جتنا بتلایا گیا، ہم اس پر ایمان لائیں گے۔ اور جو نہیں بتلایا گیا، اس کی کھود کرید نہیں کریں

گے۔ صفات باری تعالی کے بارے یہ سلف کا موقف تھا۔ اس آیت مبارکہ میں شاہ عبد القادر، شاہ رفیع الدین، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا احمد رضا خان بریلوی، مولانا محمد جونا گڑھی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مفتی محمد شفیع، مولانا مودودی، مولانا پیر کرم شاہ رحمہم اللہ سب نے آیت کا ترجمہ ہاتھ ہی سے کیا ہے اور قدرت کسی نے بیان نہیں کیا کیونکہ "یدی" کا قدرت کے لفظ سے ترجمہ کرنے سے دو قدرتیں بن جاتیں کہ اللہ عزوجل نے آدم علیہ السلام کو دو قدرتوں سے پیدا فرمایا اور یہ غیر منطقی ترجمہ ہوتا۔ اور اگر اللہ عزوجل کے دو ہاتھوں سے مراد دو قدرتیں لی جائیں تو اس آیت کا کیا معنی بنے گا کہ جس میں ارشاد ہے:

﴿وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللَّهِ مَغْلُولَةٌ غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ وَلُعِنُوا بِمَا قَالُوا بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ﴾ [المائدة: 64]

اور یہود کہتے ہیں کہ اللہ کا ہاتھ بندھا ہوا ہے۔ انہیں کے ہاتھ باندھے جائیں اور ایسا کہنے کے سبب ان پر لعنت کی گئی۔ اور اللہ عزوجل کے دونوں ہاتھ کھلے ہیں۔ وہ جس طرح چاہتا ہے خرچ کرتا ہے۔

پس ایسی صفات کے بارے معروف موقف تین ہیں۔ بعض لوگ بقیہ صفات باری تعالی میں بھی ظاہری لغوی معنی جاری کرتے ہیں اور اس کی کیفیت بیان نہیں کرتے اور یہ اسلاف کا موقف ہے۔ اسلاف سے مراد صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ دین رحمہم اللہ ہیں۔ بعض ایسی صفات میں تاویل کے قائل ہیں کہ ان میں مجازی معنی مراد لیا جائے گا اور یہ متاخرین کا موقف ہے۔ مولانا پیر کرم شاہ صاحب رحمہ اللہ ﴿خَلَقْتُ بِيَدَيَّ﴾ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

"اس کا لفظی معنی تو یہ ہے کہ جس کو میں نے اپنے دو ہاتھوں سے پیدا فرمایا۔ کیا اللہ تعالیٰ کے بھی ہاتھ ہیں؟ اسلاف کا مسلک یہ ہے کہ وہ ان کلمات کی تاویل نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں کہ ہاں اللہ تعالیٰ کے دو ہاتھ ہیں جس طرح آیت میں مذکور ہے۔ لیکن وہ کیسے ہیں۔ ان کی حقیقت کیا ہے ہمیں اس کی خبر نہیں۔ اللہ تعالیٰ خود ہی ان کی حقیقت کو جانتا ہے۔ اور متاخرین علماء کہتے ہیں کہ اس سے

مراد یہ ہے کہ دوسرے انسانوں کو میں نے ماں باپ کے واسطہ سے پیدا کیا، لیکن آدم کو بلاواسطہ محض اپنی قدرت سے پیدا فرمایا۔ تو یہاں ید کا معنی قدرت ہے اور یہ استعمال لغت عرب میں عام ہے۔"[1]

برصغیر کے جید حنفی عالم دین مولانا عبد الحی لکھنوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اس باب میں علما کے چند مسلک ہیں: ایک مسلکِ تاویل کہ استوا بمعنی استیلا اور ید بمعنی قدرت اور وجہ بمعنی ذات، وعلیٰ ہذا القیاس اور یہی مختار اکثر متاخرین متکلمین کا ہے۔ دوسرا مذہب: تشابہ فی المعنی وفی الکیفیۃ۔ تیسرا مسلک: معلوم المعنی، تشابہ الکیفیہ۔ اور حق ان میں مسلکِ ثالث ہے اور یہی مذہب صحابہ وتابعین و ائمہ مجتہدین و محدثین وفقہا واُصولیین محققین ہے۔"[2]

بعض تفویض کے قائل ہیں کہ ہم نہ تو ان صفات کی تاویل کریں گے اور نہ ہی ان کا لغوی معنی بیان کریں گے[3] لیکن یہ موقف بھی درست نہیں ہے۔ اس بارے درست موقف وہی ہے، جو سلف صالحین کا ہے۔ مثال کے طور قرآن مجید میں سات مقامات پر اس صفت کا ذکر ہے کہ اللہ عزوجل اپنے عرش پر مستوی ہوئے۔ اب بعض لوگ اس کی تاویل کرتے ہیں کہ اگر ہم نے یہ مان لیا کہ اللہ عزوجل عرش پر ہے تو اس سے یہ لازم آئے گا، وہ آئے گا، جبکہ سلف اس کو ایسے ہی مانتے تھے جیسا کہ یہ قرآن مجید میں بیان ہوا ہے۔ حضرت یحیی بن یحی کہتے ہیں کہ ہم امام مالک رحمہ اللہ کے پاس بیٹھے تھے کہ ایک شخص نے سوال کیا کہ اللہ عرش پر کس طرح مستوی ہے تو امام مالک رحمہ اللہ کو یہ سوال سن کر پسینے چھوٹ گئے اور انہوں نے اپنا سر جھکا لیا اور تھوڑی دیر بعد فرمایا:

الِاسْــتِوَاءُ غَيْرُ مَجْهُولٍ، وَالْكَيْفُ غَيْرُ مَعْقُولٍ، وَالْإِيمَانُ بِهِ وَاجِبٌ،

---

[1] پیر کرم شاہ، مولانا، تفسیر ضیاء القرآن، ضیاء القرآن پبلیکیشنز، لاہور، 252/4

[2] سلیم اللہ خان، مولانا، ماہنامہ وفاق المدارس، نومبر 2010ء، ص 9

[3] مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے تفسیر عثمانی میں اور مولانا سلیم اللہ خان صاحب نے ماہنامہ وفاق المدارس کے ایک مجلہ میں شائع شدہ مضمون میں یہی موقف اختیار کیا ہے۔

وَالسُّؤَالُ عَنْهُ بِدْعَةٌ، وَمَا أَرَاكَ إِلَّا مُبْتَدِعًا، فَأَمَرَ بِهِ أَنْ يَخْرُجَ.[1]

"اللہ کا عرش پر مستوی ہونا معلوم ہے۔ اور اس کی کیفیت کیا ہے، یہ عقل میں نہیں آسکتی۔ اور اس کے عرش پر مستوی ہونے پر ایمان لانا واجب ہے۔ اور اس کے بارے مزید سوال کرنا بدعت ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ تو بھی بدعتی ہے۔ پس امام مالک رحمہ اللہ نے اس شخص کے بارے حکم دیا کہ اسے ان کی مجلس سے اٹھا دیا جائے تو اسے ان کی مجلس سے اٹھا دیا گیا۔"

پس ایک خدا وہ ہے کہ جس کا تعارف قرآن مجید اور احادیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود ہے۔ اور ایک خدا وہ ہے کہ جو انسانوں نے قرآن مجید اور احادیث سے اپنے ذہن کے مطابق نکالا ہے۔ اور جو انسانوں نے نکالا ہے تو ان میں آپس میں بھی اختلاف ہے کہ اسماء وصفات میں جہمیہ کچھ کہتے ہیں، معتزلہ کا کچھ موقف ہے، اشاعرہ کا اور موقف ہے اور ماتریدیہ کا اور۔ کچھ فلسفی جب خدا کو مانتے ہیں تو خدا کی حقیقت ان کے نزدیک علۃ العلل (The Prime Mover) سے زائد کچھ نہیں ہوتی۔ اسی طرح جب کچھ سائنسدان خدا کو مانتے ہیں تو خدا کی حقیقت ان کے نزدیک ایک ریاضیاتی دماغ (mathematical mind) کی سی ہوتی ہے۔ اسی طرح مسلمانوں میں بھی بعض گروہوں نے خدا کو مان تو لیا لیکن ان کے نزدیک خدا نہ بول سکتا ہے، نہ سن سکتا ہے، نہ بلند ہو سکتا ہے، نہ اتر سکتا ہے، نہ جا سکتا ہے، نہ آ سکتا ہے۔[2] یہ جمیع تصورات خدا کے ناقص تصورات ہے اور انسانوں کے بنائے ہوئے تصورات ہیں۔ خدا کا صحیح تصور وہی ہے جو کتاب وسنت میں بیان ہو گیا ہے۔

---

[1] البیهقي، أحمد بن الحسين بن علي الخراساني، (المتوفى: 458هـــ)، الاعتقاد والهداية إلى سبيل الرشاد على مذهب السلف وأصحاب الحديث، دار الآفاق، بيروت، الطبعة الأولى، 1401ھ، ص 116

[2] قرآن مجید کا بیان یہ ہے کہ قیامت والے دن آپ کا رب اور فرشتے آسمانوں سے ہماری زمین پر نازل ہوں گے اور یہ زمین اللہ عزوجل کے نور سے روشن ہو جائے گی۔ [الفجر: 22؛ الزمر: 69] اب اس کا معنی واضح ہے لیکن بہت سے لوگ ایسی آیات کی تاویل کرتے ہیں۔ اور امر واقعہ یہ ہے کہ تاویل کرنے سے وہ أحوال پیدا نہیں ہوتے کہ جو ان صفات کو جیسا کہ وہ ہیں، مان لینے سے انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم نے یہ بات کہی تھی کہ توحید کے باب میں سلفیت میں جو أحوال نصیب ہوتے ہیں، وہ کسی دوسری فکر میں نصیب نہیں ہوتے۔

پس کتاب وسنت میں اللہ عزوجل کی صفات کی جب تاویل کی جاتی ہے تو انسان ایک ایسے خدا پر ایمان لا رہا ہوتا ہے کہ جو خود اس کے ذہن کی تخلیق ہو۔ بعض لوگ کتاب وسنت سے خدا کا تصور بناتے ہیں کہ جہاں وہ لے جائے، بس ہمارا خدا وہی ہے۔ اور بعض لوگ پہلے سے اپنے ذہن میں خدا کا ایک تصور رکھتے ہیں اور پھر اگر کتاب وسنت کا خدا اس کے خلاف ہو تو نصوص کی تاویل کر اسے اپنے ذہن کے خدا کے مطابق بنا لیتے ہیں۔ ہمیں حکم اس خدا پر ایمان لانے کا ہے جو محمد رسول اللہ ﷺ کا خدا ہے نہ کہ اپنے ذہن کے خدا پر۔ اور محمد رسول اللہ ﷺ کا خدا وہی ہے کہ جو کتاب وسنت میں بیان ہو چکا ہے، اور جس پر صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ دین رحمہم اللہ کا ایمان تھا کہ وہ خیر القرون میں سے تھے۔

پس قرآن مجید اور احادیث میں اللہ کا جو تعارف کروایا گیا ہے، اس کی تاویل نہیں کرنی چاہیے کہ اس سے اللہ کی حقیقی معرفت کبھی حاصل نہ ہو گی۔ اس کی تفصیل ہم نے اپنی زیر ترتیب کتاب "وجود باری تعالی" میں بیان کر دی ہے۔ اگر غور کریں تو توحید ربوبیت انسان کے عقلی شعور، توحید عبودیت نفسیاتی شعور اور توحید اسماء وصفات جمالیاتی شعور کی تسکین ہے اور اسماء وصفات کی تاویل اور تفویض کے ذریعے اس شعور کی تسکین اور سیرابی کے جمیع رستے بند کر دیے گئے ہیں۔[1] صفات میں تاویل کرنے سے خدا کوئی ذات نہیں محسوس ہوتا بلکہ یوں لگتا ہے کہ جیسے کوئی روشنی اور لہر ہے جو ہر جگہ موجود ہے۔

نماز اور تزکیہ

قرآن مجید کے مطابق نماز انسان کو برائی اور بے حیائی کے کاموں سے روکتی ہے۔

[1] توحید أسماء وصفات کے بارے ائمہ اربعہ یعنی امام أبو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور صاحبین یعنی قاضی أبو یوسف اور امام محمد رحمہم اللہ کا عقیدہ یہی ہے کہ وہ اس میں ظاہری لغوی معنی کو جاری کرتے ہیں اور کیفیت بیان نہیں کرتے۔ اس بارے ہم نے ماہنامہ محدث مارچ 2011ء کے شمارے میں اپنے ایک مضمون "کیا صفات الہیہ میں ائمہ اربعہ مفوضہ ہیں؟" میں تفصیلی گفتگو کی ہے۔

اب بہت سے نمازی ایسے ہیں کہ وہ نماز بھی پڑھتے ہیں اور برائی سے بھی نہیں رکتے۔ نمازی بھی ہیں اور بے حیائی سے بھی باز نہیں آتے۔ پس واضح رہے کہ وہی نماز انسان کو برائی اور بے حیائی سے روکتی ہے کہ جو خشوع والی نماز ہو۔ خشوع سے مراد دل کی وہ نرمی، رقت، عاجزی اور انکساری ہے کہ جس کا اظہار انسان کے اعضاء سے بھی ہو رہا ہو۔ حضرت سعید بن مسیب رحمہ اللہ نے ایک شخص کو نماز میں ڈاڑھی سے کھیلتے دیکھا تو کہا کہ اگر اس کے دل میں خشوع ہوتا تو اس کے اعضاء سے بھی اس کا اظہار ضرور ہوتا۔[1]

نماز میں خیالات یا وساوس کا آنا ایک عام بیماری ہے کہ اس امت میں سب سے پہلا خیر جو اٹھالیا جائے گا، وہ خشوع ہی ہے۔ حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«إِنْ شِئْتَ لَأُحَدِّثَنَّكَ بِأَوَّلِ عِلْمٍ يُرْفَعُ مِنَ النَّاسِ؟ الخُشُوعُ، يُوشِكُ أَنْ تَدْخُلَ مَسْجِدَ جَمَاعَةٍ فَلَا تَرَى فِيهِ رَجُلًا خَاشِعًا»[2]

"اگر تم چاہو تو میں تمہیں اس علم کے بارے بھی بتلا دوں کہ جو لوگوں میں سب سے پہلے اٹھا یا جائے گا۔ اور وہ خشوع ہے۔ تم کسی ایسی مسجد میں جاؤ گے کہ جہاں جماعت سے نماز ہو رہی ہو اور تمہیں ایک شخص بھی ایسا نظر نہیں آئے گا کہ جس میں خشوع ہو۔"

خشوع دو قسم کا ہے؛ ایک اخلاص کا اور دوسرا ریاکاری کا۔ اخلاص کا خشوع وہ ہے کہ جس کا اظہار مجلس اور تنہائی دونوں میں ایک جیسا ہو۔ پس خشیت کی جو کیفیت مجلس میں پیدا ہو، تنہائی میں اس سے بہتر یا کم از کم اس جیسی ہی کیفیت پیدا ہوتی ہو۔ اس کے برعکس ریاکاری کا خشوع وہ ہے کہ جس کا اظہار صرف مجلس میں ہوتا ہے۔ پس اگر مجلس میں تو خشیت طاری ہوتی ہو لیکن تنہائی میں نہ ہوتی ہو تو یہ ریاکاری کا خشوع ہے۔

بعض اوقات انسان نماز میں کسی ایسے شخص کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے کہ جو اس کا جان پہچان والا ہو۔ پس اس کی موجودگی کی وجہ سے انسان کا دھیان اور اعضاء کا سکون نماز میں

---

[1] ابن أبي شيبة، عبد الله بن محمد بن إبراهيم بن عثمان العبسي۔ الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار، مكتبة الرشد، الرياض، 1409ھ، 86/2

[2] سنن الترمذي، أَبْوَابُ العِلْمِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، بَابُ مَا جَاءَ فِي ذَهَابِ العِلْمِ، 31/5

بڑھ جاتا ہے لہذا یہ ریاکاری کا خشوع ہی معلوم ہوتا ہے کہ جس کا مصدر شیطان ہے۔ بعض اہل علم کا کہنا ہے کہ بعض اوقات گھر میں مہمان آئے ہوں تو انسان غیر ارادی طور تہجد پڑھنے یا رکعتیں لمبی کرنے لگ جاتا ہے تو یہ بھی ریاکاری کا خشوع ہے۔ ریاکاری کا خشوع یہ بھی ہے کہ جماعت کرواتے ہوئے امام صاحب کو رونا آئے یا رقت طاری ہو جبکہ تنہائی کی نماز میں نہ آنسو جاری ہوں اور نہ ہی دل کی نرمی حاصل ہوتی ہو۔ بہر حال ہمارا موضوع اس وقت اخلاص کا خشوع ہے جو نماز میں اصل مقصود ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے:

«إِنَّ الرَّجُلَ لَيَنْصَرِفُ وَمَا كُتِبَ لَهُ إِلَّا عُشْرُ صَلَاتِهِ تُسْعُهَا ثُمْنُهَا سُبْعُهَا سُدْسُهَا خُمْسُهَا رُبْعُهَا ثُلُثُهَا نِصْفُهَا»[1]

"لوگ نماز پڑھ کر جب واپس ہوتے ہیں تو ان میں سے بعض کے لیے نماز کے ثواب میں سے دسواں حصہ، بعض کے لیے نواں، بعض کے لیے آٹھواں، بعض کے لیے ساتواں، بعض کے لیے چھٹا، بعض کے لیے پانچواں، بعض کے لیے چوتھا، بعض کے لیے تیسرا اور بعض کے لیے آدھا لکھا جاتا ہے۔"

اس روایت میں خطاب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہے لہذا معلوم ہوا کہ ایک ہی جیسی ظاہری صورت، وقت اور مقام میں نماز پڑھنے کے باوجود ثواب میں فرق رہ جاتا ہے اور ثواب کا یہ فرق نماز میں انسان کی قلبی توجہ اور ذہنی یکسوئی میں اختلاف کی وجہ سے ہوتا ہے۔ پس خشوع کی کمی سے ثواب کم اور خشوع کی زیادتی سے ثواب بڑھ ہو جاتا ہے۔

نماز میں خشوع کیسے حاصل ہو؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ بعض اہل علم نے اس سوال کے جواب میں نماز میں خشوع و خضوع کے حصول کے طریقے بیان کر دیے ہیں۔ یہ ایک مفید بحث ہے لیکن ہماری رائے میں خشوع و خضوع کی تدابیر اختیار کرنے سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ غور کیا جائے کہ نماز میں خشوع و خضوع کے حصول میں رکاوٹیں (hindrances) کیا ہیں، اور پہلے انہیں دور کیا جائے اور پھر تدبیر پر عمل کیا جائے جیسا کہ ہم تخلیہ اور تحلیہ کے عنوان کے تحت اس بارے گفتگو کر چکے ہیں۔

---

[1] سنن أبي داود، أَبْوَابُ تَفْرِيعِ اسْتِفْتَاحِ الصَّلَاةِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي نُقْصَانِ الصَّلَاةِ، 211/1

نماز میں خشوع وخضوع کے موانع (hindrances) دو قسم کے معلوم ہوتے ہیں: ایک خارجی اور دوسرے داخلی۔ خارجی رکاوٹوں کی مثالوں میں جیسا کہ شیطان ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ سے ایک صحابی نے نماز میں وساوس زیادہ آنے کی شکایت کی تو آپ نے کہا کہ یہ "خنزب" شیطان ہے۔ بس نماز سے پہلے اس سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو۔ تو اس کا علاج تو اللہ کے رسول ﷺ نے بتلا دیا اور ان صحابی کو اس کے بعد کوئی وسوسہ محسوس بھی نہ ہوا۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ حضرت عثمان بن ابی العاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا:

«يَا رَسُولَ اللهِ إِنَّ الشَّيْطَانَ قَدْ حَالَ بَيْنِي وَبَيْنَ صَلَاتِي وَقِرَاءَتِي يَلْبِسُهَا عَلَيَّ» فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «ذَاكَ شَيْطَانٌ يُقَالُ لَهُ خَنْزَبٌ، فَإِذَا أَحْسَسْتَهُ فَتَعَوَّذْ بِاللهِ مِنْهُ، وَاتْفِلْ عَلَى يَسَارِكَ ثَلَاثًا» قَالَ: «فَفَعَلْتُ ذَلِكَ فَأَذْهَبَهُ اللهُ عَنِّي»[1]

"اے اللہ کے رسول ﷺ! شیطان میرے اور میری نماز اور میری قراءت کے مابین حائل ہو جاتا ہے اور اس کو مجھ پر خلط ملط کر دیتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس شیطان کا نام "خنزب" ہے۔ پس جب تجھے ایسا محسوس ہو تو اس سے اللہ کی پناہ مانگ لیا کرو اور اپنے بائیں طرف تین مرتبہ ہلکا سا تھوک دیا کرو۔ صحابی کہتے ہیں کہ میں نے ایسا ہی کیا تو وہ شیطان مجھ سے جاتا رہا۔"

ہم میں سے اکثر کو یہ شکایت ہوتی ہے کہ وہ خنزب شیطان سے پناہ بھی مانگ لیتے ہیں اور دل پر پھونک بھی مار لیتے ہیں لیکن پھر بھی وساوس جاری رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے خشوع وخضوع کی رکاوٹیں ایک سے زائد یا دیگر نوعیتوں کی بھی ہیں۔

خارجی رکاوٹ کی مثال کوئی دنیاوی ضرورت یا حاجت ہو سکتی ہے۔ اس کا علاج بھی یہ ہے کہ انسان کو اگر کوئی دنیاوی ضرورت یا حاجت پریشان کر رہی ہو تو پہلے اسے پورا کرے اور پھر نماز پڑھے تو نماز میں توجہ بہت بڑھ جائے گی، ان شاء اللہ۔ جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے بول وبراز کی ضرورت یا نیند کے غلبے کی حالت میں پہلے حاجت پوری

[1] صحیح مسلم، كتاب السَّلَامِ، بَابُ التَّعَوُّذِ مِنْ شَيْطَانِ الْوَسْوَسَةِ فِي الصَّلَاةِ، 1728/4

کرنے اور پھر نماز پڑھنے کا حکم دیا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«لَا يُصَلِّيَنَّ أَحَدُكُمْ بِحَضْرَةِ الطَّعَامِ، وَلَا وَهُوَ يُدَافِعُهُ الْأَخْبَثَانِ»[1]

"تم میں کوئی اس حالت میں نماز نہ پڑھے کہ کھانا اس کے سامنے موجود ہو یا وہ بول و براز کو روکنے کی کوشش کر رہا ہو۔"

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

«إِذَا نَعَسَ أَحَدُكُمْ وَهُوَ يُصَلِّي فَلْيَرْقُدْ، حَتَّى يَذْهَبَ عَنْهُ النَّوْمُ، فَإِنَّ أَحَدَكُمْ إِذَا صَلَّى وَهُوَ نَاعِسٌ، لاَ يَدْرِي لَعَلَّهُ يَسْتَغْفِرُ فَيَسُبُّ نَفْسَهُ»[2]

"جب تم میں سے کوئی نماز میں اونگھے تو اسے چاہیے کہ وہ پہلے سو جائے، یہاں تک کہ اس کی نیند پوری ہو جائے۔ پس جب کوئی تم میں سے اونگھ کی حالت میں نماز پڑھے گا تو اسے یہ معلوم نہ ہو گا کہ وہ استغفار کر رہا ہے یا اپنے کو آپ لعن طعن کر رہا ہے۔"

سنن اور نوافل میں تو ہم یہ اہتمام کر لیں کہ دنیاوی حاجت سے فراغت کے بعد ہی نماز پڑھنے کی کوشش کریں جیسا کہ اگر ہم نے عشاء کے وقت گھر والوں کے ساتھ کہیں آؤٹنگ یا کھانا کھانے کے لیے جانا ہے تو فرض مسجد میں پڑھ کر نکل آئیں۔ پھر واپس گھر آ کر سونے سے پہلے فراغت کی حالت میں عشاء کی سنتیں اور وتر ادا کریں۔

فرائض میں البتہ جماعت کی پابندی لازم ہے۔ اگر جماعت نکل گئی تو پھر اگر کام ایسا ہے کہ نماز میں وہی ذہن پر غالب رہے گا تو پہلے کام کر لے اور نماز کو دیر سے ادا کر لے لیکن منتہی اوقات (the end of the time) سے باہر نہ جائے کہ نماز قضا ہو جائے کیونکہ یہ گناہ کبیرہ ہے۔ اور اگر کوئی پریشانی ذہن پر چھائی ہوئی ہو تو اس کا ایک علاج یہ بھی ہے کہ نماز میں اذان کے فوراً بعد مسجد میں حاضر ہو جائے کہ اسے فرض نماز سے پہلے دس منٹ مل جائیں۔ پانچ منٹ میں دو رکعت نفل نماز پڑھے اور بقیہ پانچ منٹ میں

---

[1] مسند الإمام أحمد بن حنبل: 507/40

[2] صحيح بخاري، كِتَابُ الوُضُوءِ، بَابُ الوُضُوءِ مِنَ النَّوْمِ، 53/1

اذکار میں دل لگانے کی کوشش کرے تو فرض نماز میں اسے توجہ حاصل ہو جائے، ان شاء اللہ۔ اور اگر فرض نماز کے لیے پہنچا ہی تاخیر سے ہے کہ جماعت کی نماز کھڑی ہے تو اب یہی کرے کہ ذہن کو حاضر رکھنے کے لیے اپنے نفس سے ممکن مجاہدہ کرے۔ اس سے اگرچہ غالب توجہ نہ بھی حاصل ہو لیکن کسی قدر ضرور حاصل ہو جائے گی اور مذکورہ بالا حدیث کے الفاظ میں اتنی توجہ نہ بھی ہو کہ جس سے نصف ثواب حاصل ہوتا ہو لیکن اس مجاہدے کی بدولت کم از کم دسویں حصے سے کسی بڑے درجے میں ثواب لینے کا حقدار تو ضرور بن جائے گا۔

پس خارجی رکاوٹیں تو یہی دو معلوم ہوتی ہیں: ایک شیطان اور دوسرا انسانی حاجات وضروریات اور دونوں کے علاج کے بارے گفتگو کسی قدر ہو چکی ہے۔ پہلے رکاوٹ کا تعین کریں کہ شیطانی وسوسے ہیں یا دنیاوی پریشانیاں اور پھر اس کا علاج کریں تو فائدہ ضرور ہو گا، تو ان شاء اللہ۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

> «مَنْ تَوَضَّأَ نَحْوَ وُضُوئِي هَذَا، ثُمَّ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ لَا يُحَدِّثُ فِيهِمَا نَفْسَهُ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ»[1]
>
> "جس نے میرے طریقے کے مطابق وضو کیا اور اس کے بعد دو رکعتیں پڑھیں اس طرح کے ان دو رکعتوں میں اس نے اپنے نفس کے ساتھ کوئی گفتگو نہ کی ہو [یعنی مکمل توجہ اللہ ہی کی طرف رہی ہو] تو اللہ سبحانہ وتعالی اس کے سابقہ تمام گناہوں کو معاف کر دیتے ہیں۔"

نماز میں احسان

نماز میں ایسے خیال کا آنا جو انسان کو اللہ کے حضور اور اس کے سامنے کھڑے ہونے کے تصور سے نکال دے، احسان کے منافی ہے۔ حدیث جبریل علیہ السلام میں ہے کہ احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی ایسے عبادت کرو جیسے تم اللہ کو دیکھ رہے ہو یا ایسے جیسے اللہ تعالی تمہیں دیکھ رہے ہوں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

---

[1] صحیح مسلم، كِتَابِ الطَّهَارَةِ، بَابُ صِفَةِ الْوُضُوءِ وَكَمَالِهِ، 205/1

قَالَ: مَا الإِحْسَانُ؟ قَالَ: «أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ»[1]

”حضرت جبریل علیہ السلام نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ احسان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: کہ تم اللہ کی ایسے عبادت کرو گویا کہ تم اسے دیکھ رہے ہو، پس اگر تم اسے دیکھ نہ سکو تو وہ تو تمہیں دیکھ ہی رہا ہے۔“

احسان کا لفظ حسن سے نکلا ہے، پس احسان دراصل عبادت میں حسن پیدا کرنے کا نام ہے۔ اللہ کو دیکھنے سے مراد یہ نہیں ہے کہ انسان اللہ کے بارے کوئی تصویر (image) اپنے ذہن میں قائم کر لے اور اسے اپنا رب سمجھ لے۔ ایسا خدا جو انسان کی سوچ میں آ جائے، انسانی ذہن کی تخلیق (creation) ہو گا۔

اس حدیث سے مراد صرف اتنی ہے کہ اگر وہ شخص اللہ کے سامنے کھڑا ہو کر اللہ کو دیکھ رہا ہوتا تو اس میں اللہ کی خشیت کی کیفیات اور اللہ کی محبت کے احوال کیسے ہوتے؟ تو ایسی ہی خشیت کی کیفیات اور محبت کے احوال کے ساتھ نماز ادا کرے تو یہ احسان کا افضل درجہ ہے۔ اور احسان کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ اللہ اسے دیکھ رہا ہے، تو اس تصور کے ساتھ اللہ کی خشیت کی جو کیفیات اور اللہ کی محبت کے جو احوال پیدا ہوں تو ان کے ساتھ نماز ادا کرے۔ اور یہی احسان والی نماز ہے۔

اور اللہ کی خشیت کی کیفیات اور محبت کے احوال اسی وقت پیدا ہوتے ہیں جبکہ دوران نماز انسان کا دل اور دماغ دونوں اللہ کی طرف یکسو (focused) ہوں۔ اور اگر یہ دونوں اللہ کی طرف یکسو نہ ہو رہے ہوں تو انہیں یکسو کرنے کے لیے جو محنت اور کوشش کرے گا تو اسے مجاہدہ کہتے ہیں کہ جو خود ایک نیکی ہے۔

نماز میں انسان کو اللہ کے سوا کی جو سوچ آتی ہے، وہ اپنے موضوع کے اعتبار سے دو قسم کی ہے: ایک دینی اور دوسری دنیاوی۔ احسان کی اعلی ترین صورت تو یہی ہے کہ انسان نماز میں دینی اور دنیاوی دونوں قسم کی سوچ سے دور رہے اور اس کی سوچ، اللہ کی خشیت اور اللہ کی محبت کے ساتھ، صرف اُسی کی طرف یکسو ہو۔ منافقین کے بارے

[1] صحيح بخاري، كِتَابُ الإِيمَانِ، بَابُ سُؤَالِ جِبْرِيلَ النَّبِيَّ عَنِ الإِيمَانِ، وَالإِسْلاَمِ، وَالإِحْسَانِ، 19/1

قرآن مجید کا ارشاد ہے:

﴿وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كُسَالَى يُرَاءُونَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا﴾ [النساء: 142]

"اور جب وہ نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو سستی اور کاہلی کے ساتھ کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ لوگوں کے لیے دکھلاوا کرتے ہیں۔ اور [نماز میں] اللہ عزوجل کو بہت تھوڑا یاد رکھتے ہیں۔"

پس اس آیت مبارکہ میں یہ اشارہ ہے کہ نماز میں صرف اللہ ہی کی ذات کو یاد رکھنا چاہیے، دل سے بھی اور دماغ سے بھی۔ ہم یہ بھی واضح کر دیں کہ نماز میں بعض اوقات اللہ کے غیر کی سوچ کا آجانا احسان اور خشوع کے منافی نہیں ہوتا مثلاً نماز میں قرآن مجید کے معانی پر غور کرنا۔ اللہ کے رسول ﷺ کے بارے کئی ایک احادیث میں مروی ہے کہ آپ کو حالت نماز میں جنت یا جہنم کا مشاہدہ کروایا گیا۔ جب یہ مشاہدہ خود حق سبحانہ وتعالی کی طرف سے کروایا گیا تھا تو اس سے یہ ثابت ہوا کہ نماز میں سوچ اگر دینی ہو یا ایسی ہو کہ وہ اللہ کی ذات کی تو نہ ہو لیکن اللہ کی ذات کی طرف متوجہ کرنے والی ہو تو ایسی سوچ احسان اور خشوع کے منافی نہیں ہوتی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: انْخَسَفَتِ الشَّمْسُ عَلَى عَهْدِ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَصَلَّى رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ...قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ، رَأَيْنَاكَ تَنَاوَلْتَ شَيْئًا فِي مَقَامِكَ ثُمَّ رَأَيْنَاكَ كَعْكَعْتَ؟ قَالَ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «إِنِّي رَأَيْتُ الجَنَّةَ، فَتَنَاوَلْتُ عُنْقُودًا، وَلَوْ أَصَبْتُهُ لَأَكَلْتُمْ مِنْهُ مَا بَقِيَتِ الدُّنْيَا، وَأُرِيتُ النَّارَ، فَلَمْ أَرَ مَنْظَرًا كَاليَوْمِ قَطُّ أَفْظَعَ»[1]

"حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ کے دور میں سورج گرہن لگا تو آپ نے نماز پڑھائی... صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا کہ ہم نے آپ کو دیکھا ہے کہ آپ [نماز میں] اپنی جگہ پر کوئی چیز پکڑ رہے تھے اور پھر ہم نے آپ کو دیکھا کہ آپ الٹے قدموں واپس پلٹ رہے تھے۔ آپ ﷺ نے

[1] صحيح بخاري، أَبْوَابُ الكُسُوفِ، بَابُ صَلاَةِ الكُسُوفِ جَمَاعَةً، 37/2

فرمایا: بیشک میں نے جنت دیکھی تو میں نے اس سے ایک خوشہ پکڑنا چاہا اور اگر میں اسے لے لیتا تو آپ لوگ اسے رہتی دنیا تک کھاتے رہتے۔ اور مجھے جہنم دکھائی گئی اور میں نے آج تک اس جیسا خوفناک منظر نہیں دیکھا۔"

اسی طرح امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

قول عمر: إِنِّي لَأُجَهِّزُ جَيْشِي وَأَنَا فِي الصَّلَاةِ. فَهَذَا جَمْعٌ بَيْنَ الْجِهَادِ وَالصَّلَاةِ. وَنَظِيرُهُ التَّفَكُّرُ فِي مَعَانِي الْقُرْآنِ وَاسْتِخْرَاجُ كُنُوزِ الْعِلْمِ مِنْهُ فِي الصَّلَاةِ، فَهَذَا جَمْعٌ بَيْنَ الصَّلَاةِ وَالْعِلْمِ، فَهَذَا لَوْنٌ، وَالْتِفَاتُ الْغَافِلِينَ اللَّاهِينَ وَأَفْكَارُهُمْ لَوْنٌ آخَرُ.[1]

"حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں مجاہدین کے لشکر نماز کے دوران تیار کرتا ہوں۔ پس اس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ جہاد اور نماز دونوں کو جمع کر لیتے تھے۔ اور اس کی مثال یہ بھی ہو سکتی ہے کہ انسان نماز کی حالت میں قرآن مجید کی آیات کے معانی پر غور کرے اور اس میں سے علم کے خزانے برآمد کرے۔ پس یہ ایک رنگ ہے۔ اور نماز کی حالت میں اللہ کی یاد سے غافل اور بے پرواہ لوگوں کا رنگ ایک دوسرا رنگ ہے۔"

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نماز اور جہاد کو جمع کر لیتے تھے کہ جو لشکر انہوں نے جہاد کی غرض سے بھیجنے ہوتے تھے، ان کی ترتیب نماز میں قائم کر لیتے تھے۔ شاید اس سے مقصود یہ بھی ہو کہ جہاد جیسے بابرکت کام کے فیصلے مقام قرب میں یعنی حالت نماز میں ہوں تاکہ اللہ کی رہنمائی موجود رہے اور استخارے کا جو مقصود ہے، وہ بھی حاصل رہے۔

تبلیغی جماعت کے امیر حضرت مولانا الیاس رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ وہ ایک مرتبہ نماز میں تبلیغی جماعتوں کی تشکیل کرتے رہے۔ لیکن انہوں نے اپنے لیے اس چیز کو اولی نہ سمجھا اور اس کا حل یہ نکالا کہ نماز سے پہلے کچھ دیر کا مراقبہ ہو جائے تاکہ نماز میں کامل یکسوئی حاصل رہے۔ شیخ بن باز رحمہ اللہ سے اس بارے سوال ہوا کہ اگر کوئی شخص جنت، جہنم، اپنی قبر یا موت کے بارے نماز میں سوچے تو کیا اس کا جواز ہے تو انہوں نے جواب

[1] زاد المعاد في هدي خير العباد: 243/1

دیا کہ اس میں کوئی حرج نہیں جب تک کہ نماز کے واجبات اور سنن میں کوتاہی نہ ہو۔[1]

مذکورہ بالا بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ ایسی دینی سوچ جو اللہ کے حضور میں رہنے میں رکاوٹ نہ بنے تو اس کا نماز میں آنا جائز ہے اور ایسی سوچ احسان اور خشوع کے منافی بھی نہیں ہے۔ نماز میں جنت اور جہنم، موت اور قبر، حالت قیام میں قرآن مجید کی آیات میں تذکر و تدبر یا سجدے اور رکوع کی تسبیح و مناجات میں غور و فکر وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جو انسان کو اللہ ہی کے حضور میں رکھتی ہیں۔

البتہ اگر کوئی ایسی دینی سوچ ہو جو انسان کو اللہ کے حضور سے نکال کر نفس کی طرف طرف متوجہ کر دے تو یہ احسان اور خشوع کے منافی ہو گی اور اس کا ازالہ بھی ضروری ہو گا۔ مثلاً اگر کوئی مناظر کسی جگہ مناظرہ کے لیے گئے ہیں اور نماز کے بعد مناظرہ متوقع ہے یا کوئی دوست فیس بک پر جاری کسی مذہبی بحث سے اٹھ کر نماز کے لیے گئے ہیں۔ اب اگر نماز میں انہیں فریق مخالف کو زیر کرنے کی دلیلیں ہی سوجھتی رہیں تو یہ ایسی سوچ ہے جو اگرچہ دینی تو ہے لیکن انسان کو اللہ کے حضور میں رہنے نہیں دیتی بلکہ فریق مخالف کے تصور میں ہی الجھائے رکھتی ہے لہذا نماز میں ایسی سوچ کا ازالہ ضروری ہے۔ یہ بظاہر دینی لیکن اپنی حقیقت میں دنیاوی سوچ ہی ہے کیونکہ انسان جس دینی عمل (activity) کو درمیان میں چھوڑ کر نماز کی طرف متوجہ ہوا ہے، اس کا محرک (motive) اکثر و بیشتر فریق مخالف کی خیر خواہی (well-wishing) سے زیادہ اپنی ذات کے غلبے کی خواہش (urge to dominate) ہوتی ہے۔

جہاں تک دنیاوی سوچ کا معاملہ ہے تو دنیا اور دنیا کے مال و اسباب کے بارے نماز میں سوچنا احسان اور خشوع کے منافی ہے۔ صحیح مسلم کی ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«فَإِنْ هُوَ قَامَ فَصَلَّى، فَحَمِدَ اللَّهَ وَأَثْنَى عَلَيْهِ، وَمَجَّدَهُ بِالَّذِي هُوَ لَهُ أَهْلٌ، وَفَرَّغَ قَلْبَهُ لِلَّهِ إِلاَّ انْصَرَفَ مِنْ خَطِيئَتِهِ كَهَيْئَتِهِ يَوْمَ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ»[2]

---

[1] عبد العزيز بن عبد الله بن باز، فتاوى نور على الدرب، المكتبة الشاملة، المكة المكرمة، 41/8

[2] صحيح مسلم، كِتَابُ صَلَاةِ الْمُسَافِرِينَ وَقَصْرِهَا، بَابُ إِسْلَامِ عَمْرِو بْنِ عَبَسَةَ، 569/1

"پس جو شخص [اچھی طرح وضو کر کے] نماز کے لیے کھڑا ہوا۔ اللہ کی حمد و ثنا اور بڑائی ایسے بیان کرے جیسا کہ اس کی شان کے لائق ہے۔ اور نماز میں اپنا دل اللہ ہی کے لیے فارغ کر لے تو نماز کے بعد اپنے گناہوں سے ایسے پاک ہو گا جیسا کہ اس کی ماں نے اسے گناہوں سے پاک جنا تھا۔"

انسان اپنی سوچ کے اعتبار سے یا تو منتشر خیال ہوتے ہیں یا یکسو۔ منتشر خیال وہ ہے کہ ایک خیال ذہن میں آئے اور دوسرا جائے۔ کبھی اِدھر کی بات یاد آئی کبھی اُدھر کی۔ کبھی خیالوں میں یہاں اور کبھی وہاں۔ اور یکسو اسے کہتے ہیں کہ جس کے ذہن پر ایک وقت میں ایک ہی خیال حاوی اور غالب رہتا ہو۔ منتشر خیال کے کرنے کے تو دو کام ہیں کہ ایک تو مجاہدے کے ساتھ اپنی سوچ کو یکسو کرے یعنی ایک نقطہ پر مرکوز کرے اور دوسرا یہ کہ اللہ کی طرف یکسو کرے۔ اور یکسو شخص کے کرنے کا ایک ہی کام ہے کہ اپنی یکسوئی کو مجاہدے کے ساتھ اللہ کی طرف منتقل کر دے۔

اس بارے اہم تر بات یہ ہے کہ انسان کے ذہن میں پیدا ہونے والی سوچ کا اس کے دل سے گہرا تعلق ہوتا ہے۔ انسانی ذہن میں اسی چیز کی سوچ پیدا ہوتی ہے کہ جس شیء کا اس کا دل طلبگار ہوتا ہے۔ اگر دل دنیا کا طالب ہے تو دنیا کی سوچ پیدا ہو گی، علم کا طالب ہے تو علم کی سوچ آئے گی۔ اسی طرح مال، مقام، عزت، جاہ میں جس چیز کا طلبگار ہو گا، وہ اس کے ذہن پر چھائی رہے گی۔ اگر اللہ کا طالب ہے تو اللہ کی سوچ غالب رہے گی۔ خارجی روکاوٹیں کہ جن کا ذکر اوپر گزر چکا، کو دور کرنے کے باوجود اگر نماز میں توجہ اور یکسوئی حاصل نہ ہو تو پھر مسئلہ طلب اور ارادے کا ہے کہ دل کس کا طلبگار ہے اور کس مرید ہے۔ انسان اپنی طلب اور ارادے کو درست کرے کیونکہ پروردگار کا ارشاد ہے:

﴿فَأَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ وَاسِعٌ عَلِيمٌ﴾ [البقرۃ: 115]

"پس تم جس طرف بھی رخ کر لو، اسی طرف اللہ کی ذات ہے۔ بلاشبہ اللہ عزوجل وسعت والا، علم والا ہے۔"

پس مالک تو یہ کہے کہ جس طرف بھی چلے جاؤ، خالق کو پا لو گے اور ہم قبلہ رخ ہو کر بھی رب کو نہ پا سکیں تو اِس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ ہم اپنے رب کو پا لینے میں سچے طلبگار

نہیں ہیں۔ جس میں سچی طلب ہے، اسے دکان، کاروبار اور بازار میں بھی رب کا دھیان حاصل رہے گا جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّـهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ يَخَافُونَ يَوْمًا تَتَقَلَّبُ فِيهِ الْقُلُوبُ وَالْأَبْصَارُ﴾ [النور: 37]

"یہ ایسے لوگ ہیں کہ انہیں اللہ کی یاد اور نماز پڑھنے اور زکوۃ ادا کرنے سے نہ تو تجارت اور نہ ہی خرید و فروخت غافل کر سکتی ہے۔ یہ لوگ اس دن سے ڈرتے رہتے ہیں کہ جس دن میں بہت سے دل اور بہت سی آنکھیں الٹ جائیں گی۔"

اب اگر انسان کو مسجد میں بھی رب نہ ملے یا وہ حالت نماز میں بھی اللہ کی یاد سے غافل رہے تو اس کا لازماً مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے رب کا سچا طالب نہیں ہے۔ اور کسی چیز کے لیے سچی طلب جب دل میں ہوتی ہے تو انسان اسے اپنے سینے میں محسوس کر سکتا ہے۔ اگر انسان کو نئے موبائل یا گاڑی کی طلب (desire) ہو اور وہ اس طلب یا خواہش کی موجودگی یا شدت کو محسوس کر سکتا ہے تو کیا رکاوٹ ہے کہ پروردگار کی سچی طلب ہو اور وہ اپنی موجودگی کا احساس نہ دلائے؟

پس نماز میں کامل توجہ اور یکسوئی اس وقت تک حاصل نہ ہو گی جب تک کہ اپنے رب سے ملاقات، مناجات اور گفتگو کی سچی طلب دل میں نہ ہو گی۔ دل میں طلب دنیا کی ہو اور نماز میں رب یاد آ جائے تو یہ ممکن نہیں ہے۔ دنیا کی خواہش ممنوع نہیں ہے لیکن جب یہ حد سے بڑھ جائے تو بہت ہی نقصان دہ ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«أَجْمِلُوا فِي طَلَبِ الدُّنْيَا، فَإِنَّ كُلًّا مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهُ»[1]

"دنیا کی خواہش میں اعتدال اور وقار پیدا کرو کیونکہ ہر شخص کو وہی مل کر رہنا ہے جو اس کی تقدیر میں ہے۔"

ہم بعض اوقات اپنے ظاہری دینی حلیے یا اعمال سے دھوکہ کھا جاتے ہیں کہ ہم اللہ کے طلبگار ہیں۔ یہ دھوکہ ایک عالم دین، خطیب، واعظ، مدرس قرآن، مجاہد، صوفی، مرشد، مذہبی رہنما، مفتی، شیخ الحدیث، مدرسہ کے ناظم اور انقلابی تحریک کے کارکن کو

[1] سنن ابن ماجة، أَبْوَابُ التِّجَارَاتِ، بَابُ الِاقْتِصَادِ فِي طَلَبِ الْمَعِيشَةِ، 274/3

بھی لگ جاتا ہے۔ انسان میں حقیقی دینداری اتنی ہی ہے جتنی کہ نماز میں اسے اللہ کے حضور میں حاضری نصیب ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ اگر اپنے وجود یا ارد گرد میں کچھ دینداری نظر آئے تو اس دینداری کی اصلاح کی فکر کرنی چاہیے۔

مفتی، عالم، مجاہد، صوفی، واعظ، خطیب، مرشد، لیڈر اور مدرس بننے سے پہلے کہیں یہ ضروری ہے کہ اللہ کا ایک عاجز بندہ بنا جائے اور یہی مقصود زندگی ہے۔ اور اگر بندگی کے ساتھ اضافی طور اللہ تعالی کسی کو اچھا عالم، مجاہد، مدرس یا مرشد بنا دیں تو یہ اللہ کی ایک نعمت ہے جس پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے لیکن یہ ہمیشہ ذہن میں مستحضر رہے کہ اس کے حصے کا کام عالم، مجاہد، مدرس اور مرشد بننے سے زیادہ بندہ بننے کا ہے، اور اس نے اصل محنت اسی مقصد کے حصول کے لیے کرنی ہے۔

ایک سالک اپنے دل میں اللہ کی سچی طلب کیسے بیدار کرے؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔ اب یہ بھی اللہ کی مہربانی ہے کہ ہمیں یہ طلب پیدا نہیں کرنی۔ اللہ نے یہ ہمارے دل میں پیدا کی ہوئی ہے، ہم نے اسے صرف بیدار کرنا ہے کیونکہ دنیا کی طلب میں ہم مالک کی طلب کو سلا دیتے ہیں اور چھپا دیتے ہیں۔ اس طلب کو بیدار کرنے کی کئی تدابیر ہو سکتی ہیں۔ ایک تدبیر تو یہ ہے کہ صبح کی نماز مسجد میں جماعت کے ساتھ ادا کریں اور کبھی کبھار نماز فجر کے بعد اشراق تک دعا و مناجات میں وقت گزاریں اور اشراق کی نماز پڑھ کر گھر تشریف لائیں۔ صبح کی بیداری کے بغیر اپنے دل میں سوئی ہوئی طلب کو بیدار کرنا بہت مشکل کام ہے۔

اور اگر اشراق تک دعا و مناجات میں مشغول رہنا مشکل محسوس ہو تو شام کے اوقات میں مثلاً عصر کے بعد کبھی کبھار قبرستان کی زیارت کر لی جائے اور وہاں کم از کم دس منٹ کسی عزیز کی قبر کے سرہانے کھڑے ہو کر قبرستان والوں کے حق میں دعائے مغفرت کر لیا کریں۔ ان دو تدابیر میں سے کسی ایک تدبیر پر بھی عمل کرنے سے اللہ کی طلب نہ صرف قلب میں بیدار ہو جائے گی بلکہ سینے میں روشن بھی ہو جائے گی، ان شاء اللہ۔ اور ذہن میں رہے کہ بندگی کی منازل طے کرنے کے لیے مجاہدہ تو شرط ہے ہی لہذا

فجر کی بیداری یا شام کی زیارت میں جو مجاہدہ ہے، اس سے نہ گھبرائے۔

نماز میں ذہنی اور قلبی یکسوئی

احمد جاوید صاحب کا کہنا ہے کہ انسانی ذہن کی تخلیق ایسے ہوئی ہے کہ وہ ہر پل سوچتا رہے لہذا سوچ اس کا جوہر اور مادہ ہے۔ اور سوچنا اس کا ایسا عمل ہے جو جبری ہے، پس انسان اس کا مکلف نہیں ہے کہ اس کے فطری خاصے کو تبدیل کرے۔ لہذا انسان سے ذہنی یکسوئی کا مطالبہ نہیں ہے بلکہ قلبی یکسوئی کا مطالبہ ہے۔ پس انسان نماز کی حالت میں اپنے ارادے، احساسات اور جذبات میں اللہ کے علاوہ کسی کو شریک نہ کرے جبکہ تصور میں تو شرکت ہو ہی جاتی ہے۔ نماز میں اللہ کے غیر کا خیال احسان کے منافی نہیں ہے لیکن غیر کا ارادہ یا اس کے بارے احساسات اور جذبات یہ احسان کے منافی ہے۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ لوگ دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو ذہن میں اچھے ہیں یعنی فلسفیانہ ذہن کے ہیں اور دوسرے وہ جو جذبات میں اچھے ہیں یعنی شاعرانہ مزاج رکھتے ہیں۔ دونوں نماز میں الفاظ پر غور کریں۔ ذہین آدمی الفاظ سے وہ معانی ذہن میں پیدا کرے جو اسے اللہ کے حضور میں رکھیں جیسا کہ نبی کریم ﷺ کا معمول تھا کہ تہجد میں عذاب کی آیات پر پناہ مانگتے اور بشارت کی آیات پر دعا مانگتے تھے۔ اور جو لوگ مزاج میں اچھے ہیں وہ الفاظ سے وہ نئے نئے احوال پیدا کریں جو انہیں اللہ کے حضور میں رکھیں جیسا کہ حدیث جبرئیل میں احسان کے احوال کا تذکرہ ہے۔ پہلی صورت نماز میں اللہ کو دیکھنے اور دوسری اللہ کے اسے دیکھنے کی ہو سکتی ہے۔ واللہ اعلم

حضرت شیخ الکل فی الکل علامہ نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ نماز پنجگانہ "لطائف خمسہ" اور تلاوت قرآن مجید "سلطان الاذکار" ہے۔[1] اس میں اگر ایک اور اضافہ کر دیا جائے کہ تنہائی کی دعا و مناجات ہی "مراقبہ" ہے تو یہ سلفی سلوک کا جامع

---

[1] سیّد نذیر حسین محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ، مشعر باصطلاح صوفیہ ومعارج ومدارج اہل سلوک، ترجمہ: مولانا عبد العزیز صمدن فرخ آبادی، جریدہ الواقعۃ کراچی، شمارہ (5 / 6) شوال، ذیقعد 1433ھ / ستمبر، اکتوبر 2012ء

منہج ہے۔ پس جس نے اپنے لطائف روشن کرنے ہیں تو وہ اپنی ہر نماز کو روشن کرنے کے لیے مجاہدہ کرے۔ جسے مراقبہ کا شوق ہے، وہ خلوت میں دعا و مناجات میں کثرت کرے۔ اور جسے اپنی اصلاح کے لیے ذکر کا رستہ اختیار کرنا ہے، وہ قرآن مجید کو سلطان الاذکار کی جگہ رکھے۔

مصلے کی کشش

جب مصلی آپ کو ایسے کھینچنے لگے جیسے مقناطیس لوہے کو تو اب مطلوب سلوک کی منازل طے ہو چکیں، اب تقرب الی اللہ کے لیے مزید کسی شوں شاں یا ھو ھا یا پیری مریدی کی ضرورت نہیں۔ ہاں! اب اگر ضرورت ہے تو اس بات کی کہ مخلوق خدا کا قرب حاصل کیا جائے، ان سے تعلق بنایا جائے، ان کی خدمت کی جائے، ان کے کام آیا جائے اور ان کو فائدہ پہنچایا جائے۔

خالق کا مقصد بھی اپنے بندوں کے تزکیہ نفس سے یہ نہیں ہے کہ سالک مصلے پر ہی بیٹھ جائے بلکہ یہ ہے کہ اس کا دل مصلے کی طرف مائل ہو اور ہاتھ مخلوق خدا کی خدمت میں مصروف ہو۔ یہی تزکیہ کا نبوی منہج اور سلوک کا قرآنی طریق کار ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَنَسٍ، أَنَّهُ قَالَ: «أُقِيمَتْ صَلَاةُ الْعِشَاءِ فَقَالَ رَجُلٌ: لِي حَاجَةٌ فَقَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُنَاجِيهِ حَتَّى نَامَ الْقَوْمُ - أَوْ بَعْضُ الْقَوْمِ - ثُمَّ صَلَّوْا»[1]

”حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عشاء کی نماز کے لیے اقامت کہی گئی کہ ایک شخص نے کہا: اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! مجھے آپ سے کام ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے ساتھ ایک طرف کھڑے ہو کر سرگوشی میں باتیں کرنے لگے یہاں تک بعض نمازی اونگھنے لگ گئے اور پھر آپ نے نماز پڑھائی۔“

اگر سالک کسی خاص ایمانی کیفیت میں خالق کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے دو رکعت

---

[1] صحيح البخاري كِتَابُ الْحَيْضِ بَابُ الدَّلِيلِ عَلَى أَنَّ نَوْمَ الْجَالِسِ لَا يَنْقُضُ الْوُضُوءَ، 284/1

نفل کی نیت باندھے یا مصحف کھولے یا تسبیح ہاتھ میں لے اور ادھر سے کوئی دنیاوی تقاضا اور ذمہ داری اسے مخلوق خدا کی متوجہ کرے تو ایسی صورت حال میں تنہائی کے سجدے کی گریہ وزاری سے بہت بہتر بلکہ لازم ہے کہ اپنے بلکتے بچے کو مطمئن کرنے میں اپنی بیوی کا ہاتھ بٹائے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «إِنِّي لَأَدْخُلُ فِي الصَّلَاةِ، فَأُرِيدُ إِطَالَتَهَا، فَأَسْمَعُ بُكَاءَ الصَّبِيِّ، فَأَتَجَوَّزُ مِمَّا أَعْلَمُ مِنْ شِدَّةِ وَجْدِ أُمِّهِ مِنْ بُكَائِهِ»[1]

"حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں نماز شروع کرتا ہوں اور میرا دل چاہتا ہے کہ میں نماز لمبی کروں لیکن اسی دوران پیچھے کسی بچے کے رونے کی آواز سنتا ہوں تو میں نماز مختصر کر دیتا ہوں کہ اس بچے کی وجہ سے اس کی ماں بے چین ہو گی۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اندھیرے کے وقت کی نمازوں میں عورتیں بھی مسجد نبوی میں جماعت کی نماز میں شامل ہو جاتی تھیں جیسا کہ آج بھی حرمین میں عورتوں کے لیے علیحدہ سے نماز کی جگہ مخصوص ہے۔ بعض عورتیں اپنے شیر خوار بچے بھی ساتھ لے آتی تھیں اور نماز میں ان بچوں میں سے کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دیتی تو آپ جماعت کی نماز مختصر فرما دیتے تھے۔

مخلوق خدا کی طرف متوجہ ہونے سے اگرچہ مصلے کے احوال اور کیفیات جاتی رہیں گی کہ ظاہر ہے کہ بچے کو چپ کروانے میں اب سجدے کی لذت کہاں؟ لیکن قرآنی سلوک یہی ہے کہ کیفیات اصل نہیں ہیں بلکہ فرائض اور ذمہ داریاں اصل ہیں۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ سے جب مرید یہ کہتے کہ حضرت ذکر میں لذت نہیں مل رہی تو وہ جواب میں کہتے کہ میاں لذت یہاں کہاں؟

جس نے عبادت کی لذت اور کیفیات کے حصول کو مقصد بنا لیا، وہ سخت غلطی پر ہے، چاہے کسی سلسلے کا مرشد ہی کیوں نہ ہو کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت حنظلہ

---

[1] صحيح بخاري، كِتَابُ الأَذَانِ، بَابُ مَنْ أَخَفَّ الصَّلاَةَ عِنْدَ بُكَاءِ الصَّبِيِّ، 143/1

رضی اللہ عنہ کو فرمایا تھا کہ یہ تو کبھی کبھی حاصل ہوتی ہیں۔اس کا ایک معنی یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ شریعت پر عمل اور جملہ فرائض اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ ان کیفیات کا دوام ممکن نہیں ہے کہ شریعت پر عمل سالک کو خالق سے زیادہ مخلوق کی طرف متوجہ رکھتا ہے۔واللہ اعلم

نیکی کی مارکیٹنگ

مشاہدے میں آیا ہے کہ خوش الحان واعظین کی ایک ایسی جماعت وجود میں آچکی ہے کہ جو نعت خواں حضرات کی طرح مسجد انتظامیہ سے ایڈوانس رقم طے کرتی ہے اور رقم کم ہونے کی صورت میں وقت دینے پر آمادہ نہیں ہوتی۔یہ واعظین رمضان کی ایک رات میں کئی کئی مساجد بھگتاتے ہیں۔وعظ کے دوران بار بار گھڑی کو دیکھتے ہیں اور جیسے ہی گھنٹہ پورا ہوا تو وعظ ختم کیونکہ مسجد والوں نے واعظ صاحب کو صرف ایک گھنٹے کا کرایہ دیا تھا۔مزید گھنٹوں کے لیے نئے معاہدے کی ضرورت پڑتی ہے۔

ایسے واعظین عموماً مدرسے سے چوتھی یا پانچویں کلاس کے بھگوڑے ہوتے ہیں یا مدرسہ کی تاریخ میں ان کا علمی ریکارڈ کوئی قابل ذکر چیز نہیں ہوتا لیکن آواز میں ترنم یا اسٹائل ہوتا ہے کہ جس کی وجہ سے لوگ انہیں پسند کرتے ہیں۔رٹے رٹائے قصے کہانیاں سناتے ہیں،ہیکیں لگاتے ہیں،لطائف اور چٹکلے چھوڑتے ہیں اور شعر و شاعری میں وقت پاس کرتے ہیں۔اپنی چاپلوسی کو پسند کرتے ہیں اور دو چار طالب علم ان کے آگے پیچھے ہوتے ہیں۔کوئی ان کی جوتیاں سیدھا کرے تو عجیب خوشی محسوس کرتے ہیں۔وعظ کے لیے آتے اور جاتے وقت مسجد کے حجرہ میں ان کی خوب خاطر مدارت ہوتی ہے۔بعض کا تو کھا کھا کر پیٹ اس قدر باہر آیا ہوتا ہے کہ کرتہ پھٹنے کو آئے۔

یہ واعظین رمضان کی طاق راتوں میں ٹائم پاس کرنے یا تفریح کا ایک بہترین ذریعہ بن چکے ہیں۔ان کے وعظ میں اصلاح اور تربیت نام کی چیز نہیں ہوتی۔ان کا بیان کیا ہوتا ہے بس قصے کہانیوں،شعر و شاعری،ہیکوں،مخالف مکتبہ فکر پر پھبتیاں کسنے کا معجون مرکب ہوتا ہے۔

یہی حال رمضان المبارک میں قراء کا بھی بن چکا ہے۔ دو چار طالب علموں کے جلو میں تشریف لاتے ہیں۔ ان کی آدھی نماز سر پر رکھے سعودی رومال کو سنبھالنے میں ہی گزر جاتی ہے۔ بعضے تو خوب گلا پھاڑتے ہیں اور بعض بتکلف رونے کی کوشش کرتے ہیں۔ خود بھی خوب خشوع وخضوع سے روتے ہیں اور لوگوں کو بھی رلانے میں پورا زور لگاتے ہیں۔ پورا سال خلوت میں جنہیں اپنے رب کے سامنے دو آنسو بہانے کی توفیق نصیب نہیں ہوتی وہ رمضان کی طاق راتوں میں ہزاروں کے مجمعے کو رلاتے ہیں۔ تنہائی میں اگر رونے میں تکلف کرے تو ایسا تکلف جائز ہے لیکن مجمع میں تکلف سے رو کر دکھلاوہ کرنا کون سی نیکی ہے؟

اور نعت خواں تو ان کے تو کیا کہنے! رمضان ہو یا غیر رمضان، ان کی حرکتیں برابر رہتی ہیں۔ کرائے کے اعتبار سے ان میں کئی درجے ہیں۔ نعت پڑھنے کے معقول معاوضہ کے علاوہ ایئر ٹکٹ، فائیو اسٹار ہوٹل میں قیام اور سامعین کی طرف سے پھینکی جانے والی ویلوں کا بھی تقاضا کرتے ہیں۔ اور ان کی نعت کیا ہے؟ دو چیزوں کا مرکب ہے، اپنے عاشق رسول ہونے کے دعوے اور دوسرے مسلک کے گستاخ رسول ہونے کے الزامات کا مجموعہ ہے۔ نعت کو مسلکی عصبیت اور مذہبی منافرت بھڑکانے کے لیے خوب استعمال کرتے ہیں اور نعت میں اللہ کے رسول ﷺ کا ذکر کم ہی کرتے ہیں۔

نعت میں خوب راگ الاپتے ہیں اور گانوں کی دھن پر نعت کہتے ہیں۔ بعض تو میوزک کا بھی خوب استعمال کرتے ہیں۔ بعض سٹیج پر تشریف لانے سے قبل گلہ صاف کرنے کے لیے سگریٹ نوشی اور تمباکو پان کھانے کا بھی اہتمام فرماتے ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کے نام کو خوب بیچ رہے ہیں اور آپ ﷺ کا نام بیچ کر خوب دنیا بنا رہے ہیں۔ ساری رات نعت پڑھیں کریں گے اور صبح کی نماز قضا کر دیں گے اور اپنی نعت میں اللہ کے رسول ﷺ کے ذکر میں اتنا مبالغہ کریں گے کہ نعت کو شرک تک پہنچا دیں گے۔[1] ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا:

[1] اس موضوع پر پروفیسر۔ عبد اللہ شاہین صاحب کی کتاب "نعت گوئی اور اس کے آداب" ایک

«لاَ تُطْرُونِي، كَمَا أَطْرَتْ النَّصَارَى ابْنَ مَرْيَمَ، فَإِنَّمَا أَنَا عَبْدُهُ، فَقُولُوا عَبْدُ اللَّهِ، وَرَسُولُهُ»[1]

"میری تعریف میں ایسا مبالغہ نہ کرنا جیسا کہ عیسائیوں نے حضرت عیسی علیہ السلام کی تعریف میں کیا ہے۔ میں تو صرف اللہ کی بندہ ہوں اور مجھے اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہی کہو۔"

لیکن آپ ﷺ کی اس ہدایت کو پس پشت ڈالتے ہوئے بعض شعراء نے آپ ﷺ کی تعریف میں اتنا مبالغہ کیا ہے کہ جتنا عیسائیوں نے حضرت عیسی علیہ السلام کی تعریف میں نہیں کیا۔ اُنہوں نے تو حضرت عیسی علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیا تھا لیکن اِنہوں نے تو براہ راست ہی اللہ قرار دے دیا۔[2] اگر آپ کو نعت سننے کا شوق ہے تو اپنے گھر کے کسی بچے کو کوئی اچھی سی لکھی ہوئی نعت دیں اور اکیلے میں اس سے سن لیں۔ اس طرح نعت سننے سے آپ ﷺ کی ذات سے جو تعلق پیدا ہوگا، وہ کرائے کے نعت خوانوں کے گلا پھاڑ کر چیخنے چلانے اور گانوں کے راگ اور سُر لگانے سے کبھی پیدا نہ ہوگا۔

ہمیں اپنی طاق راتوں کو طویل قیام، لمبے رکوع و سجود، ذکر و اذکار، تلاوت قرآن، ترجمہ و تفسیر قرآن کے مطالعہ، محاسبہ نفس اور کائنات میں غور و فکر کے ساتھ مزین کرنا چاہیے اور دین کے نام پر تماشہ کرنے والوں سے حتی الامکان دور رہنا چاہیے۔ یہ واضح رہے کہ ہماری اس تحریر کا مقصد طاق راتوں میں کسی وعظ و بیان، نعت و نظم یا قیام اللیل کی نفی نہیں ہے بلکہ انفرادی عبادت کی ترغیب و تشویق دلانا ہے اور اجتماعی عبادت کے حوالے سے جو کوتاہیاں پیدا ہو رہی ہیں ان کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

بہت ہی عمدہ کتاب ہے۔

[1] صحیح بخاري، كِتَابُ أَحَادِيثِ الأَنْبِيَاءِ، بَابُ قَوْلِ اللَّهِ وَاذْكُرْ فِي الكِتَابِ، 167/4

[2] مثلاً شعراء کے ان نعتیہ اشعار میں غور کریں تو کھلم کھلا شرک نظر آئے گا کہ پہلے شعر میں اللہ کے رسول کو رب، دوسرے میں خدا اور تیسرے میں أحد کہا گیا ہے۔

مدینے کی مسجد کے منبر کے اوپر — بغیر عین کے میں نے ایک عرب دیکھا

وہی جو مستوی عرش تھا خدا ہو کر — اتر پڑا وہ مدینے میں مصطفی ہو کر

ذات احمد تھی یا خدا تھا — سایہ کیا میم تک جدا تھا

«فَمَنْ عَمِلَ مِنْهُمْ عَمَلَ الْآخِرَةِ لِلدُّنْيَا، لَمْ يَكُنْ لَهُ فِي الْآخِرَةِ نَصِيبٌ»[1]

"اس امت میں سے جس نے آخرت کا عمل دنیا کے لیے کیا تو اس کو آخرت میں کچھ حصہ نہ ملے گا۔"

وتر میں اجتماعی دعا

جیسے ہی رمضان کا آخری عشرہ داخل ہوتا ہے تو بعض دینی حلقوں اور سوشل میڈیا پر یہ بحث تقریباً ہر سال سامنے آتی ہے کہ رمضان میں وتر کی نماز میں لمبی لمبی اجتماعی دعاؤں کا کیا جواز ہے؟ خاص طور ان لوگوں کے ہاں کہ جو فرض نمازوں کے بعد اجتماعی دعا کو بدعت قرار دیتے ہیں؟

ایک عالم دین دوست سے اس بات پر گفتگو ہوئی کہ اہل حدیث مساجد میں یہ جو وتر میں اجتماعی دعا کی رسم چل پڑی ہے اور اس کا اکثر مساجد میں اہتمام ہوتا ہے تو اس کی شرعی دلیل کیا ہے؟ اور قراء حضرات ائمہ حرمین کی رٹی رٹائی دعائیں خشوع وخضوع بھرے لہجات میں دہراتے ہیں اور لوگ اس مقصد کے لیے اہل حدیث مساجد کا شد رحال یعنی اہتمام سے سفر کرتے ہیں کہ وتر کی اجتماعی دعا میں شریک ہوا جائے تو اس سب کچھ کی کوئی شرعی بنیاد موجود ہے؟

میں نے یہ عرض کیا کہ اللہ کے رسول ﷺ سے اتنا تو ثابت ہے کہ آپ نے رمضان میں وتر جماعت کے ساتھ پڑھائے لہذا وتر کی نماز جماعت کے ساتھ پڑھنے پڑھانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ وتر میں جو لمبی دعائیں کی جاتی ہیں، ان کے جواز کی کیا دلیل ہے؟ میں نے کہا کہ اس بارے قنوت نازلہ کی روایات سے استدلال کیا جاتا ہے۔

انہوں نے کہا کہ قنوت نازلہ کے علاوہ جو وتر میں دعائیں کی جاتی ہے اور وہ دعائیں بھی غیر مسنون اس معنی میں ہیں کہ الفاظ نبی کریم ﷺ کے نہیں ہیں بلکہ ائمہ حرمین یا بلاد عرب کی مساجد کے ائمہ کے ہیں تو اس کا کیا جواز ہے؟ میں نے کہا کہ یہ بات درست

---

[1] مسند الإمام أحمد بن حنبل: 145/35

ہے کہ قنوت نازلہ کے الفاظ متعین ہیں اور آپ ﷺ نے نماز وتر میں ویسی یا اتنی لمبی دعائیں نہیں کی جیسا کہ اہل حدیث مساجد میں کیا جاتا ہے۔

انہوں نے کہا کہ کیا آپ اسے ایک نیا رجحان (trend) کہہ سکتے ہیں اور اس کی ابتداء کہاں سے ہوئی؟ میں نے کہا کہ اسے بالکل ایک نیا رجحان کہا جا سکتا ہے اور اس کی ابتداء حرمین سے ہوئی۔ ہمارے ہاں اہل حدیث اس بارے ائمہ حرمین کی اتباع کرتے ہیں۔ اور اب بلاد عرب میں بھی بعض علماء نے یہ کہنا شروع کر دیا ہے کہ وتر کی نماز میں گھنٹہ بھر لمبی دعا کی صورت میں اکتیسویں پارے کی تلاوت بند کی جائے کہ امام کو حکم یہ ہے کہ وہ جماعت کی نماز ہلکی کروائے۔ اور اللہ کے رسول ﷺ نے نماز کی حالت میں لمبی دعا کا مقام سجدہ بتلایا ہے نہ کہ قیام۔ اور قیام میں کرنے کا اصل کام قرآن مجید کی تلاوت ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«أَلَا وَإِنِّي نُهِيتُ أَنْ أَقْرَأَ الْقُرْآنَ رَاكِعًا أَوْ سَاجِدًا، فَأَمَّا الرُّكُوعُ فَعَظِّمُوا فِيهِ الرَّبَّ عَزَّ وَجَلَّ، وَأَمَّا السُّجُودُ فَاجْتَهِدُوا فِي الدُّعَاءِ، فَقَمِنٌ أَنْ يُسْتَجَابَ لَكُمْ»[1]

"آگاہ رہو! مجھے رکوع اور سجدے کی حالت میں قرآن مجید پڑھنے سے منع کیا گیا۔ پس رکوع کی حالت میں تو اللہ عزوجل کی خوب عظمت بیان کرو۔ اور سجدے کی حالت میں خوب دعائیں کرو کہ امید ہے کہ اس حالت میں دعائیں قبول ہوں گی۔"

انہوں نے کہا کہ یہ وتر میں اتنی لمبی اجتماعی دعا کروانا کیا اخلاص کے منافی نہیں ہے؟ میں نے کہا کہ اس خدشے کا اظہار اب خود اہل حدیث میں سے بھی بہت سے لوگ کرنا شروع ہو گئے ہیں کہ اس طرح کی اجتماعی دعاؤں میں رونے اور رلانے کے مناظر میں بعض اوقات واضح تکلف اور تصنع نظر آتا ہے۔ اس گفتگو کے بعد میں یہ سوچ رہا تھا کہ ہم کسی کی نیت یا اخلاص پر شک تو نہیں کر سکتے ہیں لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ ہمیں اللہ عزوجل نے دعا میں تضرع کے ساتھ اسے چھپانے کا بھی حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالی

---

[1] صحيح مسلم، كِتَابُ الصَّلَاةِ، بَابُ النَّهْيِ عَنْ قِرَاءَةِ الْقُرْآنِ فِي الرُّكُوعِ وَالسُّجُودِ، 348/1

ہے:

﴿ادْعُوا رَبَّكُمْ تَضَــرُّعًا وَخُفْيَةً إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَـدِينَ﴾ [الأعراف: 55]

"تم اپنے رب سے گڑ گڑاتے ہوئے اور چپکے چپکے دعائیں کرو۔ بے شک اللہ تعالی حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

پس دعاء کا تنہائی میں تو خوب اہتمام ہونا چاہیے اور اگر مجلس میں بھی کبھی کبھار لمبی دعا ہو جائے اور اس میں رونا آ جائے تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مجلس میں رونے کو ممکن حد تک چھپانے اور دبانے کی کوشش کرتے تھے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَنَسٍ رَضِـيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ: خَطَبَ رَسُــولُ اللَّهِ صَـلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَــلَّمَ خُطْبَةً مَا سَــمِعْتُ مِثْلَهَا قَطُّ، قَالَ: «لَوْ تَعْلَمُونَ مَا أَعْلَمُ لَضَحِكْتُمْ قَلِيلًا، وَلَبَكَيْتُمْ كَثِيرًا، قَالَ: فَغَطَّى أَصْحَابُ رَسُــولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وُجُوهَهُمْ لَهُمْ خَنِينٌ»[1]

"حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ ایسا خطبہ دیا کہ اس جیسا خطبہ میں نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔ آپ نے کہا کہ اگر تمہیں وہ معلوم ہو جائے جو مجھے معلوم ہے تو تمہارا ہنسنا کم ہو جائے اور رونا بڑھ جائے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ یہ سن کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے چہرے ڈھانپ لیے اور ان کے رونے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔"

یہ بات مناسب نہیں ہے کہ کوئی قاری قرآن رمضان کے آخری عشرے میں ہر رات میں نپے تلے ردیف اور قافیوں میں دعا کا اہتمام کرتے ہوئے اپنا خشوع و خضوع لوگوں کو دکھائیں اور آواز کے زیر و بم سے لوگوں کو رلانے کی حتی الامکان کوشش کریں اور پھر ایسے مواقع کی آڈیو یا ویڈیو ریکارڈنگ کا بھی اہتمام ہو۔

پس اگر قاری قرآن ایک ہی طاق رات میں مختلف مساجد میں وتر پڑھا کر یا واعظ

[1] صحيح البخاري، كتاب تفسير القرآن، باب قوله لاَ تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ، 54/6

ایک ہی طاق رات میں مختلف مساجد میں وعظ کے ذریعے اپنی خشیت کا اظہار کریں کہ لوگ ان کی درد بھری دعا یا وعظ سننے کے لیے شد رحال کریں اور انتظامیہ ان کے نام پر اپنے مدرسے کی اشتہار بازی (advertisement) کرے تو اس سب کچھ پر شاید قرآن مجید کی اس آیت کا اطلاق کیا جا سکتا ہے:

﴿وَإِذَا قَامُوا إِلَى الصَّلَاةِ قَامُوا كُسَالَىٰ يُرَاءُونَ النَّاسَ وَلَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا﴾ [النساء: 142]

"اور جب وہ نماز کے لیے قیام کرتے ہیں تو سستی کی حالت میں لوگوں کو دکھانے کے لیے قیام کرتے ہیں اور اس قیام میں اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔"

ایک صاحب کہ جنہوں بھی وتر کی اجتماعی دعاؤں میں لوگوں کو رلایا ہوا ہ، کا کہنا ہے کہ یہ ایک ایسا عمل ہے کہ جسے شیطان انسان کے لیے خوبصورت بنا دیتا ہے:

﴿وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ فَصَدَّهُمْ عَنِ السَّبِيلِ فَهُمْ لَا يَهْتَدُونَ﴾ [النمل: 24]

"اور شیطان نے ان کے لیے ان کے اعمال کو خوبصورت بنا دیا ہے۔ پس اس نے انہیں سیدھے رستے سے روک دیا اور وہ ہدایت پانے والے نہیں ہیں۔"

پس یہ عمل ہے تو ریاکاری اور دکھلاوہ لیکن انسان اسے نیکی اور تقویٰ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ میں نے اتنے لوگوں کو اللہ کے حضور رلا دیا اور انہیں توبہ کروا دی۔ شاید یہ تو بہت بڑا نیکی کا کام ہے کہ مالک کے گم شدہ غلاموں کو اس سے ملوا دیا جائے لیکن ریاکاری کی یہ نیکی انسان اپنے اخلاص کے خون کا نذرانہ دے کر کر رہا ہوتا ہے۔ دوسروں کی اصلاح کا کام اگر ذاتی اصلاح کی قربانی کی قیمت پر ہو تو پھر اس صورت میں اپنی ذات کی اصلاح کو ترجیح دینی چاہیے۔ اس بارے مزید تفصیل ہم نے اس کتاب کے پہلے باب میں "صالح اور مصلح" کے عنوان کے تحت بیان کی ہے۔

تلاوت اور تزکیہ

اللہ کے رسول ﷺ نے جس ذریعے کو بنیاد بنا کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تزکیہ اور اصلاح فرمائی تو وہ قرآن مجید کا ذریعہ ہے۔ یہ قرآن ہی تھا کہ جس نے ایک ایسی قوم کو کہ جو ایک

دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، ایک دوسرے پر جان نثار کرنے والا بنا دیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگیوں میں جو تبدیلی آئی اور ایسی آئی کہ انہیں قیامت تک آنے والے امتیوں پر فضیلت حاصل ہوئی، تو اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک قرآن مجید سے گہرا تعلق اور دوسرا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت۔

ہمارے ہاں تزکیہ نفس کی جتنی بھی کوششیں ہوئیں ہیں، سلاسل میں یا خانقاہوں میں، علماء میں یا صوفیاء میں، ان سب میں صحبت کو تو اہمیت دی گئی اور اس کی اہمیت سے ہمیں انکار بھی نہیں ہے، اگرچہ مرشد کی صحبت، نبی کی صحبت کے مقابلے میں ذرہ برابر بھی حیثیت نہیں رکھتی ہے، لیکن قرآن مجید کو اصلاح نفس کے پروگرام میں ہر جگہ یکسر نظر انداز کیا گیا ہے حالانکہ قرآن مجید سے تعلق آج بھی کسی درجے میں ویسا قائم ہو سکتا ہے جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا۔ پس تزکیہ نفس کی دو نبوی بنیادوں میں جو ہمارے لیے زیادہ مفید تھی، اس کو ہم نے ترک کر دیا۔ اور جو کم مفید تھی، اس اعتبار سے کہ نبی کی صحبت کے برابر تو اب کسی مرشد کی صحبت نہیں ہو سکتی، اس کو ہم نے واحد معیار تزکیہ بنا لیا۔ اور آجکل کل تزکیہ کسی شخصیت سے تعلق کے گرد ہی گھومتا رہتا ہے، چاہے یہ تعلق بیعت کا ہو یا ارادت کا۔

بہت ضروری ہے اس امت کی اصلاح بھی انہی بنیادوں پر کی جائے کہ جن پر خیر القرون کی ہوئی ہے اور وہ بنیادیں قرآن مجید سے تعلق اور صحبت صالحین کی ہیں۔ ایک مسلمان کی قرآن مجید سے تعلق کی دو نوعتیں ہونی چاہییں۔ ایک اس پر ایمان رکھنے اور اس کی تلاوت کرنے کی اور دوسرا اس کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کی۔

قرآن مجید کی تلاوت کے بہت سے فضائل احادیث میں نقل ہوئے ہیں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ قیامت والے دن قرآن مجید اپنے پڑھنے والوں کی شفاعت کرے گا:

«اقْرَءُوا الْقُرْآنَ فَإِنَّهُ يَأْتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ شَفِيعًا لِأَصْحَابِهِ»[1]

---

[1] صحيح بخاري، كِتَابُ صَلَاةِ الْمُسَافِرِينَ وَقَصْرِهَا، بَابُ فَضْلِ قِرَاءَةِ الْقُرْآنِ، 553/1

”قرآن مجید کی تلاوت کرو بے شک یہ قیامت والے دن اپنے پڑھنے والوں کی شفاعت کرے گا۔“

اور اصل نیکی تو وہی ہے کہ جس میں نفس کو مشقت اٹھانی پڑے کہ اس میں نیک عمل کرنے کے ساتھ مجاہدہ بھی شامل ہو جاتا ہے۔ پس اگر قرآن مجید کی تلاوت پر دل آمادہ ہو یا قرآن مجید روانی سے پڑھنے کی مہارت حاصل ہو تو اس پڑھنے کا اجر وثواب تو ہے ہی لیکن اگر انسان اپنے نفس پر جبر کر کے قرآن مجید کی تلاوت کرے گا یا قرآن مجید پڑھ سکنے کی اہلیت نہ ہونے کے باوجود قرآن مجید پڑھنے کا اہتمام کرے گا تو اس کے لیے دوگنا اجر وثواب ہے۔ ایک قرآن مجید پڑھنے کا اور دوسرا مجاہدہ کرنے اور اپنے نفس پر جبر کرنے کا۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ عَائِشَةَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «مَثَلُ الَّذِي يَقْرَأُ القُرْآنَ، وَهُوَ حَافِظٌ لَهُ مَعَ السَّفَرَةِ الكِرَامِ البَرَرَةِ، وَمَثَلُ الَّذِي يَقْرَأُ، وَهُوَ يَتَعَاهَدُهُ، وَهُوَ عَلَيْهِ شَدِيدٌ فَلَهُ أَجْرَانِ»[1]

”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص قرآن مجید پڑھتا ہو اور وہ اس کا حافظ ہو تو اس کا حشر ان فرشتوں کے ساتھ ہو گا جو قرآن مجید کو لوح محفوظ میں لکھنے والے اور بزرگی والے اور نیک فرشتے ہیں۔ اور جو شخص قرآن مجید کو اٹک اٹک کر پڑھتا ہے اور اسے تلاوت میں مشکل پیش آتی ہے تو اس کے لیے تلاوت کا دوگنا اجر ہے۔“

قرآن مجید کی تلاوت کی بہترین صورت یہ ہے کہ اسے نماز میں قیام کی حالت میں پڑھا جائے جیسا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ایک جماعت کا معمول تھا کہ رات تہجد میں لمبے قیام میں لمبی تلاوت کرتے تھے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تورات کا ایک تہائی یا نصف یا دو تہائی وقت قیام کی حالت میں تلاوت کے ساتھ گزارتے تھے جیسا کہ سورۃ المزمل کی شروع کی آیات میں منقول ہے۔ اور قرآن مجید نے تزکیہ نفس کے لیے بہترین طریق کار تہجد میں قیام کی حالت میں قرآن مجید کی تلاوت کرنے کو بتلایا ہے جیسا

[1] صحيح بخاري، كِتَابُ تَفْسِيرِ القُرْآنِ، بَابُ {يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ فَتَأْتُونَ أَفْوَاجًا}، 166/6

کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ﴿1﴾ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿2﴾ نِّصْفَهُ أَوِ انقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ﴿3﴾ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ﴿4﴾ إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا ﴿5﴾ إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْئًا وَأَقْوَمُ قِيلًا﴾ [المزمل: 6]

"اے نبی ﷺ! آپ رات بھر قیام کریں سوائے تھوڑے حصے کے۔ نصف رات قیام کر لیں، یا نصف رات سے کچھ وقت کم کر لیں، یا نصف رات سے کچھ وقت زائد کر لیں اور قرآن مجید کو خوب ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں۔ بے شک ہم آپ پر ایک بھاری کلام نازل فرمانے والے ہیں۔ اور بے شک رات کا اٹھنا نفس کو قابو کرنے کے لیے اور یکسوئی سے بات کرنے کے لیے بہت مفید ہے۔"

اگر کسی کو قرآن مجید یاد نہ ہو تو وہ تہجد کی نماز میں اپنے ہاتھ میں پاکٹ سائز مصحف لے کر دیکھ کر بھی پڑھ سکتا ہے۔ قیام اللیل میں مصحف کھول کر پڑھنے کی اجازت جمہور علماء کے ہاں موجود ہے کہ اس بارے ایک روایت یہ ملتی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے غلام ذکوان رحمہ اللہ رمضان کے مہینے میں گھر کی عورتوں کو مصحف کھول کر جماعت کروالیا کرتے تھے۔[1] امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے جب یہ سوال ہوا کہ کیا قیام اللیل میں مصحف کھول کر تلاوت کر سکتے ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ کر سکتے ہیں۔ جب ان سے سوال ہوا کہ کیا فرائض میں بھی کر سکتے ہیں؟ تو انہوں نے کہا کہ اس بارے ہمیں کوئی روایت نہیں پہنچی ہے۔[2] امام مالک، امام شافعی، امام محمد اور قاضی ابو یوسف رحمہم اللہ کا موقف بھی یہی ہے کہ قیام اللیل میں مصحف کھول کر تلاوت کی جاسکتی ہے کیونکہ نماز اور مصحف میں نظر دونوں عبادت ہی کی قسمیں ہیں لہٰذا ایک عبادت میں دوسری عبادت شامل کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔[3]

---

[1] أبو بكر بن أبي داود، كتاب المصاحف، الفاروق الحديثة، مصر، الطبعة الأولى، 2002ء، ص 456

[2] ابن قدامة المقدسي، أبو محمد موفق الدين عبد الله بن أحمد بن محمد بن قدامة الحنبلي، المغني لابن قدامة، مكتبة القاهرة، القاهرة، 1388هـ-1968ء، 411/1

[3] النووي، أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف، المجموع شرح المهذب، دار الفكر، بيروت، 95/4؛

قرآن مجید کی تلاوت ایک ایسی عبادت ہے کہ جو تزکیہ نفس کے علاوہ فرشتوں کے نزول کا بھی باعث ہے۔ عام طور جہاں قرآن مجید کی تلاوت کی جاتی ہے، وہاں سکینت اور فرشتے نازل ہوتے ہیں اور شیاطین بھاگ جاتے ہیں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنِ البَرَاءِ بْنِ عَازِبٍ، قَالَ: كَانَ رَجُلٌ يَقْرَأُ سُورَةَ الكَهْفِ، وَإِلَى جَانِبِهِ حِصَانٌ مَرْبُوطٌ بِشَطَنَيْنِ، فَتَغَشَّتْهُ سَحَابَةٌ، فَجَعَلَتْ تَدْنُو وَتَدْنُو وَجَعَلَ فَرَسُهُ يَنْفِرُ، فَلَمَّا أَصْبَحَ أَتَى النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَذَكَرَ ذَلِكَ لَهُ فَقَالَ: «تِلْكَ السَّكِينَةُ تَنَزَّلَتْ بِالقُرْآنِ»[1]

"حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی سورۃ کہف کی تلاوت کر رہے تھے اور ان کا گھوڑا ایک جانب دو رسیوں سے بندھا ہوا تھا کہ دوران تلاوت انہیں ایک بدلی نے گھیر لیا۔ پس جیسے جیسے وہ بدلی آسمان سے ان کے قریب ہوتی تھی تو ان کا گھوڑا ویسے ویسے بدکنا شروع ہو جاتا تھا۔ انہوں نے صبح اس واقعے کا ذکر اللہ کے رسول رضی اللہ عنہ سے کیا تو آپ نے فرمایا کہ وہ سکینت تھی جو کہ قرآن کی تلاوت کی وجہ سے نازل ہو رہی تھی۔"

قرآن مجید کی تلاوت کے بعد دوسرا بڑا فرض اس کو سمجھنے اور سمجھانے کا ہے۔ دنیا کی ہر بڑی زبان میں قرآن مجید کے تراجم اور تفاسیر موجود ہیں۔ بعض اردو تراجم بعض مسالک کے نمائندہ ہیں تو بعض تراجم ایسے بھی ہیں کہ جو تمام مسالک میں یکساں طور معروف ہیں جیسا کہ شاہ عبد القادر محدث دہلوی رحمہ اللہ، شاہ رفیع الدین محدث دہلوی رحمہ اللہ اور مولانا فتح محمد جالندھری رحمہ اللہ کا ترجمہ ہے۔ پہلا اور تیسرا بامحاورہ جبکہ دوسرا لفظی ترجمہ ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ عُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ القُرْآنَ وَعَلَّمَهُ»[2]

المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني، الهداية في شرح بداية المبتدي، دار احياء التراث العربي، بيروت، لبنان، 63/1

[1] صحيح بخاري، كِتَابُ فَضَائِلِ القُرْآنِ، بَابُ فَضْلِ سُورَةِ الكَهْفِ، 188/6

[2] سنن الترمذي، أَبْوَابُ فَضَائِلِ الْقُرْآنِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي تَعْلِيمِ الْقُرْآنِ، 173/5

”حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں کہ جنہوں نے قرآن مجید سیکھا اور سکھایا۔“

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے ہے کہ جو سب کے سب بہترین تھے لیکن ان میں بھی درجات ہیں لہذا ان میں سے بھی بہترین وہ ہیں جو قرآن مجید کی درس وتدریس میں مصروف رہے۔اسی طرح فرد کی اصلاح کے علاوہ قوموں کی مادی ترقی اور دنیاوی عروج میں بھی اللہ کی کتاب کے ساتھ ان کے گہرے تعلق کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ایک روایت کے الفاظ ہیں۔

نَافِعَ بْنَ عَبْدِ الْحَارِثِ، لَقِيَ عُمَرَ بِعُسْفَانَ، وَكَانَ عُمَرُ يَسْتَعْمِلُهُ عَلَى مَكَّةَ، فَقَالَ: مَنِ اسْتَعْمَلْتَ عَلَى أَهْلِ الْوَادِي، فَقَالَ: ابْنَ أَبْزَى، قَالَ: وَمَنِ ابْنُ أَبْزَى؟ قَالَ: مَوْلًى مِنْ مَوَالِينَا، قَالَ: فَاسْتَخْلَفْتَ عَلَيْهِمْ مَوْلًى؟ قَالَ: إِنَّهُ قَارِئٌ لِكِتَابِ اللهِ عَزَّ وَجَلَّ، وَإِنَّهُ عَالِمٌ بِالْفَرَائِضِ، قَالَ عُمَرُ: أَمَا إِنَّ نَبِيَّكُمْ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ قَالَ: «إِنَّ اللهَ يَرْفَعُ بِهَذَا الْكِتَابِ أَقْوَامًا، وَيَضَعُ بِهِ آخَرِينَ»[1]

”حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نافع بن عبد الحارث رحمہ اللہ کو مکہ کا گورنر مقرر کیا اور ان سے پوچھا کہ آپ نے مکہ کے گرد ونواح میں وادی کے علاقے کے لیے کس کو امیر بنایا ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ ابن بزی رحمہ اللہ کو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ یہ ابن بزی کون ہیں؟ نافع بن عبد الحارث رحمہ اللہ نے بتلایا کہ آزاد کردہ غلام ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ کیا آپ نے ایک آزاد کردہ غلام کو امیر بنا دیا؟ تو نافع بن عبد الحارث رحمہ اللہ نے جواب دیا کہ وہ قرآن مجید کے بہترین قاری ہیں اور دینی فرائض کے عالم ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس پر کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بلاشبہ اس کتاب کے ذریعے اللہ تعالی بہت سی قوموں کو بلندی عطا فرماتے ہیں اور بہت سی قوموں کو زوال عطا کرتے ہیں۔“

امر واقعہ یہ ہے کہ اللہ کی کتاب سے تعلق ترک کر دینا امت مسلمہ کے زوال کا ایک بنیادی سبب ہے جیسا کہ مفکر پاکستان علامہ اقبال رحمہ اللہ نے بھی اپنی مشہور نظم ”جواب

---

[1] صحيح بخاري، كِتَابُ صَلَاةِ الْمُسَافِرِينَ وَقَصْرِهَا، بَابُ فَضْلِ مَنْ يَقُومُ بِالْقُرْآنِ، وَيُعَلِّمُهُ، 559/1

شکوہ" میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔[1]

قرآن مجید نے اہل ایمان کی یہ صفت بیان کی ہے کہ وہ قرآن مجید کی تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿الَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَتْلُونَهُ حَقَّ تِلَاوَتِهِ أُولَٰـئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ وَمَن يَكْفُرْ بِهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْخَاسِرُونَ﴾ [البقرة: 121]

"جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے تو وہ اس کی تلاوت ایسے کرتے ہیں جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے۔ یہی لوگ کتاب پر ایمان لانے والے ہیں۔ اور جو لوگ کتاب کا انکار کریں گے تو وہی لوگ ناکام ہیں۔"

قرآن مجید کی تلاوت کا حق تین قسم کا ہے۔ ایک یہ کہ اس کو سمجھ کر اور پوری توجہ سے پڑھے جیسا کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اس آیت میں تلاوت کے حق سے مراد یہ ہے کہ جب قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہوئے جنت کا ذکر آئے تو اللہ سے جنت کا سوال کرے اور جب جہنم کا ذکر آئے تو اللہ سے جہنم کی پناہ مانگے۔[2] پس قرآن مجید کو اس طرح پڑھے کہ جیسے اللہ تعالی تلاوت کرنے والے سے خطاب کر رہے ہیں اور بندہ اپنے رب کو اس کا جواب بھی دے رہا ہے۔

قرآن مجید کی تلاوت کا دوسری قسم کا حق یہ ہے کہ بندہ قرآن مجید میں اللہ عزوجل کے جن احکامات کی تلاوت کرے تو تلاوت مکمل کرنے کے بعد ان پر عمل بھی کرے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس آیت مبارکہ میں تلاوت کے حق سے مراد یہ ہے کہ بندہ قرآن مجید کی اتباع کرے کیونکہ قرآن مجید ہی میں سورۃ الشمس میں تلاوت کا لفظ اتباع کے معنی میں بھی استعمال ہوا ہے۔[3]

اور تیسرا اور ظاہری معنی یہ ہے کہ قرآن مجید کے پڑھنے کا خوب اہتمام کیا جائے۔ عام طور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا یہ معمول تھا کہ وہ ہفتے میں ایک مرتبہ قرآن مجید مکمل کر لیتے

---

[1] وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہو کر

[2] ابن كثير، أبو الفداء إسماعيل بن عمر القرشي، تفسير القرآن العظيم، دار طيبة للنشر والتوزيع، الطبعة الثانية، 1420هـ -1999 م، 403/1

[3] أيضاً

تھے یعنی دن بھر میں قرآن مجید کی ایک منزل کی تلاوت ان کے نصاب میں شامل تھی۔ روزانہ ایک منزل تلاوت کرنا بہترین عمل ہے کہ جس کو معمول بنانے کی حفاظ، علماء، خطباء، مدرسین، واعظین اور مصلحین کو کوشش کرنی چاہیے جبکہ عام آدمی کے لیے عمدہ نصاب یہ ہے کہ روزانہ ایک پارہ تلاوت کریں تاکہ مہینے میں ایک مرتبہ قرآن مجید مکمل ہو جائے۔

اور جو لوگ قرآن مجید کی تلاوت کا حق ادا کرتے ہیں تو انہی کو احادیث میں ''اصحاب القرآن'' کہا گیا ہے۔ تو ہمیں اصحاب القرآن بننا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «يُقَالُ لِصَاحِبِ الْقُرْآنِ: اقْرَأْ، وَارْتَقِ، وَرَتِّلْ كَمَا كُنْتَ تُرَتِّلُ فِي الدُّنْيَا، فَإِنَّ مَنْزِلَكَ عِنْدَ آخِرِ آيَةٍ تَقْرَؤُهَا»[1]

''حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ صاحب قرآن سے قیامت والے دن کہا جائے گا کہ آپ پڑھتے جائیں اور جنت کے درجات چڑھتے جائیں۔ اور اس طرح ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں جیسے آپ دنیا میں ٹھہر ٹھہر کر پڑھتے تھے۔ بے شک جنت میں آپ کا مرتبہ وہاں تک ہے جہاں آپ کی آخری آیت مکمل ہو گی۔''

ذکر و فکر اور تزکیہ

بندہ اپنے مالک اور محسن کو کبھی بھولے سے بھی نہ بھولے اور ہمیشہ یاد رکھے تو اس کے لیے قرآن مجید نے ہمیں ہر حال میں ذکر کا حکم دیا ہے۔ اور ذکر بھی محض زبان سے ذکر نہیں بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اپنے نفس اور کائنات کی تخلیق میں غور و فکر کرنا کہ اس سے بھی اللہ کی خشیت کے احوال حاصل ہوتے ہیں۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّـــهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَـــذَا بَاطِلًا سُبْحَانَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ﴾ [آل عمران: 191]

[1] سنن أبي داود، بَابُ تَفْرِيعِ أَبْوَابِ الْوِتْرِ، بَابُ اسْتِحْبَابِ التَّرْتِيلِ فِي الْقِرَاءَةِ، 73/2

”جو لوگ اٹھتے، بیٹھتے اور اپنے پہلوؤں پر اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ اور زمین اور آسمانوں کی پیدائش میں غور کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب! آپ نے یہ سب کچھ بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ آپ ہر قسم کے عیب سے پاک ہیں۔ پس آپ ہمیں آگ کے عذاب سے بچالیں۔“

قرآن مجید صرف ذکر کا حکم نہیں دیتا بلکہ بہت زیادہ ذکر کرنے کا حکم دیتا ہے اور صبح وشام ذکر کرنے کا حکم دیتا ہے کہ ذکر ایک ایسی عبادت ہے کہ جو ہم چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، کھیلتے کودتے بھی کر سکتے ہیں۔ ارشاد باری تعالی ہے۔

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا اللَّـهَ ذِكْرًا كَثِيرًا ﴿41﴾ وَسَبِّحُوهُ بُكْرَةً وَأَصِيلًا﴾ [آل عمران: 42]

”اے اہل ایمان! اللہ کو بہت زیادہ کثرت سے یاد کرو اور اس کی تسبیح صبح وشام بیان کرو۔“

بہترین ذکر وہ ہے جو نہ تو بلند آواز سے ہو اور نہ ہی خاموش ہو بلکہ ایسا ہو کہ اس میں دل اللہ کی طرف متوجہ ہو اور زبان اس کی یاد سے تر ہو۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَاذْكُر رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَخِيفَةً وَدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُن مِّنَ الْغَافِلِينَ﴾ [الأعراف: 205]

”اور اپنے رب کو صبح اور شام کے اوقات میں عاجزی اور خوف کے ساتھ اور آہستہ آواز سے یاد کرو۔ اور اللہ کو بھلا دینے والوں میں سے نہ ہو جاؤ۔“

اعلی درجہ تو یہی ہے کہ اللہ ہر حال میں یاد رہے لیکن اس سے کم تر درجہ یہ ہے کہ انسان اللہ کو یاد رکھنے کی کوشش کرے لیکن اگر کبھی یاد نہ رہے تو اس پر بعد میں شرمندہ ہو اور استغفار کرے۔ اور اگر صورت حال یہ ہو کہ انسان جان بوجھ کر اللہ کی یاد سے غفلت اختیار کرے کہ جسے قرآن مجید نے اعراض کہا ہے کہ اللہ کے ذکر سے منہ ہی پھیر لے تو یہی لوگ ہیں کہ جن کے لیے اللہ عزوجل ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں جو ان کا دوست بن جاتا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَمَن يَعْشُ عَن ذِكْرِ الرَّحْمَـٰنِ نُقَيِّضْ لَهُ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهُ قَرِينٌ﴾ [الزخرف: 36]

"اور جو شخص رحمان کے ذکر سے منہ پھیر لیتا ہے تو ہم اس کے لیے ایک شیطان مقرر کر دیتے ہیں جو ہر وقت اس کے ساتھ جڑا رہتا ہے۔"

ذکر کتنی بڑی عبادت ہے، اس کا اندازہ اس روایت سے بھی ہو سکتا ہے کہ جس میں اسے جہاد و قتال اور سونا چاندی صدقہ کرنے سے بھی افضل قرار دیا گیا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي الدَّرْدَاءِ، قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «أَلَا أُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرِ أَعْمَالِكُمْ، وَأَزْكَاهَا عِنْدَ مَلِيكِكُمْ، وَأَرْفَعِهَا فِي دَرَجَاتِكُمْ وَخَيْرٌ لَكُمْ مِنْ إِنْفَاقِ الذَّهَبِ وَالوَرِقِ، وَخَيْرٌ لَكُمْ مِنْ أَنْ تَلْقَوْا عَدُوَّكُمْ فَتَضْرِبُوا أَعْنَاقَهُمْ وَيَضْرِبُوا أَعْنَاقَكُمْ»؟ قَالُوا: بَلَى. قَالَ: «ذِكْرُ اللَّهِ تَعَالَى»[1]

"حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمہیں ایسے عمل کی خبر نہ دوں جو تمہارے اعمال میں سب سے بہتر اور تمہارے مالک کے نزدیک سب سے زیادہ پاکیزہ اور تمہارے درجات کو سب سے زیادہ بلند کرنے والا اور تمہارے لیے اللہ کے رستے میں سونا اور چاندی خرچ کرنے سے بھی افضل عمل بلکہ اس جہاد سے بھی افضل عمل کہ جس میں تم اپنے دشمنوں کی گردنیں اڑاؤ اور وہ تمہاری گردنیں اڑائیں۔ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا: اے اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! آپ ضرور ایسے عمل کی خبر دیں۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ اللہ کا ذکر ہے۔"

افضل ذکر وہی ہے کہ جس میں انسان کی زبان حرکت میں ہو اور دل اللہ کی طرف متوجہ ہو۔ شریعت میں نہ تو صرف قلبی ذکر مطلوب ہے اور نہ ہی محض لسانی ذکر۔ صوفیاء کے بعض حلقوں میں صرف قلبی ذکر پر زور دیا جاتا ہے جو کہ مناسب نہیں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ بُسْرٍ، أَنَّ رَجُلًا قَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ إِنَّ شَرَائِعَ الإِسْلَامِ قَدْ كَثُرَتْ عَلَيَّ، فَأَخْبِرْنِي بِشَيْءٍ أَتَشَبَّثُ بِهِ، قَالَ: «لَا يَزَالُ

---

[1] سنن الترمذي، أَبْوَابُ الدَّعَوَاتِ، بَاب مَا جَاءَ فِي فَضْلِ الذِّكْرِ، 459/5

لِسَانُكَ رَطْبًا مِنْ ذِكْرِ اللَّهِ»[1]

"حضرت عبداللہ بن بسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آکر کہا کہ اسلام کے احکامات مجھے بہت زیادہ معلوم ہوتے ہیں۔ آپ مجھے کوئی ایسا حکم بتلادیں کہ میں اس سے جڑا رہوں۔ تو آپ ﷺ نے کہا کہ تیری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تر رہنی چاہیے۔"

پس آپ ﷺ کا کہنا یہ ہے کہ ذکر وہ ہے کہ جس میں تیری زبان جاری ہو۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ زبان سے ذکر کرتے ہوئے قلب اللہ کی طرف متوجہ رہے لہذا زبان اور دل دونوں سے ذکر ہو تو یہ افضل ترین درجہ ہے۔ اور اگر صرف دل سے ہو تو یہ دوسرا درجہ ہے کہ اس میں زبان اللہ کی عبادت میں مصروف نہیں ہے۔ اور اگر صرف زبان سے ہو تو یہ تیسرا درجہ ہے کہ اس میں دل کی توجہ حاصل نہیں ہے لیکن اعضاء کو عبادت میں مصروف رکھا ہوا ہے۔ اور چوتھا درجہ تو غفلت کا ہے کہ جس میں نہ دل سے اللہ کا ذکر ہو اور نہ ہی زبان سے ہو جیسا کہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

عَنْ أَبِي مُوسَى رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَثَلُ الَّذِي يَذْكُرُ رَبَّهُ وَالَّذِي لاَ يَذْكُرُ رَبَّهُ، مَثَلُ الحَيِّ وَالمَيِّتِ»[2]

"حضرت ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص اللہ کا ذکر کرتا ہے اور جو شخص اللہ کا ذکر نہیں کرتا ہے تو دونوں کی مثال زندہ اور مردہ کی سی ہے۔"

دوسری اہم بات یہ ہے کہ ان الفاظ سے اللہ کا ذکر کیا جائے کہ جن الفاظ سے اللہ کا ذکر کرنے کی اللہ کے نبی ﷺ نے ترغیب دلائی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ: أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «مَنْ قَالَ: سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ، فِي يَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ، حُطَّتْ خَطَايَاهُ، وَإِنْ كَانَتْ مِثْلَ زَبَدِ البَحْرِ»[3]

---

[1] سنن الترمذي، أَبْوَابُ الدَّعَوَاتِ، بَاب مَا جَاءَ فِي فَضْلِ الذِّكْرِ، 497/5

[2] صحيح بخاري، كِتَابُ الدَّعَوَاتِ، بَابُ فَضْلِ ذِكْرِ اللَّهِ عَزَّ وَجَلَّ، 86/8

[3] صحيح بخاري، كِتَابُ الدَّعَوَاتِ، بَابُ فَضْلِ التَّسْبِيحِ، 86/8

”حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جس نے سبحان اللہ وبحمدہ دن میں سو مرتبہ کہا تو اس کے تمام گناہ معاف ہو جائیں گے، چاہے وہ سمندر کی جھاگ کے برابر ہوں۔“

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «لَأَنْ أَقُولَ سُبْحَانَ اللَّهِ، وَالحَمْدُ لِلَّهِ، وَلَا إِلَهَ إِلَّا اللهُ وَاللَّهُ أَكْبَرُ، أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا طَلَعَتْ عَلَيْهِ الشَّمْسُ»[1]

”حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر کہنا مجھے دنیا کی ان تمام چیزوں سے زیادہ محبوب ہے کہ جن پر سورج طلوع ہوتا ہے۔“

اب یہ جو اجر وثواب ہے تو یہ انہی الفاظ میں اللہ کا ذکر کرنے پر ہے کہ جو الفاظ احادیث میں نقل ہوئے ہیں۔ اور اگر ہم اپنے الفاظ میں اللہ کو یاد کریں گے تو ہمارا اللہ کو یاد کرنا ایک عبادت تو شمار ہو گا لیکن اس سے اللہ کا اتنا تقرب یا اتنا اجر وثواب کبھی بھی نہ ملے گا کہ جتنا اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتلائے ہوئے الفاظ میں یاد کرنے پر ملے گا۔

مسنون اذکار کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے خود اپنے نبی کو بتلایا دیا ہے کہ میرے بندوں کو کہہ دیں کہ مجھے یوں یاد کریں اور ان الفاظ میں میری حمد وثناء بیان کریں۔ اب جب اللہ عزوجل نے خود بتلا دیا ہے کہ مجھے ان الفاظ میں یاد کرو تو اس سے بڑی محرومی کیا ہو گی کہ میں اپنے محبوب کی تعریف ان الفاظ میں تو نہ کروں کہ جن میں اس نے مجھ سے اپنی تعریف کرنے کا مطالبہ کیا ہے اور خود سے اپنے الفاظ میں کرنا شروع کر دوں۔ ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَنْ قَالَ فِي يَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ لَا شَرِيكَ، لَهُ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ وَهُوَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ، كَانَ لَهُ عَدْلُ عَشْرِ رِقَابٍ، وَكُتِبَتْ لَهُ مِائَةُ حَسَنَةٍ، وَمُحِيَ عَنْهُ مِائَةُ سَيِّئَةٍ، وَكُنَّ لَهُ حِرْزًا مِنَ

[1] سنن الترمذي، أَبْوَابُ الدَّعَوَاتِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، 577/5

الشَّيْطَانِ، سَائِرَ يَوْمِهِ إِلَى اللَّيْلِ، وَلَمْ يَأْتِ أَحَدٌ بِأَفْضَلَ مِمَّا أَتَى بِهِ، إِلَّا مَنْ قَالَ أَكْثَرَ»[1]

''حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے ایک دن میں سو مرتبہ پڑھ لیا تو اسے دس غلام آزاد کرنے کا ثواب ملے گا۔ اس کے نامہ اعمال میں سو نیکیاں لکھی جائیں گی اور سو گناہ معاف کیے جائیں گے۔ اور یہ کلمات اس دن میں رات تک اس کے لیے شیطان سے حفاظت کا ذریعہ بن جائیں گے۔ اور اس دن میں اس سے افضل عمل کسی کا نہ ہو گا سوائے اس کے کہ جس نے اس سے زیادہ مرتبہ یہ کلمات پڑھے ہوں گے۔''

صوفیاء کے بعض حلقوں میں نبوی اذکار کو ترک کر کے بزرگوں کے وظائف سالکین کو تجویز کیے جاتے ہیں۔ اب ''اللہ ہو'' کا ورد کسی بھی صحیح روایت سے ثابت نہیں ہے لیکن ہر ماں بچوں کو لوری دیتے ہوئے بھی یہی پڑھ رہی ہوتی ہے۔ اس کی بجائے ہمیں ''اللہ ہم'' کی لوری دینی چاہیے کہ جو مسنون لفظ ہے کہ اس کی اصل ''أللھم'' ہے۔ اور یہ لفظ بطور دعا اور ذکر قرآن مجید اور احادیث میں کثرت سے آیا ہے۔ مسنون اذکار میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی صبح وشام کی دعائیں بھی شامل ہیں۔ کویت کے ایک عالم دین نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے صبح وشام کے اذکار اور مختلف احوال کی دعائیں ''حصن المسلم'' کے نام سے ایک کتاب میں جمع کر دی ہیں کہ جو پاکٹ سائز میں بھی مارکیٹ میں دستیاب ہے۔ ہم میں سے ہر شخص کی جیب میں یہ کتاب ہونی چاہیے کہ سفر وحضر میں جب موقع ملا تو کچھ اذکار اور دعائیں یاد کر لیں یا دہرا لیں۔

ہمارے لیے وہ الفاظ بہت اہم ہیں کہ جن کے ذریعے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کو یاد کیا کرتے تھے، اللہ کی حمد وثناء بیان کرتے تھے، اللہ کا قرب حاصل کیا کرتے تھے، اپنی بندگی کے احوال کو زندہ کرتے تھے۔ یہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے انحراف نہیں ہو گا کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اذکار کو ترک کر کے اپنے بنائے ہوئے وظائف پر لوگوں کو بھی لگائیں اور خود بھی ان کی پابندی کریں۔

---

[1] سنن الترمذي، كِتَابُ الْأَدَبِ، بَابُ فَضْلِ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، 1248/2

اب اسی پر غور کر لیں کہ اکثر لوگ درود ابراہیمی نہیں پڑھتے کہ جس کے پڑھنے کی اللہ کے نبی ﷺ نے تلقین فرمائی ہے اور اپنی طرف سے بنائے ہوئے درود مثلاً درود تاج، درود تنجینا اور درود لکھی معلوم نہیں کیا کچھ پڑھتے رہتے ہیں حالانکہ ان میں سے بعض کے الفاظ شرکیہ ہوتے ہیں کہ جن کے پڑھنے سے ثواب تو کیا الٹا گناہ ملنے کی وعید ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے آپ سے پوچھا کہ آپ پر کیسے درود بھیجیں تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ درود ابراہیمی پڑھا کرو لیکن اس کے باوجود ہم اگر نبوی الفاظ کی بجائے اپنے الفاظ میں درود بھیجنے کو زیادہ اہمیت دیں تو ہم سے بڑھ کر بدنصیب کون ہو گا؟ کیا نبی کریم ﷺ کے پسند فرمودہ اور تلقین کردہ درود شریف کے مقابلے میں کسی امتی کے درود شریف کی کوئی ذرہ برابر بھی اہمیت ہے؟

اسی طرح ذکر کی افضل ترین صورت وہ ہے کہ جو افضل ترین مقام یا افضل ترین اوقات یا افضل ترین حالات میں ہو۔ لہذا مسجد میں ذکر، تہجد کے وقت ذکر اور نماز کی حالت میں ذکر، ذکر کی افضل ترین صورتیں ہیں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَنَسٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَنْ صَلَّى الغَدَاةَ فِي جَمَاعَةٍ ثُمَّ قَعَدَ يَذْكُرُ اللَّهَ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ، ثُمَّ صَلَّى رَكْعَتَيْنِ كَانَتْ لَهُ كَأَجْرِ حَجَّةٍ وَعُمْرَةٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: تَامَّةٍ تَامَّةٍ تَامَّةٍ»[1]

”حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ جس نے صبح کی نماز جماعت کے ساتھ ادا کی اور پھر اسی جگہ بیٹھ کر اللہ کا ذکر کیا یہاں تک کہ سورج طلوع ہو گیا اور پھر دو رکعتیں نماز ادا کی تو اس کو ایک حج اور ایک عمرے کا ثواب ملے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ حج اور عمرے کا مکمل ثواب۔ اور یہ بات آپ ﷺ نے تین مرتبہ ادا فرمائی۔“

ہر سال بے شمار لوگ لاکھوں روپے لگا کر حج اور عمرہ پر جاتے ہیں لیکن ان میں سے

---

[1] سنن الترمذي، كتاب أَبْوَابُ السَّفَرِ، بَابُ ذِكْرِ مَا يُسْتَحَبُّ مِنَ الجُلُوسِ فِي الْمَسْجِدِ بَعْدَ صَلاَةِ الصُّبْحِ حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ، 727/1

کس کا حج اور عمرہ قبول ہوتا ہے؟ تو یہ کسی کے علم میں نہیں ہے۔ اس روایت میں اللہ کے رسول ﷺ ایک ایسے حج اور عمرے کی بشارت دے رہے ہیں کہ جو اللہ کے ہاں قبول ہو چکا ہے لہذا ہمیں کبھی کبھار یہ عمل ضرور کر لینا چاہیے۔

غفلت کا گناہ

گناہ عبادت کی لذت کے ساتھ سینے کے نور کو بھی ختم کر دیتا ہے۔ عبادت اگر کسی درجہ میں احسان کو پہنچتی ہو تو انسان کے سینے میں ایک روشنی پیدا کر دیتی ہے۔ یہ روشنی دیا سلائی کے ٹمٹاتے شعلے سے شروع ہوتی ہے اور معلوم نہیں کہاں تک جاتی ہے۔ اس نور کا ذکر اللہ عز و جل نے سورۃ نور میں کیا ہے:

﴿اللَّـهُ نُورُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ مَثَلُ نُورِهِ كَمِشْكَاةٍ فِيهَا مِصْبَاحٌ الْمِصْبَاحُ فِي زُجَاجَةٍ الزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ يُوقَدُ مِن شَجَرَةٍ مُّبَارَكَةٍ زَيْتُونَةٍ لَّا شَرْقِيَّةٍ وَلَا غَرْبِيَّةٍ يَكَادُ زَيْتُهَا يُضِيءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ نُّورٌ عَلَىٰ نُورٍ يَهْدِي اللَّـهُ لِنُورِهِ مَن يَشَاءُ وَيَضْرِبُ اللَّـهُ الْأَمْثَالَ لِلنَّاسِ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ [النور: 35]

"اللہ زمین اور آسمان کا نور ہے۔ [بندہ مومن کے دل میں] اللہ کے نور کی مثال ایک طاقچے کی مانند ہے کہ جس میں ایک چراغ پڑا ہو۔ اور وہ چراغ، کہ جسے زیتون کے اس بابرکت درخت کے تیل سے روشن کیا جاتا ہو جو نہ شرقی ہو نہ غربی، ایک قندیل میں ہے۔ اور وہ قندیل گویا کہ ایک چمکتا ہوا تارہ ہے۔ اور چراغ کا تیل [اس قدر صاف شفاف ہے] کہ بغیر آگ کے مس کیے بھڑکنے کے لیے تیار ہے۔ یہ نور پر نور ہے۔ اللہ تعالی اپنے اس نور کی طرف جس کی چاہتا ہے، رہنمائی کرتا ہے۔ اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔"

حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے اس آیت مبارکہ میں بیان شدہ نور کی مثال کو بندہ مومن کے سینے کا نور قرار دیا ہے۔[1] امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ اس آیت مبارکہ میں طاقچے سے مراد مومن کا سینہ ہے اور چراغ سے مراد قرآن مجید اور ایمان

[1] الطبري، محمد بن جرير بن يزيد، جامع البيان في تأويل القرآن، مؤسسة الرسالة، 2000 م، 179/19

ہے۔اور قندیل سے مراد انسان کا دل ہے۔[1] یعنی بندہ مومن کے دل میں قرآن مجید اور ایمان کا نور ہے کہ جس نے اس کے سینے کو انتہائی روشن کر دیا ہے۔اس نور کی مجسم صورت کا مشاہدہ ہمیں قیامت والے دن ہو گا جیسا کہ سورۃ تحریم میں ہے:

﴿يَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ يَسْعَىٰ نُورُهُم بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَبِأَيْمَانِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَتْمِمْ لَنَا نُورَنَا وَاغْفِرْ لَنَا إِنَّكَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾ [التحريم: 8]

"جس دن آپ دیکھیں گے مومن مردوں اور عورتوں کو کہ ان کا نور ان کی دائیں جانب اور ان کے آگے آگے دوڑتا ہو گا۔اور وہ یہ کہہ رہے ہوں گا: اے ہمارے پروردگار! ہمارے نور کو ہمارے لیے مکمل کر دے اور ہماری مغفرت فرما۔یقیناً تو ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔"

اس آیت مبارکہ کی ایک تفسیر یہ بھی کی گئی ہے کہ قیامت والے دن انسان کے سامنے اس کے قلب کا نور ہو گا جو اس کے ایمان کے برابر ہو گا جبکہ دائیں طرف اس کے نیک اعمال کا نور ہو گا کیونکہ عموماً نیک اعمال کا سبب انسان کا داہنا ہاتھ ہوتا ہے۔

قرآن مجید اور ایمان کے اس نور کے سینے میں موجود ہونے کا احساس دنیا میں ہی بندہ مومن کو ہو جاتا ہے۔جس نے اس نور کو اپنے سینے میں محسوس نہیں کیا، اس نے ایمان کی مٹھاس نہیں چکھی۔امام ابن قیم رحمہ اللہ اپنے استاذ اور شیخ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا قول نقل کرتے ہیں:

إِنَّ فِي الدُّنْيَا جَنَّةً مَنْ لَمْ يَدْخُلْهَا لَمْ يَدْخُلْ جَنَّةَ الآخِرَةِ.[2]

"اس دنیا میں بھی ایک جنت ہے۔جو دنیا کی اس جنت میں داخل نہ ہو سکا وہ آخرت کی جنت میں بھی داخل نہ ہو گا۔"

اس بارے شیخ الاسلام رحمہ اللہ کا ایک اور قول بھی معروف ہے جو انہوں نے اپنے شاگرد امام ابن قیم رحمہ اللہ سے قلعہ میں قید کر دیے جانے پر کہا تھا:

---

[1] ابن قيم الجوزية، محمد بن أبي بكر بن أيوب، مختصر الصواعق المرسلة على الجهمية والمعطلة، دار الحديث، القاهرة، مصر، ص 427

[2] ابن القيم الجوزية، الوابل الصيب ورافع الكلم الطيب، دار عالم الفوائد، مكة المكرمة، ص 109

مَا يَصْنَعُ أَعْدَائِي بِي؟، أَنَا جَنَّتِي وَبُسْتَانِي فِي صَدْرِي، أَيْنَ رُحْت فَهِيَ مَعِي لا تُفَارِقُنِي، أَنَا حَبْسِي خَلْوَةٌ، وَقَتْلِي شَهَادَةٌ، وَإِخْرَاجِي مِنْ بَلَدِي سِيَاحَةٌ.[1]

”میرے دشمن میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟ میری جنت تو میرے سینے میں ہے۔ میں جہاں بھی جاؤں، یہ میرے ساتھ ہے۔ یہ مجھے قید کر دیں تو یہ قید میرے لیے خلوت کی نعمت ہے۔ اگر مجھے قتل کر دیں تو یہ قتل میرے لیے شہادت کی نعمت ہے۔ اور اگر ملک بدر کر دیں تو یہ ملک بدری میرے لیے سیاحت کی نعمت ہے۔“

یہ کلمات وہی شخص کہہ سکتا ہے کہ جو ہر حال میں اللہ کی رضا پر راضی رہنا سیکھ چکا ہو۔ اور وہ گناہ جو سینے سے نور ایمان کو ختم کر دیتا ہے، غفلت کا گناہ ہے یعنی اللہ کی یاد سے غفلت۔ غفلت ہی وہ پہلا گناہ ہے جو دیگر گناہوں کے لیے پہلی سیڑھی بنتا ہے۔ اور غفلت سے بچنے کا بہترین ذریعہ اللہ کی یاد ہے۔ جن مومن بندوں کے سینے میں موجود ایمان کے نور کی مثال اوپر بیان ہوئی، انہی کے بارے اگلی آیات میں ارشاد ہے:

﴿رِجَالٌ لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللَّهِ وَإِقَامِ الصَّلَاةِ وَإِيتَاءِ الزَّكَاةِ﴾ [النور: 37]

”یہ ایسے لوگ ہیں کہ کسی قسم کی تجارت یا خرید و فروخت انہیں اللہ کی یاد سے غافل نہیں کر سکتی اور نہ ہی نماز قائم کرنے اور نہ ہی زکوۃ ادا کرنے سے غافل کر سکتی ہے۔“

اللہ تعالی نے ہمیں کاروبار دنیا سے منع نہیں فرمایا کیونکہ ترک دنیا تو رہبانیت ہے اور اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن خالق نے ہم سے یہ ضرور مطالبہ کیا ہے کہ بازار اور آفس، سفر اور حضر، اٹھتے اور بیٹھتے، کھڑے اور چلتے پھرتے میں بھی مجھے ویسے ہی یاد رکھو جیسے مسجد میں رکوع اور سجدے کی حالت میں یاد رکھنا چاہیے۔ ایمان کا نور اس مومن کے سینے میں روشن ہوتا ہے جسے اللہ عزوجل بھولتے نہ ہوں اور ہر حال میں یاد

[1] أيضاً

رہتے ہوں۔ اور اللہ کو یاد رکھنے کا بہترین ذریعہ زبان پر مسنون کلمات ذکر کے جاری ہونے کی عادت ڈالنا ہے۔

تہجد اور تزکیہ

اصلاح نفس کے نبوی منہج میں تہجد کی اہمیت ریڑھ کی ہڈی کی سی ہے۔ معاصر صوفیاء اور سلاسل کے ہاں تہجد کے وقت بیداری کا اہتمام تو کیا جاتا ہے لیکن اس وقت میں ذکر کو تلاوت قرآن اور مراقبے کو نماز پر ترجیح دی جاتی ہے جو کہ درست نہیں ہے۔

نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے کتاب وسنت میں یہ بات صراحت سے موجود ہے کہ تہجد کے اوقات میں ان کا شغل نماز میں طویل قیام کے ساتھ لمبی تلاوت کرنا اور رکوع وسجود میں کثرت سے دعائیں مانگنا تھا۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِن ثُلُثَيِ اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ وَطَائِفَةٌ مِّنَ الَّذِينَ مَعَكَ﴾ [المزمل: 20]

"یقیناً آپ کا رب جانتا ہے کہ آپ ایک تہائی رات یا نصف رات یا دو تہائی رات تہجد کے لیے کھڑے رہتے ہیں اور آپ کے ساتھیوں کی ایک جماعت بھی ایسا ہی کرتی ہے۔"

اللہ کے رسول ﷺ نے فرض نماز کے بعد افضل نماز تہجد کو قرار دیا ہے جیسا کہ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«أَفْضَلُ الصَّلَاةِ، بَعْدَ الصَّلَاةِ الْمَكْتُوبَةِ، الصَّلَاةُ فِي جَوْفِ اللَّيْلِ، وَأَفْضَلُ الصِّيَامِ بَعْدَ شَهْرِ رَمَضَانَ، صِيَامُ شَهْرِ اللهِ الْمُحَرَّمِ»[1]

"فرض نماز کے بعد افضل ترین نماز رات کے درمیانی حصے میں نماز ادا کرنا ہے اور رمضان کے روزوں کے بعد افضل ترین روزے محرم کے مہینے کے ہیں۔"

اللہ کے رسول ﷺ نے میاں بیوی میں سے ہر ایک کو ترغیب دلائی ہے کہ وہ ایک دوسرے کو نماز تہجد کی ادائیگی کے لیے آمادہ کرے اور اس بارے ممکن تعاون کریں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

---

[1] صحيح مسلم، كِتَاب الصِّيَامِ، بَابُ فَضْلِ صَوْمِ الْمُحَرَّمِ، 821/2

«رَحِمَ اللَّهُ رَجُلًا قَامَ مِنَ اللَّيْلِ فَصَلَّى، ثُمَّ أَيْقَظَ امْرَأَتَهُ فَصَلَّتْ، فَإِنْ أَبَتْ نَضَحَ فِي وَجْهِهَا الْمَاءَ، وَرَحِمَ اللَّهُ امْرَأَةً قَامَتْ مِنَ اللَّيْلِ فَصَلَّتْ، ثُمَّ أَيْقَظَتْ زَوْجَهَا فَصَلَّى، فَإِنْ أَبَى نَضَحَتْ فِي وَجْهِهِ الْمَاءَ»[1]

"اللہ عزوجل اس شخص پر رحم کرے کہ جو رات کی نماز کے لیے کھڑا ہوا اور نماز پڑھی۔ اور اس نے اپنی بیوی کو بھی جگایا اور اس نے بھی نماز پڑھی۔ اور اگر اس نے جاگنے میں سستی کی تو اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔ اور اللہ عزوجل اس عورت پر بھی رحم کرے کہ جس نے رات میں قیام کیا۔ اور اس نے اپنے شوہر کو بھی جگایا اور اس نے بھی نماز پڑھی۔ اور اگر اس نے جاگنے میں سستی کی تو اس کے منہ پر پانی کے چھینٹے مارے۔"

آپ ﷺ نے تہجد شروع کرنے کے بعد اس کے ترک کرنے کو ناپسند فرمایا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ آپ نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے کہا:

«يَا عَبْدَ اللَّهِ، لاَ تَكُنْ مِثْلَ فُلاَنٍ كَانَ يَقُومُ اللَّيْلَ، فَتَرَكَ قِيَامَ اللَّيْلِ»[2]

"اے عبداللہ! اس شخص کی مانند نہ ہو جانا جو تہجد کی نماز پڑھا کرتا تھا اور پھر اس نے تہجد پڑھنا چھوڑ دیا۔"

دعاء اور تزکیہ

ایک دفعہ راقم نے اس سوچ سے اکابر اہل علم کی سوانح (biographies) کا مطالعہ شروع کیا کہ معلوم ہو کہ ان کو بڑا بنانے میں کس چیز کا اہم کردار تھا؟ یا وہ کون سا ایسا عمل کرتے تھے جس نے انہیں علم و فضل میں ایسے مقام پر پہنچا دیا کہ بعد میں آنے والے لوگ ان پر رشک کرنے لگے۔ میں نے جو چیز ان کی حیات زندگی سے اخذ کی، وہ ان کا لمبی لمبی دعاؤں کو اپنا معمول بنانا تھا۔ معلوم نہیں میں نے جو چیز اخذ کی، اس کا ان کے بڑا بننے میں کیا کردار تھا لیکن یہ بات طے ہے کہ یہ شے ان سب کی زندگیوں میں

[1] سنن النسائي، كِتَابُ قِيَامِ اللَّيْلِ وَتَطَوُّعِ النَّهَارِ، بَابُ التَّرْغِيبِ فِي قِيَامِ اللَّيْلِ، 205/3
[2] صحيح بخاري، كتاب التهجد، بَابُ مَا يُكْرَهُ مِنْ تَرْكِ قِيَامِ اللَّيْلِ لِمَنْ كَانَ يَقُومُهُ، 54/2

مشترک طور نظر آئی۔

اکثر اکابر علماء تین اوقات میں دعا کا اہتمام کرتے تھے۔ بعض اہل علم تہجد کے وقت بیدار ہو کر لمبی چوڑی دعا فرماتے جبکہ بعض کا معمول تھا کہ وہ فجر کی نماز کے بعد مسجد میں ہی بیٹھے رہتے اور اشراق تک دعا کیا کرتے تھے۔ اسی طرح عصر کی نماز کے بعد مغرب تک مسجد میں بیٹھ کر دعا کا اہتمام کرنا بھی بعض کے معمولات میں شامل تھا۔ ماضی میں راقم کو تقریباً ایک سال تک فجر سے اشراق اور عصر سے مغرب کے دوران لمبی دعا کرنے کی توفیق ملی تو اس سے بہت سی ایسی کیفیات میسر ہوئیں کہ جن کی یادیں آج بھی دل ودماغ میں تازہ ہیں۔

دعا میں زیادہ تاثیر اس وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ دعا مسنون اور لمبی ہو۔ دعا کی تاثیر دو قسم کی ہے: ایک دنیوی اور دوسری دینی۔ دنیوی تاثیر سے مراد اس کا قبول ہونا ہے اور دینی تاثیر سے مراد اس کا تقرب الی اللہ اور سلوک کی منازل طے کرنے کا ذریعہ بن جانا ہے۔ اور لمبی دعا کرنا اور کثرت سے دعا کرنا ایک ایسا عمل ہے جو اسے مقبول بنانے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔ دینی تاثیر سے مراد یہ ہے کہ دعا اگر قبول نہ بھی ہو تو کم از کم ایک یقینی فائدہ تو ضرور ہے کہ دعا کرنے والے نے جس دنیاوی مسئلے میں دعا کی، اللہ عزوجل دعا کرنے کے بعد نہ صرف اس بارے فوری دلی سکون عطا فرماتے ہیں بلکہ اس کی یہ دعا قرب الہی کا ذریعہ بھی بن جاتی ہے۔ اور دعا کرنے والے کا اللہ کی ذات پر ایمان اور توکل بڑھ جاتا ہے۔

لمبی دعائیں کرنے میں جناب مولانا عبدالرحمن مدنی کے عمل سے ان کی اولاد کو بہت ترغیب وتشویق ملی۔ طواف وسعی کے دوران یا تہجد کے اوقات میں گھنٹوں دعا کرنا یہ ان کے عام معمولات میں سے ہے۔ وہ خود اپنے جملہ دینی کام کو اپنی دعاؤں کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ لمبی دعا سے ہماری مراد کم از آدھ پون گھنٹے کی دعا ہے۔

اور دعا صرف اس لیے نہیں ہے کہ ہمیں کوئی آزمائش پیش آئے یا کوئی نعمت چاہیے تو اللہ سے دعا کریں۔ عموماً ہمارے ہاں دعا انہی دو مقاصد میں سے کسی ایک مقصد کے

لیے کی جاتی ہے۔ اور اگر ان دو میں سے کوئی مقصد پیش نظر نہ ہو تو انسان دعا کو ایک اضافی کام سمجھتا ہے۔ دعا دراصل ایک ایسی مستقل عبادت ہے جو اللہ کو راضی کرنے اور اس کا قرب حاصل کرنے کا اسی طرح کا ذریعہ ہے جیسا کہ نماز، صدقہ اور دیگر عبادات ذریعہ ہیں۔ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے دعا کی دو قسمیں بیان کی ہیں: ایک دعائے مسئلہ اور دوسری دعائے عبادت۔ دعائے مسئلہ وہ ہے جو کسی مشکل یا مصیبت میں کی جائے اور دعائے عبادت وہ دعا ہے جو عبادت سمجھ کر کی جائے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «الدُّعَاءُ هُوَ العِبَادَةُ ثُمَّ قَرَأَ: وَقَالَ رَبُّكُمْ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ»[1]

”حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: دعا ہی عبادت ہے اور آپ نے اس کے بعد قرآن مجید کی اس آیت کی تلاوت کی: اور تمہارے رب نے کہا ہے کہ تم مجھ سے دعا کرو کہ میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔ بے شک جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں تو وہ جہنم میں ذلیل وخوار ہوتے ہوئے داخل ہوں گے۔“

اس آیت مبارکہ میں دعا کو عبادت قرار دیا گیا ہے اور جو لوگ دعا نہیں کرتے انہیں متکبر کہا گیا ہے۔ دعا کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ یہ انسان میں عاجزی کی کیفیات پیدا کرتی ہے۔ جس قدر انسان کی زندگی میں دعا کی عبادت ہو گی، اسی قدر اسے عاجزی کے احوال میسر ہوں گے۔ بعض مذہبی حلقوں میں نمازوں کے بعد اجتماعی دعا کے انکار یا اسے بدعت قرار دینے کے عمل کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا ہے کہ لوگوں کی زندگی سے دعا سرے ہی سے نکل گئی ہے۔

پس ایک طرف تو وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے دعا کو ایک رسم بنا دیا ہے جیسا کہ کسی کی فوتیدگی پر تھوک کے حساب سے رسماً دعائیں کی جاتی ہیں اور لوگ گھنٹوں غفلت، لاپرواہی اور بے دلی سے ہاتھ اٹھانے اور ہاتھ گرانے کی مشق میں لگے رہتے ہیں۔ ایک

---

[1] سنن الترمذي، أَبْوَابُ الدَّعَوَاتِ، بَاب مَا جَاءَ فِي فَضْلِ الدُّعَاءِ، 313/5

روایت کے الفاظ ہیں:

«وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَجِيبُ دُعَاءً مِنْ قَلْبٍ غَافِلٍ لَاهٍ»[1]

”جان لو! اللہ عزوجل اس دل کی دعا قبول نہیں فرماتے کہ جو غفلت اور کھیل میں دعا کرے۔“

دوسری طرف وہ لوگ ہیں کہ جنہوں نے ان رسموں کا انکار کرتے کرتے دعا ہی کو اپنی زندگی سے نکال دیا ہے۔ تو دعا تزکیہ نفس کے عمل میں اور سالک کے راہ سلوک میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے کہ جس کا التزام بہت ضروری ہے۔

بعض لوگوں کو یہ شکایت ہوتی ہے کہ ہم دعا کرتے ہیں لیکن قبول نہیں ہوتی۔ تو اس بارے ہم ایک بات تو یہ کر چکے ہیں کہ ایک دعائے مسئلہ ہے جو کسی مشکل میں کی جائے اور ایک دعائے عبادت ہے جو اللہ کا تقرب اور رضامندی حاصل کرنے کے لیے عبادت سمجھ کر کی جائے۔ یہ سوال پہلی قسم کی دعا کے بارے پیدا ہو سکتا ہے اور اس کا جواب یہ ہے کہ دعا کی قبولیت کا وہ مفہوم ہمیں ذہن میں رکھنا چاہیے جو اللہ کے ﷺ نے واضح کیا ہے۔ اس سے ان شاء اللہ، دعا کرنے کے بعد کبھی مایوسی نہ ہو گی۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«إِنَّ رَبَّكُمْ تَبَارَكَ وَتَعَالَى حَيِيٌّ كَرِيمٌ، يَسْتَحْيِي مِنْ عَبْدِهِ إِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ إِلَيْهِ، أَنْ يَرُدَّهُمَا صِفْرًا»[2]

”بے شک تمہارا رب بہت ہی کریم اور حیا والا ہے۔ وہ اپنے بندے سے اس بارے حیا محسوس کرتا ہے کہ وہ اس کے سامنے ہاتھ پھیلائے اور وہ اس کے ہاتھوں کو خالی لوٹا دے۔“

اللہ عزوجل کسی بندے کے ہاتھوں کو خالی نہیں لوٹاتے تو اس سے کیا مراد ہے؟ اللہ کے رسول ﷺ کی ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

«مَا عَلَى الأَرْضِ مُسْلِمٌ يَدْعُو اللَّهَ بِدَعْوَةٍ إِلاَّ آتَاهُ اللَّهُ إِيَّاهَا أَوْ صَرَفَ عَنْهُ مِنَ السُّوءِ مِثْلَهَا مَا لَمْ يَدْعُ بِإِثْمٍ أَوْ قَطِيعَةِ رَحِمٍ، فَقَالَ رَجُلٌ

---

[1] سنن الترمذي، أَبْوَابُ الدَّعَوَاتِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، 517/5

[2] سنن أبي داود، بَابُ تَفْرِيعِ أَبْوَابِ الْوِتْرِ، بَابُ الدُّعَاءِ، 78/2

مِنَ الْقَوْمِ: إِذًا نُكْثِرُ، قَالَ: اللَّهُ أَكْثَرُ»[1]

"جب بھی کوئی مسلمان اللہ سے دعا کرتا ہے بشرطیکہ اس کی دعا گناہ یا قطع رحمی کے بارے نہ ہو تو اللہ تعالی اس دعا کے بدلے میں اسے تین میں سے ایک انعام ضرور دیتے ہیں: یا تو اس کی دعا فوراً قبول کر لیتے ہیں یا پھر اس کو آخرت کے لیے ذخیرہ کر لیتے ہیں یا اس دعا کے بدلے میں اپنے بندے سے کوئی دوسری آزمائش ٹال دیتے ہیں۔ اس پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے کہا کہ اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم! پھر تو ہم کثرت سے دعا کریں گے؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا: اللہ بھی کثرت سے ان تین میں سے کوئی ایک انعام دے گا۔"

پس انسان کی دعا کسی صورت رائیگاں نہیں جاتی اور اگر دنیا میں قبول نہ بھی ہو تو آخرت میں اس سے بہتر چیز اسے ملے گی کہ جس کے لیے اس نے دنیا میں دعا کی تھی۔ یا پھر اللہ تعالی انسان سے اس دعا کے بدلے کوئی آزمائش اور مصیبت ٹال دیتے ہیں کہ جو اسے لاحق ہوتی ہے یا مستقبل میں لاحق ہونے والی ہے۔ اور بعض اوقات تو اسے علم بھی نہیں ہوتا کہ یہ آزمائش فلاں دعا کے بدلے ٹل گئی ہے۔

بعض لوگوں کا سوال ہوتا ہے کہ آدھا پون گھنٹہ دعا میں مانگیں کیا؟ ہمیں اتنی دعائیں نہیں آتی۔ آسان حل تو یہ ہے کہ جو خیر اور بھلائی ذہن میں آئے، وہ اپنی زبان میں پروردگار سے مانگتے جائیں۔ علاوہ ازیں ڈاکٹر سعید بن علی القحطانی کا ایک کتابچہ "الدعاء من الكتاب والسنة" اگر پاکٹ سائز میں مل جائے تو اسے سامنے رکھ کر صبح وشام لمبی دعائیں مانگی جا سکتی ہیں۔ اس کتابچے میں قرآن مجید سے تمام انبیاء کی اور احادیث سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام دعاؤں کو جمع کیا گیا ہے۔

اسمائے حسنی کی برکت

اسمائے حسنی کو یاد کرنا اور ان کے ذریعے دعا کرنا ایک ایسی سنت ہے کہ جسے تقریباً بھلایا جا چکا ہے۔ اور یہ ایسے بابرکت نام ہیں کہ ان کی برکت سے انسان بابرکت

[1] سنن الترمذي، أَبْوَابُ الدَّعَوَاتِ، بَاب فِي انْتِظَارِ الفَرَجِ وَغَيْرِ ذَلِكَ، 458/5

بن جائے۔ احادیث میں اسمائے حسنی کو یاد کرنے کی بھی بہت فضیلت وارد ہوئی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«لِلَّهِ تِسْعَةٌ وَتِسْعُونَ اسْمًا، مِائَةٌ إِلَّا وَاحِدًا، لاَ يَحْفَظُهَا أَحَدٌ إِلَّا دَخَلَ الجَنَّةَ، وَهُوَ وَتْرٌ يُحِبُّ الوَتْرَ»[1]

"اللہ عز وجل کے ننانوے نام ہیں۔ جو بھی انہیں یاد کرے گا تو وہ جنت میں داخل ہو گا۔"

یہ واضح رہے کہ اللہ کے نام ننانوے کے علاوہ بھی ہیں جیسا کہ دوسری روایات میں موجود ہیں لیکن کم از کم ننانوے کو یاد کرنے کی فضیلت یہ بیان ہوئی ہے کہ ایسا کرنے والا جنت میں داخل ہو گا۔ ایک اور روایت کے الفاظ ہیں کہ جو شخص کسی غم یا آزمائش میں مبتلا ہو تو اللہ تعالی اسمائے حسنی کے وسیلے سے دعا کرنے سے اس کا غم یا آزمائش دور کر دیتے ہیں۔ روایت کے الفاظ ہیں:

«مَا قَالَ عَبْدٌ قَطُّ إِذَا أَصَابَهُ هَمٌّ وَحَزَنٌ: اللهُمَّ إِنِّي عَبْدُكَ، وَابْنُ عَبْدِكَ، ابْنُ أَمَتِكَ، نَاصِيَتِي بِيَدِكَ، مَاضٍ فِيَّ حُكْمُكَ، عَدْلٌ فِيَّ قَضَاؤُكَ، أَسْأَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ، سَمَّيْتَ بِهِ نَفْسَكَ، أَوْ أَنْزَلْتَهُ فِي كِتَابِكَ، أَوْ عَلَّمْتَهُ أَحَدًا مِنْ خَلْقِكَ، أَوِ اسْتَأْثَرْتَ بِهِ فِي عِلْمِ الْغَيْبِ عِنْدَكَ، أَنْ تَجْعَلَ الْقُرْآنَ رَبِيعَ قَلْبِي، وَنُورَ صَدْرِي، وَجِلَاءَ حُزْنِي، وَذَهَابَ هَمِّي، إِلَّا أَذْهَبَ اللهُ عَزَّ وَجَلَّ هَمَّهُ، وَأَبْدَلَهُ مَكَانَ حُزْنِهِ فَرَحًا، قَالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ يَنْبَغِي لَنَا أَنْ نَتَعَلَّمَ هَؤُلَاءِ الْكَلِمَاتِ؟ قَالَ: أَجَلْ، يَنْبَغِي لِمَنْ سَمِعَهُنَّ أَنْ يَتَعَلَّمَهُنَّ»[2]

"جب کسی شخص کو کوئی غم یا آزمائش پہنچے اور وہ یہ دعا کرے: اے اللہ! میں، آپ کا غلام، آپ کے غلام کا بیٹا، آپ کی بندی کا بیٹا۔ میری پیشانی آپ کے ہاتھ میں ہے، میرے بارے آپ کا حکم جاری ہو کر رہنے والا اور میرے بارے آپ کا فیصلہ عدل پر مبنی ہے۔ میں آپ سے ہر اس نام کے ذریعے سوال کرتا ہوں جو آپ نے اپنے لیے رکھا ہو، یا وہ آپ ہی کا نام ہو، یا آپ نے وہ نام اپنی

---

[1] صحيح البخاري، كِتَابُ الدَّعَوَاتِ، بَابٌ: لِلَّهِ مِائَةُ اسْمٍ غَيْرَ وَاحِدٍ، 87/8

[2] مسند أحمد: 341/7

مخلوق میں سے کسی کو سکھایا ہو، یا آپ نے وہ نام اپنی کسی کتاب میں نازل کیا ہو، یا آپ نے وہ نام اپنے پاس علم غیب میں محفوظ کیا ہو۔ پروردگار! آپ قرآن عظیم کو میرے دل کی بہار، میرے سینے کا نور، میرے غم کا مداوا، میری پریشانی کا علاج بنادیں۔ آپ نے فرمایا: اگر کوئی شخص اس طرح دعا کرے گا تو اللہ تعالی اس کے غم اور پریشانی کو خوشی میں بدل دیں گے۔ آپ ﷺ سے سوال کیا گیا: اے اللہ کے رسول ﷺ! کیا ہم یہ نام سیکھ نہ لیں۔ آپ نے فرمایا: بلکہ ہر اس شخص لیے کہ جس نے یہ بات سنی ہے، لازم ہے کہ وہ ان ناموں کو سیکھے۔"

قرآن مجید نے بھی ہمیں یہ حکم دیا ہے کہ ہم اللہ عزوجل سے اس کے ناموں کے واسطے سے دعا کریں۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَلِلَّهِ الأَسْمَاءُ الْحُسْنَى فَادْعُوهُ بِهَا﴾ [الأعراف: 180]

"اور اللہ کے اچھے اچھے نام ہیں۔ اللہ عزوجل سے ان ناموں کے ذریعے دعا کیا کرو۔"

بعض روایات میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ اللہ کے ناموں میں سے ایک نام ایسا ہے جو اسم اعظم ہے اور اگر اس نام سے اللہ سے دعا کی جائے تو اللہ عزوجل لازماً دعا قبول کرتے ہیں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«عن بُرَيْدَةَ بنِ الحُصَيْب أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَمِعَ رَجُلًا يَقُولُ: اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ أَنِّي أَشْهَدُ أَنَّكَ أَنْتَ اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ الْأَحَدُ الصَّمَدُ الَّذِي لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ، فَقَالَ: لَقَدْ سَأَلْتَ اللَّهَ بِالِاسْمِ الَّذِي إِذَا سُئِلَ بِهِ أَعْطَى وَإِذَا دُعِيَ بِهِ أَجَابَ»[1]

"حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے ایک شخص کو یہ دعا کرتے سنا: اے اللہ! میں آپ سے اس بنیاد پر سوال کرتا ہوں کہ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ ہی اللہ عزوجل ہیں اور یہ کہ آپ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ آپ اکیلے اور بے نیاز ہیں۔ نہ کسی نے آپ کو جنم دیا اور نہ آپ نے کسی

[1] سنن الترمذي، أَبْوَابُ الدَّعَوَاتِ، بَابُ جَامِعِ الدَّعَوَاتِ، 515/5

کو جنا اور آپ کا کوئی ہمسر نہیں ہے۔ اس پر اللہ کے رسول ﷺ نے کہا: تو نے اللہ سے ایک ایسے نام کے ساتھ دعا کی ہے کہ جب بھی اللہ سے اس نام کے ساتھ سوال کیا جائے تو وہ پورا کیا جاتا ہے اور جب اس نام سے دعا کی جائے تو وہ قبول کی جاتی ہے۔"

اللہ کا اسم اعظم کیا ہے؟ اس بارے اہل علم کا اختلاف ہے۔ بعض نے تو اسے محض ایک کیفیت اور حال کہا ہے جیسا کہ جنید بغدادی رحمہ اللہ کا قول ہے جبکہ بعض نے اسے متعین نام قرار دیا ہے اور اس بارے علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے فتح الباری میں 14 اقوال نقل کیے ہیں۔[1] درست یہی معلوم ہوتا ہے کہ اسم اعظم سے مراد الفاظ اور کیفیات دونوں ہیں۔ پس اسم اعظم سے متعلق صحیح احادیث میں وارد الفاظ کو کسی خاص کیفیت اور حال میں ادا کرتے ہوئے اللہ سے دعا کی جائے تو وہ دعا لازماً قبول ہوتی ہے۔

اللہ کے ناموں کا احصاء یا انہیں حفظ کرنے کے لیے بعض اہل علم نے انہیں نظم میں پرویا ہے جیسا کہ "قصیدہ طوبیٰ" اس بارے بعض حلقوں میں کافی معروف ہے۔ اس قصیدے کا مقصد اچھا ہے اور وہ یہ کہ اللہ کے ناموں کو نظم میں پرو دیا جائے تا کہ یاد کرنے اور رکھنے میں آسانی ہو اور دعا مانگنے میں بھی کام آئے لیکن اس قصیدے کے الفاظ زبان پر مشکل سے جاری ہوتے ہیں کہ ان میں غرابت اور ندرت ہے۔ اور اس قصیدے کے ایک شعر میں وحدت الوجود کے نظریے کو بھی شامل کیا گیا ہے جبکہ اللہ کی ذات کے بارے یہ عقیدہ نہ تو کتاب و سنت میں موجود ہے اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین عظام، تبع تابعین، ائمہ اربعہ، فقہاء، محدثین، متکلمین اور متقدمین صوفیاء رحمہم اللہ اس عقیدے کے قائل تھے۔

البتہ شیخ زید بن محمد المدخلی نے اسمائے حسنیٰ کو ایک نظم میں پرویا ہے کہ جس میں عبارت کی ایسی روانی و سلاست ملتی ہے کہ جو پڑھنے میں بھی بہت آسان ہے اور معنی میں بھی بہت جامع ہے۔ لہذا ہمیں ان کی نظم کے ذریعے اسمائے حسنیٰ کو یاد کرنا اور ان سے دعا

---

[1] ابن حجر، أحمد بن علي العسقلاني، فتح الباري شرح صحيح البخاري، دار المعرفة، بيروت، 1379، 225-224/11

کرنا زیادہ پسند ہے۔

دعا اور شکر

بعض دوستوں کا کہنا ہے کہ وہ اپنی کسی دنیاوی آزمائش، مشکل یا غرض میں اللہ عزوجل سے دعا کرتے ہیں تو آزمائش ٹلتی نہیں، مشکل حل نہیں ہوتی اور غرض پوری نہیں ہو پاتی جس سے رفتہ رفتہ دل میں ایک عجیب سی مایوسی کی کیفیت پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ اور اس مایوسی کی پیدائش کا ایک سبب انسان کا ازلی دشمن شیطان بھی ہوتا ہے جو اسے اپنے مالک سے بدگمان کرنے کے لیے ہر وقت پھونکیں مارتا رہتا ہے۔

اگر پروردگار کو اپنے بندے سے محبت ہو تو وہ اس کے ذہن میں کچھ ایسی باتیں ڈال دیتے ہیں کہ اس کی مایوسی کی کیفیت دور ہوتی چلی جاتی ہے۔ انسان یوں سوچنا شروع کر دیتا ہے کہ اللہ عزوجل نے اسے بغیر مانگے اتنی نعمتیں دی ہوئی ہیں۔ اگر ان میں سے فلاں فلاں نعمت نہ ہوتی تو وہ اس نعمت کے لیے کس قدر بے چین یا دعا گو ہوتا؟ پس اس طرح وہ اللہ کی نعمتوں کو شمار کرتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ جو چیز اسے دعا کے نتیجے میں نہیں مل رہی، وہ بہت چھوٹی ہے جبکہ جو نعمتیں اسے دعا کیے بغیر ملی ہوئی ہیں، ان کا کوئی شمار قطار نہیں ہے تو اس کی مایوسی کی کیفیت خوشی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

اب وہ یہ سوچنا شروع کر دیتا ہے کہ جو شے ہمارے پاس نہیں ہوتی ہے اسی کا تو ہم رونا روتے ہیں لیکن جو بیسیوں نعمتیں ہماری جیب میں ہوتی ہیں، ہم ان کا شکر ادا نہیں کرتے ہیں۔ اگر ہم صرف شکر ادا کرنا شروع کر دیں تو ہر وقت ذہن میں یہ تازہ رہے گا کہ اللہ تعالی مجھے بن مانگے بہت کچھ دے رہا ہے۔ اور اگر کبھی کوئی دعا قبول نہ بھی ہو گی تو اس آزمائش سے مایوسی پیدا نہیں ہو گی۔

ہمارا حال کیا ہے کہ ہم میں سے کسی ایک کے پاس بیس ہزار کی ملازمت یا آمدن ہوتی ہے لیکن وہ پچاس کی ملازمت یا آمدن کے لیے کوشش اور دعا کر رہا ہوتا ہے لیکن اس کی کوشش یا دعا قبول نہیں ہو رہی ہوتی لہذا وہ مایوس اور نا امید ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ اس دعا کے ساتھ ساتھ اس بیس ہزار کی ملازمت یا آمدن پر شکر کا حق ادا کر رہا ہوتا تو اسے

یہ سوچ کر مایوسی نہ ہوتی کہ میرے ارد گرد کتنے ایسے ہیں جو مجھ سے زیادہ باصلاحیت، ہنر مند اور صالح ہیں لیکن ان کے پاس بیس ہزار کی ملازمت یا آمدن بھی نہیں جو کہ اللہ نے مجھے یہ بن مانگے دی ہوئی ہے۔

اگر سترہویں گریڈ کا افسر اٹھارہویں گریڈ کے لیے اہل (qualify) نہ ہو سکے گا تو مایوسی کا شکار ہو جائے گا لیکن وہ یہ بھی تو سوچے کہ اس کے پاس سترہویں گریڈ کی ملازمت کی صورت میں ایک ایسی نعمت ہے جو لاکھوں کے پاس نہیں ہے۔ایک دوست نے بتلایا کہ وہ مسجد میں روزانہ ایک نوجوان کو لمبی لمبی دعائیں کرتے دیکھتے تھے اور انہیں بڑا تعجب ہوتا تھا کہ یہ اتنی لمبی دعا میں اپنے رب سے مانگتا کیا ہے۔ایک دن انہوں نے اس نوجوان سے اصرار کر کے پوچھ ہی لیا تو اس نے کچھ ہچکچاہٹ کے بعد بتلایا کہ وہ دعا میں باری باری ان چیزوں کا نام لے کر اللہ کا شکر ادا کرتا ہے کہ جو اس کے پاس موجود ہیں۔ صحیح مسلم کی ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «انْظُرُوا إِلَى مَنْ أَسْفَلَ مِنْكُمْ، وَلَا تَنْظُرُوا إِلَى مَنْ هُوَ فَوْقَكُمْ، فَهُوَ أَجْدَرُ أَنْ لَا تَزْدَرُوا نِعْمَةَ اللهِ»[1]

”حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم اس کو دیکھو جو تم سے نیچے ہے اور اس کی طرف مت دیکھو جو تم سے اوپر ہے۔ پس ایسا کرنے سے تم اللہ کی نعمتوں کی ناقدری نہیں کرو گے۔“

صدقہ اور تزکیہ

جن ذرائع سے اللہ کا تقرب حاصل کیا جا سکتا ہے، ان میں ایک اہم تر ذریعہ مال ہے۔ نفس انسانی میں رذائل، برے اخلاق اور عادات کا سب سے بڑا سبب دنیا کی محبت ہے۔اور دنیا کی محبت کا خلاصہ مال کی محبت ہے۔مال کی محبت جہاں انسان میں کنجوسی، بخیلی، لالچ اور حرص پیدا کرتی ہے، وہاں تکبر، حسد، بغض، کینہ، ظلم اور نفاق جیسے

[1] صحیح مسلم، كِتَابُ الزُّهْدِ وَالرَّقَائِقِ، 2275/4

رذائل کو بھی جنم دیتی ہے۔ صدقہ کرنے سے دل میں اللہ کی محبت، مال کی محبت پر غالب آجاتی ہے اور یہی تزکیے کا مطلوب ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿خُذْ مِنْ أَمْوَالِهِمْ صَـدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيهِم بِهَا وَصَـلِّ عَلَيْهِمْ إِنَّ صَلَاتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ﴾ [التوبة: 103]

"اے نبی ﷺ! آپ ان کے اموال میں سے صدقہ لے کر انہیں اس ذریعے ظاہری طور پاک کریں اور ان کا تزکیہ کریں۔ اور ان کے حق میں رحمت کی دعا فرمائیں کہ آپ کی دعا ان کے لیے موجب اطمینان ہو گی۔ اور اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔"

قرآن مجید میں بار بار اللہ کے رستے میں مال خرچ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جہاں نماز کا حکم ہے، وہاں زکوۃ کا حکم ہے۔ جہاں حقوق العباد کا تذکرہ ہے، وہاں اللہ کے بندوں پر صدقہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ صلہ رحمی صرف یہ نہیں ہے کہ اپنے رشتہ داروں کو اچھی طرح سلام کر لیا یا عید کے موقع پر ان کے گھر سویاں بھجوا دی بلکہ صلہ رحمی تو یہ ہے کہ اگر آپ کے رشتہ داروں میں سے کوئی مالی طور کمزور ہے، تو اس کی مدد کریں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْـكِينَ وَابْنَ السَّـبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا﴾ [الإسراء: 26]

"اور رشتہ داروں کو ان کا حق دو۔ اور مساکین اور مسافروں کو ان کا حق دو۔ اور فضول خرچی مت کرو۔"

اللہ نے اِسے رشتہ داروں کا حق قرار دیا ہے کہ اُن پر خرچ کیا جائے۔ اگر تو آپ پر زکوۃ فرض ہے اور آپ کے رشتہ داروں میں کوئی اس کا مستحق ہے تو آپ پر لازم ہے کہ آپ اس رقم سے اس کی مدد کریں۔ یہ رویہ درست نہیں ہے کہ رشتہ داروں میں صدقے کے مستحق لوگ موجود ہوں اور انسان دوسرے شہر میں صدقہ تقسیم کرتا پھرے۔ یا پڑوسی ضرورت مند ہو اور انسان دوسرے محلے میں صدقہ کر رہا ہو۔ اور اگر آپ کے پاس زکوۃ کی رقم نہیں ہے تو بھی یہ اخلاقی حق تو ہے کہ ہم اگر نفلی صدقات

سے رشتہ داروں کی بنیادی ضروریات (basic needs) پوری کرنے میں مدد کر سکتے ہوں تو ضرور کریں۔ اور اس میں بھی کسی رشتہ دار کو یہ بتلانا ضروری نہیں ہے کہ یہ زکوۃ اور صدقے کی رقم ہے کہ ان کی دل آزاری نہ ہو بلکہ غیر محسوس انداز میں پکڑا دے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الَّذِينَ يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّـهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُونَ مَا أَنفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى لَّهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ [البقرة: 262]

"جو لوگ اپنا مال اللہ کے رستے میں خرچ کرتے ہیں۔ پھر اس کے بعد نہ تو اس خرچ کا (کسی پر) احسان رکھتے ہیں اور نہ (کسی کو) تکلیف دیتے ہیں تو ان کا اجر ان کے پروردگار کے پاس (تیار) ہے۔ اور (قیامت کے روز) نہ ان کو کچھ خوف ہوگا اور نہ وہ غمگیں ہوں گے۔"

رشتہ داروں اور دوستوں میں یہ ہو جاتا ہے کہ اگر کسی مشکل وقت میں کسی مدد کر دی تو بعد میں کسی اختلاف یا لڑائی کے موقع پر جتلا دیا کہ میں نے فلاں وقت میں تمہاری مدد کی تھی۔ یہ جتلانا کسی مسلمان بھائی کو ذہنی اذیت اور دلی تکلیف پہنچانے کے مترادف ہے لہذا قرآن مجید میں ارشاد ہے جو صدقہ کرنے کے بعد جتلائے گا تو اس کا صدقہ ضائع ہو جائے گا یعنی اس کا کچھ اجر و ثواب اس کو نہ ملے گا۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تُبْطِلُوا صَدَقَاتِكُم بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ كَالَّذِي يُنفِقُ مَالَهُ رِئَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللَّـهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۖ فَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا ۖ لَّا يَقْدِرُونَ عَلَىٰ شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا ۗ وَاللَّـهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ﴾ [البقرة: 264]

"اے اہل ایمان! اپنے صدقات (و خیرات) کو احسان جتلا کر یا تکلیف پہنچا کر برباد نہ کر دینا جیسا کہ وہ شخص ہے کہ جو لوگوں کو دکھاوے کے لئے مال خرچ کرتا ہے اور اللہ اور قیامت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا۔ تو اس (کے مال) کی مثال اس چٹان کی سی ہے کہ جس پر تھوڑی سی مٹی پڑی ہو۔ اور اس پر زور کا مینہ برسے اور اس مٹی کو صاف کر ڈالے۔ (اسی طرح) یہ (ریاکار اور احسان

جتلانے والے) لوگ اپنے صدقات کا کچھ بھی صلہ حاصل نہیں کر سکیں گے۔
اور خدا ایسے ناشکروں کو ہدایت نہیں دیا کرتا۔"

بعض اُوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ آپ گاڑی چلا رہے ہیں اور اشارے پر کوئی سائل آپ کی گاڑی کے پاس آیا اور آپ سے سوال کیا اور آپ کے پیچھے ہی پڑ گیا کہ جس سے نہ چاہتے ہوئے بھی آپ نے پانچ دس روپے کا سکہ نکال کر اسے دے دیا اور ساتھ میں یہ بات بھی سنا دی کہ اچھے خاصے ہٹے کٹے ہو، محنت کیوں نہیں کرتے۔ اگر آپ کو وہ پیشہ ور بھکاری معلوم ہوتا ہے تو اسے دینا یا نہ دینا یہ آپ کا فیصلہ ہے لیکن دینے کے بعد بات سنانا تو اس سے قرآن مجید نے منع کیا ہے کہ صدقہ کرنے میں اہم یہ نہیں ہے کہ آپ نے کس کو دیا ہے بلکہ اہم یہ ہے کہ آپ نے کس کے لیے دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّن صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا أَذًى وَاللَّهُ غَنِيٌّ حَلِيمٌ﴾ [البقرة: 263]

"جس صدقہ کرنے کے بعد (لینے والے کو) اذیت دی جائے تو اس صدقے سے تو بہتر ہے کہ نرم بات کر لی جائے اور (اس کی بے ادبی سے) در گزر کر دیا جائے۔ اور اللہ بے پروا اور بردبار ہے۔"

قلب کی تطہیر کے لیے یہ بہت ضروری ہے کہ صدقہ کو اپنے معمولات میں شامل کیا جائے۔ ہم مہینے میں ایک بار صدقہ کر لینے کا کافی سمجھتے ہیں حالانکہ ہمیں کوشش کرنی چاہیے کہ روزانہ کچھ نہ کچھ صدقہ کریں۔ اگر دن میں پانچ مرتبہ نماز کا حکم ہے تو پسندیدہ تو یہی ہے کہ دن میں پانچ مرتبہ صدقہ کرے، اگرچہ اپنی حیثیت کے مطابق ہو کہ جیسے ہی مسجد سے باہر نکلے تو کچھ رقم کسی سوالی کے ہاتھ میں تھما دی۔ پانچ دس روپے کے صدقے کو بھی حقیر نہیں سمجھنا چاہیے کہ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«مَا تَصَدَّقَ أَحَدٌ بِصَدَقَةٍ مِنْ طَيِّبٍ، وَلَا يَقْبَلُ اللهُ إِلَّا الطَّيِّبَ، إِلَّا أَخَذَهَا الرَّحْمَنُ بِيَمِينِهِ، وَإِنْ كَانَتْ تَمْرَةً، فَتَرْبُو فِي كَفِّ الرَّحْمَنِ حَتَّى تَكُونَ أَعْظَمَ مِنَ الْجَبَلِ، كَمَا يُرَبِّي أَحَدُكُمْ فَلُوَّهُ أَوْ فَصِيلَهُ»[1]

[1] صحیح مسلم، كِتَاب الزَّكَاةِ، بَابُ قَبُولِ الصَّدَقَةِ مِنَ الْكَسْبِ الطَّيِّبِ وَتَرْبِيَتِهَا، 702/2

”جب بھی کوئی شخص اپنی حلال اور صاف ستھری کمائی سے اللہ کے رستے میں خرچ کرتا ہے اور اللہ تعالی حلال اور صاف ستھرے مال کے علاوہ قبول بھی نہیں کرتا تو اللہ عزوجل اس صدقے کو اپنے داہنے ہاتھ میں پکڑتے ہیں۔ اور اگر وہ ایک کھجور کا صدقہ ہو تو اللہ کے ہاتھ میں وہ پرورش پاتے ہوئے پہاڑ سے بڑا ہو جاتا ہے جیسا کہ تم کوئی شخص اپنے گھوڑے یا اونٹ کے بچے کی دیکھ بھال کر کے اسے بڑا کرتا ہے۔“

اور بہترین صدقہ وہ ہے جو اس چیز کا ہو کہ جو دل کو پسند ہو۔ گھر سے وہ کھانا نکال دینا کہ جسے خود کھانے کا دل نہ کر رہا ہو، بھی صدقہ کی ایک قسم ہے لیکن بہترین صدقہ وہی ہے کہ جو خود کھانے کا دل کر رہا ہو، وہ نکال کر مسکین کو دے، اور جو خود پہننے کو دل ہو، وہ اللہ کی راہ میں دے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿لَن تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّىٰ تُنفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ وَمَا تُنفِقُوا مِن شَيْءٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ﴾ [آل عمران: 92]

”تم اس وقت تک نیکی کے مقام کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ وہ چیز اللہ کی راہ میں خرچ نہ کر دو جو کہ جو تمہیں پسند ہو۔“

ہمارا حال یہ ہے کہ جب ہم کسی غریب کو دس روپے بٹوے سے نکال کر دیتے ہیں تو اس میں بھی ہماری یہ پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہ نوٹ صدقہ کریں کہ جو پرانا اور پھٹا ہوا ہو۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ الْأَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ وَلَسْتُم بِآخِذِيهِ إِلَّا أَن تُغْمِضُوا فِيهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ حَمِيدٌ﴾ [البقرة: 267]

”اے اہل ایمان! جو تم نے کمایا ہے اور جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا ہے تو اس میں سے صاف ستھرا مال اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ اور اپنے مال میں سے بری اور خراب چیز اللہ کے رستے میں خرچ کرنے کا ارادہ نہ کرو کہ اگر تمہیں وہ چیز لینی پڑی جائے تو اسے نہ لو گے الا یہ کہ تم اس کو لیتے وقت آنکھیں بند کر لو۔ اور جان لو کہ اللہ عزوجل بے پروا اور تعریف کیا گیا ہے۔“

اور بہترین صدقہ وہ ہے کہ جو اپنی اور اپنی گھر والوں کی ضروریات پوری کرنے کے بعد صدقہ کیا جائے۔اور سارا مال اللہ کی راہ میں دے دینا کہ انسان فقیر ہو جائے اور اب اپنی ضرورت پوری کرنے کے لیے دوسروں سے سوال کرتا پھرے تو یہ اسے اللہ نے پسند نہیں کیا ہے۔ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ حَكِيمِ بْنِ حِزَامٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «اليَدُ العُلْيَا خَيْرٌ مِنَ اليَدِ السُّفْلَى، وَابْدَأْ بِمَنْ تَعُولُ، وَخَيْرُ الصَّدَقَةِ عَنْ ظَهْرِ غِنًى، وَمَنْ يَسْتَعْفِفْ يُعِفَّهُ اللَّهُ، وَمَنْ يَسْتَغْنِ يُغْنِهِ اللَّهُ»[1]

”حضرت حکیم بن حزام سے روایت ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اوپر والا ہاتھ، نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔اور سب سے پہلے صدقہ اس پر کرو کہ جس کے تم ذمہ دار ہو [یعنی اپنے گھر والوں پر صدقہ کرے]۔اور بہترین صدقہ وہ ہے کہ انسان صدقہ کرنے کے بعد بھی غنی رہے [یعنی اپنا سارا مال صدقہ کر کے فقیر بن جانا، شریعت میں پسندیدہ نہیں ہے]۔اور جو لوگوں سے سوال کرنے سے بچنا چاہے گا تو اللہ اسے بچا لیں گے۔اور جو اللہ سے غنی طلب کرے گا تو اللہ اسے غنی کر دیں گے۔“

اور صدقے کی ابتداء اپنی ذات، گھر والوں اور ملازموں سے کرے کہ انسان اپنے گھر والوں پر جو خرچ کرتا ہے، وہ بھی صدقہ ہے جبکہ اسے اللہ کا حکم سمجھ کر خرچ کرے اور آخرت میں اس پر اللہ سے امید رکھے۔ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: أَمَرَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالصَّدَقَةِ، فَقَالَ رَجُلٌ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، عِنْدِي دِينَارٌ، فَقَالَ: «تَصَدَّقْ بِهِ عَلَى نَفْسِكَ»، قَالَ: عِنْدِي آخَرُ، قَالَ: «تَصَدَّقْ بِهِ عَلَى وَلَدِكَ»، قَالَ: عِنْدِي آخَرُ، قَالَ: «تَصَدَّقْ بِهِ عَلَى زَوْجَتِكَ» - أَوْ قَالَ: «زَوْجِكَ» -، قَالَ: عِنْدِي آخَرُ، قَالَ: «تَصَدَّقْ بِهِ عَلَى خَادِمِكَ»، قَالَ: عِنْدِي آخَرُ، قَالَ: «أَنْتَ أَبْصَرُ»[2]

---

[1] صحيح بخاري، كِتَابُ الزَّكَاةِ، بَابُ لاَ صَدَقَةَ إِلَّا عَنْ ظَهْرِ غِنًى، 112/2

[2] سنن أبي داود، كِتَاب الزَّكَاةِ، بَابٌ فِي صِلَةِ الرَّحِمِ، 132/2

”حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صدقے کا حکم دیا تو ایک شخص نے کہا کہ میرے پاس ایک دینار ہے تو کس پر صدقہ کروں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ اپنی ذات پر کرو۔ اس نے کہا کہ میرے پاس ایک اور دینار ہے تو وہ میں کس پر صدقہ کروں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ اپنی اولاد پر کرو۔ اس نے کہا کہ میرے پاس ایک اور دینار ہے تو وہ میں کس پر صدقہ کرو؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ اپنی بیوی پر کرو۔ تو اس نے کہا کہ میرے پاس ایک اور دینار ہے تو وہ میں کس پر صدقہ کروں؟ تو آپ نے کہا کہ اپنے ملازم پر کرو۔ اس نے کہا کہ میرے پاس ایک اور دینار ہے تو وہ میں کس پر صدقہ کروں؟ تو آپ نے کہا کہ اب جس پر مناسب سمجھو، صدقہ کر دو۔“

اور صدقہ کرنے سے مال کم نہیں ہوتا بلکہ بڑھتا ہے۔ مال بڑھنے سے مراد یہ بھی ہے کہ اللہ اس شخص کو اور زیادہ عطا کرتے ہیں جو اللہ کے رستے میں خرچ کرتا ہے۔ اور اس کا معنی یہ بھی ہے کہ اللہ عزو جل اُس کے مال میں برکت عطا فرما دیتے ہیں کہ جو اللہ کے رستے میں خرچ کرتا ہے کہ اُس کی دنیاوی آزمائش اور مصیبت ٹل جاتی ہے اور اس پر خرچ ہونے والا اس کا مال بچ جاتا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«مَا مِنْ يَوْمٍ يُصْـبِحُ العِبَادُ فِيهِ، إِلَّا مَلَكَانِ يَنْزِلاَنِ، فَيَقُولُ أَحَدُهُمَا: اللَّهُمَّ أَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا، وَيَقُولُ الآخَرُ: اللَّهُمَّ أَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا»[1]

”جب بھی صبح طلوع ہوتی ہے تو دو فرشتے نازل ہوتے ہیں کہ جن میں سے ایک یہ کہتا ہے کہ اے پروردگار! اس شخص کو اور مال عطا فرما کہ جو آپ کے رستے میں خرچ کرے۔ اور دوسرا یہ کہتا ہے کہ اے پروردگار! اس شخص کے مال کو کم کر دے کہ جس نے آپ کے رستے میں خرچ کرنے سے اپنے ہاتھ کو روک رکھا ہے۔“

یہ تو صدقہ کرنے والوں کے لیے ہدایات ہیں اور جہاں تک لوگوں سے زکوۃ اور

[1] صحيح بخاري، كِتَابُ الزَّكَاةِ بَابُ قَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى: فَأَمَّا مَنْ أَعْطَى وَاتَّقَى، 115/2

صدقہ وصول کرنے کے لیے سوال کرنا ہے تو اگر تو بنیادی ضروریات پوری کرنے کے لیے سوال ہو تو جائز ہے لیکن اگر مال میں اضافے کے لیے ہو تو جہنم کی آگ ہے۔ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«مَنْ سَأَلَ النَّاسَ أَمْوَالَهُمْ تَكَثُّرًا، فَإِنَّمَا يَسْأَلُ جَمْرَ جَهَنَّمَ، فَلْيَسْتَقِلَّ مِنْهُ أَوْ لِيُكْثِرْ»[1]

”جو لوگوں سے اس لیے سوال کرے کہ اپنے مال میں اضافہ کر سکے تو وہ یہ جان لے کہ وہ لوگوں سے جہنم کے انگارے مانگ رہا ہے، چاہے تو زیادہ مانگ لے اور چاہے تو کم کر لے۔“

پس اس شخص کا تزکیہ ممکن نہیں ہے کہ جس نے اللہ کے رستے میں مال خرچ کرنے کو اپنا محبوب عمل نہ بنالیا ہو۔

۞۞۞۞۞۞۞

[1] سنن ابن ماجة، كِتَابُ الزَّكَاةِ، بَابُ مَنْ سَأَلَ عَنْ ظَهْرِ غِنًى، 589/1

باب چہارم

اصلاح خاندان

اس باب میں اصلاح خاندان کے ضمن میں میاں بیوی کے رویوں کی اصلاح، أولاد کی تربیت، والدین کے حقوق، أولاد کے حقوق، رشتہ داروں سے نیکی اور حسن سلوک کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

میاں بیوی کے اختلافات

قرآن اکیڈمی کے شعبہ تحقیق اسلامی میں ملازمت کے دوران لوگ متنوع مسائل میں دینی رہنمائی کے لیے رجوع کرتے تھے۔ان سائلین کی کثیر تعداد عموماً دو میں سے کسی ایک مسئلے میں مشاورت چاہ رہی ہوتی تھی؛ جادو ٹونے کا مسئلہ یا میاں بیوی کے اختلافات۔اس وقت ہم دوسرے مسئلے پر کچھ گفتگو کرنا چاہ رہے ہیں۔

میاں بیوی کے اختلافات کو حل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کے اسباب معلوم ہوں۔ میاں بیوی کا اختلاف دو قسم کا ہوتا ہے؛واقعی اور غیر واقعی (real and unreal)۔واقعی اختلاف وہ ہے کہ جو حقیقی ہو اور اس اختلاف کے اسباب داخلی ہوتے ہیں یعنی میاں بیوی کے مزاج میں شامل ہوتے ہیں۔اور غیر واقعی اختلاف وہ ہے کہ جو حقیقی نہ ہو یعنی اختلاف تو ہے لیکن بلاوجہ کا ہے اور اس کے اسباب خارجی ہوتے ہیں۔ یہاں اختلاف کا سبب مزاج نہیں ہے بلکہ شیطان یا حسد کرنے والے رشتہ دار ہوتے ہیں۔واقعی اختلاف کو کم تو کیا جا سکتا ہے لیکن ختم نہیں کیا جا سکتا کہ یہ مزاجوں کا اختلاف ہے اور مزاج ختم نہیں ہوتے۔اور غیر واقعی اختلاف کو ختم بھی کیا جا سکتا ہے کہ اس کی وجہ شیطان یا حسد کرنے والے رشتہ دار ہوتے ہیں۔آپ ان کی باتوں پر کان نہ دھریں تو آپ کا اختلاف ختم ہو جائے گا۔

واقعی اختلاف یہ ہے کہ اللہ تعالی نے مرد اور عورت دونوں کو ایک مزاج پر پیدا کیا ہے کہ جس میں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہیں جیسا کہ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«اسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ، فَإِنَّ المَرْأَةَ خُلِقَتْ مِنْ ضِلَعٍ، وَإِنَّ أَعْوَجَ شَيْءٍ فِي الضِّلَعِ أَعْلاَهُ، فَإِنْ ذَهَبْتَ تُقِيمُهُ كَسَرْتَهُ، وَإِنْ تَرَكْتَهُ لَمْ يَزَلْ أَعْوَجَ، فَاسْتَوْصُوا بِالنِّسَاءِ»[1]

”عورتوں کے بارے میں میری نصیحت سن لو کہ عورتیں پسلی سے پیدا کی گئی ہیں اور پسلی میں سب سے ٹیڑھی اوپر کی پسلی ہوتی ہے۔اگر تم اسے سیدھا کرنا

[1] صحيح البخاري، كتاب أحاديث الأنبياء، بَابُ خَلْقِ آدَمَ صَلَوَاتُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَذُرِّيَّتِهِ، 133/4

چاہو گے تو اسے توڑ دو گے اور اگر اسے اس کے حال پر چھوڑ دو گے تو ہمیشہ ٹیڑھی ہی رہے گی۔ پس عورتوں کے بارے میری نصیحت سن لو۔"

اس روایت میں خطاب مرد سے ہے یعنی میاں بیوی کے اختلافات میں شریعت نے مرد کو سمجھایا ہے کہ وہ بڑا ہے لہذا اسے بڑے پن کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ اور یہ بھی کہ مرد میں عقل جبکہ عورت میں جذبات کا پہلو غالب ہوتا ہے لہذا میاں بیوی کی لڑائی میں سمجھنے سمجھانے کے زیادہ امکانات مرد کی طرف میں ہوتے ہیں۔ پس مرد چونکہ ذمہ دار بھی ہے اور اس میں عورت کی نسبت عقل کا پہلو غالب ہے لہذا اسے اپنی ذمہ داری اور فطری تخلیق کا خیال رکھتے ہوئے گھر کو جوڑنے میں عورت کی نسبت زیادہ کردار ادا کرنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ طلاق کا حق بھی مرد ہی کو دیا گیا ہے یعنی یہ مرد ہی ہے کہ جس نے یہ فیصلہ کرنا ہوتا ہے کہ اس نے گھر کو توڑنا ہے یا جوڑ کر رکھنا ہے۔ اور اگر طلاق کا حق عورت کے پاس ہوتا تو مسلم معاشروں میں طلاق کی نسبت (ratio) بہت بڑھ جاتی کہ عورتیں، مردوں سے زیادہ جذباتی ہوتی ہیں۔

اور اگر مرد یہ عزم کر لے کہ اس نے اپنی عورت کو سیدھا کر کے ہی رہنا ہے تو یہ اسے توڑنے کے مترادف ہے اور اس توڑنے کا معنی طلاق ہے۔ ثالث (mediator) کو بھی چاہیے کہ میاں بیوی کے اختلافات میں زیادہ مرد کو سمجھائے کیونکہ عورت کو اللہ تعالیٰ نے فطری طور کمزور بنایا ہے جیسا کہ مذکورہ بالا روایت کے الفاظ ہیں۔ اس روایت کا یہ معنی نہیں ہے کہ کوئی مرد اپنی بیوی کو طعنہ دینے کے لیے اس روایت کو دلیل بنائے کہ تم تو ہو ہی ٹیڑھی لہذا تمہارے کیا کہنے بلکہ اس روایت میں اللہ کے رسول ﷺ کی مردوں کو نصیحت کا معنی یہ ہے کہ عورت کو چونکہ اللہ عزوجل نے کمزور بنایا ہے لہذا اس کی فطری کمزوری کو سامنے رکھتے ہوئے اس سے سمجھداری، بڑے پن اور حکمت کے ساتھ معاملہ کرو۔

دوسری چیز یہ ہے کہ انسانوں میں باہمی مزاج کا بھی فرق ہوتا ہے جیسا کہ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«إِنَّ اللَّهَ خَلَقَ آدَمَ مِنْ قَبْضَةٍ قَبَضَهَا مِنْ جَمِيعِ الْأَرْضِ، فَجَاءَ بَنُو آدَمَ عَلَى قَدْرِ الْأَرْضِ: جَاءَ مِنْهُمُ الْأَحْمَرُ، وَالْأَبْيَضُ، وَالْأَسْوَدُ، وَبَيْنَ ذَلِكَ، وَالسَّهْلُ، وَالْحَزْنُ، وَالْخَبِيثُ، وَالطَّيِّبُ»[1]

”اللہ تعالی نے آدم علیہ السلام کو مٹھی بھر مٹی سے پیدا کیا اور یہ مٹی تمام زمین سے لی گئی تھی۔ پس آدم علیہ السلام کی اولاد میں زمین کے تمام رنگ اور خصوصیات موجود ہیں۔ ان میں سے کوئی سفید، کوئی سرخ اور کوئی سیاہ ہے۔ اور کوئی رنگت میں ان کے مابین ہے۔ اور کوئی مزاج میں نرم ہے تو کوئی سخت۔ اور کوئی طبعاً خبیث ہے تو کوئی طیب۔“

پس آدم کی اولاد میں مزاج کی کچھ کمزوریاں فطری ہیں لہذا دوسروں کو اس کا کسی قدر اعتبار (credit) دینا چاہیے۔ ایک شخص اگر پیدائشی طور غصیلے یا لاپرواہ مزاج کا حامل ہے تو وہ اپنے اس مزاج کو اپنی تربیت سے کسی قدر قابو تو کر سکتا ہے لیکن ختم نہیں کر سکتا کیونکہ وہ مزاج اس کے خمیر میں شامل ہے۔ اور مزاج کی یہ فطری کمزوریاں ہر شخص میں اس فرق کے ساتھ موجود ہیں کہ جو ایک میں ہیں وہ دوسرے میں نہیں ہیں۔

پس ان فطری کمزرویوں میں دو چیزیں مطلوب ہیں: ایک تو ہر فریق اپنی کمزوری کو دور کرنے کی امکان بھر کوشش کرے اور دوسرا یہ کہ میاں بیوی ایک دوسرے کی ایسی کمزوریوں کے بارے برداشت اور تحمل کا رویہ پیدا کریں۔ یہی بات ہے جو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کو عورت کے حوالے سے بیان کی ہے کہ نہ تو اسے بالکل سیدھا کرنے کے چکر میں پڑو اور نہ ہی اسے اس کے حال پر چھوڑ دو۔ ان دو قسم کی انتہاؤں میں میاں بیوی میں ساتھ رہنا مشکل بلکہ ناممکن ہو جائے گا اور نوبت علیحدگی تک جا پہنچے گی۔

مثلاً عام زندگی کی مشکلات میں سے یہ ہے کہ عموماً مرد گھر وقت پر آنے میں دیر لگا دیتے ہیں اور عورتیں گھر سے نکلنے میں دیر لگا دیتی ہیں اور اس پر اچھا خاصا جھگڑا ہو جاتا ہے۔ اب اگر میاں یا بیوی کے مزاج کی یہ خامی ہے یا اس کے حالات ایسے ہیں جو دیری کا باعث بن جاتے ہیں تو میاں بیوی کو ممکن حد تک اپنی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے

---

[1] سنن أبي داود، كتاب السنة، باب في القدر، 222/4

اور فریق مخالف کو یہ چاہیے کہ دیر کی صورت میں ایک دوسرے کو جتلا دیں یا بعض اوقات ناراضگی کا اظہار بھی کر دیں لیکن اس ناراضگی میں شدت نہ لائیں کہ چھوٹا سا مسئلہ فساد بن جائے کیونکہ یہ مزاج کے مسائل ہیں اور آپ کو ان کے ساتھ سمجھوتہ (compromise) کرنا ہے۔

یہ واضح رہے کہ کچھ مزاج فطری نہیں ہوتے لیکن معاشرہ انہیں فطری سمجھ رہا ہوتا ہے۔ مثلاً میاں بیوی کی لڑائی میں عام طور یہی رواج ہے کہ غلطی چاہے شوہر کی ہو یا بیوی کی، معذرت شوہر ہی نے کرنی ہے۔ ایک دفعہ کسی کے ہاں جانا ہوا تو وہاں ٹیلی ویژن چینل پر ایک اشتہار (ad) چل رہا تھا جس میں میاں بیوی ناراض تھے اور بیوی اپنے شوہر کو جادوئی الفاظ (magical words) بولنے کا کہہ رہی تھی اور جادوئی الفاظ سے اس کی مراد یہ تھی کہ مرد یہ کہے کہ **"غلطی میری تھی"۔**

عورت کا غلطی تسلیم نہ کرنا یہ اس کی پیدائشی کمزوری نہیں ہے بلکہ معاشرتی بگاڑ ہے یعنی معاشرے نے اس کے ذہن میں یہ بات ڈال دی ہے کہ جھگڑے کا حل یہی ہے کہ شوہر معذرت کر لے۔ یہ ایک ناممکن بات ہے کہ میاں بیوی کے جھگڑے میں ہمیشہ غلطی شوہر کی ہو۔ بعض اوقات شوہر کی غلطی ہوتی ہے اور بعض اوقات بیوی کی۔ جس کی غلطی ہے، اسے تسلیم کرنا چاہیے، یہ دینی تقاضا ہے اور ایک بندہ مومن کے اخلاقی اور روحانی نشوونما کے لیے بھی بہت ضروری ہے۔ کہنے کو تو ہر بار شوہر کے تسلیم کر لینے سے اختلاف رفع ہو جائے گا لیکن اگر یہی رویہ عادت بن جائے گا تو اس کا عورت کو دینی اور اخلاقی نقصان بہت زیادہ ہو گا۔ عورت کی زندگی سے اپنی غلطی تسلیم کرنے کا مادہ ہی نکلتا چلا جائے گا یہاں تک کہ ایسی خاتون اپنے رب سے بھی جھگڑا کرنے والی بن جائے گی اور استغفار اس کی زندگی میں کم ہی ملے گا۔ رویے جب عادت بن جاتے ہیں تو پھر وہ یہ نہیں دیکھتے کہ سامنے کون ہے؟ انسان یا خالق؟ بچے یا والدین؟ شاگرد یا استاذ؟ چھوٹا یا بڑا؟ لہذا انسانوں کے سامنے غلطی تسلیم نہ کرنے کی عادت خدا کے سامنے بھی غلطی تسلیم نہ کرنے کی خُو ڈال دیتی ہے۔

میاں بیوی کے دوسری قسم کے اختلافات وہ ہیں جو غیر واقعی (unreal) ہیں یعنی حقیقی نہیں ہیں اور ان کا سبب شیطان مردود اور حسد کرنے والے رشتہ دار ہو سکتے ہیں۔

اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِنَّ إِبْلِيسَ يَضَعُ عَرْشَهُ عَلَى الْمَاءِ، ثُمَّ يَبْعَثُ سَرَايَاهُ، فَأَدْنَاهُمْ مِنْهُ مَنْزِلَةً أَعْظَمُهُمْ فِتْنَةً، يَجِيءُ أَحَدُهُمْ، فَيَقُولُ: فَعَلْتُ كَذَا وَكَذَا، فَيَقُولُ: مَا صَنَعْتَ شَيْئًا، قَالَ: وَيَجِيءُ أَحَدُهُمْ، فَيَقُولُ: مَا تَرَكْتُهُ حَتَّى فَرَّقْتُ بَيْنَهُ وَبَيْنَ أَهْلِهِ، قَالَ: فَيُدْنِيهِ مِنْهُ - أَوْ قَالَ: فَيَلْتَزِمُهُ - وَيَقُولُ: نِعْمَ أَنْتَ أَنْتَ»[1]

"ابلیس سمندر پر اپنا تخت بچھاتا ہے اور اپنے لشکر لوگوں میں فساد کی غرض سے بھیجتا ہے۔ پس اس کے لشکروں میں اس کے سب سے زیادہ قریب وہ ہوتا ہے جس نے سب سے بڑا فتنہ برپا کیا ہو۔ اس کے بھیجے ہوئے چیلوں میں سے ایک آکر اسے اطلاع دیتا ہے کہ میں فلاں کے پیچھے ہی لگا رہا یہاں تک کہ اس نے یہ یہ بکواس کر ڈالی۔ تو ابلیس اسے کہتا ہے، اللہ کی قسم! تو نے کچھ بھی نہیں کیا۔ یہاں تک کہ اس کا ایک چیلہ آکر اسے اطلاع دیتا ہے کہ میں نے فلاں شخص کو اس حال میں چھوڑا کہ اس کے اور اس کی بیوی کے مابین جدائی ڈلوادی تو ابلیس اپنے اس چیلے کو اپنے قریب کرتا ہے اور اپنے ساتھ چمٹا لیتا ہے اور کہتا ہے: کیا خوب کام کیا ہے! کیا خوب کام کیا ہے!"

پس میاں بیوی کے درمیان پھوٹ ڈلوانا ابلیس کے نزدیک اتنا عظیم کام ہے کہ اس کے ایسے چیلے اس کے مقربین میں شمار ہوتے ہیں جو میاں بیوی میں طلاق کا باعث بن جائیں۔ اور یہ شیطان مردود ہر وقت انسان کے دل میں وسوسہ ڈالنے کے لیے تیار بیٹھا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ النَّاسِ ﴿1﴾ مَلِكِ النَّاسِ ﴿2﴾ إِلَٰهِ النَّاسِ ﴿3﴾ مِن شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ ﴿4﴾ الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ ﴿5﴾ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ﴾ [الناس: 6]

---

[1] مسند الإمام أحمد بن حنبل: 275/22

”اے نبی ﷺ! کہہ دیں، میں پناہ مانگتا ہوں انسانوں کے رب، انسانوں کے بادشاہ اور انسانوں کے حقیقی معبود کی، اُس وسوسہ ڈالنے والے کے شر سے جو بار بار پلٹ کر آتا ہے، جو لوگوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے، خواہ وہ جنوں میں سے ہو یا انسانوں میں سے۔ “

ان آیات میں یہ کہا گیا ہے کہ وسوسہ ڈالنے والا شیطان جنات میں سے بھی ہو سکتا ہے اور انسانوں میں سے بھی کہ بعض اوقات رشتہ داروں میں بعض لوگ میاں بیوی میں جدائی ڈالنے کے لیے شیطان کا سا کردار ادا کرتے ہیں۔ان حالات میں میاں بیوی کو ایک تو خود باشعور ہونا چاہیے کہ رشتہ داروں میں سے کون ان کا خیر خواہ ہے اور کون لگائی بجھائی کرنے والا ہے اور دوسرا حاسدین کے شر سے بچنے کے لیے صبح، شام اور رات سونے سے پہلے تین مرتبہ سورۃ الفلق اور سورۃ االناس کا ورد کر لیں۔اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَا مِنْكُمْ مِنْ أَحَدٍ، إِلَّا وَقَدْ وُكِّلَ بِهِ قَرِينُهُ مِنَ الْجِنِّ» قَالُوا: وَإِيَّاكَ؟ يَا رَسُولَ اللهِ قَالَ: «وَإِيَّايَ، إِلَّا أَنَّ اللهَ أَعَانَنِي عَلَيْهِ فَأَسْلَمَ، فَلَا يَأْمُرُنِي إِلَّا بِخَيْرٍ»[1]

”تم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے کہ جس کے ساتھ ایک شیطان جن نہ لگا ہوا ہو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کی: اے نبی ﷺ! کیا آپ کے ساتھ بھی کوئی شیطان لگا ہوا ہے؟ آپ نے فرمایا: ہاں، میرے ساتھ بھی ہے لیکن اللہ عزوجل نے میری اس کے خلاف مدد کی ہے لہذا وہ میرا فرمانبردار ہے اور مجھے نیکی کے علاوہ کسی بات کی ترغیب نہیں دیتا۔“

پس میاں بیوی میں جب بھی چھوٹی چھوٹی باتوں پر بڑی بڑی لڑائیاں اور جھگڑے ہونا شروع ہوں جائیں تو اس کا سبب شیطان ہوتا ہے۔ سائیکالوجی میں جسے ہم غیر معمولی رویہ (abnormal attitude) کہتے ہیں، اس کی وجہ داخلی نہیں خارجی ہوتی ہے۔ اگرچہ ماہرین نفسیات اس کی وجہ داخلی قرار دیتے ہیں اور یہ کہہ دیتے ہیں کہ نفسیاتی مسئلہ

[1] صحیح مسلم، کتاب صِفَةِ الْقِيَامَةِ وَالْجَنَّةِ وَالنَّارِ، بَابُ تَحْرِيشِ الشَّيْطَانِ وَبَعْثِهِ سَرَايَاهُ، 2167/4

ہے لیکن جھاڑ پھونک کرنے والوں کا تجربہ اس کے خلاف کہتا ہے۔ روحانی معالجین کے مطابق غیر معمولی رویوں کی اصل وجہ شیطان مردود ہوتا ہے، چاہے وہ بچوں میں ہوں یا بڑوں میں۔ اور اکثر و بیشتر نفسیاتی مسائل شیطان کے وساوس ہیں۔

پس میاں بیوی میں سے کوئی ایک جب غیر معمولی رویے (abnormal attitude) کا اظہار کرے تو اختلاف حل کرنے کے لیے سب سے پہلے خارجی وجہ کو ختم کرنا چاہیے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ میاں بیوی میں سے جو ذرا حواس (senses) میں ہے، دوسرے پر معوذتین، تعوذات[1] اور سورہ الصافات کی پہلی دس آیات دم کر کے پھونک ماریں۔ پس پہلے شیطان مردود کو بھگائیں اور اختلاف کو فطری سطح پر لے کر آئیں اور اب اس واقعی اختلاف کے حل کے لیے مشاورت (counselling) کریں یا مکالمہ (dialogue)۔

اسی طرح ایک غصہ فطری ہے اور ایک شیطان کی طرف سے ہے۔ شیطان کی طرف سے غصے کو اگر فطری سمجھ لیں گے تو مسئلہ کبھی حل نہ ہو گا۔ شیطان کی طرف سے غصے کا حل یہ ہے کہ وضو کر لے یا سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کا کثرت سے ورد کرے۔ بعض اوقات کسی حسد کرنے والے رشتہ دار کی نظر بھی لگ جاتی ہے کہ جس کی وجہ سے میاں بیوی میں جھگڑا بن جاتا ہے کیونکہ نظر لگنے میں بھی ایک شیطان ہوتا ہے۔ اس بارے ہم مزید بحث حسد کے مقامات کے عنوان کے تحت کریں گے۔ پس میاں بیوی کے اختلاف میں یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ وہ اختلاف نارمل ہیں یا ابنارمل۔ اگر نارمل ہیں تو دو اصولوں، افہام و تفہیم اور تحمل و برداشت، کی روشنی میں انہیں حل کرنے کی کوشش کرے اور اگر دوسری قسم کے ہیں تو پھر تعوذات اور شرعی دم وغیرہ سے

---

[1] تعوذات ان دعاؤں کو کہتے ہیں کہ جن میں شیطان مردود سے اللہ کی پناہ مانگی گئی ہو۔ احادیث میں ایسی بہت سی دعائیں مروی ہیں جن میں سے ایک یہ بھی ہے: أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللّٰهِ التَّامَّاتِ مِنْ غَضَبِهِ وَعِقَابِهِ وَشَرِّ عِبَادِهِ، وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ وَأَنْ يَحْضُرُونِ۔ ترجمہ: میں اللہ کے پورے ہو کر رہنے والے کلمات کی پناہ مانگتا ہوں، اس کے غضب سے، اس کی پکڑ سے، اس کے بندوں کے شر سے، اور شیطان کی پھونکوں سے اور اس بات سے کہ شیاطین میرے پاس آئیں۔ [سنن الترمذي: 429/5] موثر ترین تعوذات میں سورۃ الفلق اور سورۃ الناس ہیں۔

انہیں حل کرے۔

اکثر میاں بیوی کے مسائل دوسری نوعیت کے ہوتے ہیں لیکن وہ پہلی قسم میں ان کا حل تلاش کرتے ہیں۔ اگرچہ اس طرح ان کے مسائل عارضی طور تو حل ہو جاتے ہیں لیکن مستقل طور حل نہیں ہو پاتے۔ پہلے لڑائی کے خارجی سبب یعنی شیطان مردود یا حسد کے اثرات بد دور کریں اور پھر آپس کا اختلاف حل کرنے بیٹھیں۔ اور اس کے بھگانے کا طریقہ ہم نقل کر چکے ہیں۔ مزید برآں صبح و شام کے اذکار اور ادعیہ ماثورہ کی پابندی کریں۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِذَا دَخَلَ الرَّجُلُ بَيْتَهُ، فَذَكَرَ اللهَ عِنْدَ دُخُولِهِ وَعِنْدَ طَعَامِهِ، قَالَ الشَّيْطَانُ: لَا مَبِيتَ لَكُمْ، وَلَا عَشَاءَ، وَإِذَا دَخَلَ، فَلَمْ يَذْكُرِ اللهَ عِنْدَ دُخُولِهِ، قَالَ الشَّيْطَانُ: أَدْرَكْتُمُ الْمَبِيتَ، وَإِذَا لَمْ يَذْكُرِ اللهَ عِنْدَ طَعَامِهِ، قَالَ: أَدْرَكْتُمُ الْمَبِيتَ وَالْعَشَاءَ»[1]

"جو شخص اپنے گھر میں داخل ہوتے اللہ کا نام لے لے تو شیاطین آپس میں یہ کہتے ہیں کہ اس گھر میں تمہارے لیے رات گزارنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اور اگر کوئی شخص اپنے گھر میں داخل ہوتے وقت اللہ کا نام نہ لے تو شیاطین کہتے ہیں کہ اب تمہارے لیے یہ گنجائش ہے کہ تم اس گھر میں رات گزار سکو۔"

گھر میں داخل ہوتے وقت اللہ کا نام لینے سے مراد یہ ہے کہ گھر میں داخل ہونے کی دعا پڑھی جائے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ خَيْرَ الْمَوْلَجِ، وَخَيْرَ الْمَخْرَجِ، بِسْمِ اللَّهِ وَلَجْنَا، وَبِسْمِ اللَّهِ خَرَجْنَا، وَعَلَى اللَّهِ رَبِّنَا تَوَكَّلْنَا»[2]

"اے اللہ! میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ خیر کے ساتھ گھر میں داخل ہوں اور خیر کے ساتھ باہر نکلوں۔ اللہ کے نام کے ساتھ ہم گھر میں داخل ہوتے ہیں

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الْأَشْرِبَةِ، بَابُ آدَابِ الطَّعَامِ وَالشَّرَابِ وَأَحْكَامِهِمَا، 1598/3

[2] سنن أبي داود، أَبْوَابُ النَّوْمِ، بَابُ مَا يَقُولُ الرَّجُلُ إِذَا دَخَلَ بَيْتَهُ، 325/4۔ امام أبو داود نے اس روایت کو "صالح" جبکہ علامہ ابن حجر اور شیخ بن باز رحمہما اللہ نے "حسن" کہا ہے۔

اور اللہ کے نام کے ساتھ باہر نکلتے ہیں۔ اور اپنے رب پر ہی ہم توکل کرتے ہیں۔"

بچوں کی تربیت کے دو اصول

انسان کا ایک تعلق اپنے خالق سے ہے اور دوسرا مخلوق سے اور دونوں قسم کے تعلق کے بارے ہمارے دین میں ہدایات موجود ہیں۔ پہلی قسم کو ہم "حقوق اللہ" کہتے ہیں اور دوسری کو "حقوق العباد"۔ اللہ کے حقوق اچھی طرح ادا کرنے سے "اچھا مسلمان" بنتا ہے اور بندوں کے حقوق بہتر طور ادا کرنے سے "اچھا انسان" وجود میں آتا ہے۔ خالق کے حقوق کو ایک لفظ میں بیان کریں تو وہ "عبادت" ہے اور بندوں کے حقوق کو ایک لفظ میں جمع کرنا چاہیں تو وہ "اخلاق" ہیں۔

اپنے بچوں کے اگر ہم عبادت اور اخلاق درست کر دیں تو ان کا اپنے رب اور انسانوں دونوں سے تعلق اچھا ہو جائے گا اور وہ دنیا اور آخرت دونوں جگہ کامیاب زندگی گزاریں گے۔ عبادت چونکہ خالق کا حق ہے اور عبادت میں سب سے اہم نماز ہے لہذا بچے کی عبادت درست کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی نماز درست کرا دی جائے۔ اپنے بچوں کو اگر ہم اللہ کا اچھا بندہ بنانا چاہتے ہیں تو ان کی نماز پر خصوصی توجہ دیں۔ نماز کے اچھا کیے بغیر کسی کا اللہ کا اچھا بندہ بن جانا مشکوک امر ہے۔

اگر بچے کی نماز صحیح ہو جائے گی تو اس کی جملہ زندگی میں اللہ کی بندگی کے جمیع پہلو بھی سنور جائیں گے، ان شاء اللہ۔ لیکن اگر اس کی نماز خراب رہ گئی تو زندگی کے دیگر شعبوں میں اس کا اللہ کا بندہ بن کر زندگی گزارنا ناممکن ہو جائے گا۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

«إِنَّ أَوَّلَ مَا يُحَاسَبُ بِهِ العَبْدُ يَوْمَ القِيَامَةِ مِنْ عَمَلِهِ صَلاَتُهُ، فَإِنْ صَلُحَتْ فَقَدْ أَفْلَحَ وَأَنْجَحَ، وَإِنْ فَسَدَتْ فَقَدْ خَابَ وَخَسِرَ»[1]

"قیامت والے دن سب سے پہلے انسان کے اعمال میں سے اس کی نماز کا

[1] سنن الترمذي، أَبْوَابُ الصَّلَاةِ، بَابُ مَا جَاءَ أَنَّ أَوَّلَ مَا يُحَاسَبُ بِهِ العَبْدُ يَوْمَ القِيَامَةِ الصَّلَاةُ، 535/1

حساب لیا جائے گا۔ پس اگر نماز درست نکلی تو وہ فلاح پا جائے گا اور کامیاب ہو جائے گا اور اگر نماز خراب نکلی تو ناکام ہو جائے گا اور نقصان میں رہ جائے گا۔“

اور جہاں تک اخلاق کا معاملہ ہے کہ بچے کے رویے درست ہو جائیں تو اس میں جو ایک چیز کہ جسے توجہ (focus) کرنے سے بچے کے تمام رویے درست ہوتے چلیں جائیں گے، ان شاء اللہ، وہ خیر خواہی ہے۔ جس طرح نماز کے درست ہونے سے جملہ عبادات درست ہو جائیں گی، اسی طرح بچے میں خیر خواہی کا جذبہ پیدا ہو جانے سے اس کے تمام رویے اور اخلاق درست ہوتے چلے جائیں گے، ان شاء اللہ! ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ تَمِيمٍ الدَّارِيِّ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: «الدِّينُ النَّصِيحَةُ» قُلْنَا: لِمَنْ؟ قَالَ: «لِلَّهِ وَلِكِتَابِهِ وَلِرَسُولِهِ وَلِأَئِمَّةِ الْمُسْلِمِينَ وَعَامَّتِهِمْ»[1]

”حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ دین تو نام ہی خیر خواہی کا ہے۔ ہم نے کہا: اے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! کس کے لیے خیر خواہی؟ آپ نے فرمایا: اللہ کے لیے، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے، اللہ کی کتاب کے لیے، مسلمان حکمرانوں کے لیے اور عام مسلمانوں کے لیے۔“

اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اس کی کتاب کے لیے خیر خواہی تو واضح ہے۔ عام لوگوں کے لیے خیر خواہی سے مراد ان کے ساتھ خالص اور کھرا تعلق رکھنا کہ جس میں کوئی کھوٹ، ملاوٹ، دھوکہ، فریب اور جھوٹ نہ ہو۔ یعنی کسی کا برا کرنا تو دور کی بات کسی کا برا سوچنا یا چاہنا بھی نہ ہو اور ہر ایک کی بھلائی مقصود ہو۔ بچوں میں اگر دوسروں کی خیر خواہی کا جذبہ پیدا ہو جائے تو وہ کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کریں گے۔

بچے جس فطرت پر پیدا ہوتے ہیں اس میں اپنی ذات کے ساتھ تو خیر خواہی کا جذبہ موجود ہوتا ہی ہے کہ بچہ اپنی ذات کی ہمیشہ خیر خواہی ہی چاہتا ہے لیکن دوسروں کے ساتھ صرف اتنا ہی اخلاص رکھتا ہے کہ وہ اس کی ذات کے ساتھ خیر خواہی سے ٹکراتا نہ

[1] صحیح مسلم، كِتَابُ الْإِيمَانِ، بَابُ بَيَانِ أَنَّ الدِّينَ النَّصِيحَةُ، 74/1

ہو۔ شعوری عمر سے پہلے بچے اپنی ذات کو اپنے بہن بھائیوں پر ترجیح دیتے ہیں اور یہاں ہی سے والدین نے ان کی تربیت کا عمل شروع کرنا ہوتا ہے۔ مثال کے طور گھر میں کوئی کھلونا آئے تو ہر بچے کی یہ خواہش ہو گی کہ یہ اسے ملے نہ کہ اس کے بہن بھائی کو۔ ہر بچہ اپنے مفاد کو ترجیح دیتا ہے اور اسے دینی بھی چاہیے کیونکہ وہ اسی فطرت پر پیدا ہوا ہے لیکن تربیت کرنے کا میدان یہ ہے کہ بچے میں ایک تو خیر خواہی کا جذبہ پیدا کیا جائے کہ کسی کے نقصان کے بدلے میں اپنا مفاد حاصل کرنے سے اسے ہر گز خوشی نہ ہو اور دوسرا ایثار کا مادہ کہ وہ کبھی کبھار اپنا مفاد دوسرے کو ہبہ (gift) بھی کر دیا کرے۔ یہی رویہ عام لوگوں سے اخلاص یا خیر خواہی رکھنا کہلاتا ہے۔

یہ بھی واضح رہے کہ اخلاق دو قسم کے ہیں۔ ایک فطری یعنی پیدائشی جو بچہ اپنے ساتھ لے کر اس دنیا میں آتا ہے اور دوسرا دینی یعنی جن کی تعلیم دین نے دی ہے۔ فطری اخلاق کا مادہ یا جوہر حیاء ہے۔ جس میں حیاء نہ ہو اس میں انسانیت نام کی کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ ہم نے فطری اخلاق کا یہاں ذکر نہیں کیا کیونکہ وہ تو بچہ اپنے ساتھ لے کر آتا ہے الا یہ کہ اس کا معاشرہ اس قدر بگڑا ہوا ہو کہ اسے فطرت سے پھیر دے۔ ہم نے یہاں دینی اخلاق کا ذکر کیا ہے جو کہ کسبی (earned) ہوتے ہیں یعنی جنہیں حاصل کرنے کے لیے محنت اور کوشش کی ضرورت ہوتی ہے اور جملہ دینی اخلاق کی بنیاد اخلاص یعنی تعلقات میں خالص پن پر ہے اور لوگوں کے ساتھ تعلق کا خالص ہونا ہی ان کی خیر خواہی کہلاتا ہے۔

بچوں کی تربیت میں والدین کا کردار

بچوں کی تربیت کے حوالے سے بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ اردو زبان میں سراج الدین ندوی صاحب کی کتاب "بچوں کی تربیت کیسے کریں" ایک اچھی تحریر ہے۔ مختلف عمر کے بچوں کے مسائل بھی مختلف ہوتے ہیں۔ بلوغت سے پہلے اور بلوغت کے بعد بچوں کے مسائل میں کافی فرق آ جاتا ہے۔ فی الحال ہم سات سے دس سال کے بچوں کے بعض مسائل پر گفتگو کرنا چاہ رہے ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب بچہ سات

سال کا ہو جائے تو اسے نماز کی تلقین کرو اور اگر دس سال کا ہو جائے تو نماز نہ پڑھنے پر اسے سزا بھی دو۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«مُرُوا أَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ أَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِينَ، وَاضْرِبُوهُمْ عَلَيْهَا، وَهُمْ أَبْنَاءُ عَشْرٍ وَفَرِّقُوا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ»[1]

"جب بچے سات سال کے ہو جائیں تو انہیں نماز پڑھنے کا حکم دو۔ اور جب وہ دس سال کے ہو جائیں اور نماز نہ پڑھیں تو انہیں سزا دو۔ اور دس سال کے بعد ان کے بستر ایک دوسرے سے علیحدہ کر دو۔"

بچوں کو نماز کی طرف کیسے لایا جائے؟ یہ والدین کی ایک پریشانی ہے۔ بچوں کی نیکی شعوری نہیں ہوتی ہے بلکہ کسی جبر یا لالچ کے سبب سے ہوتی ہے۔ شعوری نیکی عموماً بلوغت کے بعد کی عمر میں ہوتی ہے۔ اس لیے بچوں سے کوئی بھی کام لینے کے دو طریقے ہیں: سختی یا پیار۔ بعض حالات میں پیار سے کام لینا پڑتا ہے اور بعض اوقات سختی کرنی پڑتی ہے۔ محض سختی یا صرف پیار سے بچے بگڑ جاتے ہیں۔

بعض والدین اپنے مزاج میں سخت ہوتے ہیں اور اگر صرف مزاج ہی کی سختی ہو تو بھی گزارہ چل جاتا ہے لیکن اس کے ساتھ وہ بچوں سے لاپرواہ بھی ہوتے ہیں اور ان کے پاس بچوں کی تربیت کے لیے وقت بھی نہیں ہوتا۔ ایسے والدین بچے کو عمر کے پندرہویں برس تک تو بالکل نہیں پوچھیں گے اور سولہویں برس ڈنڈے سے نماز پڑھانے کی کوشش کریں گے اور بچہ اس وقت سختی قبول کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو گا۔ بچوں کی تربیت کی یہ ترتیب بالکل غلط ہے۔

ایک والد صاحب نے مولانا صاحب سے اپنے بچے کی شکایت کی کہ وہ نماز نہیں پڑھتا اور جب میں اس پر سختی کرتا ہوں تو وہ مجھ سے الجھ پڑتا ہے۔ مولانا صاحب نے پوچھا کہ بچے کی عمر کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ سترہ سال کا ہو گا۔ مولانا نے کہا کہ کیا چودہ پندرہ سال کی عمر تک اسے کبھی نماز کے لیے کہا تھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ مولانا نے کہا تو اب آپ کی سختی کا یہی نتیجہ نکلنا ہے۔

[1] سنن أبي داود، كِتَاب الصَّلَاةِ، بَابُ مَتَى يُؤْمَرُ الْغُلَامُ بِالصَّلَاةِ، 133/1

اسی طرح بعض والدین عمر کے ساتویں سال میں ہی بچے سے یہ امید کرنے لگ جاتے ہیں کہ وہ رابعہ بصری رحمہا اللہ اور جنید بغدادی رحمہ اللہ بن جائیں۔ اسی طرح یہ بھی درست طریقہ نہیں ہے کہ ساتویں سال میں ہی بچے کو جماعت کے ساتھ نماز پڑھانے کے لیے ڈنڈے کا استعمال کیا جائے یا سات سال کی بچی کو زبردستی حجاب پہنا دیا جائے۔ یہ عمر اس معاملے میں سختی کرنے کی نہیں ہے۔

یہ بات بہتر معلوم ہوتی ہے کہ کسی بھی معاملے میں بچے کی تربیت میں تدریج کے اصول کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ مثلاً نماز ہی کا معاملہ لے لیں، عمر کے ساتویں برس والدین بچے کو نماز سکھادیں اور اس کے پڑھنے کا کہنا شروع کر دیں۔ وہ کبھی پڑھ لے گا اور کبھی نہیں پڑھے گا۔ اگر پڑھ لیتا ہے تو اسے شاباش دیں اور اگر نہیں پڑھتا تو نظر انداز کریں۔ آٹھویں برس میں اسے نماز کا پابند بنانے کے لیے کچھ لالچ بھی دیں۔ اس لالچ میں نماز سے آخرت میں حاصل ہونے والے مادی فوائد اور دنیا میں نماز پڑھنے پر کسی قدر انعام بھی شامل ہو سکتا ہے۔ عمر کے نویں برس میں بچے کو نماز چھوڑنے پر ڈانٹ ڈپٹ کریں اور پھر دسویں برس میں اگر وہ نماز میں کوتاہی کرے تو سزا بھی دیں۔ اس طرح کی تدریج کو اگر ملحوظ رکھا جائے گا تو بچے میں دین سے رد عمل (reaction) پیدا نہیں ہو گا۔

ایک صاحب کا بیٹا، جس کی عمر آٹھ سال تھی، کافی عرصے سے اپنے والد سے فلائنگ ہیلی کاپٹر مانگ رہا تھا۔ انھوں نے کہا یہ مہنگا کھلونا ہے، تمھیں ایسے نہیں لے کر دوں گا۔ اگر تم چالیس دن پانچوں نمازیں پڑھ لو تو لے دوں گا اور اس میں بھی کوئی جماعت کے ساتھ پڑھنے کی شرط نہیں لگائی اور یہ بھی کہا کہ صرف فرض پڑھ لو تو پھر بھی انعام مل جائے گا۔ یہ بات طے ہو جانے کے بعد نماز کا ایک چارٹ بنایا اور گھر میں ڈرائنگ روم کے دروازے پر لگا دیا۔ انھیں ویسے امید نہ تھی کہ بچہ چالیس دنوں کی نمازیں پوری کرے گا لیکن بچوں میں انرجی اور جذبہ بہت ہوتا ہے لہذا اس نے ایک قیمتی کھلونا حاصل کرنے کی خواہش میں چالیس دن کی نمازیں مکمل کر لیں۔ وہ ہر دن کی نمازوں کے آگے اپنے سائن بھی کرتا رہا۔ اس طرح چالیس دن بعد اسے ہیلی کاپٹر تو مل

گیا لیکن وہ فرائض کا بھی پابند ہو چکا تھا۔اس کی یہ عادت اتنی پختہ ہو گئی کہ اب اسے نماز چھوڑنے پر الجھن ہوتی تھی۔جب اس معاملے کو کوئی چھ ماہ گزر گئے تو اس کی نانی اماں نے اسے سنتوں کی ترغیب دلائی تو اب چونکہ فرائض کا عادی تو تھا ہی، ساتھ ہی ترغیب میں سنتیں بھی پڑھنے لگا۔اگرچہ ابھی بھی اس کی نماز میں یہ کمی ہے کہ جلد پڑھتا ہے اور بعض اوقات دیر کر دیتا ہے لیکن پڑھتا ضرور ہے۔

کئی دفعہ والد نے دیکھا کہ کارٹون دیکھتے یا گیم کھیلتے ہوئے اذان ہوئی اور اس نے درمیان میں وقفہ دے کمپیوٹر کے ساتھ خود سے ہی جائے نماز بچھائی اور نماز پڑھ لی۔بچے کی والدہ نے والد سے پوچھا کیا یہ آپ کے ڈر سے نماز پڑھتا ہے یا اسے اللہ کا خوف ہے؟ انھوں نے کہا مجھے اتنی خوش فہمی نہیں ہے۔میرے خیال میں نہ میرا ڈر ہے اور نہ اللہ کا خوف بلکہ یہ اس کی عادت بن گئی ہے۔اور عادت اگر پوری نہ ہو تو انسان الجھن اور بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے لہذا یہ عادتاً نماز پڑھ رہا ہے۔اور اس عمر میں اتنا بھی کافی ہے۔

ہمارا المیہ یہ بھی ہے کہ ہم میں سے ہر شخص اپنے بچوں کے بارے بڑی اونچی امیدیں لگائے بیٹھا ہے۔اگر دین دار ہے تو اس کا دل ہے کہ میرا بچہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ بن جائے۔دنیادار ہے تو اس کی خواہش ہے کہ ڈاکٹر عبد القدیر بن جائے۔بچوں کے لیے آئیڈیل ہمیشہ چھوٹا رکھیں کہ جسے وہ حاصل کر سکتے ہوں۔اسی طرح ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے بچوں کی اچھی تعلیم و تربیت ہو لیکن اس تعلیم و تربیت میں ہم سے کوئی مطالبہ نہ کیا جائے بلکہ یہ سارا کام اسکول یا مدرسہ کے اساتذہ کریں۔ہمارے بچوں کی اس وقت تک اچھی تربیت نہیں ہو گی جب تک ہم خود ان کے لیے وقت فارغ نہیں کریں گے۔بچے کو نماز سکھانی ہے تو ہماری خواہش ہے کہ قاری صاحب سکھا دیں۔اور یہ ایک آزمائی ہوئی بات ہے کہ اگر والدین خود سے بچے کو نماز سکھائیں تو بچے کی ایک تو نماز سیکھنے میں دلچسپی بہت بڑھ جاتی ہے اور دوسرا اس کے سیکھنے کی رفتار بھی تیز ہوتی ہے۔

ایک صاحب کا بیٹا حفظ کر رہا تھا، تین پارے کر لیے تھے۔شروع میں ایک پارے تک اسے قاری صاحب سبق یاد کرواتے تھے تو نہ تو اس کا حفظ میں دل لگتا تھا اور روزانہ

شکایات بھی آجاتی تھیں کہ سبق صحیح یاد نہیں ہے، یا سبق یاد کرنے میں کافی وقت لگا دیتا ہے۔ پھر انھوں نے اسے خود سے وقت دینا شروع کیا اور گھر سے سبق یاد کروا کے قاری صاحب کے پاس بھیجنا شروع کر دیا۔ اس طرح حفظ میں اس کی دلچسپی بڑھنی شروع ہو گئی۔ وہ جب اسے سبق یاد کرواتے تو ساتھ میں حوصلہ دیتے۔ اپنے حفظ کے کچھ واقعات سنا دیتے۔ کچھ ایسی تدابیر بتلا دیتے کہ جس سے وہ سبق جلد یاد کر لے۔ اب ظاہری بات ہے کہ جو توجہ والدین اپنے بچوں کو دے سکتے ہیں وہ کوئی بھی استاذ نہیں دے سکتا۔ بچے کو جب کوئی چیز یاد نہ ہو تو وہ اسے بوجھ سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ ایسی صورت میں وہ پڑھائی سے بھاگے گا یا بہانے بنائے گا۔ اور جب اسے سبق یاد ہو گا تو وہ پڑھائی سے بھاگنے کا نام بھی نہ لے گا۔

جدید دور میں لیپ ٹاپ، انٹرنیٹ، ٹیبلٹ، اسمارٹ فون اور آئی فون نے انسان کو اتنا مصروف کر دیا ہے کہ اس کے پاس اپنے بچوں کے لیے وقت ہی نہیں ہے۔ سوشل میڈیا نے ہماری حقیقی سوشل لائف کو ختم کر دیا ہے۔ ہم فیس بک کے ساتھیوں سے قریب اور گھر والوں سے دور ہو گئے ہیں۔ ایک اسکول کے بچوں کو اپنے آئیڈیل کے بارے مضمون لکھنے کو کہا گیا تو ایک بچے نے اپنے مضمون کا عنوان یہ رکھا کہ "کاش میں ایک اسمارٹ فون ہوتا!" کہ شاید اس بہانے مجھے اپنے والدین کی توجہ ملتی۔

اسی طرح والدین کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ انہوں نے بچے کو جو لیپ ٹاپ، ٹیبلٹ یا اسمارٹ فون لے کر دیا ہے تو اس کی اس مشین پر سرگرمیاں (activities) کیا ہیں۔ بچے عموماً پڑھائی اور اسائنمنٹ کے بہانے یہ آلات خریدتے ہیں اور پھر منفی سرگرمیوں میں ان کا استعمال کرتے ہیں۔ اور والدین اپنی اولاد پر اندھا اعتماد کرنے کی وجہ سے پہلے تو غافل رہتے ہیں اور جب پانی سر سے گزر جاتا ہے تو اب پریشان ہوتے ہیں۔ اگر بچوں کو کمپیوٹر وغیرہ لے کر دینا بھی ہو تو اسے لاؤنج میں رکھنا چاہیے تاکہ ان کی سرگرمیاں والدین کی نظروں میں رہیں۔

والدین کے حقوق

ہمارا ایک تعلق اپنے رب سے ہے اور اس تعلق کا نام "بندگی" ہے۔ اور دوسرا تعلق اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں، بیوی بچوں، دوست احباب، رشتہ داروں، پڑوسیوں اور ملازمین سے ہے کہ جس تعلق کا نام "معاشرت" ہے۔ پس انسان کی فلاح اس میں ہے کہ وہ اپنی بندگی میں حسن پیدا کرے اور اپنی معاشرت کو خوبصورت بنائے۔

اللہ تعالی نے قرآن مجید میں چار مقامات پر اپنا حق بیان کرنے کے فوراً بعد والدین کا حق بیان کیا ہے کہ جس میں یہ اشارہ ہے کہ اللہ کے بعد انسان پر اگر کسی کا سب سے زیادہ حق بنتا ہے، تو وہ اس کے والدین کا حق ہے۔ انسان کی دنیوی اور اخروی فلاح کا دارومدار "حسن بندگی" اور "حسن معاشرت" پر ہے۔ انسان کی بندگی میں حسن اسی وقت پیدا ہو سکتا ہے جب وہ اپنے رب کے ساتھ تعلق کو بہتر بنا لے اور رب کے سب سے بڑے حق کو ادا کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرے اور وہ حق یہ ہے کہ وہ رب کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائے۔

اور "حسن معاشرت" کی بنیاد بلکہ ابتداء والدین سے ہوتی ہے۔ اگر کسی انسان کا تعلق اپنے والدین سے اچھا نہیں ہے تو وہ انسان کبھی بھی معاشرے کے لیے مفید نہیں ہو سکتا۔ ایسا شخص خود غرضی اور نفس پرستی کی انتہا پر ہوتا ہے کہ جس نے دنیا میں اپنے سب سے بڑے محسن کا شکر ادا نہ کیا تو وہ اور کیا کسی کا بنے گا؟ یا اور کیا کسی کا شکر ادا کرے گا؟ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک شخص اپنے والدین سے اچھا نہ ہو لیکن دوسروں سے اچھا ہو۔ دوسروں سے اس کی جو اچھائی نظر آتی ہو گی تو وہ نظروں کا دھوکا ہو گا، اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ پس اچھا انسان وہی ہے جو اپنے والدین سے اچھا ہو ورنہ بچوں سے اچھا کرنا تو جانوروں میں بھی ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا تَعْبُدُوا إِلَّا إِيَّاهُ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۚ إِمَّا يَبْلُغَنَّ عِندَكَ الْكِبَرَ أَحَدُهُمَا أَوْ كِلَاهُمَا فَلَا تَقُل لَّهُمَا أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُل لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيمًا ﴿23﴾ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُل رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيَانِي صَغِيرًا﴾ [الإسراء: 24]

”اور آپ کے رب نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ تم اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو گے۔ اور یہ کہ تم اپنے والدین کے ساتھ حسن سلوک کرو گے۔ پس اگر تمہارے والدین میں سے کوئی ایک یا وہ دونوں ہی بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائیں تو انہیں اُف تک مت کہو۔ اور انہیں جھڑک کر جواب مت دو۔ اور ان سے نرم لہجے میں احترام کے ساتھ بات کرو۔ اور ان کے لیے نرمی اور شفقت کے ساتھ اپنے بازو پھیلائے رکھنا۔ اور ان کے لیے یہ دعا کرتے رہنا کہ اے اللہ تعالی! ان پر ایسے رحم فرما جیسا کہ انہوں نے بچپن میں میری پرورش کی ہے۔“

والدین کی خدمت اس قدر ضروری ہے کہ اسے جہاد و قتال پر بھی ترجیح حاصل ہے۔ اگر ایک طرف جہاد کے لیے منادی ہو جائے اور دوسری طرف انسان کے بوڑھے والدین ہوں تو اسے اپنے والدین کی خدمت کرنی چاہیے کہ ان حالات میں یہی اس کا جہاد ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ عَمْرٍو، قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، يَسْتَأْذِنُهُ فِي الْجِهَادِ فَقَالَ: «أَحَيٌّ وَالِدَاكَ؟» قَالَ: نَعَمْ، قَالَ: «فَفِيهِمَا فَجَاهِدْ»[1]

”عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور آپ سے جہاد میں شرکت کرنے کی اجازت طلب کی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے پوچھا کہ کیا تمہارے والدین زندہ ہیں؟ تو اس نے جواب دیا کہ ہاں! آپ نے کہا کہ جا کر ان کی خدمت کرو اور یہی تمہارا جہاد ہے۔“

بندگی کوئی لذت اور شہرت حاصل کرنے کا نام تھوڑا ہی ہے کہ جس نیکی میں قلب کو لذت حاصل ہو یا نفس کو شہرت ملے تو انسان اس کی طرف تو دوڑ کر جائے اور جس نیکی کی اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم تاکید فرما رہے ہوں لیکن اس پر دل آمادہ نہ ہو اور نفس پر جبر کرنا پڑتا ہو تو انسان اس نیکی کو ترک کر دے۔ ہمارے ہاں عموماً نیکیاں اس بنیاد پر ہوتی ہیں کہ اس میں میرے قلب کو کیفیات کتنی حاصل ہو گی اور اس نیکی کو معاشرے میں کتنی

[1] صحیح مسلم، كتاب الْبِرِّ وَالصِّلَةِ وَالْآدَابِ، بَابُ بِرِّ الْوَالِدَيْنِ وَأَنَّهُمَا أَحَقُّ بِهِ، 1975/4

بڑی نیکی سمجھا جاتا ہے حالانکہ نیکی کرنے میں اصلاً یہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ ان حالات میں اللہ کی نظر میں میری کون سی نیکی بہت بڑی نیکی شمار ہو گی۔

والد کی حیثیت گھر کے سربراہ کی ہوتی ہے لہذا والد کا اصل حق ان کی بات ماننا ہے اور والدہ کی ذمہ داری اولاد کی پرورش کی ہوتی ہے لہذا ان کا اصل حق ان سے حسن سلوک رکھنا ہے۔ والد کے جمیع حقوق کو اگر ہم ایک لفظ میں بیان کریں تو وہ لفظ اطاعت ہے اور والدہ کے تمام حقوق کو ایک لفظ میں جمع کریں تو وہ لفظ حسن سلوک ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «رِضَى الرَّبِّ فِي رِضَى الوَالِدِ، وَسَخَطُ الرَّبِّ فِي سَخَطِ الْوَالِدِ»[1]

”حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا ہے کہ جو شخص اپنے رب کو راضی کرنا چاہتا ہے تو وہ اپنے والد کو راضی رکھے۔ اور جو اپنے رب کو ناراض رکھنا چاہتا ہے تو اپنے والد کو ناراض رکھے۔“

والد کو راضی رکھنے سے مراد یہی ہے کہ گھر کے جمیع معاملات میں اپنے والد صاحب کی اطاعت اور فرمانبرداری کرے۔ اور بعض اوقات صورت حال ایسی ہوتی ہے کہ کسی مسئلے میں اولاد کا دل اپنے والد کی اطاعت کی طرف مائل نہیں ہوتا اور انہیں اپنے نفس پر جبر کرنا پڑتا ہے تو یہ بھی اولاد کے لیے بہت بڑی نیکی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

قَالَ أَبُو الدَّرْدَاءِ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: «الوَالِدُ أَوْسَطُ أَبْوَابِ الجَنَّةِ، فَإِنْ شِئْتَ فَأَضِعْ ذَلِكَ البَابَ أَوْ احْفَظْهُ»[2]

”ابو درداء رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ والد جنت کے دروازوں میں سے بہترین دروازہ ہے۔ پس اگر تم چاہو تو اس دروازے کی حفاظت کر لو اور چاہو تو اس کو ضائع کر دو۔“

انسان جنت میں کسی دروازے سے ہی داخل ہو گا اور جنت میں داخل ہونے کے

---

[1] سنن الترمذي، أَبْوَابُ البِرِّ وَالصِّلَةِ، بَابُ مَا جَاءَ مِنَ الفَضْلِ فِي رِضَا الوَالِدَيْنِ، 311-310/4

[2] سنن الترمذي، أَبْوَابُ البِرِّ وَالصِّلَةِ، بَابُ مَا جَاءَ مِنَ الفَضْلِ فِي رِضَا الوَالِدَيْنِ، 311/4

لیے جو دروازے ہیں، ان میں آسان ترین والد کا دروازہ ہے۔ یہ دروازہ کھلے گا تو انسان جنت میں داخل ہو سکے گا اور دروازے کے کھلنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا والد اس سے خوش ہو۔ اور دروازہ بند ہو گا تو انسان کے لیے جنت میں داخلہ بھی ممکن نہیں ہو گا اور دروازے کے بند ہونے کا معنی یہ ہے کہ اس کا والد اس سے ناراض ہو۔

اور والدہ سے حسن سلوک کا کیا معنی ہے، اس بارے ایک خوبصورت روایت پیش خدمت ہے کہ جو والدہ سے حسن سلوک کی بنیاد قائم کر دے گی، ان شاء اللہ۔ روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّهُ قَالَ: كَانَ جُرَيْجٌ يَتَعَبَّدُ فِي صَوْمَعَةٍ، فَجَاءَتْ أُمُّهُ... فَقَالَتْ: يَا جُرَيْجُ أَنَا أُمُّكَ كَلِّمْنِي فَصَادَفَتْهُ يُصَلِّي، فَقَالَ: اللهُمَّ أُمِّي وَصَلَاتِي، فَاخْتَارَ صَلَاتَهُ، فَرَجَعَتْ، ثُمَّ عَادَتْ فِي الثَّانِيَةِ، فَقَالَتْ: يَا جُرَيْجُ أَنَا أُمُّكَ فَكَلِّمْنِي، قَالَ: اللهُمَّ أُمِّي وَصَلَاتِي، فَاخْتَارَ صَلَاتَهُ، فَقَالَتْ: اللهُمَّ إِنَّ هَذَا جُرَيْجٌ وَهُوَ ابْنِي وَإِنِّي كَلَّمْتُهُ، فَأَبَى أَنْ يُكَلِّمَنِي، اللهُمَّ فَلَا تُمِتْهُ حَتَّى تُرِيَهُ الْمُومِسَاتِ. قَالَ: وَلَوْ دَعَتْ عَلَيْهِ أَنْ يُفْتَنَ لَفُتِنَ. قَالَ: وَكَانَ رَاعِي ضَأْنٍ يَأْوِي إِلَى دَيْرِهِ، قَالَ: فَخَرَجَتِ امْرَأَةٌ مِنَ الْقَرْيَةِ فَوَقَعَ عَلَيْهَا الرَّاعِي، فَحَمَلَتْ فَوَلَدَتْ غُلَامًا، فَقِيلَ لَهَا: مَا هَذَا؟ قَالَتْ: مِنْ صَاحِبِ هَذَا الدَّيْرِ، قَالَ فَجَاءُوا بِفُئُوسِهِمْ وَمَسَاحِيهِمْ، فَنَادَوْهُ فَصَادَفُوهُ يُصَلِّي، فَلَمْ يُكَلِّمْهُمْ، قَالَ: فَأَخَذُوا يَهْدِمُونَ دَيْرَهُ، فَلَمَّا رَأَى ذَلِكَ نَزَلَ إِلَيْهِمْ، فَقَالُوا لَهُ: سَلْ هَذِهِ، قَالَ فَتَبَسَّمَ، ثُمَّ مَسَحَ رَأْسَ الصَّبِيِّ فَقَالَ: مَنْ أَبُوكَ؟ قَالَ: أَبِي رَاعِي الضَّأْنِ، فَلَمَّا سَمِعُوا ذَلِكَ مِنْهُ قَالُوا: نَبْنِي مَا هَدَمْنَا مِنْ دَيْرِكَ بِالذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ، قَالَ: لَا، وَلَكِنْ أَعِيدُوهُ تُرَابًا كَمَا كَانَ، ثُمَّ عَلَاهُ.[1]

"حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک بزرگ حضرت جریج رحمہ اللہ اپنی خانقاہ میں ہر وقت عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ ان کی والدہ ایک دفعہ ان سے ملنے آئیں جبکہ وہ نماز پڑھ رہے تھے تو والدہ نے کہا کہ اے جریج! میں تیری والدہ ہوں، مجھ سے بات چیت کرو۔ حضرت

[1] صحیح مسلم، کتاب الْبِرِّ وَالصِّلَةِ وَالْآدَابِ، بَابُ تَقْدِيمِ بِرِّ الْوَالِدَيْنِ عَلَى التَّطَوُّعِ، 1976/4

جریج رحمہ اللہ نے دل میں کہا کہ اے پروردگار! ایک طرف یہ نماز ہے اور دوسری طرف والدہ۔ تو انہوں نے نماز کو جاری رکھا اور والدہ کی بات نہ سنی۔ پھر کچھ دنوں بعد وہ دوبارہ تشریف لائیں اور کہا کہ اے جریج! میں تیری والدہ ہوں، مجھ سے بات چیت کرو۔ حضرت جریج رحمہ اللہ نے دل میں کہا کہ اے پروردگار! ایک طرف یہ نماز ہے اور دوسری طرف والدہ۔ تو انہوں نے نماز کو جاری رکھا اور والدہ کی بات نہ سنی۔ تو اس پر ان کی والدہ نے کہا کہ اے پروردگار! یہ جریج میرا بیٹا ہے۔ میں نے اس سے بات چیت کرنی چاہی لیکن اس نے مجھے جواب نہ دیا۔ اے اللہ! یہ مرنے سے پہلے بدکار عورتوں کا منہ ضرور دیکھے۔[1] اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر ان کی والدہ ان کے لیے عورتوں کے فتنے میں مبتلا ہو جانے کی بد دعا کرتیں تو وہ بھی قبول ہو جاتی۔ ایک چرواہا ان کی خانقاہ کے پاس کچھ دیر آرام کرتا تھا۔ ایک دن ایک عورت بستی سے نکلی اور اس چرواہے نے اس سے بدکاری کی۔ پس وہ حاملہ ہو گئی اور اس نے ایک بچے کو جنم دیا۔ عورت سے جب پوچھا گیا کہ یہ بچہ کس کا ہے؟ تو اس نے کہا کہ اس کا ہے جو اس خانقاہ میں رہتا ہے۔ پس لوگ اپنی کلہاڑیاں اور بیلچے لے کر وہاں پہنچے اور انہوں نے حضرت جریج رحمہ اللہ کو پکارا تو وہ نماز پڑھ رہے تھے اور انہوں نے لوگوں کی بات کا جواب نہ دیا۔ تو لوگوں نے ان کی خانقاہ کو گرانا شروع کر دیا۔ پس انہوں نے جب یہ دیکھا تو خانقاہ سے باہر نکلے اور لوگوں نے عورت کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ اس سے پوچھیں کہ کیا معاملہ ہے؟ پس حضرت جریج رحمہ اللہ مسکرائے اور بچے کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا کہ تمہارا باپ کون ہے؟ بچے نے جواب دیا کہ چرواہا ہے۔ پس جب لوگوں نے یہ کرامت دیکھی تو ان سے کہنے لگے کہ ہم آپ کی خانقاہ سونے اور چاندی سے بنا دیتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ مجھے اس کی ضرورت نہیں ہے۔ جس طرح یہ

[1] والدہ نے یہ دعا نہیں کی تھی کہ بدکاری میں مبتلا ہوں۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ اگر ان کی والدہ یہ دعا بھی کر دیتیں تو وہ بدکاری میں بھی مبتلا ہو جاتے۔ والدہ نے صرف یہ بد دعا دی کہ بدکار عورتوں کا منہ دیکھ لیں تا کہ ان سے اپنی پرہیزگای کا زعم جاتا رہے۔

پہلے مٹی کی تھی، ویسے ہی بنادو۔ اس کے بعد وہ پھر خانقاہ میں داخل ہو گئے۔"

اولاد کے حقوق

ہماری شریعت نے جس وضاحت سے والدین کے حقوق کو بیان کیا ہے، اتنی تفصیل سے اولاد کے حقوق بیان نہیں فرمائے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اولاد کا کرنا انسان کی جبلت اور عادت میں شامل ہے کہ جانور بھی اپنی اولاد کا کرتے ہیں۔ اگر والدین اپنی اولاد کا کرنا چھوڑ دیں تو نسل انسانی تباہ ہو جائے۔ زندگی میں بہت سے مواقع ایسے آتے ہیں کہ جن میں والدین اپنی خواہش پر اپنی اولاد کی خواہش کو ترجیح دیتے ہیں اور اس ایثار میں سکون اور خوشی محسوس کرتے ہیں۔

لیکن اس کے باوجود بعض اوقات ایسا ہو جاتا ہے کہ اولاد اگر زیادہ ہو تو ایک کی طرف زیادہ میلان ہونے کی وجہ سے دوسری اولاد کے حقوق متاثر ہو جاتے ہیں۔ یہ تو فطری بات ہے کہ کسی اولاد سے زیادہ محبت ہوتی ہے اور کسی سے کم کہ اس میں انسان کا اپنے اوپر کوئی اختیار نہیں ہے جیسا کہ عام طور گھر میں سب سے چھوٹے بچے کو والدین کا پیار زیادہ ملتا ہے۔ لیکن اللہ عزوجل نے والدین کو اس بات کا پابند بنایا ہے کہ وہ ظاہری معاملات میں اپنی اولاد کے مابین عدل کریں۔ والدین کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کہ اپنی زندگی میں ہی بعض اولاد کو تو لاڈلوں کی طرح نوازتے رہیں اور بعض کو یتیموں کی طرح بھلائے رکھیں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«فَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْدِلُوا بَيْنَ أَوْلَادِكُمْ»[1]

"اللہ سے ڈرتے رہو اور اپنی اولاد میں عدل کرتے رہو۔"

ایک صحابی نے اپنے ایک بیٹے کو اپنا ایک باغ ہبہ (gift) کرنا چاہا تو انہوں نے آپ ﷺ سے اس بارے کہا کہ آپ اس واقعے کے گواہ بن جائیں۔ تو آپ نے کہا کہ کیا تمہاری اور بھی اولاد ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ جی ہاں، ہے۔ آپ ﷺ نے کہا کہ میں اس

[1] صحيح البخاري، كِتَابُ الهِبَةِ وَفَضْلِهَا وَالتَّحْرِيضِ عَلَيْهَا، بَابُ الإِشْهَادِ فِي الهِبَةِ، 158/3

ظلم پر گواہ نہیں بنوں گا۔[1] اور بعض روایات میں ہے کہ آپ نے یہ بھی کہا کہ کہ اگر تم چاہتے ہو کہ تمہاری ساری اولاد تمہاری فرمانبردار ہو تو ایسا مت کرو۔[2] آپ ﷺ نے اس بات کو ظلم قرار دیا ہے کہ والدین اپنی کسی اولاد کو جائیداد ہبہ کریں اور کسی کو محروم رکھیں بلکہ آپ نے ساتھ ہی یہ توجہ بھی دلا دی ہے کہ جس اولاد کو محروم رکھو گے اسے تم اپنی اس بے انصافی سے خود اپنا نافرمان بنا دو گے لہذا ایسا مت کرو۔

اکثر لوگوں کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اللہ تعالی انہیں بیٹا عطا فرمائے لہذا جب ان کے ہاں بیٹی ہوتی ہے تو وہ مایوسی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کچھ تو اپنی خواہش کی وجہ سے اور کچھ معاشرتی دباؤ کے سبب سے۔ لہذا ایسے والدین بیٹیوں کو عموماً اپنے لیے بوجھ سمجھنا شروع کر دیتے ہیں لیکن ایسا نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ بیٹیاں ہی تو ہیں کہ جن سے آدم علیہ السلام کی نسل آگے چل رہی ہے۔ اگر یہ آج طے کر لیں کہ انہوں نے اولاد پیدا نہیں کرنی تو نسل انسانی کا سلسلہ رک جائے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَا مِنْ رَجُلٍ تُدْرِكُ لَهُ ابْنَتَانِ، فَيُحْسِنُ إِلَيْهِمَا مَا صَحِبَتَاهُ - أَوْ صَحِبَهُمَا - إِلَّا أَدْخَلَتَاهُ الْجَنَّةَ»[3]

"حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ اگر کسی شخص کے دو بیٹیاں ہوں اور وہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرے اور ان کی اچھی تربیت کرے تو وہ دونوں اس کو جنت میں داخل کرنے کا سبب بن جائیں گی۔"

صلہ رحمی

صلہ رحمی سے مراد رشتہ داروں سے تعلق ناطہ جوڑنا اور ان سے اچھا سلوک کرنا ہے اور قطع رحمی رشتہ داری کو توڑ دینے یا تعلق ختم کرنے کو کہتے ہیں۔ اسلام ہمیں صلہ رحمی کا

---

[1] صحیح مسلم، كِتَابُ الْهِبَاتِ، بَابُ كَرَاهَةِ تَفْضِيلِ بَعْضِ الْأَوْلَادِ فِي الْهِبَةِ، 1243/3

[2] أيضاً

[3] سنن ابن ماجه، كِتَابُ الْأَدَبِ، بَابُ بِرِّ الْوَالِدِ، وَالْإِحْسَانِ إِلَى الْبَنَاتِ، 1210/2

حکم دیتا ہے اور قطع رحمی کو حرام قرار دیتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

«مَنْ سَرَّهُ أَنْ يُبْسَطَ لَهُ فِي رِزْقِهِ، أَوْ يُنْسَأَ لَهُ فِي أَثَرِهِ، فَلْيَصِلْ رَحِمَهُ»[1]

"جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اس کے رزق میں کشادگی کی جائے یا اس کی عمر لمبی ہو تو وہ صلہ رحمی کرے۔"

صلہ رحمی صرف یہ نہیں ہے کہ رشتہ داروں سے اخلاق کے ساتھ پیش آیا جائے بلکہ صلہ رحمی میں یہ بھی شامل ہے کہ اگر رشتہ داروں میں سے کچھ معاشی طور کمزور ہوں تو ان کی مالی امداد کرے۔ اگر دنیا میں کسی اچھے عہدے پر ہو تو اپنے رشتہ داروں کا دھیان رکھے۔ دھیان رکھنے سے یہ مراد نہیں ہے کہ ان کے ناجائز کام کرے بلکہ مراد یہ ہے کہ ان کے جائز کاموں میں بھاگ دوڑ کرنا بھی صلہ رحمی میں شامل ہے۔

اسی طرح صلہ رحمی یہ نہیں ہے کہ کوئی رشتہ دار ہمارے ساتھ اچھا سلوک کرے تو ہم بھی اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں، یہ تو ادلے کا بدلہ ہے جو کہ دنیا میں چلتا ہے۔ اور صلہ رحمی تو یہ ہے کہ جو ہم سے رشتہ توڑے، ہم اس سے ناطہ جوڑیں۔ جو ہم سے منہ پھیرے، ہم اسے سلام کریں۔ جو ہم سے برا کرے، ہم اس سے اچھا کریں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«لَيْسَ الْوَاصِلُ بِالْمُكَافِئِ، وَلَكِنْ هُوَ الَّذِي إِذَا قُطِعَتْ رَحِمُهُ وَصَلَهَا»[2]

"صلہ رحمی کرنے والا وہ نہیں ہے جو بدلے میں حسن سلوک کر رہا ہو بلکہ صلہ رحمی تو یہ ہے کہ جب کوئی رشتہ توڑے تو اس کے ساتھ رشتہ جوڑا جائے۔"

اور یہی انسانوں کے ساتھ تعلق میں احسان کا درجہ ہے۔ ایک احسان عبادت میں ہے اور ایک احسان اخلاق میں ہے۔ اخلاق کا احسان یعنی اعلی ترین درجہ کیا ہے، اس بارے ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّ رَجُلًا قَالَ: يَا رَسُولَ اللهِ إِنَّ لِي قَرَابَةً أَصِلُهُمْ وَيَقْطَعُونِي، وَأُحْسِنُ إِلَيْهِمْ وَيُسِيئُونَ إِلَيَّ، وَأَحْلُمُ عَنْهُمْ وَيَجْهَلُونَ

---

[1] صحيح بخاري، كِتَابُ البُيُوعِ، بَابُ مَنْ أَحَبَّ البَسْطَ فِي الرِّزْقِ، 56/3

[2] سنن أبي داود، كِتَاب الزَّكَاةِ، بَابٌ فِي صِلَةِ الرَّحِمِ، 132/2

عَلَيَّ، فَقَالَ: «لَئِنْ كُنْتَ كَمَا قُلْتَ، فَكَأَنَّمَا تُسِفُّهُمُ الْمَلَّ وَلَا يَزَالُ مَعَكَ مِنَ اللهِ ظَهِيرٌ عَلَيْهِمْ مَا دُمْتَ عَلَى ذَلِكَ»[1]

"حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس اس شخص آیا اور اس نے کہا کہ میرے کچھ رشتہ دار ہیں کہ میں ان سے رشتہ جوڑتا ہوں اور وہ مجھ سے رشتہ توڑتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ حسن سلوک کرتا ہوں اور وہ میرے ساتھ بری طرح پیش آتے ہیں۔ میں ان کے رویے برداشت کرتا ہوں جبکہ وہ میرے ساتھ جذباتی ہو جاتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر ایسا ہی ہے کہ جیسا کہ تم کہہ رہے ہو تو تم ان کے مونہوں میں راکھ ڈال رہے ہو۔ اور جب تک تم ان کے ساتھ اسی طرح پیش آتے رہو گے اس وقت تک اللہ کی طرف سے ایک فرشتہ تمہاری مدد کرتا رہے گا۔"

پس صلہ رحمی یہ نہیں ہے کہ کسی نے عید کے موقع پر ہمارے گھر کھیر بھجوا دی اور ہم نے ان کے گھر سویاں بھجوا دیں۔ یہ تو ادلے کا بدلہ ہے کہ دنیا میں یہی نظام چلتا ہے۔ صلہ رحمی تو یہ ہے کہ جس کے بارے یقین ہو کہ وہ کچھ نہیں بھجوائے گا تو اس کی طرف کچھ بھجوایا جائے۔ یہ صلہ رحمی میں احسان کا درجہ ہے۔ اور اس کے لیے ہم سب کو کوشش کرنی چاہیے۔

قرض کی نیکی

اصلاح نفس کے ذرائع میں سے ایک بہت بڑا ذریعہ مال کے ذریعے اپنے نفس کی اصلاح کرنا ہے کہ جس میں زکوۃ، صدقہ اور قرض وغیرہ شامل ہیں۔ صدقے میں عبادت کا پہلو غالب ہے جبکہ قرض میں صلہ رحمی کا۔

ہماری شریعت میں قرض دینے کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے جبکہ لینے کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی۔ اگر آپ کے کسی رشتہ دار اور دوست کو قرض کی ضرورت ہے تو اسے قرض دے کر آپ نے اپنے نفس کی اصلاح کی بنیاد رکھ دی۔ آپ نے اللہ کی محبت کو مال کی

[1] صحیح مسلم، کتاب الْبِرِّ وَالصِّلَةِ وَالْآدَابِ، بَابُ صِلَةِ الرَّحِمِ وَتَحْرِيمِ قَطِيعَتِهَا، 1982/4

محبت پر غالب کرنے کے لیے اپنے نفس سے مجاہدہ کیا اور یہی جہاد بالنفس ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے حجۃ الوداع کے موقع پر خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

«وَالْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهُ فِي طَاعَةِ اللَّهِ»[1]

”مجاہد تو وہ ہے جو اپنے نفس کو اللہ کا فرمانبردار بنانے کے لیے اس سے جہاد کرے۔“

قرض دینے کا روایات میں صدقہ دینے سے بھی زیادہ اجر وثواب بیان ہوا ہے۔ صدقہ تو عموماً وہ رقم ہوتی ہے کہ جو ضرورت سے زائد ہو لیکن قرض عموماً وہ رقم ہوتی ہے کہ جو آپ کی ضرورت کی ہو۔ پیسہ کس کی ضرورت نہیں لیکن اگر آپ نے اپنی ضرورت پر اپنے بھائی کی ضرورت کو ترجیح دی تو یہ وہ ایثار ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک دوسرے کے لیے کیا کرتے تھے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ سُلَيْمَانَ بْنِ بُرَيْدَةَ، عَنْ أَبِيهِ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا فَلَهُ بِكُلِّ يَوْمٍ مِثْلِهِ صَدَقَةٌ، قَالَ: ثُمَّ سَمِعْتُهُ يَقُولُ: مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا فَلَهُ بِكُلِّ يَوْمٍ مِثْلَيْهِ صَدَقَةٌ، قُلْتُ: سَمِعْتُكَ يَا رَسُولَ اللهِ تَقُولُ: مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا فَلَهُ بِكُلِّ يَوْمٍ مِثْلِهِ صَدَقَةٌ، ثُمَّ سَمِعْتُكَ تَقُولُ: مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا فَلَهُ بِكُلِّ يَوْمٍ مِثْلَيْهِ صَدَقَةٌ، قَالَ لَهُ: بِكُلِّ يَوْمٍ صَدَقَةٌ قَبْلَ أَنْ يَحِلَّ الدَّيْنُ، فَإِذَا حَلَّ الدَّيْنُ فَأَنْظَرَهُ فَلَهُ بِكُلِّ يَوْمٍ مِثْلَيْهِ صَدَقَةٌ[2]

”حضرت سلیمان بن بریدہ اپنے والد بریدہ رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے کہا کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ جس نے کسی تنگدست کو مہلت دی تو اس کو ہر دن اتنا صدقہ کرنے کا اجر ملے گا کہ جتنا اس نے اسے قرضہ دے رکھا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ پھر ایک دن میں نے آپ ﷺ کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ جس نے کسی تنگدست کو مہلت دی تو اس کو ہر دن اس سے دوگنا صدقہ کرنے کا اجر ملے گا کہ جتنا اس نے اسے قرضہ دے رکھا تھا۔ تو

[1] مسند الإمام أحمد بن حنبل: 381/39

[2] مسند الإمام أحمد بن حنبل: 153/38

وہ کہتے ہیں کہ میں نے کہا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! پہلے آپ نے یہ بات کی کہ جتنی رقم قرض دی ہے، ہر دن اتنا صدقہ کرنے کا اجر ملے گا۔ اور بعد میں آپ نے یہ بات کی کہ جتنی رقم قرض دی ہے، ہر دن اس سے دوگنا صدقہ کرنے کا ثواب ملے گا۔ تو اللہ کے رسول ﷺ نے جواب دیا کہ جس دن سے قرضہ دیا ہے، اس دن سے قرضے کی مدت ختم ہونے تک ایک گنا صدقہ کا ثواب ہے۔ اور جس دن قرضے کی میعاد ختم ہو گئی اور پھر اسے مہلت دے دی تو اس دن سے دوگنا صدقے کا ثواب ہے۔"

اگر آپ نے کسی رشتہ دار یا دوست کو تین ماہ کے لیے دس ہزار قرض دیا ہے تو اب تین ماہ تک ہر دن میں آپ کو دس ہزار صدقہ کرنے کا ثواب ملے گا۔ اور جب آپ تین ماہ بعد اپنے رشتہ دار یا دوست سے اپنے قرض کی واپسی کا مطالبہ کرتے ہیں اور اس کے حالات اتنے اچھے نہیں ہیں کہ وہ فوراً واپس کر سکے اور وہ آپ سے مطالبہ کرتا ہے کہ آپ اسے مزید تین ماہ کی مہلت دے دیں اور آپ اسے یہ مہلت دے دیتے ہیں تو اب ان اگلے تین ماہ میں آپ کو ہر دن میں بیس ہزار صدقے کا ثواب ملے گا۔ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس بعض اوقات کچھ بھی نہیں ہوتا تھا لیکن کسی دوسرے سے قرض لے کر کسی کی ضرورت پوری کر دیتے تھے۔

مقروض کو مہلت دینے کا یہ ثواب تو ہے ہی اور اگر مقروض کے حالات ایسے ہوں کہ وہ قرض واپس نہیں کر سکتا اور آپ اسے قرض معاف کر دیتے ہیں تو اس بارے میں ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا، أَوْ وَضَعَ لَهُ، أَظَلَّهُ اللَّهُ يَوْمَ القِيَامَةِ تَحْتَ ظِلِّ عَرْشِهِ يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلُّهُ»[1]

"جس نے کسی مقروض کو مہلت دے دی یا اس کا قرض ہی معاف کر دیا تو قیامت والے دن اللہ تعالیٰ اس کو اپنے عرش کا سایہ نصیب فرمائیں گے کہ جس دن اللہ کے عرش کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہو گا۔"

[1] سنن الترمذي، أَبْوَابُ الْبُيُوعِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي إِنْظَارِ المُعْسِرِ وَالرِّفْقِ بِهِ، 591/3

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

«كَانَ تَاجِرٌ يُدَايِنُ النَّاسَ، فَإِذَا رَأَى مُعْسِرًا قَالَ لِفِتْيَانِهِ: تَجَاوَزُوا عَنْهُ، لَعَلَّ اللَّهَ أَنْ يَتَجَاوَزَ عَنَّا، فَتَجَاوَزَ اللَّهُ عَنْهُ»[1]

''ایک تاجر لوگوں کو قرض دیتا تھا۔ اور جب وصولی کا وقت آتا تو اپنے خادموں سے کہتا تھا کہ اگر کوئی تنگدست ہو تو اسے قرض معاف کر دینا، شاید اللہ بھی ہمیں معاف کر دے۔ تو اللہ عزوجل نے اسے معاف فرما دیا۔''

یہ علیحدہ بات ہے کہ اگر مقروض اپنا قرض واپس کر سکتا ہو اور پھر بھی ٹال مٹول سے کام لے جیسا کہ ہمارے ہاں اکثر لوگ ایسا کرتے ہیں تو اللہ کے رسول ﷺ کی ایسے شخص کے بارے وعید ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«مَطْلُ الْغَنِيِّ ظُلْمٌ»[2]

''غنی اور مالدار شخص کا ٹال مٹول کرنا ظلم ہے۔''

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

«لَيُّ الْوَاجِدِ يُحِلُّ عِرْضَهُ وَعُقُوبَتَهُ»[3]

''جو شخص قرض ادا کر سکتا ہو اور پھر ٹال مٹول کرے تو اس کی بے عزتی بھی جائز ہو جاتی ہے اور اس کو سزا بھی دی جا سکتی ہے۔''

جس طرح ہمارے دین نے قرض دینے کو پسند کیا ہے، اسی طرح قرض لینے کو ناپسند جانا ہے بلکہ اللہ کے رسول ﷺ تو اس شخص کی نمازہ جنازہ نہ پڑھاتے تھے کہ جو مقروض ہوتا تھا۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ جَابِرٍ، قَالَ: كَانَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَا يُصَلِّي عَلَى رَجُلٍ مَاتَ وَعَلَيْهِ دَيْنٌ، فَأُتِيَ بِمَيِّتٍ، فَقَالَ: «أَعَلَيْهِ دَيْنٌ؟» قَالُوا: نَعَمْ، دِينَارَانِ، قَالَ: «صَلُّوا عَلَى صَاحِبِكُمْ» فَقَالَ أَبُو قَتَادَةَ الْأَنْصَارِيُّ: هُمَا عَلَيَّ يَا رَسُولَ اللَّهِ، قَالَ: فَصَلَّى عَلَيْهِ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَلَمَّا فَتَحَ اللَّهُ عَلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: «أَنَا

---

[1] صحيح البخاري، كِتَابُ البُيُوعِ، بَابُ مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا، 58/3

[2] الموطأ، كِتَابُ الْبُيُوعِ، باب جَامِعُ الدَّيْنِ وَالْحِوَلِ، 972/4

[3] سنن ابن ماجة، أَبْوَابُ الصَّدَقَاتِ، بَابُ الْحَبْسِ فِي الدَّيْنِ وَالْمُلَازَمَةِ، 497/3

أَوْلَى بِكُلِّ مُؤْمِنٍ مِنْ نَفْسِهِ، فَمَنْ تَرَكَ دَيْنًا فَعَلَيَّ قَضَاؤُهُ وَمَنْ تَرَكَ مَالًا فَلِوَرَثَتِهِ»[1]

”حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ اس شخص کی نماز جنازہ نہیں پڑھاتے تھے کہ جس کے بارے معلوم ہو جاتا کہ یہ مقروض فوت ہوا ہے۔ ایک بار ایک میت لائی گئی تو آپ نے پوچھا کہ کیا اس پر قرض ہے؟ تو لوگوں نے کہا کہ دو دینار قرض ہے۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اسے لے جاؤ اور خود اس کی نماز جنازہ پڑھ لو۔ حضرت ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اللہ کے رسول ﷺ! اس کا قرض میرے ذمہ ہے تو پھر اللہ کے رسول ﷺ نے اس شخص کی نماز جنازہ پڑھائی۔ پس جب آپ ﷺ کو فتوحات حاصل ہوئیں [اور بیت المال میں مال غنیمت وافر مقدار میں آیا] تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں اہل ایمان سے ان کی اپنی جان سے بھی زیادہ تعلق رکھتا ہوں لہذا آئندہ جو مومن مقروض فوت ہو گا تو اس کا قرض میرے ذمہ ہے جبکہ اس کی وراثت اس کے ورثاء کا حق ہے۔“

ہمیں قرض دینے والا بننا چاہیے نہ کہ لینے والا کہ قرض دینا نیکی ہے نہ کہ قرض لینا۔ اور قرض دینے والے کا تزکیہ ہوتا ہے نہ کہ لینے والے کا کہ لینا تو پھر سوال ہی کی ایک قسم ہے۔ حضرت ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک دفعہ جہاد پر خطبہ دیا تو ایک شخص نے سوال کیا:

أَرَأَيْتَ إِنْ قُتِلْتُ فِي سَبِيلِ اللهِ، تُكَفَّرُ عَنِّي خَطَايَايَ؟ فَقَالَ لَهُ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «نَعَمْ، إِنْ قُتِلْتَ فِي سَبِيلِ اللهِ، وَأَنْتَ صَابِرٌ مُحْتَسِبٌ، مُقْبِلٌ غَيْرُ مُدْبِرٍ»، ثُمَّ قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «كَيْفَ قُلْتَ؟» قَالَ: أَرَأَيْتَ إِنْ قُتِلْتُ فِي سَبِيلِ اللهِ أَتُكَفَّرُ عَنِّي خَطَايَايَ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «نَعَمْ، وَأَنْتَ صَابِرٌ مُحْتَسِبٌ، مُقْبِلٌ غَيْرُ مُدْبِرٍ، إِلَّا الدَّيْنَ، فَإِنَّ جِبْرِيلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ لِي ذَلِكَ»[2]

---

[1] سنن أبي داود، كِتَاب الْبُيُوعِ، بَابٌ فِي التَّشْدِيدِ فِي الدَّيْنِ، 247/3

[2] صحيح مسلم، كِتَابُ الْإِمَارَةِ، بَابُ مَنْ قُتِلَ فِي سَبِيلِ اللهِ كُفِّرَتْ خَطَايَاهُ إِلَّا الدَّيْنَ، 1501/3

"اگر میں اللہ کے رستے میں شہید ہو جاؤں تو کیا میرے تمام گناہ معاف ہو جائیں گے؟ تو اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ ہاں! اگر تو تم نے صبر اور حوصلے سے لڑائی کی اور ثواب کی امید میں کی اور میدان جنگ سے فرار نہ ہوئے۔ پھر تھوڑی دیر بعد آپ ﷺ نے اس شخص سے کہا کہ تم نے کیا سوال کیا تھا؟ تو اس نے دوبارہ کہا کہ میں نے یہ پوچھا تھا کہ اگر میں میدان جنگ میں شہید ہو جاؤں تو کیا میرے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں! اگر تو تم نے صبر اور حوصلے سے لڑائی کی اور ثواب کی امید میں کی اور میدان جنگ سے فرار نہ ہوئے اور تم پر کوئی قرض نہ ہوا۔ یہ قرض والی بات ابھی جبرئیل علیہ السلام نے آکر مجھ سے کہی ہے۔"

تو شہید کے بھی تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں مگر قرض معاف نہیں ہوتا لہذا قرض لینا ہر گز پسندیدہ امر نہیں ہے۔ پس قرض دینا تو نیکی کا کام ہے لیکن لینا نیکی نہیں ہے۔ ہمارے ہاں لوگوں کو نئی گاڑی، نیا گھر اور نئی فیکٹری لگانے کے لیے قرض لینے کی اس طرح ترغیب دی جاتی ہے جیسے یہ نیکی کا بہت بڑا کام ہو۔[1] یہ اسلام کا مزاج نہیں ہے، اسی لیے ہم نے اس کتاب میں اصلاح علماء کے باب میں یہ واضح کیا ہے کہ ہماری فقہ اسلامی کو ایک نئے زاویہ نگاہ سے نظر ثانی کی اشد ضرورت ہے، اور وہ زاویہ نگاہ تزکیہ نفس اور اصلاح معاشرہ کا ہے۔ ہمارے مفتی حضرات فتوی دیتے ہوئے اس پہلو کو یکسر نظر انداز کر دیتے ہیں اور فقہ اسلامی فقہی جمود اور خشک قانون کا مجموعہ بن کر رہ گئی ہے۔

❀❀❀❀❀❀❀

[1] اپنی بنیادی ضرورت پوری کرنے کے لیے ایک شخص دوسرے سے قرض لے لے تو یہ جائز ہے لیکن نظام بینکاری کی بنیاد ہی قرض پر رکھی گئی ہے اور دنیا کی ہر آسائش حاصل کرنے کے لیے اسلامی بینک مرابحہ کے نام سے اور روایتی بینک لون کے نام سے ادھار لینے کی ترغیب دے رہے ہیں۔

باب پنجم

اصلاح معاشرہ

اس باب میں اصلاح معاشرہ کے ضمن میں دعوت وتبلیغ، امر بالمعروف ونہی عن المنکر، رستوں کی اخلاقیات، رسوم ورواج، تعلیم اور ادب کی اصلاح اور فکر کی درستگی پر گفتگو کی گئی ہے۔

دعوت اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر میں فرق

دعوت تو نیکی اور خیر کے کام کی طرف لوگوں کو بلانے کا نام ہے اور منت سماجت والا کام ہے جبکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں کسی قدر سختی کا عنصر بھی شامل ہے۔ حکم دینے اور روکنے کے الفاظ میں ہی سختی (strictness) کا معنی شامل ہے۔

اگر سوسائٹی میں بگاڑ زیادہ ہو اور مذہبی طبقات کی حیثیت معاشرے میں ایک اقلیت (minority) کی سی ہو تو وہاں "دعوت الی الخیر" (calling to the good) کا کام ہونا چاہیے۔ اور اگر اصحاب اختیار واقتدار کا ذہن مذہبی ہو اور انہیں سوسائٹی میں اثر ورسوخ حاصل ہو تو انہیں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا کام کرنا چاہیے۔ تبلیغی جماعتوں کا انداز "دعوت الی الخیر" کا انداز ہے۔

ایک باپ اپنے بیٹے کو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کر سکتا ہے جبکہ بیٹا اپنے باپ کو صرف دعوت دے سکتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اولاد کے نماز نہ پڑھنے کی صورت میں والد کو سختی کرنے بلکہ مارنے کا بھی حکم دیا ہے۔ یہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے کہ جس میں ڈانٹ ڈپٹ، سختی اور مار تک بھی شامل ہے۔ لیکن اگر والد نماز نہ پڑھے تو اولاد صرف دعوت ہی دے سکتی ہے۔

بعض دوستوں نے تبصرہ کیا کہ اگر والدین نماز کے معاملے میں اپنی اولاد پر سختی کریں گے تو اولاد ان کے سامنے تو نماز پڑھ لے گی لیکن ان کے پیچھے نہیں پڑھے گی لہذا اس معاملے میں اولاد پر سختی نہ کرنا ہی بہتر ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اللہ کے دین کے معاملے میں سختی وہاں کی جا سکتی ہے کہ جہاں آپ ذمہ دار کی حیثیت میں ہوں یا صاحب اختیار ہوں۔ جہاں آپ ذمہ دار نہیں ہیں یا آپ کے پاس اختیار نہیں ہے تو وہاں دین کے معاملے میں سختی درست نہیں ہے۔ والدین چونکہ اپنی اولاد کے ذمہ دار اور نگران ہیں لہذا انہیں اولاد پر دین کے معاملے میں سختی کرنے کا حق ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ والدین دنیا کے معاملات میں بھی تو اپنی اولاد پر سختی کرتے ہیں۔ مائیں اسکول کی تعلیم کے حصول میں چھوٹے بچوں پر کتنی سختی کرتی ہیں۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ بات بات پر

تھپڑ لگا دینا بھی مناسب نہیں ہے کہ اس سے بچے ڈھیٹ بن جاتے ہیں۔ اسی طرح اتنا رعب بھی درست نہیں ہے کہ والد جیسے ہی گھر میں داخل ہو، بچوں کا سانس ہی سو کھ جائے جیسے والد نہ ہو، کوئی جلاد ہو۔ اس بارے معتدل رویہ ہونا چاہیے، کبھی نرمی کر لی اور کبھی سختی سے کام لے لیا۔

دعوت و تبلیغ کا مطالبہ ہر کسی سے ہے جبکہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہر کسی کا کام نہیں ہے۔ ہر شخص اپنے دائرہ اختیار میں امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا مکلف ہے۔ والد اپنے گھر، ہیڈ ماسٹر اپنے اسکول، پرنسپل اپنے کالج، وائس چانسلر اپنی یونیورسٹی، مدرسہ کا منتظم اپنے مدرسہ، فیکٹری کا مالک اپنی فیکٹری، تھانیدار اپنے تھانے کی حدود، اسسٹنٹ کمشنر اپنی تحصیل، افواج کے سربراہان اپنی مسلح افواج، وزیر اپنی وزارت، وزیر اعظم اپنی حکومت اور صدر اپنی ریاست میں امر المعروف و نہی عن المنکر کا ذمہ دار ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

«كُلُّكُمْ رَاعٍ وَمَسْـئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالإِمَامُ رَاعٍ وَمَسْـئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالرَّجُلُ رَاعٍ فِي أَهْلِهِ وَمَسْـئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ، وَالمَرْأَةُ فِي بَيْتِ زَوْجِهَا رَاعِيَةٌ وَمَسْـئُولَةٌ عَنْ رَعِيَّتِهَا، وَالخَادِمُ فِي مَالِ سَيِّدِهِ رَاعٍ وَمَسْـئُولٌ عَنْ رَعِيَّتِهِ»[1]

"تم میں سے ہر ایک ذمہ دار ہے اور اس سے اس کی ذمہ داری کے بارے پوچھا جائے گا۔ امیر المومنین نگران ہے اور اس سے اس کی رعیت (citizens) کے بارے پوچھا جائے گا۔ اور وہ شخص جو اپنے گھر کا سرپرست ہے، اس سے اپنے گھر والوں کے بارے سوال ہو گا۔ اور عورت اپنے شوہر کے گھر میں ذمہ دار ہے لہذا اس سے شوہر کے گھر کے بارے سوال ہو گا۔ اور خادم اپنے مالک کے مال میں نگران ہے لہذا اس سے مالک کے مال کے بارے سوال ہو گا۔"

راستے کے حقوق [Road Ethics]

ہمارے معاشرے میں حقوق کی سب سے زیادہ پامالی رستوں میں ہوتی ہے۔ کبھی

1 صحيح البخاري، كتاب الوصايا، بَابُ تَأْوِيلِ قَوْلِ اللَّهِ تَعَالَى: مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ، 5/4

کبھار ایسا ہوتا ہے کہ آپ سڑک پر سفر کر رہے ہوں تو کوئی موٹر سائیکل یا گاڑی کسی دوسری موٹر سائیکل یا گاڑی سے ٹکرا جائے تو چند لمحوں میں صورت حال کس قدر گھمبیر ہو جاتی ہے۔ لوگ معمولی خراش (scratch) پر گالم گلوچ اور گریبان پھاڑنے پر اتر آتے ہیں۔

علاوہ ازیں شادی بیاہ کے موقع پر گلی کو بند کر دینا یا دوسروں کے گھروں کے مین گیٹ کے سامنے گاڑی کھڑی کر دینا وغیرہ بھی عام ہے۔ یورپ میں بھی گاڑیوں میں ٹکراؤ ہو جاتا ہے لیکن وہاں نظام مضبوط ہے۔ اگر آپ کی گاڑی سے کسی کی گاڑی ٹکرا جائے تو باقاعدہ اس نقصان کو پورا کرنے کا ایک قانونی طریق کار مقرر ہے اور لوگ اپنی خوشیوں کی خاطر دوسروں کا راستہ بند نہیں کرتے ہیں۔

شاہراہوں پر لوگ کس قدر ذہنی اذیت سے خود بھی دوچار ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی اذیت دیتے ہیں، اس کا اندازہ ان لوگوں کو بخوبی ہے، جو ڈرائیونگ کرتے ہیں۔ بعض اوقات تو محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے معاشرے کا سارا ذہنی دباؤ اور تناؤ سڑکوں پر ہی نکلتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے:

«إِيَّاكُمْ وَالْجُلُوسَ فِي الطُّرُقَاتِ» قَالُوا: يَا رَسُولَ اللهِ مَا لَنَا بُدٌّ مِنْ مَجَالِسِنَا نَتَحَدَّثُ فِيهَا، قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «فَإِذَا أَبَيْتُمْ إِلَّا الْمَجْلِسَ فَأَعْطُوا الطَّرِيقَ حَقَّهُ» قَالُوا: وَمَا حَقُّهُ؟، قَالَ: «غَضُّ الْبَصَرِ، وَكَفُّ الْأَذَى، وَرَدُّ السَّلَامِ وَالْأَمْرُ بِالْمَعْرُوفِ، وَالنَّهْيُ عَنِ الْمُنْكَرِ»[1]

"راستوں میں مت بیٹھو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ! ہمیں راستے پر بیٹھنا پڑتا ہے کہ ہمارے جمع ہونے اور مل بیٹھنے کی جگہ یہی راستے ہی تو ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: اگر تم نے راستوں پر مجلس لگانی ہی ہے تو ان راستوں کا حق ادا کرو۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سوال کیا کہ ان کا حق کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ ان کا حق یہ ہے کہ اپنی نظروں کو دبا کر

[1] صحيح مسلم، كتاب اللِّبَاسِ وَالزِّينَةِ، بَابُ النَّهْيِ عَنِ الْجُلُوسِ فِي الطُّرُقَاتِ، 1675/3

رکھو[کہ کسی عورت کو گھور کر نہ دیکھو]۔ کسی راہگیر کو تکلیف نہ دو۔ گزرنے والے کے سلام کا جواب دو۔ نیکی کا حکم دو اور برائی سے منع کرو۔"

تو راستے پر کسی راہگیر کو اذیت دینا گناہ کا کام ہے، چاہے یہ اذیت جسمانی ہو یا زبانی۔ ہم لوگ ٹریفک اشاروں کے مقامات پر ایک دوسرے کے لیے بہت زیادہ ذہنی اذیت کا بھی باعث بنتے ہیں۔ راستہ ملنے میں دو چار سیکنڈ کی دیر ہو جانے پر گزرتے گزرتے کسی کو ہاتھ اور منہ سے ایسا اشارہ کریں گے کہ جس سے وہ جل بھن کر رہ جائے لیکن یہ اشارہ کرتے ہوئے یہ نہیں سوچتے کہ ایک دن اللہ کے سامنے حاضر ہو کر ہمیں اس اشارے کے نتیجے میں پہنچائی جانے والی تکلیف کا حساب بھی دینا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «أَتَدْرُونَ مَنِ الْمُفْلِسُ»؟ قَالُوا: الْمُفْلِسُ فِينَا يَا رَسُولَ اللَّهِ مَنْ لَا دِرْهَمَ لَهُ وَلَا مَتَاعَ، قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «الْمُفْلِسُ مِنْ أُمَّتِي مَنْ يَأْتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِصَلَاتِهِ وَصِيَامِهِ وَزَكَاتِهِ، وَيَأْتِي قَدْ شَتَمَ هَذَا وَقَذَفَ هَذَا، وَأَكَلَ مَالَ هَذَا، وَسَفَكَ دَمَ هَذَا، وَضَرَبَ هَذَا فَيَقْعُدُ فَيَقْتَصُّ هَذَا مِنْ حَسَنَاتِهِ، وَهَذَا مِنْ حَسَنَاتِهِ، فَإِنْ فَنِيَتْ حَسَنَاتُهُ قَبْلَ أَنْ يُقْتَصّ مَا عَلَيْهِ مِنَ الخَطَايَا أُخِذَ مِنْ خَطَايَاهُمْ فَطُرِحَ عَلَيْهِ ثُمَّ طُرِحَ فِي النَّارِ»[1]

"حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوچھا کہ کیا تم جانتے ہو کہ مفلس کون ہے؟ تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم! ہم تو مفلس اس کو کہتے ہیں کہ جس کے پاس درہم اور دینار نہ ہو اور دنیا کا مال و متاع نہ ہو۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کا مفلس وہ ہے کہ جو قیامت کے دن اس حال میں آئے گا کہ اس کے اعمال نامے میں نمازیں بھی ہوں گی، روزے بھی اور زکاتیں بھی لیکن اس نے کسی کو گالی دی ہو گی اور کسی پر بہتان لگایا ہو گا، کسی کا مال کھایا ہو گا اور کسی کا خون

---

[1] سنن الترمذي، أَبْوَابُ صِفَةِ الْقِيَامَةِ وَالرَّقَائِقِ وَالْوَرَعِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي شَأْنِ الْحِسَابِ وَالْقَصَاصِ، 613/4

بہایا ہو گا، اور کسی کو مارا ہو گا تو اس شخص کو بٹھایا جائے گا اور اس سے قصاص لیا جائے گا تو بدلہ میں لوگوں میں اُس کی نیکیاں تقسیم ہوں گی۔ اور اگر اُس کی نیکیاں ختم ہو گئیں اور پھر بھی کچھ بدلہ لینے والے باقی رہ گئے تو اُن کے گناہ اُس کے کھاتے میں ڈال دیے جائیں گے، یہاں تک کہ یہ اُن گناہوں کے ساتھ جہنم میں داخل کر دیا جائے گا۔"

اسی طرح کبھی آپ سڑک پر جا رہے ہوں تو آگے ناکہ لگا ہو تو گاڑیوں کی ایک قطار بن جاتی ہے۔ ایسے میں کوئی صاحب دوسری گاڑیوں سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ دراصل ان کا حق مار رہے ہوتے ہیں اور قیامت والے دن اس حق کے بارے بھی جوابدہی ہو گی کہ اس سے دوسروں کو ذہنی اذیت اور کوفت ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«المُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ المُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ، وَالمُؤْمِنُ مَنْ أَمِنَهُ النَّاسُ عَلَى دِمَائِهِمْ وَأَمْوَالِهِمْ»[1]

"مسلمان وہ ہے کہ جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں اور مومن وہ ہے کہ جس سے دوسرے لوگوں کا خون اور مال محفوظ رہے۔"

اس روایت میں اللہ کے رسول ﷺ نے مسلمان اور مومن کی تعریف کی ہے۔ اب ہم میں سے ہر شخص اس تعریف پر اپنے آپ کو پرکھ لے کہ وہ کتنا مسلمان اور کس قدر مومن ہے؟ کہ سڑک پر اس کے ہاتھ اور زبان سے کتنے لوگ محفوظ ہیں۔ اور یہ تو سڑک پر ہی معلوم ہوتا ہے کہ صبر کس بلا کا نام ہے، ورنہ تو مسجد اور مدرسہ کے ماحول میں تو ہر دوسرا شخص فرشتہ معلوم ہوتا ہے کہ معمولی سی بات پر معذرت کر رہا ہوتا ہے۔

بلاوجہ ہارن دینا

ہمارے ہاں روڈ کی اخلاقیات میں کمی تو کیا، محسوس ہوتا ہے کہ بیڑہ ہی غرق ہے۔ لوگ روڈ پر ایک دوسرے کو جتنی ذہنی اذیت پہنچاتے ہیں، لعن طعن اور گالم گلوچ

---

[1] سنن الترمذي، أَبْوَابُ الْإِيمَانِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي أَنَّ الْمُسْلِمَ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُونَ مِنْ لِسَانِهِ وَيَدِهِ، 17/5

کرتے ہیں، شاید ہی کسی اور موقع پر ایسا کرتے ہوں۔ اس لیے اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ روڈ کی اخلاقیات پر لکھا جائے بلکہ قانون سازی کی جائے اور ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کو جرمانہ کیا جائے۔

اب بلاوجہ ہارن دینے کی عادت بد ہی کو دیکھ لیں کہ بعض اوقات آپ اگر گاڑی چلا رہے ہیں اور اشارہ بند ہے یا ٹریفک بلاک ہے تو آپ کے پیچھے موجود کوئی عجلت پسند ہارن پر ہارن دیے چلے جاتا ہے اور آپ کو سمجھ نہیں آتی کہ آپ اسے کیسے سمجھائیں کہ آپ کے پاس گاڑی ہے، ہوائی جہاز نہیں۔ بعض اوقات کچھ لوگ آپ کو کراس کرنے کے لیے بھی بلاوجہ ہارن دیتے چلے جاتے ہیں کہ اگر آپ نے پچھلی گاڑی کو راستہ دینے کے لیے اشارہ لگا بھی دیا ہے لیکن ظاہری بات ہے کہ آپ کو ایک طرف ہونے میں کچھ وقت لگتا ہے لیکن عجلت پسند اس دوران ہارن پر ہارن بجاتے ہیں جو کہ آپ کی ذہنی اذیت کا سبب بنا رہے گا۔ اسی طرح آپ نے سڑک کے کنارے کہیں گاڑی کھڑی کی تھی اور اب آپ اپنی گاڑی نکالنا چاہ رہے ہیں تو پیچھے سڑک پر آنے والوں کو ایک دو منٹ انتظار کرنا پڑ سکتا ہے لیکن وہ اس وقفے میں ہارن بجا بجا کر آپ کے لیے گویا صور اسرافیل پھونکنے کا کردار ادا کرتے رہتے ہیں۔

البتہ ایک بات مشاہدے میں آئی ہے کہ بڑی گاڑی والے چھوٹی گاڑی والوں کو ہارن کثرت سے دیتے ہیں لیکن بڑی گاڑی والا بڑی گاڑی والے کو ہارن کم ہی دیتا ہے۔ مثلاً کرولا اور سٹی والا مہران کو بہت ہارن دے گا جبکہ کرولا والا کرولا والے کو بہت کم ہارن دے گا اور کروزر والے کو بالکل بھی نہیں دے گا۔ ہمارے ایک دوست کا تو کہنا ہے کہ پاکستان میں چھوٹی گاڑی خریدنا اپنے لیے ذلت کا سامان پیدا کرنے کے مترادف ہے۔ آپ کے پاس جتنی چھوٹی گاڑی ہے، آپ روڈ پر اتنے ذلیل اور حقیر سمجھے جاتے ہیں اور آپ کے پاس جتنی بڑی گاڑی ہے، آپ کا روڈ پر اتنا ہی احترام ہے۔

آج سے اگر ہم خود سے یہ عہد کر لیں کہ کسی کو بلاوجہ ہارن دے کر پریشان نہیں کریں گے، اور خاص طور پیدل چلنے والوں، سائیکل سواروں اور چھوٹی گاڑی والوں کا

احترام کریں گے، تو ہم نے سڑک کی اخلاقیات کی بنیاد رکھ دی ہے، ان شاء اللہ۔ ہمیں راستے اور سڑک پر کسی مسلمان کو تکلیف دینے کے بجائے اس کی راحت کا باعث اور سبب بننے کا حکم دیا گیا ہے جیسا کہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

«تَبَسُّمُكَ فِي وَجْهِ أَخِيكَ لَكَ صَدَقَةٌ، وَأَمْرُكَ بِالمَعْرُوفِ وَنَهْيُكَ عَنِ المُنْكَرِ صَدَقَةٌ، وَإِرْشَادُكَ الرَّجُلَ فِي أَرْضِ الضَّلَالِ لَكَ صَدَقَةٌ، وَبَصَرُكَ لِلرَّجُلِ الرَّدِيءِ البَصَرِ لَكَ صَدَقَةٌ، وَإِمَاطَتُكَ الحَجَرَ وَالشَّوْكَةَ وَالعَظْمَ عَنِ الطَّرِيقِ لَكَ صَدَقَةٌ، وَإِفْرَاغُكَ مِنْ دَلْوِكَ فِي دَلْوِ أَخِيكَ لَكَ صَدَقَةٌ»[1]

"تیرا اپنے بھائی سے مسکرا کر ملنا بھی صدقہ ہے۔ تیرا کسی نیکی کا حکم کرنا اور برائی سے منع کرنا بھی صدقہ ہے۔اور تیرا کسی ویران علاقے میں اپنے بھائی کو راستہ دکھلا دینا بھی صدقہ ہے۔اور تیرا کسی اندھے کو راستے پر ڈال دینا بھی صدقہ ہے۔اور تیرا راستے سے پتھر، ہڈی اور کانٹا ہٹا دینا بھی صدقہ ہے۔اور تیرا اپنے ڈول میں سے پانی اپنے بھائی کے ڈول میں ڈال دینا بھی صدقہ ہے۔"

اساتذہ اور مشائخ کے حقوق

ایک دوست نے توجہ دلائی کہ بعض اوقات کوئی صاحب کوئی کام کہتے ہیں جو ہم وقت پر نہیں کر سکتے تو وہ اس کا شکوہ رکھ لیتے ہیں یا شکایت کا اظہار کر دیتے ہیں کہ ہم نے تو آپ کو ایک ہی کام کہا تھا اور آپ نے وہ بھی نہ کیا حالانکہ شکوہ رکھنے یا شکایت کرنے والے صاحب کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ ان دس اشخاص میں سے ایک ہیں، جنہوں نے اس دن میں ہمیں صرف ایک ہی کام کہا ہوتا ہے۔اس سے میرا ذہن علماء اور مدرسین کے اس حق کی طرف متوجہ ہوا جس کا عام طور لوگ خیال نہیں رکھتے۔

ہمارے معاشرے میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو دین کی تعلیم و تعلم، درس وتدریس، وعظ و نصیحت، دعوت وارشاد اور بحث و تحقیق میں اپنے اوقات کا ایک بڑا حصہ

---

[1] سنن الترمذي، أَبْوَابُ البِرِّ وَالصِّلَةِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي صَنَائِعِ المَعْرُوفِ، 339/4

کھپا دیتے ہیں۔ کسی مدرس قرآن ہی کی مثال کو لے لیں کہ جنہیں اللہ تعالی نے اچھا درس قرآن دینے کی صلاحیت سے نوازا ہے۔ اب ان کے کچھ دروس تو روزمرہ کے ہوتے ہیں جو ان کی جملہ دیگر دینی اور دنیاوی مصروفیات مثلاً ملازمت اور گھر بار وغیرہ کی ذمہ داریوں کے ساتھ چلتے رہتے ہیں۔ اور ان کے بعض دروس ایسے ہوتے ہیں جو عارضی اور وقتی ہوتے ہیں کہ جن کا تقاضا ان کے بعض سامعین کی طرف سے آتا ہے کہ وہ یہ درس ان کے گھر، مسجد یا گاؤں وغیرہ میں فلاں وقت میں دیں۔

یہ سامعین ایسے لوگ ہوتے ہیں جو اس مدرس کے چاہنے والے ہوتے ہیں، اس کے درس سے متاثر ہوتے ہیں اور اس کے درس سے دوسروں کو بھی مستفید کروانا چاہتے ہیں۔ مدرس قرآن کے شیڈول میں بعض اوقات اس کی گنجائش نہیں ہوتی کہ وہ کسی اضافی درس کے لیے علیحدہ سے وقت نکال پائیں لیکن لوگ اصرار کرتے ہیں لہذا مدرس صاحب اس اصرار کی بناء پر یا اس وجہ سے کہ لوگ انہیں متکبر نہ سمجھیں یا شکوہ و شکایت کا اظہار نہ کریں یا تبلیغ کی دینی ذمہ داری کے احساس وغیرہ جیسی وجوہات کی بناء پر ایسے دروس قرآن کی بھی حامی بھر لیتے ہیں کہ جس کی گنجائش ان کے گھر اور دیگر علمی ودعوتی کام کو کسر لگائے بغیر نہیں نکلتی۔ لہذا مدرس صاحب عموماً یہ سب کچھ ایک مشین کی طرح کرتے رہتے ہیں اور اس پر خود اپنی ذات اور اپنے اہل خانہ کی طرف سے پریشانی کا سامنا کرتے رہتے ہیں۔

اسی طرح ایک محقق (researcher) کی مثال لے لیں۔ کوئی ایک صاحب انہیں ایک حدیث کے بارے کہتے ہیں کہ اس کا حوالہ (reference) چاہیے جبکہ ایک دوسرے صاحب ان سے ایک دوسری حدیث کی صحت (authenticity) کے بارے معلوم کرنا چاہ رہے ہوتے ہیں۔ ایک تیسرا دوست ان سے اپنے مقالہ کی اصلاح مانگ رہا ہے تو چوتھے صاحب کسی فقہی مسئلے میں فتوی کے طلبگار ہیں۔ اب ہر ایک کے نزدیک انہوں نے اسے ایک ہی کام کہا ہے لیکن ہر ایک کو یہ معلوم نہیں، سوائے محقق کے، کہ اسے کتنے لوگوں نے ایک ہی دن میں کتنے کام کہے ہیں یا وہ

اپنی ملازمت، گھر بار اور اپنی روزمرہ کی لگی بندھی دینی مصروفیات کے علاوہ کتنا وقت اس قسم کی دینی خدمات کے لیے نکال سکتے ہیں؟

اسی طرح ایک عالم دین کی مثال لے لیں۔ ان سے موبائل پر مسئلہ پوچھنے والا شخص ایک ہی مسئلہ پوچھتا ہے لیکن اسے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ اس دن میں بیسواں شخص ہے، جو اس عالم دین سے ایک مسئلہ پوچھ رہا ہے۔ لہذا بعض لوگ ایسے علماء یا داعیان دین کہ جن کی طرف لوگ کثرت سے رجوع کرتے ہیں، سے شکایت رکھ لیتے ہیں کہ ان کے موبائل فون اکثر بند رہتے ہیں یا وہ اپنا موبائل اٹھاتے نہیں ہیں۔ تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اس قسم کے حالات میں ان کی اپنی ذاتی اور گھریلو زندگی تو نظر انداز ہو رہی ہوتی ہے جبکہ بعض اوقات ان کی لگی بندھی دینی مصروفیات بھی متاثر ہونا شروع ہو جاتی ہیں۔ ایک عالم دین نے بتلایا کہ ان کا گھر میں اپنی اہلیہ سے اکثر یہ اختلاف رہتا ہے کہ ان کا موبائل گھر میں داخل ہونے کے بعد بند (off) رہنا چاہیے کیونکہ اہلیہ کا کہنا ہے کہ یہ ان کے بیوی بچوں کا وقت ہے جو وہ دوسرے لوگوں کو دے دیتے ہیں۔ گھر والوں کا موقف ہے کہ اہل خانہ کا وقت ان کا حق ہے اور یہ حق دوسرے لوگوں کو دینا کس طرح جائز ہے اور وہ بھی دین کے نام پر؟

قرآن مجید نے ہمیں کسی کے گھر جانے کے جو آداب سکھلائے ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ دستک دینے پر اگر جواب نہ ملے تو واپس آ جائیں لیکن ہمارے ہاں لوگ مِس کال پر مِس کال دیے چلے جاتے ہیں اور اگلے کی پرائیویسی کا ذرا بھی دھیان نہیں کرتے اور گویا اپنا یہ حق سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے کسی کو فون کیا ہے تو وہ لازماً ہماری بات سنے۔ ایسا کوئی حق ہمیں شریعت میں اس ملاقاتی کے لیے بھی نہیں ملتا ہے کہ جو بغیر وقت لیے آپ سے ملاقات کے لیے آپ کے گھر کے دروازے پر آ گیا ہو۔ آپ چاہیں تو اپنے اہل خانہ سے اجازت لے کر ان کا وقت اس ملاقاتی کو دے دیں، اور چاہیں تو نہ دیں اور کسی دوسرے وقت میں اس سے ملاقات طے کر لیں۔

ایسے میں عامۃ الناس (public) کو دھیان رکھنا چاہیے کہ ایسے مدرسین، علماء،

داعیان دین یا واعظین کی طرف کسی مسئلہ میں رجوع کرتے ہوئے ان سے اس قدر اصرار نہ کریں کہ وہ اپنی ذات میں تنگ ہو کر مروت میں آپ کا کوئی کام کریں بلکہ کسی خواہش کے اظہار میں ہمیشہ ایسا انداز اختیار کریں کہ وہ فیصلہ کرنے میں آزاد ہوں اور اگر کسی کام سے انکار بھی کرنا چاہیں تو سہولت سے انکار کر سکیں اور ان کے انکار کو محسوس بھی نہ کریں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کھانے کی دعوت پر تشریف لاتے تو کھانا کھانے کے انتظار میں بہت پہلے سے آکر بیٹھ رہتے یا کھانا کھانے کے بعد بہت دیر تک باتیں کرتے رہتے کہ جس سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی متاثر ہوتی تھی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج میں لحاظ اور مروت اس قدر تھا کہ کسی کو جانے کو کہتے نہ تھے۔ اس پر اللہ عزوجل نے یہ آیات نازل فرمائیں:

﴿فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانتَشِرُوا وَلَا مُسْتَأْنِسِينَ لِحَدِيثٍ إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِي مِنكُمْ وَاللَّهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ﴾ [الأحزاب: 53]

”پس جب تم کھانا کھالو تو چلے جایا کرو اور باتیں کرنے کے لیے نہ بیٹھ رہو۔ بے شک تمہارا یہ طرز عمل اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تکلیف کا باعث بنتا ہے لیکن وہ تم سے کچھ کہنے میں شرم محسوس کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالی حق بات کرنے سے نہیں شرماتا۔“

مزدور کی حوصلہ افزائی

صدقہ کی ایک بہترین صورت یہ ہے کہ ہاتھ سے کمانے والے کی حوصلہ افزائی کریں۔ آپ کسی ریڑھی والے سے پھل خریدتے ہیں اور آپ کو احساس ہوتا ہے کہ اس کی دیہاڑی نہیں لگتی ہو گی کہ جس سے اس کے گھر کا خرچہ چل سکتا ہو تو اس نیت سے پھلوں کا ریٹ کم نہ کروائیں کہ غریب کے لیے صدقہ ہی نکل جائے گا۔ آپ نائی کی دکان پر بال کٹوانے کے لیے گئے ہیں اور اس کاروبار سے اس کی کوئی خاطر خواہ آمدن نہیں ہے تو اسے کٹنگ کے بیس تیس روپے زیادہ دے دیں۔ آپ نے اپنی گلی کے نکڑ پر بیٹھے موچی سے جوتا مرمت کروانا ہے تو اگر اس نے تیس مانگے ہیں تو پچاس دیں کہ یہی

لوگ ہیں جو آپ کے صدقہ کے صحیح مستحق ہیں۔

بھاؤ تاؤ کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن غریب کو ہمیشہ دو چار پیسے زیادہ ہی دے دینے چاہییں بلکہ بعض اوقات تو اگر کسی چیز کی ضرورت نہ بھی ہو اور پھر بھی صرف اسی نیت سے خرید لے کہ غریب کی مدد ہو جائے گی تو یہ بھی صدقہ ہے۔ اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ بھاؤ تاؤ کروا کے قیمت کم کروالی اور پھر اس کی منہ مانگی قیمت اسے ادا کر دی۔ یا اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ چیز خرید لی اور قیمت ادا کرے۔ اور اب وہی خریدی ہوئی چیز دوبارہ اسی غریب کو واپس کر دے کہ جس سے خریدی ہے۔

حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ایک غزوے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ شریک تھا کہ میرا اونٹ پیچھے رہ گیا اور اس نے مجھے تھکا دیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم میرے پاس آئے تو میں نے اپنے اونٹ کی شکایت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اپنی لاٹھی سے ہانکا تو وہ ایسے دوڑنے لگا کہ مجھے اسے روکنا مشکل ہو گیا۔ اس کے بعد اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے کہا کہ کیا یہ اونٹ مجھے بیچو گے؟ تو میں نے ہاں کر دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ اونٹ مجھ سے خرید لیا اور مدینہ پہنچنے پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے کہا کہ مجھے قیمت ادا کر دیں۔ جتنی قیمت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے اونٹ خریدا تھا، حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اس سے زیادہ قیمت مجھے ادا کی۔ جب میں قیمت وصول کر کے واپس ہونے لگا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے واپس بلوا کر کہا:

«خُذْ جَمَلَكَ وَلَكَ ثَمَنُهُ»[1]

”اپنا اونٹ بھی لے جاؤ اور اس کی قیمت بھی رکھ لو۔“

استخارہ اور مشاورت

استخارہ عربی زبان کا لفظ ہے کہ جس کا معنی خیر طلب کرنا ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ سنت تھی کہ آپ کوئی بھی کام کرنے سے پہلے اللہ عزوجل سے بھی مشورہ کرتے تھے اور اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشاورت کرتے تھے۔ اللہ عزوجل سے کسی کام میں

[1] صحيح البخاري، كِتَابُ البُيُوعِ، بَابُ شِرَاءِ الدَّوَابِّ وَالحُمُرِ، 62/3

خیر اور مشورہ طلب کرنے کو دینی اصطلاح میں استخارہ کہتے ہیں۔ روایات میں ملتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو استخارہ کرنا ایسے سکھاتے تھے جیسا کہ قرآن مجید کی کوئی سورت سکھاتے تھے۔ اس سے استخارہ کی اہمیت کا علم ہوتا ہے۔

ہر چھوٹے بڑے کام میں اللہ عزوجل سے مشورہ کرنا چاہیے، یہی سنت ہے اور یہی استخارہ ہے۔ ہمارے ہاں استخارے کے طریقے کے بارے کچھ غلط فہمیاں عام ہو گئی ہیں، جن میں ایک "آن لائن استخارہ" ہے۔ استخارہ وہی ہے کہ جو آپ خود سے کریں کہ آپ کے مسئلے میں جتنا تعلق (concern) آپ کو ہے، اتنا کسی اور کو نہیں ہو سکتا۔ استخارہ کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ بندہ دو رکعت نفل نماز پڑھے اور کسی بھی وقت میں پڑھ سکتا ہے، تہجد کے وقت، اشراق کے وقت، ظہر کے بعد، عشاء کے بعد، اور اس کے بعد استخارہ کی دعا مانگے اور دعا مانگتے ہوئے اس کا ترجمہ ذہن میں رکھے۔ استخارہ کی دعا اور اس کا ترجمہ ہم ذیل میں نقل کر رہے ہیں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ جَابِرٍ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُعَلِّمُنَا الاِسْتِخَارَةَ فِي الأُمُورِ كُلِّهَا، كَالسُّورَةِ مِنَ القُرْآنِ: إِذَا هَمَّ بِالأَمْرِ فَلْيَرْكَعْ رَكْعَتَيْنِ ثُمَّ يَقُولُ: «اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْتَخِيرُكَ بِعِلْمِكَ، وَأَسْتَقْدِرُكَ بِقُدْرَتِكَ، وَأَسْأَلُكَ مِنْ فَضْلِكَ العَظِيمِ، فَإِنَّكَ تَقْدِرُ وَلاَ أَقْدِرُ، وَتَعْلَمُ وَلاَ أَعْلَمُ، وَأَنْتَ عَلَّامُ الغُيُوبِ، اللَّهُمَّ إِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ هَذَا الأَمْرَ خَيْرٌ لِي فِي دِينِي وَمَعَاشِي وَعَاقِبَةِ أَمْرِي - أَوْ قَالَ: فِي عَاجِلِ أَمْرِي وَآجِلِهِ - فَاقْدُرْهُ لِي، وَإِنْ كُنْتَ تَعْلَمُ أَنَّ هَذَا الأَمْرَ شَرٌّ لِي فِي دِينِي وَمَعَاشِي وَعَاقِبَةِ أَمْرِي - أَوْ قَالَ: فِي عَاجِلِ أَمْرِي وَآجِلِهِ - فَاصْرِفْهُ عَنِّي وَاصْرِفْنِي عَنْهُ، وَاقْدُرْ لِي الخَيْرَ حَيْثُ كَانَ، ثُمَّ رَضِّنِي بِهِ، وَيُسَمِّي حَاجَتَهُ»[1]

"حضرت جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ ہمیں تمام کاموں میں استخارہ کرنے کی یوں تعلیم فرماتے تھے جیسے قرآن مجید کی کسی سورت کی تعلیم فرماتے تھے۔ اور استخارہ یہ ہے کہ جب کوئی کام کرنے کا ارادہ

[1] صحيح بخاري، كِتَابُ الدَّعَوَاتِ، بَابُ الدُّعَاءِ عِنْدَ الِاسْتِخَارَةِ 81/8

ہو تو دو رکعت نفل نماز پڑھے اور اس کے بعد یوں دعا مانگے: اے اللہ! میں آپ سے آپ کے علم کے ساتھ خیر طلب کرتا ہوں، اور آپ کی قدرت کے ساتھ قدرت طلب کرتا ہوں، اور آپ سے عظیم فضل کا سوال کرتا ہوں۔ اے اللہ! آپ کے پاس قدرت ہے، میرے پاس نہیں ہے، آپ کے پاس علم ہے، میرے پاس نہیں ہے، اور آپ غیب کی باتیں جاننے والے ہیں۔ اے اللہ! آپ کے علم کے مطابق اگر یہ کام میرے دین، میرے معاش اور میرے آخرت کے اعتبار سے خیر ہے تو اس کام کو میرا مقدر بنا دیں۔ اور آپ کے علم کے مطابق اگر یہ کام میرے دین، میرے معاش اور میری آخرت کے اعتبار سے شر ہے تو اس کام کو مجھ سے دور کر دیں اور مجھے اس سے دور کر دیں۔ اور اس کے علاوہ کہیں سے مجھے خیر دے دیں اور پھر اس پر مجھے راضی رہنے کی توفیق بھی عطا فرمائیں۔ حدیث کے راوی کہتے ہیں کہ دعا کرتے ہوئے کام کے لفظ کی جگہ اس متعین کام کا نام لے کہ جس کے لیے استخارہ کر رہا ہو۔"

استخارہ کرنے کے بعد سونا لازمی نہیں ہے اور نہ ہی یہ ضروری ہے کہ استخارہ کے بعد خواب میں کوئی بابا جی آکر آپ کو بتلائیں گے کہ بچے آپ نے یہ کام کرنا ہے یا نہیں۔ اکثر لوگوں کو دیکھا ہے کہ وہ استخارہ کے بعد اپنے خوابوں میں استخارے کا جواب تلاش کرتے رہتے ہیں حالانکہ خواب میں جواب کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ یہ ممکن ہے کہ کسی کے استخارے کے نتیجے میں اللہ عزوجل اسے خواب میں کوئی اشارہ فرما دیں لیکن یہ ضروری نہیں ہے۔ اس لیے استخارے کے بعد الم غلم خوابوں میں اس کا جواب تلاش کرنا مناسب نہیں ہے کہ خواب تو ہماری زندگی کا حصہ ہیں، ہم روزانہ خواب دیکھتے ہیں بلکہ خواب کا نہ آنا بیماری ہے۔ پس استخارہ کے بعد معمول کے خوابوں میں تکلف سے اس کا جواب تلاش کرنا انسان کو کسی اور راستے پر لے جا سکتا ہے۔

تو پھر کیا کرنا چاہیے؟ دیکھیں! اگر آپ استخارہ کی دعا پر غور کریں تو اس کے الفاظ میں ہی یہ بات شامل ہے کہ اے اللہ! اگر یہ کام میرے لیے بہتر ہے تو اسے میرا مقدر بنا دے اور اگر بہتر نہیں ہے تو اسے مجھ سے دور کر دے۔ پس اگر وہ کام آپ کے حق میں

بہتر ہو گا تو اللہ عزوجل آپ کے دل کو اس کی طرف مائل کر دیں گے اور ذہن اس کی طرف لگا دیں گے۔ اور اگر وہ کام آپ کے حق میں بہتر نہ ہوا تو ایسے حالات پیدا ہو جائیں گے یا آپ کے خیالات ایسے بن جائیں گے کہ آپ اس کام سے بھاگیں گے اور وہ کام آپ سے بھاگے گا۔

استخارہ کے ساتھ اہل لوگوں سے مشاورت کرنا بھی سنت کا حصہ ہے۔ آپ ﷺ نے جنگوں کے معاملات تک میں عمومی مشاورت کی ہے۔ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ وغیرہ سے تو آپ اپنے گھر کے معاملات میں بھی مشاورت کر لیتے تھے۔ پس استخارہ کے بعد اپنے رشتہ داروں اور دوستوں سے مشاورت بھی بہت ضروری ہے اور ان سے مشاورت کے بعد دل جس کی طرف مائل ہو اور ذہن کا جس طرف رجحان بنے تو یہی استخارے کا نتیجہ ہے کہ آپ نے یہی استخارے کی دعا میں مانگا ہے۔

خودکشی

خودکشی اسلام میں حرام ہے کہ کسی شخص کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنی جان خود سے لے سکے۔ یہ جان انسان کے لیے اللہ کی دی ہوئی نعمتوں میں سے سب سے بڑی نعمت ہے اور خودکشی کر لینا اس نعمت کی ناشکری ہے۔ خودکشی کرنے والا اللہ عزوجل سے یہ جھگڑا کرتا ہے کہ اللہ عزوجل نے اسے زندگی کی نعمت عطا کرنے کا جو فیصلہ کیا تھا، وہ غلط تھا اور اگر وہ اس فیصلے کو صحیح سمجھتا تو خودکشی کیوں کرتا؟ خودکشی کرنے والا اللہ کی تقدیر پر راضی نہیں ہے، وہ تقدیر کو مٹانا چاہتا ہے اور اس کے لیے خود مٹ جاتا ہے۔ خودکشی ایسے کبیرہ گناہوں میں سے ہے کہ جس کی سزا جہنم بیان ہوئی ہے۔ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا:

«مَنْ قَتَلَ نَفْسَهُ بِحَدِيدَةٍ فَحَدِيدَتُهُ فِي يَدِهِ يَتَوَجَّأُ بِهَا فِي بَطْنِهِ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيهَا أَبَدًا، وَمَنْ شَرِبَ سُمًّا فَقَتَلَ نَفْسَهُ فَهُوَ يَتَحَسَّاهُ فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيهَا أَبَدًا، وَمَنْ تَرَدَّى مِنْ جَبَلٍ

فَقَتَلَ نَفْسَهُ فَهُوَ يَتَرَدَّى فِي نَارِ جَهَنَّمَ خَالِدًا مُخَلَّدًا فِيهَا أَبَدًا»[1]

”جس نے لوہے کے کسی تیز دھار آلے سے اپنے آپ کو قتل کیا تو جہنم میں اس کے ہاتھ میں وہ تیز دھار آلہ ہو گا کہ جسے وہ اپنے پیٹ میں مارتا رہے گا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں پڑا رہے گا۔ اور جس شخص نے زہر پی کر اپنے آپ کو قتل کیا تو وہ جہنم میں زہر پیتا رہے گا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں پڑا رہے گا۔ اور جس شخص نے پہاڑ سے اپنے آپ کو گرا کر قتل کر لیا تو وہ جہنم میں اپنے آپ کو پہاڑ سے گراتا رہے گا اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں پڑا رہے گا۔“

بعض دوستوں کا تبصرہ ہے کہ مذہبی لوگ وعیدیں سنا دیتے ہیں لیکن مسائل نہیں حل کرتے۔ تو جو لوگ خودکشی کر رہے ہیں، ان کے مسائل معلوم کریں اور ان کو حل کرنے کی کوشش کریں۔

یہ بات درست ہے کہ خودکشی کرنے والوں کے مسائل پر بھی غور ہونا چاہیے اور انھیں حل کرنے کے لیے کوشش بھی کرنی چاہیے لیکن یہ بات اپنی جگہ حقیقت ہے کہ ہمارے معاشرے میں لوگ جن مسائل کی وجہ سے خودکشی کرتے ہیں، وہ عموماً ایسے نہیں ہیں کہ جن کی وجہ سے خودکشی کرنے والے سے کوئی ہمدردی پیدا ہوتی ہو۔ اخبارات میں عموماً یہ خبریں شائع ہوتی ہیں کہ رشتہ نہ ملنے پر لڑکی کے گھر والوں کو مار کر خودکشی کر لی، عشق میں ناکامی پر ٹرین کے سامنے چھلانگ لگا دی، اور عشق بھی وہ جو اس نے ایشوریہ رائے سے کیا تھا کہ اس کی شادی ہوئی نہیں اور اس نے غم اور دکھ میں ٹرین کے سامنے چھلانگ لگا دی، میاں بیوی کے جھگڑے میں خاوند یا بیوی نے خودکشی کر لی، عید کے کپڑے نہ ملنے پر ماں نے بچوں سمیت نہر میں چھلانگ لگا دی، ملازمت نہ ملنے پر نوجوان نے مینار پاکستان سے چھلانگ لگا دی، ماں کے ڈانٹ پلانے پر بچی نے زہر پھانک لی وغیرہ۔

اس دنیا میں آزمائش ہر شخص کے لگی ہوئی ہے اگرچہ نوعیت مختلف ہے کہ کسی کی

---

[1] صحیح مسلم، كِتَابُ الْإِيمَانَ، بَابُ غِلَظِ تَحْرِيمِ قَتْلِ الْإِنْسَانِ نَفْسَهُ، 103/1

آزمائش جسمانی ہے، کسی کی مالی ہے اور کسی کی ذہنی ہے۔ یہ بھی فرق ہے کہ کسی کی آزمائش زیادہ ہے اور کسی کی کم ہے۔اب اگر خودکشی کرنے والے کی آزمائش اور حالات پر غور کیا جائے کہ جن کے سبب سے اس نے خودکشی کی ہے تو آپ کو احساس ہو گا کہ معاشرے میں اس سے بدتر حالات اور آزمائش میں لوگ مبتلا ہیں لیکن زندگی گزار رہے ہیں اور مطمئن بھی ہیں۔اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان میں صبر کا مادہ ہے۔ جس شخص نے صبر کرنا سیکھ لیا تو وہ زندگی گزارنا اور جینا بھی سیکھ لیتا ہے اور جس نے صبر کرنا نہ سیکھا تو زندگی گزارنا اس کے لیے عذاب بن جاتا ہے۔

اور صبر کے بغیر زندگی نہیں ہے کہ المیہ (tragedy) اور طربیہ (comedy) آپ کی زندگی کے دو رخ ہیں۔اور انہی دو پہلوؤں کے حوالے سے ہمارے دین میں صبر اور شکر کا حکم دیا گیا ہے کہ آزمائش میں صبر کرو اور آسائش میں شکر کرو۔اس کتاب کے آخری باب میں ہم نے صبر اور شکر پر مستقل بحث کی ہے کہ یہ دونوں رویے ہم اپنی زندگیوں میں کیسے پیدا کر سکتے ہیں کہ ان دونوں ہی سے اس زندگی کی خوبصورتی اور توازن ہے۔

اصلاح رسوم

ہمارے دین میں انسانی ضروریات، حاجیات، طبائع، میلانات، رجحانات اور فطرت کا خصوصی دھیان رکھا گیا ہے لہذا معاشرتی اقدار اور رسوم و رواج کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ اسلام انہی رسوم و رواج کو پسند کرتا ہے کہ جن میں معاشرے کی فلاح و بہبود کا پہلو ہو اور جو رسوم و رواج معاشرے میں ظلم اور بگاڑ کا باعث بنتے ہوں تو اسلام ان پر قدغن لگاتا ہے۔

سوسائٹی میں رسوم و رواج کا پیدا ہونا یا ختم ہونا، یہ اسلام کا موضوع نہیں ہے۔اسلام کا موضوع یہ ہے کہ ان میں سے کوئی رسم اسلامی اقدار کے منافی نہ ہو، دین کے مقاصد کے خلاف نہ ہو، اس سے معاشرے میں ظلم اور بگاڑ پیدا نہ ہو رہا ہو، اسے دین نہ بنا لیا جائے، اسے فرض اور قانون کا درجہ نہ دے دیا جائے، اور اس میں اسراف اور فضول

خرچی نہ ہو۔ اور رسوم ورواج میں انہی پہلوؤں کو مد نظر رکھتے ہوئے ان کی اصلاح دین میں مطلوب ہے نہ کہ رسوم ورواج کو ختم کرنے کی تحریک چلانا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے دور جاہلیت کی اکثر رسوم کی اصلاح کی نہ کہ سب رسموں کو بالکل ہی ختم کر دیا۔ البتہ جو ظالمانہ رسوم ورواج تھے تو انھیں آپ نے ختم کیا۔

آپ ایک رسم ختم کریں گے، دوسری اس کی جگہ لے لی گی کیونکہ رسوم ورواج کا تعلق انسان کے جذبات اور تعلقات سے ہے۔ اور جب تک انسانی جذبات اور تعلقات قائم رہیں گے، یہ رسوم ورواج پیدا ہوتے رہے گے لہذا اسلام کا مقصود رسوم ورواج کا خاتمہ نہیں ہے بلکہ ان کی اصلاح ہے۔ یہ اہم نکتہ ہے کہ جسے اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اور رسموں کی بھر مار تو یہ ایک دوسری انتہا ہے اور غیر متوازن رویہ ہے لہذا یہ بھی پسندیدہ امر نہیں ہے کہ ہر وقت کھیل تماشے میں ہی لگے رہو۔

پیدائش، شادی اور وفات انسانی زندگی کے تین اہم مراحل ہیں۔ ان مواقع کے حوالے سے کچھ رسومات ایسی ہیں کہ جنہیں دین نے خود جاری کیا ہے جبکہ بعض رواج ایسے بھی ہیں کہ جنہیں مسلمان معاشروں نے ہندوانہ اور مغربی تہذیب سے ادھار لیا ہے۔ اور یہ رسوم ورواج وہ ہیں جو شریعت اسلامیہ کی تعلیمات اور مقاصد کے خلاف ہیں اور معاشرے میں ظلم اور بگاڑ کا باعث ہیں لہذا ممنوع ہیں۔

بچے کی پیدائش کے موقع پر اس کے کان میں آذان کہنا، اسے گھٹی ڈالنا، اس کا ختنہ کروانا اور ساتویں دن بچے کا نام رکھنا، اس کی طرف سے عقیقہ کرنا، اور اس کے سر کے بال منڈوانا مسنون اعمال ہیں۔ بچے کی پیدائش کے موقف پر مٹھائی وغیرہ بانٹنا جائز ہے کہ یہ دوسروں کو اپنی خوشی میں شریک کرنے کے مترادف ہے۔ اسی طرح بچے کی پیدائش کے موقع پر تحفے تحائف دینا بھی جائز ہے کہ اس سے باہمی محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

«تَهَادُوا تَحَابُّوا»[1]

---

[1] البخاري، محمد بن إسماعيل بن إبراهيم بن المغيرة الجعفي، الأدب المفرد، دار البشائر الإسلامية،

"ایک دوسرے کو تحفے دیا کرو کہ اس سے باہمی محبت بڑھتی ہے۔"

تحفہ دینا سنت ہے لیکن اگر تحفہ دینے میں مقصود یہ ہو کہ جواب میں مجھے بھی تحفہ دیا جائے تو یہ مسنون نہیں ہے بلکہ ایک ایسی رسم ہے کہ جس میں دوسرے سے محبت کی بجائے اپنی ذات کے لیے لالچ کا عنصر غالب آگیا ہے اور اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرنی چاہیے۔ اس کے علاوہ بچے کی پیدائش پر جو رسوم ورواج ہیں تو وہ سنت سے ثابت نہیں ہیں۔ اور آذان، گھٹی، نام رکھنا، بال منڈوانا، عقیقہ کرنا، ختنہ کرنا اور مٹھائی بانٹنے وغیرہ سے بڑھ کر اور کرنا بھی کیا ہے؟ کیا یہ رسمیں کم ہیں کہ ہمیں اور رسموں کی ایجاد کی ضرورت محسوس ہو۔ اور اگر اولاد کی زیادہ خوشی منانی ہو تو انہی رسموں میں اپنے رشتہ داروں اور دوستوں کو بھرپور انداز میں شریک کر لیں۔

اسی طرح شادی کے لیے منگنی کرنا، نکاح کا اعلان کرنا اور دعوت ولیمہ مسنون اعمال میں سے ہیں۔ پس منگنی کے موقع پر بات پکی کرنے میں تاکید لانے کی غرض سے لڑکی کو سونے یا چاندی وغیرہ کی انگوٹھی پہنانے یا کپڑوں کا تحفہ بھیجنا جائز ہے لیکن اس میں اسراف کا پہلو نہ ہونا چاہیے کہ اسراف اور فضول خرچی سے ظلم پیدا ہوتا ہے۔

جہاں تک نکاح کی بات ہے تو احادیث میں نکاح علی الاعلان کرنے کا حکم دیا گیا ہے یعنی محلے اور بستی والوں کو پتہ چلے کہ فلاں کا نکاح ہو رہا ہے۔ روایت کے الفاظ ہیں:

«أَعْلِنُوا هَذَا النِّكَاحَ»[1]

"اس نکاح کا اعلان کیا کرو۔"

اور نکاح کا اعلان کرنا لازم ہے کہ اس میں اور زنا میں یہی فرق ہے کہ نکاح علی الاعلان ہوتا ہے اور زنا چوری چھپے ہوتا ہے۔ لہذا شادی والے گھر میں لائٹنگ وغیرہ کرنا ایک جائز امر ہے کیونکہ یہ نکاح کے اعلان کا ایک ذریعہ ہے۔

شادی بیاہ کے موقع پر فضول خرچی اور اسراف بہت زیادہ ہوتا ہے کہ جس کا نتیجہ ظلم، فساد اور بگاڑ ہے۔ دلہن کا عروسی جوڑا چار چار لاکھ میں تیار ہوتا ہے کہ جو اس نے

بیروت، الطبعة الثالثة، 1409ھ – 1989ء، ص 208

[1] سنن الترمذي، أَبْوَابُ النِّكَاحِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي إِعْلَانِ النِّكَاحِ، 390/3

صرف ایک دن پہننا ہے اور برائیڈل میک اپ ایک لاکھ تک میں ہوتا ہے جو ایک دن بھی باقی نہیں رہنا ہے۔ بارات اور مہندی کے کھانے کا ولیمے کی طرح اہتمام کیا جاتا ہے حالانکہ ولیمے میں بھی سادگی کا حکم ہے کہ اپنی استطاعت کے مطابق کرے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَآتِ ذَا الْقُرْبَىٰ حَقَّهُ وَالْمِسْكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيرًا ﴿26﴾ إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ وَكَانَ الشَّيْطَانُ لِرَبِّهِ كَفُورًا﴾ [الإسراء: 27]

"اور رشتہ داروں کو ان کا حق دو اور مسکینوں اور مسافروں کو ان کا حق دو۔ اور فضول خرچی مت کرو۔ بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔ اور شیطان اپنے رب کا بہت ہی ناشکرا ہے۔"

فضول خرچ کو شیطان کا بھائی اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ وہی کام کرتا ہے جو شیطان کرتا ہے۔ اور شیطان کا کام لوگوں کے دلوں میں بغض اور نفرت ڈالنا ہے جبکہ فضول خرچ اپنی فضول خرچی کے ذریعے معاشرے کے پسے ہوئے غریب اور مسکین طبقے میں اپنے خلاف بغض اور نفرت کے بیج بوتا ہے۔ جب ایک طرف لوگوں کو دو وقت کی روٹی نہ مل رہی ہو اور دوسری طرف مہندی اور بارات میں دس قسم کے کھانے پیش کیے جا رہے ہوں تو وہاں معاشرے میں طبقاتی تقسیم پیدا ہو گی۔ امیر اور غریب میں نفرت بڑھے گی۔ قرآن مجید نے ہمیں کھانے پینے کے معاملات میں بھی فضول خرچی سے منع کیا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَكُلُوا وَاشْرَبُوا وَلَا تُسْرِفُوا إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِينَ﴾ [الأعراف: 31]

"اور کھاؤ اور پیو لیکن اسراف نہ کرو کہ اللہ تعالی اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔"

شادی بیاہ کے موقع پر کھانا ضرورت سے زائد بنانا اور ضائع کرنا فضول خرچی میں شامل ہے۔ انسان کے پاس بچوں کی شادی بیاہ کے لیے جس قدر پیسے موجود ہوں، اسی میں گزارہ کرے اور قرض وغیرہ لے کر اپنی حیثیت سے زائد ہر گز خرچ نہ کرے،

چاہے دعوت ولیمہ ہی کیوں نہ ہو۔ نکاح کے بعد لڑکے کی طرف سے دعوت طعام مسنون عمل ہے اور اس کی ترغیب دلائی گئی ہے لیکن اس میں بھی آپ ﷺ نے سادگی کی تلقین کی ہے۔ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«أَوْلِمْ، وَلَوْ بِشَاةٍ»[1]

"ولیمہ کرو، چاہے ایک بکری ہی کیوں نہ ہو۔"

شادی بیاہ کے موقع پر عموماً مردوں اور عورتوں کے لیے بیٹھنے اور کھانے کا انتظام ایک ہی جگہ، ایک ہی ہال اور سائبان کے نیچے کیا جاتا ہے۔اس قسم کی مخلوط محافل میں عموماً عورتیں فل میک اپ، جیولری، تنگ، باریک اور مختصر لباس کے ذریعے اپنی زیب وزینت اور جسمانی اعضاء کا اظہار کرتی ہیں کہ جس سے نامحرم مردوں کے دلوں میں ہیجانی کیفیات کے راستے بے حیائی کا راستہ ہموار ہوتا ہے کہ جس سے قرآن مجید نے منع فرمایا ہے۔ عورتوں میں دو بچگانہ خواہشات بہت عام ہیں۔ایک یہ کہ میں اپنی ملنے جلنے والی خواتین میں حسین ترین عورت نظر آؤں کہ جس کے لیے وہ نت نئے فیشن، ڈیزائنگ اور ڈریسنگ کرے گی حالانکہ یہ بات طے ہے کہ ان میں سب سے زیادہ حسین ایک ہی ہو سکتی ہے نہ کہ ساری۔اور دوسری یہ کہ میں مردوں کی توجہ کا مرکز بنوں حالانکہ یہ طے ہے کہ مرد کو اس کے حسن سے کچھ لینا دینا نہیں ہے، اسے تو اپنی ہوس پوری کرنی ہے، چاہے آنکھوں کی ہو یا پیٹ کی۔

اور مہندی تو اسلام میں مہندی لگانا جائز ہے۔ لہٰذا اگر دلہن کی گھر کی خواتین اور سہیلیاں اس کی زیب وزینت کے لیے اس کے گھر اجتماع کر لیں اور مہندی لگا لیں، کوئی خوشی کر لیں، گپ شپ لگا لیں تو اس قسم کا اجتماع بالکل جائز ہے لیکن عرف عام میں "رسم حنا" سے مراد مخلوط معاشرت، گانا بجانا، ڈانس پارٹی، اجتماعی کھانا، دولہا کے گھر سے دولہن کے گھر جلوس کی صورت میں مہندی لگانے کے لیے جانا وغیرہ ہے تو اس میں بے حیائی اور فضول خرچی شامل ہے اور ان دونوں سے ہمیں منع کیا گیا ہے۔ ہمارے ہاں

---

[1] الموطأ، كِتَابُ النِّكَاحِ، مَا جَاءَ فِي الْوَلِيمَةِ، 783/3

لوگوں میں یہ غلط فہمی بھی عام ہوگئی ہے کہ گانے بجانے کے بغیر تفریح کا کوئی تصور ممکن نہیں ہے حالانکہ بہترین تفریح ہوتی ہی گانے بجانے کے بغیر ہے۔اس بارے ہم ساتویں باب میں "فلم بنانا" کے عنوان کے تحت مزید گفتگو کریں گے۔اگر آجکل کے معاشرے کی صورت حال یہ ہے کہ جہاں تھوڑی دیر وائے فائے نہ ملے، وہاں انسان بور ہو جاتا ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وائے فائے سے پہلے کے زمانے میں سارے لوگ بور رہتے تھے۔

اسی طرح شادی والے گھر میں ایک اسٹیج تیار کیا جاتا ہے کہ جہاں نوجوان لڑکیاں اور لڑکے تیز میوزک پر ڈانس کرتے ہیں۔ دین اسلام نے ہر طرح کے آلات موسیقی کو ناجائز قرار دیا ہے کہ انسان میں شہوانی اور سفلی جذبات کو بھڑکانے کا سبب بنتے ہیں۔اور میوزک، شراب نوشی اور زنا کی طرف انسان کو صرف مائل نہیں کرتا بلکہ دھکیل دیتا ہے۔ تیز میوزک میں انسان کو اپنے وجود پر قابو نہیں رہتا اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی تھرکنا شروع کر دیتا ہے جیسا کہ شراب نوشی کے نتیجے میں انسان اپنے حواس قابو میں نہیں رکھ پاتا۔یہی تھرکنا، رقص بنتا ہے اور رقص میں وجد کی حالت میں وہ شراب نوشی کرتا ہے۔اور شراب نوشی سے حواس گم کرتا ہے اور زنا اور بدکاری میں پڑ جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ جن محفلوں میں میوزک ہو، وہاں عموماً شراب اور زنا عام ہوتا ہے جیسا کہ نئے سال کی رات میں ہونے والی تقریبات وغیرہ کے احوال تو ہمارے سامنے کے ہی ہیں۔ آلات موسیقی، شراب نوشی اور زنا کا آپس میں بہت گہرا تعلق ہے۔ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«لَيَكُونَنَّ مِنْ أُمَّتِي أَقْوَامٌ، يَسْتَحِلُّونَ الحِرَ وَالحَرِيرَ، وَالخَمْرَ وَالمَعَازِفَ»[1]

"میری امت میں کچھ لوگ زنا، ریشم، شراب اور آلات موسیقی کو جائز قرار دے دیں گے۔"

---

[1] صحيح بخاري، كِتَابُ الأَشْرِبَةِ، بَابُ مَا جَاءَ فِيمَنْ يَسْتَحِلُّ الخَمْرَ وَيُسَمِّيهِ بِغَيْرِ اسْمِهِ، 106/7

البتہ یہ جائز ہے کہ گھر کی بچیاں گھر میں دف وغیرہ بجا کر دولہا اور دولہن کی تعریف میں کوئی گیت گا لیں کہ یہ سب کچھ نکاح کے اعلان میں شامل ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: دَخَلَ عَلَيَّ أَبُو بَكْرٍ، وَعِنْدِي جَارِيَتَانِ مِنْ جَوَارِي الْأَنْصَارِ تُغَنِّيَانِ بِمَا تَقَاوَلَتْ بِهِ الْأَنْصَارُ فِي يَوْمِ بُعَاثٍ، قَالَتْ: وَلَيْسَتَا بِمُغَنِّيَتَيْنِ، فَقَالَ أَبُو بَكْرٍ: أَبِمَزْمُورِ الشَّيْطَانِ فِي بَيْتِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ وَذَلِكَ فِي يَوْمِ عِيدِ الْفِطْرِ، فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «يَا أَبَا بَكْرٍ، إِنَّ لِكُلِّ قَوْمٍ عِيدًا، وَهَذَا عِيدُنَا»[1]

"حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ عید والے دن ان کے گھر ان کے والد حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ آئے اور ان کے پاس اس وقت انصار کی دو بچیاں موجود تھیں جو کہ وہ گیت گا رہی تھیں جو انصار نے جنگ بعاث کے موقع پر کہے تھے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ وہ بچیاں کوئی پیشہ ور گانے بجانے والی نہ تھی۔ تو ابو بکر رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھ کر کہا کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں شیطانی آلات۔ اور یہ عید الفطر کا دن تھا تو اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ اے ابو بکر! ہر قوم کا ایک خوشی کا دن ہوتا ہے اور یہ ہمارا خوشی کا دن ہے [یعنی انہیں اس سے منع نہ کرو]۔"

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

«فَصْلُ مَا بَيْنَ الحَرَامِ وَالحَلَالِ، الدُّفُّ وَالصَّوْتُ»[2]

"حلال اور حرام [نکاح اور زنا] کے مابین فرق دف اور آواز کا ہے۔"

یعنی نکاح کے موقع پر شادی والے گھر میں دف اور گیت وغیرہ ہوتا ہے کہ جس سے اس کا اعلان ہوتا ہے جبکہ زنا اور بدکاری کو چھپایا جاتا ہے لہذا اس پر اس طرح خوشی نہیں منائی جاتی۔ پس نکاح کے گھر کا منظر یہ بھی نہیں ہونا چاہیے جیسے ماتم کا گھر ہو۔

اور شادی بیاہ کے موقع پر بھی دولہا یا دولہن کو کوئی تحفہ دینا جائز ہے لیکن جب یہ دینا

---

[1] سنن ابن ماجة، كِتَابُ النِّكَاحِ، بَابُ الْغِنَاءِ وَالدُّفِّ، 612/1

[2] سنن الترمذي، أَبْوَابُ النِّكَاحِ بَابُ مَا جَاءَ فِي إِعْلَانِ النِّكَاحِ، 390/3

دلانا رسم بن جاتا ہے تو پھر یہ ایک وبال ہے۔ عموماً شادی بیاہ کے موقع پر دیے جانے والے تحائف کا ریکارڈر کھا جاتا ہے تاکہ اپنے موقع پر واپس لیے جاسکیں۔ یہ تحفہ دینے کی بدترین صورت ہے کہ جس میں اس سے بہتر تحفہ کی واپسی کی امید رکھی جائے اور اگر جوابی تحفہ نہ ملے تو خاندانی ناراضگی تک نوبت جا پہنچے۔ حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«إِنَّ مَثَلَ الَّذِي يَعُودُ فِي عَطِيَّتِهِ، كَمَثَلِ الْكَلْبِ أَكَلَ، حَتَّى إِذَا شَبِعَ قَاءَ، ثُمَّ عَادَ فِي قَيْئِهِ، فَأَكَلَهُ»[1]

"اس شخص کی مثال جو تحفہ دے کر واپس لینا چاہتا ہے، اس کتے کی سی ہے کہ جس نے کھانا کھایا۔ جب اس کا پیٹ بھر گیا تو اس نے قے کر دی۔ پھر اس نے اپنی قے ہی واپس دوبارہ کھالی۔"

لڑکی کے گھر والوں کی طرف سے عموماً بارات کے لیے کھانے کا انتظام بھی ہوتا ہے جو لڑکی کے والدین اور سرپرستوں کے لیے ایک اضافی معاشی بوجھ ہے کہ جس کے سبب سے غریب والدین کی اکثریت قرض کے بوجھ تلے دب جاتی ہے۔ اسی طرح کی ایک قبیح رسم جہیز کی رسم ہے کہ اکثر بچیاں جہیز نہ ہونے کی وجہ سے ساری عمر بن بیاہے اپنے والدین کے ہاں گزار دیتی ہیں اور ان کے لیے کوئی مناسب رشتہ نہیں ملتا۔ دوسری طرف کم جہیز لانے والی بہوؤں کو طعنے دیے جاتے ہیں اور سسرال میں ان کی زندگی اجیرن بنادی جاتی ہے۔ بعض اوقات تو لڑکے والوں کی طرف سے جہیز کی ایک باقاعدہ فہرست لڑکی والوں کو بھجوائی جاتی ہے اور اسے لڑکے والے مال غنیمت کی طرح اپنے لیے حلال سمجھتے ہیں۔ یہ قباحت بھی عام ہے کہ بیٹی کو جہیز کے نام پر کچھ دے دلا کر وراثت سب بیٹوں میں تقسیم کر دی جاتی ہے اور بیٹی کو اس کے وراثت کے جائز حق سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ قرآن مجید نے بیٹے اور بیٹی دونوں کے لیے وراثت میں حصہ مقرر کیا ہے اور بیٹی کو وراثت میں اس کا حصہ دینا فرض ہے۔

[1] سنن ابن ماجة، كِتَابُ الْهِبَاتِ، بَابُ الرُّجُوعِ فِي الْهِبَةِ، 797/2

اور اگر والدین شادی کے موقع پر اپنی بچی کو کچھ تحائف خاموشی سے دے دیں کہ ان کی نمود و نمائش نہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ تحائف کی نمود و نمائش سے ایک تو شادی میں شریک غریب رشتہ داروں میں حسرت اور نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں کہ وہ اپنی بیٹیوں کو وہ نہیں دے سکتے جو یہاں دیا جا رہا ہے اور دوسرا دلہن کے والدین میں فخر اور غرور پیدا ہوتا ہے کہ وہ عموماً رشتہ داروں کو دکھلانے کے لیے ہی یہ کام کر رہے ہوتے کہ دیکھو ہم نے اپنی بیٹی کو کیا کچھ نہیں دیا؟ اور دولہا کے گھر والوں میں اس سے لالچ پیدا ہوتی ہے کہ کسی طرح کوئی ایسی لڑکی اپنے گھر لائی جائے کہ جو اپنے ساتھ زیادہ سے زیادہ مال غنیمت جہیز کی صورت میں لے کر آئے۔ ایسی رسومات کو قرآن مجید نے "اصر و اغلال" کا نام دیا ہے یعنی ایسا بوجھ اور طوق جو قیدیوں کی پیٹھوں اور گردنوں میں ڈالا جاتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ دور جاہلیت میں موجود ایسے رسوم و رواج کے بوجھ سے معاشرے کو آزاد کروانے آئے تھے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ﴾ [الأعراف: 157]

"اور آپ ﷺ ان سے ان کا بوجھ اتارتے ہیں اور ان کے گلے کے پھندوں سے انہیں آزاد کراتے ہیں۔"

خلاصہ کلام یہی ہے کہ اسلام رسوم و رواج میں سادگی کو پسند کرتا ہے اور اگر رسوم و رواج میں اسراف، فضول خرچی، ظلم اور بگاڑ ہو تو یہ ناجائز ہیں۔ اسی طرح اسلام رسوم و رواج کی پابندی پسند نہیں کرتا اور اگر کسی علاقے میں رسوم و رواج کی پابندی یوں کی جانے لگے کہ جیسے فرائض اور قانون کی پابندی کی جاتی ہے تو ایسی صورت میں یہ خاندانی رسوم و رواج، خاندان کے غریب افراد کے لیے بوجھ اور گلے کا پھندا بن جاتے ہیں لہذا اسلام ان کی لازم حیثیت ختم کرنے کے لیے ان کے خلاف مجاہدے کا حکم دیتا ہے۔

سالگرہ مبارک

سات دسمبر راقم کا یوم پیدائش تھا۔ بہت سے دوستوں نے ہیپی برتھ ڈے کا پیغام

بھیجا۔ فوری طور تو پیغام بھیجنے والوں کو یہ کہا کہ بھائی اس موقع پر کوئی دعا بھی دے دینی چاہیے لیکن اس موضوع پر مذہبی حوالے سے کچھ گفتگو کرنے کا دل چاہ رہا ہے۔ ہمارے ہاں عام طور اہل علم کی رائے ہے کہ یوم پیدائش (birth day) منانا ایک بدعت ہے۔ اگرچہ میں نہیں مناتا لیکن کچھ لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ بدعت تو دین میں اضافے کا نام ہے اور یوم پیدائش دینی شعائر کے طور تو نہیں منایا جاتا۔

ایک بات یہ بھی کہی جاتی ہے کہ یہ انگریز اقوام سے تشبہ ہے کیونکہ یہ رسم ان سے آئی ہے۔ لیکن کچھ لوگ اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ اگر کوئی رسم مسلمان معاشروں میں اس قدر عام ہو جائے کہ ان کا عرف بن جائے تو پھر تشبہ کا اعتراض باقی نہیں رہنا چاہیے کیونکہ اب تو یہ خود مسلمان معاشروں کا رواج ہے۔ ہاں اگر کسی رسم یا رواج کے خلاف کتاب وسنت میں کوئی صریح نص موجود ہو تو پھر اس کا مسلمان معاشرے میں رائج ہو جانا بھی دلیل نہیں بنے گا بلکہ یہ عرف فاسد کہلائے گا۔

انسان کے جبلی تقاضوں (inherent requirements) میں یہ بات شامل ہے کہ وہ دوسروں کو خوش کرنا چاہتا ہے یا ان کی خوشیوں میں شریک ہونا چاہتا ہے، چاہے اس کا مقصد اس سرگرمی (activity) سے دراصل اپنی خوشی ہی کا حصول کیوں نہ ہو۔ اور یہ مقاصد کے اعتبار سے اچھی چیز ہے۔ اس لیے ہماری رائے میں اگر ہم مغرب کی نقالی کو درمیان سے نکال دیں اور اس موقع کو اپنے دین سے جوڑ دیں تو اس طرح ایک رسم کا ہم امالہ (divert) کر سکتے ہیں یعنی اسے ایک صحیح رخ دے سکتے ہیں۔ اور یہ اس سے آسان ہے کہ ہم اس رسم کا ازالہ (eliminate) کریں۔

اس ضمن میں پہلی تجویز تو یہ ہو سکتی ہے کہ کسی کو اس کے یوم پیدائش کی مادری زبان میں مبارک باد دی جائے مثلاً ہیپی برتھ ڈے کی بجائے جنم دن مبارک ہو، یوم پیدائش مبارک ہو یا یوم ولادت مبارک ہو، کے الفاظ کہے جائیں۔ صرف زبان کے بدل دینے سے اس رسم پر مغربی اور انگریزی کلچر کی لگی چھاپ بہت حد تک ختم ہو جائے گی۔ مزید اس کو اسلامی تہذیب سے جوڑنے کے لیے یہ کیا جائے کہ اس موقع پر کوئی دعا دی

جائے جیسا کہ اللہ تعالی آپ کو جنم دن مبارک کرے۔ اب اس رسم میں خدا کا تصور آ گیا، دعا شامل ہو گئی، برکت بھی آ گئی اور انسان کی خواہش بھی پوری ہو گئی۔ قرآن مجید میں حضرت عیسی علیہ السلام کی یہ دعا منقول ہے:

﴿وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدتُّ وَيَوْمَ أَمُوتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا﴾ [مریم: 33]

"اور مجھ پر سلام ہو اس دن میں کہ جس دن میں پیدا ہوا۔ اور اس دن میں بھی مجھ پر سلام ہو کہ جس دن میں میری وفات ہوئی۔ اور اس دن میں بھی مجھ پر سلام ہو کہ جس دن میں اٹھایا جاؤں گا۔"

ہمارے معاشرے میں بعض لوگوں نے عید کے موقع پر گلے ملنے کو بھی بدعت قرار دے دیا ہے کہ یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہے حالانکہ اتنی سختی کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اسلام تو ایسی چیزوں کی حوصلہ افزائی کرتا ہے کہ جو مسلمانوں میں باہمی محبت اور الفت بڑھانے میں اہم کردار ادا کریں۔

بس اس تناظر میں، یہ کہا جا سکتا ہے کہ مغرب یا دوسرے معاشروں سے جو بہت سے رسمیں ہمارے ہاں آ گئی ہیں تو ان میں ازالے (elimination) کی بجائے اگر امالے (diversion) کا تصور دیا جائے کہ ان رسموں یا رواجات کو اس طرف موڑ دیا جائے کہ دینی مقاصد پورے ہو جائیں اور وہ رسمیں اسلامی کلچر اور دینی تہذیب کے چوکھٹے (framework) میں سازگار (fit) ہو جائیں تو یہ بھی ایک کرنے کا کام ہے۔ واللہ اعلم۔ میں کوئی مفتی نہیں کہ اس موضوع کو فتوی کے انداز میں دیکھا جائے۔ ایک تجویز دل میں آئی، سو بیان کر دی کہ مروجہ رسوم میں ازالے کی بجائے امالے پر محنت کی جائے۔ اگر کسی دوست کے ملاحظات ہوں تو ضرور پیش کیے جائیں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم پیدائش منانا

مجھ سے ایک صاحب نے سوال کیا کہ آپ میلاد منانے کے قائل ہیں؟ میں نے کہا: ہاں! لیکن اس طرح جس طرح آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے منائی۔ انہوں نے کہا: آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے منائی؟ میں نے کہا: روزہ رکھ کر اللہ کا شکر ادا کیا۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي قَتَادَةَ الْأَنْصَارِيِّ، رَضِيَ اللهُ عَنْهُ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سُئِلَ عَنْ صَوْمِ الِاثْنَيْنِ؟ فَقَالَ: «فِيهِ وُلِدْتُ وَفِيهِ أُنْزِلَ عَلَيَّ»[1]

"حضرت ابو قتادہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوموار کے روزے کے بارے سوال ہوا؟ آپ نے فرمایا: اس دن میں میں پیدا ہوا اور اسی دن میں مجھ پر وحی نازل کی گئی۔"

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس امت کے لیے اللہ کی طرف سے ایک بہت بڑی نعمت ہیں لہذا اگر ہم اس نعمت کا شکر ادا کرنے کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم پیدائش میں روزہ رکھ لیں تو ایسا عمل پسندیدہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اب چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ پیدائش میں تو بہت اختلاف ہے لیکن پیدائش کا دن متعین ہے۔ لہذا سوموار کے دن میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں روزہ رکھنا مستحب ہے۔

پس آپ کی پیدائش کی خوشی منانے میں اختلاف نہیں ہے جب تک کہ اس میں دو باتیں ملحوظ رہیں۔ ایک یہ کہ تاریخ کی بجائے دن کو بنیاد بنایا جائے کیونکہ وہ یقینی ہے اور دوسرا یہ کہ روزہ رکھ کر منایا جائے۔ میں نے اپنے دوست سے کہا کہ آپ سال میں میلاد منانے کی بات کرتے ہیں، ہم تو ہر ہفتے منانے کے قائل ہیں۔ لیکن ہم جھنڈیاں لگا کر اور پہاڑیاں بنا کر منانے کو پسند نہیں کرتے کہ اس میں فضول خرچی اور نمود و نمائش ہے کہ جس سے کتاب وسنت نے منع کیا ہے بلکہ عبادت کے ذریعے منانے کو پسند کرتے ہیں کہ جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش ایک بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کے نعمت ہونے سے انکار ناممکن ہے۔ اور اللہ کی نعمت پر اس کا شکر ادا کرنا بھی لازم ہے۔ اب شکر کے طریقے مختلف ہو سکتے ہیں۔ کچھ طریقے ایسے ہو سکتے ہیں جو واقعتاً شکر ادا کرنے میں شمار ہوتے ہوں اور کچھ ایسے ہو سکتے ہیں جو شکر ادا کرنے کی بجائے ناشکری کہلانے کے زیادہ مستحق ہوں۔ پس ناشکری کے ایسے طریقوں سے بچنا چاہیے اور یہ تصور درست نہیں ہے کہ

[1] صحیح مسلم، كِتَاب الصِّيَامِ، بَابُ اسْتِحْبَابِ صِيَامِ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ مِنْ كُلِّ شَهْرٍ، 820/2

ہمیں نہ تو اپنی پیدائش کی خوشی ہونی چاہیے اور نہ نبی کریم ﷺ کی۔ جس دن میں اللہ نے آپ ﷺ کو پیدا کیا ہے یعنی سوموار کے دن تو اس دن شکر کے طور روزہ رکھ لیں یا آپ ﷺ کے نام سے کوئی صدقہ خیرات کر دیں یا درود شریف پڑھنے کا اہتمام کر لیں۔ واللہ اعلم۔

جادو اور خواب

عاملین کا کہنا یہ ہے کہ اگر کسی پر جادو، ٹونا، تعویز، گنڈا، آسیب یا نظر بندی وغیرہ ہو، تو اس کی سب سے بڑی علامت انسان کے خواب ہیں۔ براعظم افریقہ وغیرہ میں کہ جہاں سینکڑوں قسم کا جادو ٹونا پایا جاتا ہے، روحانی عاملین کی ایک ایسی جماعت وجود میں آ چکی ہے کہ جنہوں نے جادو ٹونے کے بارے نہ صرف بیسیوں کتب مرتب کر دی ہیں، بلکہ روحانی ہسپتال بھی قائم کر دیے ہیں اور ایسے دسیوں فورمز بنا دیے ہیں جہاں وہ اپنے مشاہدات اور تجربات سینکڑوں موضوعات کے تحت بیان کر رہے ہوتے ہیں۔

مختصراً کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جادو جس طرح ایک علم کے طور مروج رہا ہے، اسی طرح اب جادو کا علاج بھی ایک سائنس بن چکا ہے کہ جس میں بیسیوں پہلوؤں سے تحقیق ہو رہی ہے۔ کچھ عاملین سائیکالوجی اور جھاڑ پھونک دونوں کو جمع کر کے ایک نیا مکتبہ فکر بنا رہے ہیں تو کچھ میڈیکل سائنس کے ساتھ دم درود کو استعمال کر رہے ہیں۔

عاملین کی ایک جماعت کا کہنا ہے کہ اگر آپ کو خواب میں بار بار سانپ نظر آئے تو یہ جادوگر کا خادم جن ہے جو آپکو تنگ کر رہا ہے۔ اگر وہ سانپ آپ کے پیچھے لگتا ہے تو ابھی تک وہ جن آپ کے جسم میں داخل نہیں ہوا اور اگر وہ آپ کو خواب میں کاٹ لیتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ اس جن نے آپ کو مس (touch) کیا ہے۔ اگر وہ اژدھا ہے تو یہ کوئی بہت بڑا جن ہے اور اگر عام سائز کا سانپ ہے تو عام جن ہے کہ جنہیں اصطلاح میں ''عمار'' کہا جاتا ہے۔ اگر کالے سیاہ رنگ کا سانپ ہے تو یہودی جن ہونے کا امکان زیادہ ہے، اگر زرد رنگ کا ہے تو عیسائی جن اور سفید رنگ ہے تو مسلمان جن ہونے کا امکان زیادہ ہے۔ جادو اور سانپ میں تعلق کے بارے حضرت موسی علیہ السلام

اور فرعون کے جادو گروں کے واقعے میں بھی صریح اشارے موجود ہیں۔

اگر خواب میں بلی بار بار نظر آئے تو عاشق جن ہے۔ اور عاشق جن خواب میں ایسی صورت میں آتا ہے کہ جس سے انسان کو مانوسیت ہو۔ اگر خواب میں اونٹ کو دیکھے کہ وہ پیچھے لگا ہے تو یہ سرکش شیطان ہے۔ اور اگر چیتا دیکھے تو یہ بھی متمرد شیطان ہے اور صحرائی ہے۔ اگر بار بار مچھلی دیکھے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ حملہ آور شیطان پانی کا رہائشی ہے۔

اگر خواب میں شیر دیکھے تو یہ جنات میں کوئی مقام اور رتبہ رکھنے والے جن کی علامت ہے اور اگر گدھا دیکھے تو یہ بہت ہی بڑا جن ہے کہ جسے عام جادو گروں کے لیے قابو کرنا مشکل ہے اور عاملین کے لیے اس کا علاج آسان نہیں ہے۔ اگر خواب میں کتا دیکھے تو یہ بھی جادو گر کا خادم جن ہے، اگر کالا ہو تو یہ یہودی جن ہے اور اگر زرد رنگ کا ہے تو اس کا ایک معنی یہ ہو سکتا ہے کہ وہ عیسائی جن ہے اور دوسرا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ وہ واش روم، بیت الخلاء وغیرہ جیسے مکان میں رہتا ہے۔ اور اگر خواب میں چھپکلی دیکھے تو یہ حاسد کی نشانی ہے۔ اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ یہ حاسد کی نظر لگنے کی علامت ہے۔

ان چیزوں کا خواب میں دیکھنے کا ضروری مطلب یہ نہیں ہے کہ جادو ٹونا یا تعویذ گنڈا ہی ہوا ہے بلکہ اگر یہ چیزیں خواب میں بار بار نظر آئیں اور خواب میں یا خواب کے بعد بے چینی اور اضطراب کا باعث بنیں تو آپ کو روحانی علاج کی ضرورت ہے۔ اور بہتر یہی ہے کہ آپ اپنا روحانی علاج خود سے کریں۔ آپ کے لیے آپ سے بہتر روحانی معالج کوئی نہیں ہو سکتا۔

بعض اوقات کچھ بھی نہیں ہوتا، صرف انسانی وہم ہوتا ہے اور انسان اسے جادو ٹونا یا تعویذ گنڈا سمجھ لیتا ہے لیکن وہم اور حقیقت کو جاننے کے کئی ایک ذرائع ہیں، جن میں سے ایک یہ ہے کہ اچانک انسان کے خواب غیر معمولی ہو جائیں۔ اسی طرح جادو ٹونا ہے یا نہیں، تو یہ معلوم کرنے کا دوسرا راستہ شرعی جھاڑ پھونک اور مخصوص اوراد و ظائف ہیں کہ جن کا پڑھنا فوراً تیر کی طرح جا کر لگتا ہے اور چیزیں ظاہر ہونا شروع ہو جاتی ہیں یا

پڑھنے والے کو اپنی موجودگی کا احساس دلانا شروع کر دیتی ہیں، چاہے وہ پیشہ ور ہو یا نہ ہو۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ، عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: «إِنَّ الرُّؤْيَا ثَلَاثٌ: مِنْهَا أَهَاوِيلُ مِنَ الشَّيْطَانِ لِيَحْزُنَ بِهَا ابْنَ آدَمَ، وَمِنْهَا مَا يَهُمُّ بِهِ الرَّجُلُ فِي يَقَظَتِهِ، فَيَرَاهُ فِي مَنَامِهِ، وَمِنْهَا جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَأَرْبَعِينَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ»[1]

”حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خواب تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ ہیں کہ جو شیطان کی طرف سے ڈراوا ہیں تا کہ وہ ان کے ذریعے انسان کو پریشان رکھے۔ دوسرا وہ خواب ہیں کہ جو کچھ ہم بیداری میں دیکھتے ہیں تو وہ خواب میں نظر آتا ہے۔ اور تیسرا وہ خواب ہیں جو نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہیں [یعنی یہ اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں اور سچے خواب ہوتے ہیں]۔“

جھاڑ پھونک: اثرات اور موانع

آسیب، سحر اور نظر بد تین چیزیں ہیں۔ آسیب تو یہ ہے کہ کسی نے کوئی جادو ٹونا نہیں کروایا لیکن کسی سبب سے کوئی شریر جن یا جننی کسی انسان سے چمٹ گئی یا اسے اذیت پہنچانے لگی۔ اس کا عموماً سبب یہ ہوتا ہے کہ ”عمار“[2] کو کسی انسان سے لاشعوری طور کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ غصہ اور ردعمل میں اس انسان کو تنگ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یا کوئی شخص جنات قابو کرنے کے لیے چلہ کاٹتا ہے تو وہ اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ یا کوئی جن کسی انسان پر کسی سبب سے عاشق ہونے کی وجہ سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا اور اس کی شادی میں رکاوٹ بن رہا ہوتا ہے اور ایسا بہت ہی نادر ہے۔ یا پھر کسی قسم کی خوشبو لگانے سے کوئی جن کسی انسان کے پیچھے لگ جاتا ہے۔ یا بعض اوقات نیک لوگوں کی نیکی میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے بھی جنات شرارتیں کرتے ہیں تا کہ انہیں پریشان کر کے ان کی

---

[1] سنن ابن ماجة، كِتَابُ تَعْبِيرِ الرُّؤْيَا، بَابُ الرُّؤْيَا ثَلَاثٌ، 1285/2

[2] وہ جنات جو گھروں میں رہتے ہیں۔

نیکی میں رکاوٹ بن جائیں۔ اور بعض لوگوں کو یہ خوابوں میں ڈراتے یا پریشان کرتے ہیں۔ اور بعض اوقات صرف وہم ہوتا ہے کہ جنات ہیں جبکہ وہ حقیقت میں نہیں ہوتے۔ اور بعض اوقات کوئی نفسی مسئلہ ہوتا ہے مثلاً خاص طور نوجوان لڑکوں یا لڑکیوں کا بروقت شادی نہ ہونے کا مسئلہ ہوتا ہے لیکن اسے جنات کا مسئلہ بنالیا جاتا ہے۔

اس بارے ہمارے معاشرے میں دونوں انتہائیں موجود ہیں۔ ایک طرف وہ لوگ ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ جن وغیرہ کچھ نہیں ہے، بس ماہر نفسیات کو دکھائیں اور دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو بچوں کے نفسی مسائل کو بھی جنات کا مسئلہ بنا دیتے ہیں۔ اگر روحانی معالج اچھا اور نیک ہو تو جھاڑ پھونک سے اسے فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ مسئلہ جنات کا نہیں ہے بلکہ نفسی ہے یا شادی وغیرہ کا ہے۔ اور ماہرین نفسیات تو وہ اکثر وبیشتر جنات وغیرہ کی حقیقت کو مانتے ہی نہیں ہیں لہذا انہیں کبھی یہ اندازہ نہیں ہو پاتا کہ مسئلہ نفسی ہے یا روحانی۔ لیکن یہ بات درست ہے کہ نفسی طریقہ علاج سے کسی قدر مریض کو افاقہ ہوتا ہے لیکن مکمل صحت نہیں ملتی۔ روحانی مریض کو نفسی طریقہ علاج سے جو کسی قدر شفاء ملتی ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ جنات کا حملہ انسان کے دل ودماغ اور جسم کے ان حصوں پر ہوتا ہے جو کمزور ہوں۔ پس اگر ان اعضاء میں قوت مدافعت بڑھ جائے تو مریض کو نقصان کم پہنچتا ہے۔ محسوس یہی ہوتا ہے کہ شیطان، انسان کے جسم میں بیماری پیدا نہیں کرتا بلکہ انسانی خون میں موجود بیماری کے جراثیم کو چھیڑتا ہے اور دل ودماغ میں وسوسہ پیدا کرتا ہے اور یہ وسوسہ بڑھتے بڑھتے ذہنی بیماری کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ پہلی صورت سے جسمانی اور دوسری سے ذہنی بیماری پیدا ہوتی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«إِنَّ الشَّيْطَانَ يَجْرِي مِنَ الإِنْسَانِ مَجْرَى الدَّمِ»[1]

"بے شک شیطان انسان کی رگوں میں خون کی جگہ میں دوڑتا ہے۔"

روحانی معالج جسمانی اور نفسی بیماری کے بیرونی سبب کو ختم کرنے کی کوشش کرتا

[1] صحيح البخاري، كتاب الاعتكاف، بَابُ زِيَارَةِ المَرْأَةِ زَوْجَهَا فِي اعْتِكَافِهِ، 50/3

ہے جبکہ طبیب (physician) اور ماہر نفسیات (psychologist) مریض کے جسم اور دماغ میں قوت مدافعت پیدا کر کے اور بیماری کے جراثیم کا مقابلہ کروا کے علاج کرتے ہیں۔

سحر یہ ہے کہ کسی رشتہ دار، دوست، پڑوسی، دشمن نے حسد، بغض، نفرت کے سبب تعویذ گنڈا یا جادو ٹونا کروا دیا۔ جادو گر کفریہ اور شرکیہ عمل کے ذریعہ شیاطین جنات کو خوش کر کے اس کے بدلے میں اُن کی مدد حاصل کرتا ہے۔ اور اُن شیاطین کو اُس کی طرف بھیجتا ہے کہ جس پر جادو کیا جاتا ہے۔ اس کام کے لیے جادو گر جادو کروانے والے سے ایک رقم وصول کرتا ہے۔

اور جادو کرنا کفر ہے کہ جادو گر کو اپنے جادو میں شیاطین کو خوش کرنے کے لیے ان کی عبادت بھی کرنی پڑتی ہے۔ جادو کرنے والا اپنے کفر کے سبب دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ اور اللہ کے رسول ﷺ نے جادو گر کی سزا یہ بیان کی ہے کہ اس کی گردن اڑا دی جائے۔ ایک موقوف روایت کے الفاظ ہیں:

«حَدُّ السَّاحِرِ ضَرْبَةٌ بِالسَّيْفِ»[1]

"جادو گر کی سزا اس کو قتل کرنا ہے۔"

اور نظر سے مراد نظر کا لگ جانا ہے اور نظر کا لگ جانا برحق ہے۔ جس طرح انسان کی گفتگو دوسرے کو متاثر کرتی ہے کہ آپ کسی کو گالم گلوچ کریں تو اس کے چہرے کا رنگ سرخ ہو جاتا ہے، اسی طرح انسان کے جذبات بھی دوسروں کو متاثر کرتے ہیں۔ اگر آپ کسی سے حسد کا جذبہ رکھتے ہیں تو یہ جذبہ (feeling) آپ کی آنکھوں کے راستے اس شخص کو متاثر کر سکتا ہے کہ جس سے آپ کو حسد ہو۔ اور اسی کو نظر لگ جانا کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں سورۃ الفلق میں حاسدین کے شر سے پناہ مانگی گئی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ أَعُوذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ ﴿1﴾ مِن شَرِّ مَا خَلَقَ ﴿2﴾ وَمِن شَرِّ

[1] سنن الترمذي، أبواب الحدود، باب ما جاء في حد الساحر، 112/3

غَاسِقٍ إِذَا وَقَبَ ﴿3﴾ وَمِن شَرِّ النَّفَّاثَاتِ فِي الْعُقَدِ ﴿4﴾ وَمِن شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ﴾ [الفلق: 5]

"نبی ﷺ کہہ دیں، میں پناہ مانگتا ہوں صبح کے رب کی۔ ہر اُس چیز کے شر سے جو اُس نے پیدا کی۔ اور رات کی تاریکی کے شر سے جب کہ وہ چھا جائے۔ اور گرہوں میں پھونکنے والوں (یا والیوں) کے شر سے۔ اور حاسد کے شر سے جب کہ وہ حسد کرے۔"

ان تینوں قسموں آسیب، جادو اور نظر کا روحانی علاج الگ ہے جو کہ اس وقت ہمارا موضوع نہیں ہے۔ ہم اس وقت یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ بعض روحانی معالج بعض اوقات شرعی دم کرتے ہیں لیکن ان کی جھاڑ پھونک کے نتائج برآمد نہیں ہوتے تو اس کی کیا وجوہات ہیں؟ یا شرعی دم کو اثر انگیز بنانے والی کیا چیزیں ہوتی ہیں؟ ذیل میں ہم چھ چیزیں نقل کر رہے ہیں۔

پہلی چیز روحانی معالج کا متقی اور عالم ہونا ہے۔ جھاڑ پھونک کرنے والا جس قدر زیادہ علم اور تقوی کا حامل ہو گا، اسی قدر اس کے دم میں اثر ہو گا۔ اور انسان کی زندگی میں جس قدر علم اور تقوی کم ہو گا، اسی قدر اس کے دم کا اثر بھی کم ہو گا۔ مثال کے طور بہترین بارش بہترین فصل پیدا کرتی ہے۔[1]

دوسری چیز مریض کا اثر قبول کرنے کی صلاحیت رکھنا ہے۔ اگر کسی عامل کا دم مریض کو فائدہ نہیں دے رہا تو سارا الزام عامل کو نہیں دیا جا سکتا کیونکہ بعض اوقات مریض میں دم کے اثرات کو قبول اور جذب کرنے کی صلاحیت نہیں ہوتی یا کوئی رکاوٹ حائل ہوتی ہے۔ فصل کے لیے صرف بارش کا ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ زمین بھی اس قابل ہونی چاہیے کہ پیداوار دے سکے۔ اگر زمین بنجر یا سخت ہے تو بارش اسے فائدہ نہیں

---

[1] ہمارے ایک دوست قاری شفیق الرحمن صاحب جادو ٹونا اور تعویذ گنڈا کے علاج کے لیے مستند عامل ہیں۔ ان کا ادارہ "الحکمۃ" کے نام سے گرین ایوی نیو، اولڈ مسلم ٹاؤن، لاہور میں ہے۔ ان کا موبائل نمبر یہ ہے: 0301 5989211۔ اس کے علاوہ کتاب وسنت ویب سائیٹ پر اس کے علاج کے بارے مستند کتب سافٹ کاپی میں موجود ہیں کہ جن کے مطالعہ سے ایک انسان خود سے بھی اس کا علاج کر سکتا ہے۔ http://kitabosunnat.com/

پہنچا جا سکتی۔ ایک روحانی معالج نے بتلایا کہ انہوں نے ایک خاتون کو ہفتوں دم کیا لیکن دوران دم تو کچھ تکلیف کم ہو جاتی تھی لیکن جب وہ گھر جاتی تھیں تو تکلیف دوبارہ لوٹ آتی تھی۔ بعد ازاں معاملہ یہ کھلا کہ وہ سود کھانے میں ملوث ہیں کہ جس کی وجہ سے دم کے اثرات ان تک نہیں پہنچ رہے تھے۔ بلاشبہ حرام کھانا انسانی جسم تک کلام الٰہی کے انوارات اور برکات کے پہنچنے میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ اگر مریض متقی اور شریعت پر عمل کرنے والا ہے تو اس پر دم کا اثر زیادہ اور جلدی ہوتا ہے اور مریض جس قدر معصیت میں مبتلا ہو، اس میں دم کے اثرات کو قبول کرنے کی صلاحیت اسی قدر سست ہوتی ہے۔

معالج اور مریض کے علاوہ تیسری چیز دم کے لیے آیات اور اوراد کا انتخاب ہے اور اس کے لیے معالجین کے علم اور تجربے سے فائدہ لینا چاہیے۔ مثلاً اگر تو مریض کو اذیت دینے والا جن یہودی ہو تو اس پر وہ آیات زیادہ اثر کرتی ہیں جو یہود پر لعنت کے بارے میں ہیں۔ اگر ہندو جن ہے تو اس پر مشرکین پر سختی کرنے والی اور توحید کی آیات بہت اثر کرتی ہیں۔ اگر تو کوئی جن مرتد ہے تو پھر ارتداد والی آیات فائدہ دیتی ہیں۔ اسی طرح اگر جادوگر یا جنات کے دل میں رعب ڈالنا ہو تو آیات رعب کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اگر مسلط جن کی حاضری لگوانی ہو تو آیات حضور کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اگر جن کو ہلاک کرنا مقصود ہو تو آیات احراق کی تلاوت کی جاتی ہے۔ اگر جن کو مسلمان کرنا ہو تو اسلام پیش کرنے والی آیات تلاوت کی جاتی ہیں۔ اگر مریض کو خوف اور ڈر محسوس ہوتا ہو تو ایسی آیات کی تلاوت کی جاتی ہیں جن میں اہل ایمان کے لیے خوف یا غم کے نہ ہونے کا ذکر ہے۔

چوتھی چیز مریض کا جن ہے۔ جس طرح انسان اپنی قوتِ برداشت میں مختلف ہوتے ہیں یعنی کوئی پہلوان ہے اور کوئی کمزور تو اسی طرح کا معاملہ جنات کا بھی ہے۔ بعض مریضوں پر جو جنات مسلط کیے جاتے ہیں، ان کی قوت برداشت (stamina) بہت زیادہ ہوتی ہے۔ معالج ان پر ایک آدھ گھنٹہ دم کر کے تھک جاتے ہیں اور جن یہ تاثر

دیتا ہے کہ اسے کچھ نہیں ہو رہا حالانکہ اسے اذیت ہو رہی ہوتی ہے لیکن وہ معالج کو دھوکا دیتا ہے۔ بہت سے معالجین نے یہ بیان کیا ہے کہ جب انہوں نے دم کا دورانیہ بڑھایا یعنی کئی گھنٹے مسلسل دم کیا تو جن کی قوت برداشت جواب دے گئی اور اس نے اقرار کیا کہ اثر تو مجھ پر شروع سے ہی ہو رہا تھا لیکن وہ میرے لیے قابل برداشت تھا۔ اس لیے جن کی قوت برداشت بھی بعض اوقات بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اگر مریض کا جن معالج کو یہ چیلنج کرے کہ مجھے کچھ نہیں ہو رہا یا کچھ نہیں ہو گا تو وہ جھوٹا ہے۔ اور اگر معالج ہمت کرے کہ اسے کئی گھنٹے مسلسل دم کرے تو جن کا تکبر اور غرور خاک میں مل جائے گا، ان شاء اللہ۔ جنات اس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ایک مریض کے لیے معالجین کے پاس اتنا وقت نہیں ہے لہذا تھوڑی دیر برداشت کر لو اور معالج خود ہی مایوس ہو کر چھوڑ دے گا۔ اس لیے وہ برداشت کرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

پانچویں بات یہ ہے کہ اللہ تعالی نے ہر معالج کے ہاتھ میں ہر بیماری کی شفاء نہیں رکھی جیسا کہ ہر طبیب کے ہاتھ میں ہر بیماری کا علاج نہیں ہے۔ اور معالج اپنے علم اور تجربے میں بھی مختلف ہوتے ہیں۔ لہذا ایک خاص وقت میں اگر کسی معالج سے فائدہ نہ ہو رہا ہو تو اپنا معالج تبدیل کر کے دیکھیں۔ اس سے بھی بعض لوگوں کو فائدہ ہو جاتا ہے۔

چھٹی بات یہ ہے کہ بعض اوقات اللہ تعالی انسان پر کوئی آزمائش کچھ خاص وقت تک لیے باقی رکھنا چاہتے ہیں جیسا کہ انسان جسمانی بیماری کا علاج کرواتا ہی رہتا ہے لیکن شفاء نہیں ہوتی کیونکہ اللہ تعالی کی طرف امر اور قضاء نہیں ہے۔ اس لیے اگر جھاڑ پھونک کی تاثیر کے مذکورہ بالا تمام اسباب موجود ہوں اور پھر بھی دم اثر نہ کر رہا ہو تو اسے اللہ کا فیصلہ سمجھے، اللہ عزوجل سے اس آزمائش کے ٹل جانے کی دعا کرے اور صبر سے کام لے لیکن دم کو ترک نہ کرے۔ اس صورت میں صبر اور صبر کے ساتھ دعا ہی ایک ایسی صورت ہے جو آپ کو اس آزمائش سے نجات دلا سکتی ہے۔

تعلیم کا المیہ

ہمارے قومی مسائل کی فہرست میں نظام تعلیم کا مسئلہ ایک اہم تر موضوع ہے۔

ایک دوست سے اس بارے گفتگو ہوئی تو انہوں نے کہا کہ ایک المیہ تو یہ ہے کہ ہم اپنی مادری زبان میں سائنسی علوم نہیں پڑھاتے، ہمیں انگریزی کا "ہوکا" ہے۔ دوران بحث یہ بات سامنے آئی کہ بعض علوم تو مادری زبان میں منتقل ہی نہیں کیے جا سکتے۔ اب ریاضی تو انگریزی میں ہے ہی نہیں بلکہ اس کی زبان تو لاطینی ہے یا یونانی ہے وغیرہ۔ اب آپ ریاضیاتی مساواتوں (mathematical equations) کو کیسے اردو میں ترجمہ کریں گے۔ علاوہ ازیں پاکستانی یونیورسٹیوں میں سائنس کے یہ مضامین پڑھاتے ہوئے کتنی انگریزی بولی جاتی ہے، بلکہ پی ایچ ڈی پروفیسر پنجابی میں بھی پڑھا رہے ہوتے ہیں۔ تو عملاً تو ہم اردو میں ہی سائنس کے مضامین پڑھتے ہیں۔

باقی ہر مضمون کی کچھ اصطلاحات ہیں۔ اردو میں انگریزی زبان کے اتنے الفاظ شامل ہو گئے ہیں اور اس طرح ہماری زبان کا حصہ بن گئے ہیں کہ ان کا اردو ترجمہ ہماری قوم کے لیے ایک نیا مسئلہ پیدا کر دے گا۔ مثلاً ہم بائیالوجی کے طالب علم کو بلڈ پریشر پڑھائیں تو شاید اسے مشکل پیش نہ آئے بلکہ ایک دیہاتی کو بھی یہ لفظ سمجھنے میں مشکل نہیں ہو گی۔ لیکن اگر ہم اسے بلند فشار خون سے ترجمہ کر کے بتلائیں گے تو اس اردو لفظ کی ادائیگی اور اسے یاد رکھنا اس کے لیے انگریزی لفظ سے زیادہ مشکل ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اردو میں اگر آپ نے کوئی نئی اصطلاح لانی ہی ہے تو وہ یا تو فارسی سے لائیں گے یا عربی سے کیونکہ اردو تو خود متنوع زبانوں کا مجموعہ ہے۔ اب کمپیوٹر کے لیے ترجمہ کہاں سے لائیں گے؟ آپ اس کے ترجمے کے لیے فارسی یا عربی کی طرف دیکھیں گے۔ عربی والوں نے "آلة الحساب" ترجمہ کیا ہے، آپ "آلہ حساب" کر لیں گے۔ پھر بھی لیا تو غیر زبان ہی سے ہے۔ تو اس سے بہتر ہے کہ اردو کے مصادر میں ترکی، فارسی، عربی، سنسکرت کے علاوہ انگریزی زبان کا بھی اضافہ کر لیں۔

تو دو باتیں سامنے آئیں۔ ایک یہ کہ سائنس کے مضامین کی اصطلاحات کو ہماری قوم انگریزی میں زیادہ بہتر سمجھ سکتی ہے لہذا ان کا اردو میں ترجمہ کرنا مفید نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ کلاس میں لیکچر کا مادری زبان یعنی ایسی اردو میں ہونا ہی مفید ہے

کہ جس میں انگریزی کی آمیزش ہو۔ ورنہ تو مکمل انگریزی کی صورت میں طلباء کے پلے کچھ نہیں پڑے گا۔

پھر نصاب پر بات چلی تو انہوں نے کہا کہ نصاب میں تبدیلی ہونی چاہیے یہاں تک کہ سائنس کے مضامین میں بھی۔ میں نے کہا کہ یہ بات درست ہے۔ ہمیں کیمبرج یا آکسفورڈ کے فزکس، کیمسٹری، بائیالوجی اور ریاضی وغیرہ کے نصابات کو از سر نو مرتب کرنے کی ضرورت ہے اور اس محنت کا مقصود صرف اتنا ہو کہ سائنس پڑھنے والا الحاد کی بجائے خدا پر ایمان کی طرف راغب ہو کیونکہ اہل مغرب نے ہر علم کو نظریہ ارتقاء کا تڑکا لگا کر خدا کے انکار تک پہنچانے کا ذریعہ بنا دیا ہے۔ یہی کچھ ہمیں سماجی اور انسانی علوم (Humanities and Social Sciences) میں کرنا چاہیے۔

فلکیات (Astronomy)، حیاتیات (Biology)، ریاضی اور نظریاتی فزکس (Theoretical Physics)، تو خدا تک پہنچا کر رہتی ہے، اگر کوئی صاحب دل اس پر کام کرے تو۔ اسلام اور سائنس یا قرآن اور سائنس کے حوالے سے جو کام ہوا، اس کا مقصود بھی یہی ہے۔

پھر یہ بات چلی ہے کہ ہمارے نظام تعلیم میں رٹا سسٹم ہے یعنی ہم علم کو نقل (reproduce) کرتے ہیں، اُس کی تطبیق (application) نہیں کرتے جبکہ یورپ میں علم کی تطبیق ہوتی ہے لہذا وہ ہم سے آگے ہیں۔ میں نے کہا: یہ تجزیہ بھی بالکل درست ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے ہاں دینی مدارس کا بھی یہی المیہ ہے کہ وہاں علم نقل (reproduce) ہو رہا ہے، تطبیق (application) نہیں ہو رہی اور قوم کی ذہانت علم کی تطبیق سے بڑھتی ہے نہ کہ اس کی نقل سے۔ میں نے کہا کہ یہ بھی درست ہے۔ انہوں نے کہا کہ سابق چیئرمین ایچ ای سی ڈاکٹر عطاء الرحمن صاحب نے ایک انٹرویو کے دوران ایک سوال کے جواب میں کہا کہ پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ یہاں کوئی یونیورسٹی نہیں ہے۔ انٹرویو کرنے والے نے کہا کہ پاکستان میں تو ایک سو پچاس یونیورسٹیاں ہیں اور آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ یہ کالجز ہیں، یونیورسٹی

کوئی نہیں ہے کیونکہ یونیورسٹی کا کام علم کی تخلیق اور پیداوار (creation and production of knowledge) ہے جبکہ کالج یہ کام کرتے ہیں کہ جو علم پیدا ہو چکا ہو، اسے دوبارہ پیش (reproduce) کرتے ہیں اور یہی کام ہمارے ہاں کی پاکستانی یونیورسٹیاں کر رہی ہیں۔

پھر مقاصد تعلیم (objectives and goals) کی بات چلی تو اس میں تو بیڑا ہی غرق ہے۔ ہم یہ کیوں پڑھنا چاہتے ہیں اور پڑھ کر کیا کرنا چاہتے ہیں؟ اس بارے نہ طالب علم کا ذہن واضح نہ ہے، نہ استاذ کا اور نہ ہی تعلیمی ادارے کا۔ تعلیم کے مقاصد متعین نہ ہونے کی وجہ سے بیشتر لڑکیاں انجینیئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہی ہیں؟ سوال تو یہ ہے کہ کیا لڑکیوں کو انجینیئرنگ کی تعلیم کی ضرورت ہے؟ یا اگر وہ حاصل کر لیں گی تو ان کی مارکیٹ میں کیا کھپت ہو گی؟ مثلاً اگر وہ گائنی کی تعلیم حاصل کر لیں یا چائلڈ سپیشلسٹ بن جائیں یا ہوم اکنامکس میں کچھ کر لیں تو سمجھ میں آتا ہے کہ وہ کیا کریں گی۔ لیکن یہاں تو جیسے کچھ متعین ہی نہیں ہے کہ کس کو کیا پڑھنا چاہیے یا کس کے لیے کون سی ڈگری حاصل کرنا مفید ہے۔ بس اسی ڈگری کے پیچھے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں لگی ہیں کہ جس کا مارکیٹ میں نام ہے، یا اشتہار بازی (advertisement) کے ذریعے اس کی اہمیت نمایاں کر دی گئی، یا جس میں فیس کم ہے، یا جس میں کم نمبروں کی وجہ سے داخلہ مل گیا، یا جو ان کے والدین کی خواہش ہے، یا جس میں دو چار پیسے زیادہ کی ملازمت کی امید ہو وغیرہ

پھر یہ بات آئی کہ کیا کرنا چاہیے؟ یہ کریں، وہ کریں، یہ کچھ کر لیا، وہ کر لیا لیکن نتائج نہیں نکلے۔ ہماری سوسائٹی میں بہت سے جذبے والے نوجوان ہیں جو دین اور سوسائٹی کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں لیکن عمر، تجربہ اور وسائل نہیں ہیں۔ یہ بات سامنے آئی کہ اگر کسی کام کو مشن بنا کر کرنا ہے تو وہ اپنے آپ کو وقف کر کے ہی کرنا ہو گا اور ابھی آپ پر بیوی بچے اور گھر وغیرہ کی ذمہ داریاں ہیں۔ تو جو نوجوان کچھ کرنا چاہتے ہیں، وہ چالیس سال کی عمر کے بعد ہی کچھ کریں کہ جب وہ معاشی طور کسی قدر مستحکم ہوں۔ اس

وقت تک بس اپنے گھر بار کو سنبھالیں، اپنی ملازمت کریں، اپنا وژن مکمل کریں، اپنی ٹیم بنانے کی کوشش کریں کیونکہ کوئی بھی بڑا کام ٹیم ورک کے بغیر نہیں ہوتا۔ 37 سے 40 سال کی عمر میں اگلے تین سالوں کے بھی کچھ بچت (saving) کرلیں اور چالیس سال کے بعد کم از کم تین سال کے لیے اپنے آپ کو اس کام کے لیے وقف کرنے کا تجربہ کر لیں، کہ جسے آپ بطور مشن اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ اور ان تین سالوں میں مصلے پر بیٹھ جائیں اور اللہ سے مانگیں اور اگر اللہ نے کسی راستے پر ڈال دیا تو اس کا شکر ادا کریں، اور اللہ تعالی آپ کے اخلاص پر آپ کو ضائع نہیں کریں گے، ان شاء اللہ۔ بڑے کام ایک خاص عمر کے بعد ہی ہوتے ہیں جبکہ آپ کی کچھ ساکھ (credibility) بن چکی ہو۔ پس امت کے نوجوانوں کو جوانی میں جاگتے میں خواب ضرور دیکھنے چاہییے اور جب تک یہ خواب دیکھنے والے ہزاروں میں نہیں ہوں گے، اس امت میں احیاء (renaissance) کا عمل شروع نہیں ہو گا لیکن ان خوابوں کی تعبیر کا مناسب وقت چالیس کے بعد کا ہے جبکہ شخصیت میں کچھ پختگی آچکی ہو۔

اور خوابوں کی تعبیر مکمل کرنے کے لیے تو یہی تدبیر سمجھ میں آتی ہے کہ چالیس سال تک گھر بار کی خدمت کریں اور اس کے بعد کسی بھی دینی مشن کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیں اور ٹیم ورک کے ساتھ کوئی بڑا دینی کام کریں کیونکہ اکیلا شخص کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ آپ ٹیلی ویژن چینل کھولنا چاہتے ہیں یا اسلامی یونیورسٹی بنانا چاہتے ہیں، یا ریسرچ سنٹر قائم کرنے کی خواہش رکھتے ہیں، یا این جی او بنا کر ویلفیئر کا کام کرنا چاہتے ہیں، یا عوامی دعوتی کام کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں یا اسلامی اسکول کا تجربہ کرنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے مناسب وقت چالیس کے بعد کا ہے، اس سے پہلے تو لوگ یہی کہیں گے کہ عمر دیکھو اور نعرے دیکھو۔ کم از کم آپ کی ڈاڑھی میں چند بال تو سفید ہوں کہ لوگ آپ کو سمجھدار (mature) خیال کریں۔ اور اگر کسی کو عمر کے اس حصے سے پہلے ہی کوئی موقع مل جاتا ہے تو ضرور فائدہ اٹھائے۔ واللہ اعلم۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَوَصَّيْنَا الْإِنسَانَ بِوَالِدَيْهِ إِحْسَانًا حَمَلَتْهُ أُمُّهُ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا حَتَّىٰ إِذَا بَلَغَ أَشُدَّهُ وَبَلَغَ أَرْبَعِينَ

سَنَةً قَالَ رَبِّ أَوْزِعْنِي أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِي أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَىٰ وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضَاهُ وَأَصْلِحْ لِي فِي ذُرِّيَّتِي إِنِّي تُبْتُ إِلَيْكَ وَإِنِّي مِنَ الْمُسْلِمِينَ﴾ [الأحقاف: 15]

"اور ہم نے انسان کو اپنے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کرنے کا حکم دیا ہے، اس کی ماں نے اسے تکلیف جھیل کر پیٹ میں رکھا اور تکلیف برداشت کر کے پیدا کیا۔ اس کا حمل اور اس کے دودھ چھڑانے کی مدت تیس مہینے کی ہے۔ یہاں تک کہ جب وہ پختگی اور چالیس سال کی عمر کو پہنچا تو کہنے لگا اے میرے پروردگار! مجھے توفیق دے کہ میں تیری اس نعمت کا شکر بجالاؤں جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر انعام کی ہے اور یہ کہ میں ایسے نیک عمل کروں جن سے تو خوش ہو جائے اور تو میری اولاد بھی صالح بنا، میں تیری طرف رجوع کرتا ہوں اور میں مسلمانوں میں سے ہوں۔"

اردو ادب

اردو ادب کا ذوق رکھنے والے ایک دوست نے یہ تحریر لکھی: "منٹو نے صرف غلاظت میں انگلیاں کرید کرید کر بدبو پھیلانے کا کام کیا ہے۔ سماج کے لیے منٹو سے زیادہ مفید وہ بھنگی ہے جو غلاظت صاف کرتا ہے۔"

منٹو کے حق میں اور اس کے خلاف بہت سے لوگوں نے لکھا ہے۔ آپ کو منٹو کے جتنے مخالفین ملیں گے، اتنے ہی مویدین بھی مل جائیں گے کہ جو یہ کہتے نظر آئیں گے کہ منٹو کو لوگوں نے سمجھا ہی نہیں ہے۔ اگر منٹو نے ایسے موضوعات نہ چھیڑے ہوتے کہ جن کی زد میں مذہبی تصورات براہ راست آتے ہوں تو ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی کہ اس نے کیا لکھا ہے؟

منٹو کے مؤیدین سے سوال یہ ہے کہ منٹو کے افسانے پڑھ کر ایک عام قاری کو حاصل کیا ہوتا ہے؟ دل میں جو قیمتی احوال پیدا ہوتے ہیں اور دماغ میں جو اعلی سوچیں بیدار ہوتی ہیں، اسے موضوع بحث بنا لیا جاتا تو شاید فن پارے کی قدر و قیمت متعین کرنے میں آسانی ہو سکتی۔ صحیح مسلم کی ایک روایت کے مطابق وہ بھی تو شاعر ہی تھا کہ

جس کے کلام پر آپ ﷺ نے فرمایا کہ شیطان کو پکڑو۔

مسند احمد میں مروی ایک روایت میں امرؤالقیس کو جہنم کے راستے پر چلنے والے شعراء کا راہنما کہا گیا ہے۔ پس ایک ہے ادب کو ''ادب برائے ادب'' کی نظر سے دیکھنا تو امرؤالقیس جیسا شاعر نہیں ہے اور منٹو جیسا ادیب نہیں ہے۔ اور ایک ہے ادب کے بارے اسلام کی نظر سے فیصلہ کرنا تو اس تناظر میں بالکل مختلف فیصلہ سامنے آئے گا۔ کامیاب شاعر یا ادیب ہونے کا ہر گز مطلب یہ نہیں ہے کہ اس کے کلام کو دین اسلام کی روشنی میں خیر کی سند جاری کی جائے۔ ادب کے پہلو سے منٹو کا کلام اعلی ہے کیونکہ ادب اپنے ادب ہونے یا بننے یا کہلوانے کے اپنے معیارات رکھتا ہے جبکہ خیر وشر ہونے کے پہلو سے منٹو کے کلام کی حیثیت وہی ہے جو امرؤالقیس کی شاعری کی پیغمبر اسلام ﷺ نے متعین کر دی ہے۔ خیر وشر کا تعین ادب کا موضوع نہیں ہے بلکہ مذہب کا ہے۔

ایک شخص شاعر ہے یا نہیں، اگر ہے تو کس درجے کا ہے، یہ ادب کا موضوع ہے۔ باقی دین صرف یہ فیصلہ کرے گا کہ وہ اچھا شاعر ہے یا برا۔ اسی طرح ایک شخص ادیب ہے یا نہیں، اگر ہے تو کس پائے کا ہے؟ یہ ادب کے معیارات سے طے ہو گا۔ باقی وہ ادیب اچھا ہے یا برا، اس کا پیش کردہ ادب خیر ہے یا شر، تو یہ دین سے طے ہو گا۔

منٹو کے ادیب ہونے سے انکار کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ امرؤالقیس کے شاعر ہونے کا انکار کر دینا۔ باقی دونوں کا ادب فحش ہے لہذا اسلام کی نظر میں اسے شر قرار دیا جائے گا۔ مصوری یا مجسمہ سازی ایک فن ہے۔ کوئی شخص ان فنون میں ماہر ہے یا نہیں، یہ مذہب کا موضوع نہیں ہے۔ باقی یہ کہ ایک مصور کی مصوری کا فن پارہ اور مجسمہ سازی کا شاہکار خیر ہے یا شر، تو یہ دین کا موضوع ہے۔ اور اس بارے علماء کوئی فتوی جاری کریں گے تاکہ معاشرے کو ان فنون سے پیدا ہونے والے بگاڑ سے بچایا جا سکے۔

اسلام فنون کے مخالف نہیں ہے لیکن جب ان فنون کو بے حیائی، عریانی، فحاشی اور بے غیرتی کے پھیلانے کا آلہ بنالیا جاتا ہے تو پھر اسلام ان پر قدغن عائد کرتا ہے۔ انسان کی حس جمال یہ نہیں ہے کہ کسی عورت کا بے لباس مجسمہ بنائے، یا انسان کا ذوق جمال یہ

نہیں ہے کہ اپنی شاعری میں عورت کے نازک اعضاء کی تعریف کرے۔ جمالیات کا تعلق تخلیق سے ہے نہ کہ بے حیائی اور فحاشی سے۔ آرٹ اور ادب جب بے حیائی اور فحاشی کا مترادف بن جاتا ہے تو پھر اسلام کو اس پر اعتراض ہے اور شدید اعتراض ہے۔

معروف کالم نگار اوریا مقبول جان لکھتے ہیں:

"میر تقی میرؔ سے لے کر فراق گھور کھپوری تک سب کے ادبی محاسن اور لونڈوں سے محبت کے انداز کو جس خوبصورتی کے ساتھ نقادوں نے سراہا اور جس طرح انھیں معاشرے میں عزت و تکریم کے مقام پر فائز کیا، اس سے ہماری پستی اور زوال کی تصویر نمایاں ہوتی ہے۔ الطاف حسین حالی نے جب مسدس لکھی تو انھی شعراء کے بارے میں کہا تھا "جہنم کو بھر دیں گے شاعر ہمارے"... کیا حیرت انگیز دعویٰ ہے استاذ الشعراء میر تقی میرؔ کا۔

ترک بچے سے عشق کیا تھا ریختے کیا کیا ہم نے کہے
رفتہ رفتہ ہندوستان سے شعر مرا ایران گیا

ادب کے اس عظیم سپوت نے چھ دیوانوں میں 13,590 اشعار تحریر کیے جن میں 86 فیصد شعروں میں معشوق کی جنس مرد ہے، لونڈا، طفل یا نونہال۔ یہ اشعار فحش گوئی اور امرد پرستی کے نمونے ہیں۔ نمونے بھی ایسے کہ انھیں نقل کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ لڑکے یا لونڈے کے حسن کے قصے اور طرحداریوں کے افسانے اس کے خال و خد سے لے کر عشوہ طرازیوں تک چلے جاتے ہیں۔ چہرے پر ہلکے ہلکے روئیں آنے کو خط آنا کہتے ہیں۔ اس کو بھی ان شاعرانِ عظیم نے سو طرح کے مضمون سے باندھا ہے۔

وہ جو عالم اس کے اوپر تھا وہ خط نے کھو دیا
مبتلا ہے اِس بلا میں میرؔ اک عالم ہنوز

اور اب اسیرؔ اسی خط کے آنے کو ایک اور طریقے سے بیان کرتا ہے

خط نمودار ہوا، وصل کی راتیں آئیں
جن کا اندیشہ تھا منہ پر وہی باتیں آئیں

یوں تو یہ وبا برصغیر پاک و ہند میں ایران سے آئی، بلکہ نقاد جنہوں نے عربی ادب کا مطالعہ کیا، وہ بھی کہتے ہیں کہ ایران ہی سے لونڈوں سے عشق کے مضامین عرب شاعری میں داخل ہوئے۔ حافظ کا مشہور شعر تو ہر کوئی کس لذت سے سناتا ہے

اگر آں ترکِ شیرازی، بدست آرد دلِ مارا
بخالِ ہندوش بخشم سمر قند و بخارا را

(اگر وہ شیراز کا ترک لڑکا مجھے مل جائے تو میں اس کی گال کے تِل کے بدلے سمرقند اور بخارا کے شہر اسے بخش دوں)۔ یوں لگتا ہے شاعری میں لطف و کمال اور ذوقِ جمال اسی ایک شوق کے گرد گھومتا تھا۔ ان شعراء کی ذاتی زندگی کے قصوں میں بھی اس شوق کی جھلک نظر آتی ہے۔ جوش ملیح آبادی نے کس فخر کے ساتھ لڑکوں سے اپنے معاشقوں کا ذکر کیا۔ ان شعراء کی محفل میں ایک نوجوان شاعر ساغر نظامی آنکلا، خوبصورت تھا، کیا کیا قصے اس کے ساتھ مشہور نہیں ہوئے۔ سیماب اکبر آبادی کا یہ مصرعہ تو ادبی تاریخ کے منہ پر غلیظ طمانچہ ہے ''ساغر کی تہہ میں قطرۂ سیماب رہ گیا''۔ فراق گھورکھپوری کہ جس کی انھی حرکتوں کی وجہ سے اس کے بیٹے نے خودکشی کرلی تھی کہ اس کا باپ اس کے دوستوں سے بھی باز نہ آتا تھا۔ ہوس زدگی کا وہی عالم جو میر تقی میر میں تھا کہ

وے نہیں تو انھوں کا بھائی اور
عشق کرنے کی کیا مناہی ہے

''ہندو لڑکے سے کیا معیشت ہو'' سے لے کر ''یہ نرم شانہ لڑکے ہیں مخمل دوخابہ ــــ'' اور پھر ''اسی عطار کے لونڈے سے دوا لیتے ہیں'' جیسے نسبتاً کم فحش مصرعوں کو ہی اگر اردو شاعری میں چھانٹا جائے تو یوں لگتا ہے کہ ہمارے اردگرد ایک ایسا ماحول آباد تھا اور ہے جو اسقدر بیمار ہے جس میں ہیرو وہ ہے جو اپنے ساتھ ایک لڑکا معشوق لیے پھرتا ہے یا جس نے اپنی مردانگی کے زیرِاثر

شہر کے خوبرو لڑکوں کو اپنے قابو میں رکھا ہوا ہے۔ وہ ان سے دھونس اور زبردستی سے بھی اپنی ہوس پوری کرتا ہے اور ان کے ناز نخرے اور خرچہ اٹھا کر بھی۔ ایسا کردار سعادت حسن منٹو کے دو دا پہلوان میں بھی آکر اجاگر ہوتا ہے اور وہ اسے کیسے ایک سچے عاشق کے طور پر پیش کرتا ہے۔"[1]

ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي سَعِيدٍ الْخُدْرِيِّ، قَالَ: بَيْنَا نَحْنُ نَسِيرُ مَعَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بِالْعَرْجِ إِذْ عَرَضَ شَاعِرٌ يُنْشِدُ، فَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «خُذُوا الشَّيْطَانَ، أَوْ أَمْسِكُوا الشَّيْطَانَ لَأَنْ يَمْتَلِئَ جَوْفُ رَجُلٍ قَيْحًا خَيْرٌ لَهُ مِنْ أَنْ يَمْتَلِئَ شِعْرًا»[2]

"حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مقام "عرج" سے گزر رہے تھے تو ایک شاعر شعر کہتا ہوا سامنے آیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا کلام سن کر کہا: اس شیطان کو پکڑ و یا روکو کیونکہ کسی شخص کا پیٹ قے سے بھرا ہو، یہ اس سے زیادہ بہتر ہے کہ وہ شعر سے بھرا ہو۔"

زاویہ نگاہ

ایک دوست نے سوال کیا کہ اسلام میں چار شادیاں کیوں کرتے ہیں۔؟ جواب: اس کا جواب تب سمجھ میں آئے گا جب کر لیں گے۔ میرا مطلب ہے تزکیہ نفس کے لیے کرتے ہیں۔ جب ایک بیوی سے انسان کا تزکیہ نہ ہو رہا ہو تو اسے دوسری شادی کر لینی چاہیے۔

اس جواب میں یہ پہلو بھی ہے کہ ہر سوال کا جواب ہمیشہ نپے تلے انداز میں دینا ممکن نہیں ہوتا۔ اور ہر سوال کا جواب ہمیشہ سنجیدہ بھی نہیں ہوتا۔ بعض اوقات سنجیدہ سوال کا جواب اگر آپ مزاحیہ انداز میں دے دیں گے تو سنجیدہ جواب سے جو لایعنی بحث شروع ہو سکتی تھی، اس سے آپ بچ سکتے ہیں۔

---

[1] اوریا مقبول جان، قصور کا رونا، قصور کس کا، روزنامہ ایکسپریس، 14 اگست، 2015ء

[2] صحیح مسلم، کتاب الشِّعْرِ، 1769/4

اور اس جواب میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ ایک ہی شیء کو دیکھنے کا ایک ہی زاویہ نہیں ہوتا بلکہ آپ ایک شیء کو مختلف زاویوں (angles) سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اور بعض اوقات آپ اگر کسی اور زاویے سے اس شیء کو دیکھیں تو آپ کو اس شیء پر جو اعتراض ہوتا ہے، وہ دور ہو جاتا ہے کیونکہ آپ کے اعتراض کا سبب دراصل وہ زاویہ ہوتا ہے کہ جس سے آپ اس شیء کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ اہل سائنس کا کہنا ہے کہ کسی شیء کی حقیقت جاننے کے لیے ضروری ہے کہ آپ اسے گیارہ جہات (dimentions) سے دیکھیں اور اسے وہ اسٹرنگ تھیوری کا نام دیتے ہیں۔

ایک سے زائد جہات سے کسی شیء کو دیکھنے سے اس کا تصور مکمل ہوتا ہے۔ یہ امکان ہے کہ باہر گلی میں اگر ہم اپنے گھر کے روزن سے جھانکیں تو کچھ اور منظر دکھائی دے اور اگر ہمارا پڑوسی اسی گلی میں اپنے گھر کے روزن سے جھانکے تو کچھ اور منظر دکھائی دے۔ اور جو کچھ انھیں دکھائی دے رہا ہے، وہ درست ہے کیونکہ وہ اپنے زاویے سے اس کو دیکھ رہے ہیں لہذا ان کے بیان میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ تو کبھی کبھی اگر پڑوسی دعوت دے تو اس کے گھر کے روزن سے بھی گلی میں جھانک لینا چاہیے کہ حقیقت حال معلوم کرنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض اوقات اہل ایمان میں بھی ایک شیء کے اچھے یا برے ہونے کے بارے اختلاف ہو جاتا ہے تو ایسا اختلاف عموماً مختلف زاویوں سے ایک شیء کو دیکھنے کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور اسے اختلاف تنوع کہتے ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور تابعین عظام رحمہم اللہ کا تفسیر میں جو اختلاف ہے، وہ اسی نوعیت کا ہے۔

ہمارے معاشرے میں دوسری شادی کو ہمیشہ اس زاویے سے دیکھا جاتا ہے کہ یہ عورت کے ساتھ ظلم ہے کہ مرد کو تو ایک سے زائد کی اجازت ہے جبکہ عورتوں کو نہیں ہے۔ لیکن دوسری شادی کو دیکھنے کا ایک ہی زاویہ نہیں ہے بلکہ دسیوں ہیں کہ جن سے معاشرے نے اسے دیکھا نہیں ہے۔ ان زاویوں میں سے ایک زاویہ یہ بھی ہے کہ ہمارے معاشرے میں مرد کو انسان بنانے میں عورت کا اہم کردار ہے۔ شادی کے بعد

ایک مرد کی شرافت، اخلاق اور ذمہ داری میں واضح طور تبدیلی دیکھنے کو ملتی ہے اور اس کی وجہ بلاشبہ اس کی بیوی ہی ہوتی ہے۔ تو ایک مرد کو مزید انسان بنانے کے لیے بھی اس کی دوسری شادی کرائی جاسکتی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«مَنْ كَانَتْ لَهُ امْرَأَتَانِ، يَمِيلُ مَعَ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى، جَاءَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَأَحَدُ شِقَّيْهِ سَاقِطٌ»[1]

"جس شخص کی دو بیویاں ہوں اور وہ ان میں سے ایک کی طرف زیادہ مائل رہتا ہو تو قیامت والے دن وہ اس حال میں آئے گا کہ اس کا ایک پہلو گرا ہوا ہو گا۔"

دوسری شادی کی اجازت اسی صورت میں ہے کہ جب شوہر بیویوں کے مابین عدل کرے اور اگر وہ عدل نہ کر سکے تو پھر اسے ایک ہی پر اکتفا کرنا چاہیے کیونکہ اس صورت میں ایک سے زائد شادیاں اس کے لیے آخرت میں وبال بن جائیں گی۔ اور وہ اس حال میں اللہ کے حضور میں پیش ہو گا کہ جیسے اس کا ایک پہلو فالج کے سبب سے مردہ ہو گیا ہو۔ تو دوسری شادی کو دیکھنے کا ایک زاویہ یہ ہے کہ یہ انسان کے عدل کا امتحان ہے اور اس امتحان میں وہ اسی صورت کامیاب ہو سکتا ہے جبکہ اس کا تزکیہ ہو چکا ہو۔

اسی طرح ایک دوست نے کہا کہ بعض یورپی حکومتوں کو کیا آفت آپڑی ہے کہ نقاب کو عوامی مقامات پر پابند (ban) کرنے کے لیے قانون سازی کر رہی ہیں حالانکہ ان کا یہ رویہ ان کے ملکی آئین میں فرد کی آزادی کے بارے موجود تصورات سے بھی متصادم ہے۔

میں نے کہا کہ نقاب محض ایک مذہبی مسئلہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک اعلان جنگ ہے جو ہر نقاب پہننے والی خاتون 270 بلین ڈالر کی بیوٹی انڈسٹری کے خلاف کرتی ہے کہ اتنی بڑی انڈسٹری کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور یہ ملٹی نیشنل کمپنیوں اور کیپٹلزم کے خلاف اعلان جنگ ہے لہذا مغربی اقوام اس کے خلاف قانون سازی کی خواہاں ہیں۔ ایک سروے کے مطابق بیوٹی انڈسٹری کا تقریباً 70 فی صد افریقن ممالک میں استعمال ہوتا

---

[1] سنن ابن ماجه، كِتَابُ النِّكَاحِ، بَابُ الْقِسْمَةِ بَيْنَ النِّسَاءِ، 633/1

ہے۔ یہ کمال نہیں ہے کہ انہوں نے ملین ڈالرز کی اشتہار بازی کے ذریعے ایک حبشن (negress) کو بھی یہ یقین دلا دیا ہے کہ ان کی بنائی ہوئی کریم استعمال کرنے سے اس کا رنگ گورا ہو سکتا ہے۔

یہ نقاب اور حجاب کے مسئلے کو دیکھنے کا ایک دوسرا زاویہ ہے جو کہ مذہبی نہیں معاشی ہے۔ اسی طرح نقاب اور حجاب کو دیکھنے کا ایک زاویہ معاشرتی بھی ہو سکتا ہے۔ ایمان ہی کے مسئلے کو لے لیں کہ ہمارے دین میں اسے دیکھنے کے ستر سے زائد زاویے ہیں کہ جنہیں "شعب الإیمان" بھی کہتے ہیں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«الإِيمَانُ بِضْـعٌ وَسَـبْعُونَ بَابًا، فَأَدْنَاهَا إِمَاطَةُ الأَذَى عَنِ الطَّرِيقِ، وَأَرْفَعُهَا قَوْلُ: لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ»[1]

"ایمان کے ستر سے زائد دروازے ہیں کہ جن میں سے ادنی ترین یہ ہے کہ راستے سے کسی تکلیف دہ چیز کو ہٹا دیا جائے اور سب سے اعلی درجہ یہ ہے کہ لا الہ الا اللہ کہا جائے۔"

کسی شخص میں ایمان دیکھنے کا معیار صرف اس کا لباس اور وضع قطع نہیں ہے بلکہ اخلاق بھی ایمان دیکھنے کا زاویہ ہے، طہارت اور صفائی بھی ایمان ہی کا ایک پہلو ہے، حیاء بھی ایمان کا حصہ ہے وغیرہ۔ پس میک انڈسٹری نے دنیا کی ہر دوسری خاتون کو یہ یقین دلوا دیا ہے کہ وہ دنیا کی حسین ترین عورت بن سکتی ہے بشرطیکہ اُن کی مصنوعات کو استعمال کرے۔ قرآن مجید نے نہ صرف جنات شیاطین سے متنبہ کیا ہے کہ ان سے دور رہو بلکہ انسانی شیاطین سے بھی ہمیں خبردار کیا ہے کہ ان سے بچ کر رہو جیسا کہ سورۃ الناس میں ہے۔

جنات شیاطین تو صرف سینے میں وسوسہ ڈالتے ہیں اور انسانی شیاطین تو دل میں ایسی خواہشات کا بیج پیدا کرتے ہیں کہ جو اس دنیا میں کبھی بھی پوری ہونے والی نہیں ہیں۔ پھر وہ خواہش کے اس بیج کو ایک تناور درخت بناتے ہیں اور پھر اس پر پٹرول چھڑک کر اسے آگ لگا دیتے ہیں اور انسان اپنی خواہشات کی آگ میں جلتا رہتا ہے، یہاں تک کہ اسی بے

[1] سنن الترمذي، أَبْوَابُ الْإِيمَانِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي اسْتِكْمَالِ الإِيمَانِ وَزِيَادَتِهِ وَنُقْصَانِهِ، 10/5

سکونی اور بے اطمینانی کی کیفیت میں اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے۔

خواہشات کی یہ آگ اگر ٹھنڈی ہو سکتی ہے تو وہ دین اسلام کے احکامات پر عمل پیرا ہونے سے ہی ہو سکتی ہے اور یہ بات کیپٹلزم کے پجاریوں کو اچھی طرح سمجھ آگئی ہے کہ دین اسلام جس سادگی اور دنیا سے بے رغبتی کا حکم دیتا ہے تو اس کے ساتھ ان کا کاروبار نہیں چلنے والا لہذا وہ ایک تو اپنی ایڈورٹزمنٹ کے ذریعے اپنی مصنوعات کی خواہشات کی آگ بھڑکاتے ہیں اور دوسری طرف ان مصنوعات کو استعمال نہ کرنے والوں پر قانون سازی کے ذریعے جرمانے عائد کرتے ہیں۔

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

«لاَ يَزَالُ قَلْبُ الكَبِيرِ شَابًّا فِي اثْنَتَيْنِ: فِي حُبِّ الدُّنْيَا وَطُولِ الأَمَلِ»[1]

”بوڑھے کا دل بھی دو چیزوں میں ہمیشہ جوان رہتا ہے، ایک دنیا کی محبت میں اور دوسرا لمبی امیدوں میں۔“

فکر کی کجی

تزکیہ نفس میں جہاں عمل کی اصلاح شامل ہے، وہاں فکر کی اصلاح بھی ضروری ہے۔ اس شخص کا تزکیہ کیا تزکیہ ہے کہ جس کی فکر کج ہے اور وہ اپنے اخلاق کو سنوارنے میں لگا ہوا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک شخص کی فکر میں کجی ہو اور اس کے رویے درست ہو جائیں۔ انسان اسی پر عمل کرتا ہے جو اس کی فکر ہوتی ہے لہذا عمل سے پہلے فکر کی اصلاح ضروری ہے۔ ہمارا دین فکر کی اصلاح پر بہت زور دیتا ہے کہ اسی فکر ہی سے انسان کے اخلاق پیدا ہوتے ہیں۔

صالح فکر سے اچھے اخلاق پیدا ہوتے ہیں اور کج فکری سے برے اخلاق جنم لیتے ہیں۔ بندہ مومن جس قدر اپنے اخلاق کی اصلاح کے لیے مجاہدہ کرتا ہے، اس سے زیادہ اپنی فکر کی اصلاح میں فکر مند رہتا ہے کہ اللہ عزوجل نے فکر کی اصلاح کو اخلاق کی اصلاح پر اہمیت دی ہے۔ قرآن اس بارے بہت واضح ہے کہ جس کی فکر توحید پر قائم ہو

---

[1] صحیح بخاري، كِتَابُ الرِّقَاقِ، بَابُ مَنْ بَلَغَ سِتِّينَ سَنَةً، فَقَدْ أَعْذَرَ اللَّهُ إِلَيْهِ فِي العُمُرِ، 89/8

گی تو بالآخر نجات پالے گا لیکن جس کی فکر میں کفر اور شرک ہوگا تو اس کی نجات کبھی بھی نہ ہوگی۔

ایک دہریے (atheist) نے مسلمان سے کہا: کیا آپ نے دی گرینڈ ڈیزائن (The Grand Design) پڑھی ہے؟ مسلمان نے کہا: کیا آپ نے دی گرینڈ پلان (The Grand Plan) پڑھی ہے؟ دہریے نے کہا: نہیں، ویسے یہ کس کی کتاب ہے مسلمان نے کہا: دی گرینڈ ڈیزائن میں تو صرف ڈیزائن کا ذکر ہے، ڈیزائنر غائب ہے جبکہ دی گرینڈ پلان میں گرینڈ ڈیزائن کے ساتھ ڈیزائنر کا بھی ذکر ہے۔ دہریہ کہنے لگا: واہ، کمال کی بات ہے۔ لیکن بتاؤ تو سہی کہ لکھی کسی نے ہے؟ مسلمان نے کہا: خود ڈیزائنر نے۔

دی گرینڈ ڈیزائن، اسٹیون ہاکنگ کی تصنیف ہے کہ جسے پوری دنیا میں آئن سٹائن کے بعد ذہین ترین سائنسدان سمجھا جاتا ہے۔ یہ کتاب 2010ء میں شائع ہوئی اور کہا جاتا ہے کہ اس کے ایک ارب سے زائد نسخے فروخت ہو چکے ہیں۔ اس کتاب میں ہاکنگ نے یہ دعوی کیا ہے کہ دنیا، حیات اور کائنات کی ابتداء جاننے کے لیے کسی خدا کی ضرورت نہیں ہے بلکہ قدرت کے قوانین (laws of nature) ہمیشہ سے ہیں اور وہ وہی اس گرینڈ ڈیزائن کی علت (cause) ہیں۔

اس مکالمہ میں دی گرینڈ پلان سے مراد لوح محفوظ تھا کہ جس میں انسان اور کائنات کا ماضی، حال اور مستقبل سب کچھ موجود ہے۔ اسے ہم مذہب کی اصطلاح میں "تقدیر" بھی کہتے ہیں۔ تقدیر ہی علم کی حقیقت (reality) ہے اور جو تقدیر کے نکتے کو نہ جان سکا، تو وہ علم کی حقیقت سے محروم رہا۔ خدا کے وجود کی سب سے بڑی دلیل یہی تقدیر ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«دَخَلْتُ عَلَى عُبَادَةَ، وَهُوَ مَرِيضٌ أَتَخَايَلُ فِيهِ الْمَوْتَ فَقُلْتُ: يَا أَبَتَاهُ أَوْصِنِي وَاجْتَهِدْ لِي. فَقَالَ: أَجْلِسُونِي. فَلَمَّا أَجْلَسُوهُ قَالَ: يَا بُنَيَّ إِنَّكَ لَنْ تَطْعَمَ طَعْمَ الْإِيمَانِ، وَلَنْ تَبْلُغْ حَقَّ حَقِيقَةِ الْعِلْمِ بِاللَّهِ حَتَّى تُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ خَيْرِهِ وَشَرِّهِ قَالَ: قُلْتُ: يَا أَبَتَاهُ وَكَيْفَ لِي أَنْ أَعْلَمَ مَا

خَيْرُ الْقَدَرِ مِنْ شَرِّهِ؟ قَالَ: تَعْلَمُ أَنَّ مَا أَخْطَأَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيبَكَ، وَمَا أَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ. يَا بُنَيَّ إِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: إِنَّ أَوَّلَ مَا خَلَقَ اللهُ الْقَلَمُ، ثُمَّ قَالَ: اكْتُبْ فَجَرَى فِي تِلْكَ السَّاعَةِ بِمَا هُوَ كَائِنٌ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ، يَا بُنَيَّ إِنْ مِتَّ وَلَسْتَ عَلَى ذَلِكَ دَخَلْتَ النَّارَ»[1]

"حضرت ولید بن عبادۃ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے مرض الموت میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے کہا کہ ابا جان! مجھے اچھی طرح وصیت کریں۔ تو انہوں نے کہا کہ مجھے بٹھا دو۔ پس جب انہیں بٹھا دیا گیا تو انہوں نے کہا: اے میرے بچے! تجھے ایمان کا ذائقہ اس وقت تک محسوس نہیں ہو گا اور تو اللہ کے بارے علم کی حقیقت تک اس وقت تک نہیں پہنچ پائے گا جب تک کہ تو اچھی بری تقدیر پر ایمان نہ لے آئے۔ تو میں نے کہا کہ ابا جان! مجھے اچھی اور بری تقدیر کا علم کیسے ہو گا؟ تو انہوں نے کہا کہ یہ جان لو کہ جو چیز تجھے نہ مل سکی تو وہ تجھے کبھی بھی نہ ملنے والی تھی۔ اور جو چیز تجھے مل گئی تو وہ کبھی تجھ سے خطا نہ ہونے والی تھی۔ اور جان لو کہ میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ اللہ عزوجل نے سب سے پہلے قلم کو پیدا کیا اور اسے کہا کہ لکھو تو اس نے قیامت تک جو کچھ ہونے والا تھا، اسے لکھ دیا۔ اے میرے بچے! اگر تیری موت اس حال میں ہوئی کہ تیرا اس پر ایمان نہ ہوا تو تو آگ میں داخل ہو گا۔"

اس دنیا کا نظام اسی گرینڈ پلان کے مطابق چل رہا ہے اور آج تک کسی سائنسدان اور فلسفی کو یہ جرات نہ ہو سکی کہ اس گرینڈ پلان کے اس جزوی فیصلے کو ہی اپنی مرضی کے مطابق تبدیل کر سکے کہ جو اس کی ذاتی زندگی اور آزمائش سے متعلق ہے۔ مثلاً انسان اپنے لیے جیسی شکل و صورت پسند کرتا ہے، کیا ویسی شکل و صورت کے ساتھ اس دنیا میں آ سکتا ہے؟ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ

---

[1] مسند الإمام أحمد بن حنبل: 37/378-379

الْحَكِيمُ﴾ [آل عمران: 6]

”وہی تو ہے جو تمہاری ماؤں کے پیٹ میں تمہاری صورتیں، جیسی چاہتا ہے، بناتا ہے۔اُس زبردست حکمت والے کے سوا کوئی اور خدا نہیں ہے۔“

یہ گرینڈ پلان بتلاتا ہے کہ انسان کس قدر بے بس، محتاج اور مسکین ہے۔نہ اس دنیا میں آنے میں اس کی مرضی غالب ہے اور نہ جانے میں اور نہ دونوں کے درمیانی وقت میں۔اس بیچارے کو کچھ معلوم نہیں کہ اس کے ساتھ کس وقت کیا ہونے والا ہے یا کیا ہونے جارہا ہے بلکہ یہ تو خواہش بھی اپنے رب کی اجازت کے بغیر نہیں کر سکتا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَمَا تَشَاءُونَ إِلَّا أَن يَشَاءَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ﴾ [التکویر: 29]

”اور تم پروردگار عالم کے چاہے بغیر کچھ چاہ بھی نہیں سکتے۔“

علمی بات یہ ہے کہ اللہ کا ارادہ دو قسم پر ہے: تکوینی اور شرعی۔ تکوینی ارادے کے تحت اللہ عزوجل نے ہر شیء کی تخلیق فرمائی ہے، خیر کی بھی اور شر کی بھی، جبکہ شرعی ارادے کے تحت اللہ نے انسان سے کچھ مطالبات کیے ہیں کہ جنہیں ہم شریعت کہتے ہیں۔ پس تقدیر امر تکوینی ہے اور شریعت امر شرعی ہے۔امر تکوینی میں اللہ کی رضا شامل نہیں ہوتی بلکہ تخلیق مقصود ہے جبکہ امر شرعی میں اللہ کی رضا بھی شامل ہے۔ تکوینی امور کو مشیئت بھی کہتے ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلُوا وَلَٰكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ﴾ [البقرة: 253]

”اور اگر اللہ تعالی چاہتا تو یہ آپس میں نہ لڑتے مرتے لیکن اللہ تعالی جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔“

اللہ تعالی شر کا خالق ہے جبکہ اس سے راضی نہیں ہے اور خیر کا خالق بھی ہے اور اسی سے راضی بھی ہے۔پس کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر کائنات کا ڈیزائن عظیم ہے تو ڈیزائنر بھی عظیم ہو گا۔ کتنی سیدھی سی بات ہے لیکن سمجھ جب شیطان کے حوالے ہو جائے تو پھر انسان ایسی ہی بہکی بہکی باتیں کرتا ہے۔

اسی طرح تنظیم اسلامی کے کچھ دوستوں کی وساطت سے قرآن اکیڈمی میں ایک

منکر حدیث سے ملاقات ہوئی۔ ملتے ہی سوالات کی بوچھاڑ کر دی کہ آپ کی تعلیم، ڈگری، مسلک، تعلیم حاصل کرنے کے مقاصد کیا تھے؟ میں نے کہا کہ کام کی بات کریں کہ مسئلہ کیا ہے جس کے لیے آپ ملاقات کے خواہاں تھے؟

انہوں نے کہا: میں حدیث کو نہیں مانتا، آپ حدیث کو ثابت کریں۔ میں نے کہا: آپ قرآن کو مانتے ہیں؟ انہوں نے کہا: مانتا ہوں۔ میں نے کہا: میں قرآن کو نہیں مانتا، آپ قرآن کو ثابت کریں۔ انہوں نے کہا: یہ کیا بات ہوئی؟ میں نے کہا: یہی تو بات ہے۔ انہوں نے کہا: آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا: جس طریقے سے آپ قرآن مجید کو ثابت کریں گے، اسی طریقے سے میں حدیث کو ثابت کروں گا۔ انہوں نے کہا: آپ کے نزدیک قرآن مجید کیسے ثابت ہوتا ہے؟ میں نے کہا: جس طرح حدیث ثابت ہوتی ہے۔

انہوں نے کہا: پھر بھی کیسے؟ میں نے کیا: میں نے اپنے استاذ سے سنا، انہوں نے اپنے استاذ سے، انہوں نے اپنے استاذ سے اور اسی طرح یہ سلسلہ سند اللہ کے رسول ﷺ تک جا پہنچتا ہے۔ مدرسہ کے طالب علم کے پاس اپنے استاذ سے اللہ کے رسول ﷺ تک کی مکمل سند موجود ہوتی ہے۔ جس طرح ہم نے قرآن "قاری المقری" سے لیا، اسی طرح حدیث "شیخ الحدیث" سے لی۔ قاری المقری نے جس طرح قرآن کی سند اللہ کے رسول ﷺ تک پہنچائی، اسی طرح شیخ الحدیث نے حدیث کی سند نبی کریم ﷺ تک پہنچائی۔[1]

---

[1] مثلاً ہمارے استاذ مولانا حافظ عبد الرحمن مدنی صاحب نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ محمد بن عطیہ السالم سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ عبد العزیز بن عبد اللہ آل باز سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ عبد الحق ہاشمی سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ احمد بن عبد اللہ بن سالم بغدادی سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ عبد الرحمن بن حسن بن محمد بن عبد الوهاب سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ اور دادا شیخ محمد بن عبد الوهاب سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ عبد اللہ بن ابراہیم مدنی سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ عبد القادر التغلبی سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ المحدث عبد الباقی سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ احمد بن مفلح الوفائی سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ احمد بن موسی الحجاوی سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ احمد بن محمد المقدسی سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ

انہوں نے کہا: قرآن تو اس لیے ثابت ہے کہ اللہ نے قرآن مجید کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ میں نے کہا: کہاں لیا ہے؟ انہوں نے آیت پڑھی۔ میں نے کہا: قرآن کے ثبوت ہی کی بات چل رہی ہے اور آپ دلیل بھی قرآن مجید ہی سے دے رہے ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے کہ میں حدیث کو ثابت کرنے کے لیے حدیث ہی کو دلیل بناؤں۔

انہوں نے کہا: آپ کیا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا: آپ کوئی مثبت کام کریں مثلاً حدیث پر اعتراضات کی بجائے قرآن مجید کا دفاع کریں۔ انہوں نے کہا: قرآن مجید پر کیا اعتراض ہے؟ میں نے کہا: اہل مغرب نے بہت کیے ہیں اور ان اعتراض کرنے والوں کو مستشرقین (orientalists) کہتے ہیں۔ میرے پاس تقریباً اڑھائی صد تحریریں ہیں کہ جن میں مغرب کی معروف یونیورسٹیوں کے پروفیسروں نے قرآن مجید کو بائبل کی طرح تحریف شدہ کتاب ثابت کرنے کے لیے تحقیقات پیش کی ہیں، معاذ اللہ![1]

احمد بن عبد اللہ عسکری سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ علاؤ الدین مرداوی سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ ابراہیم بن قندس البعلی سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ ابن اللحام حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ ابن رجب الحنبلی سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ ابن قیم الجوزیہ سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ امام ابن تیمیہ سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ فخر ابن البخاری سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ ابن قدامہ المقدسی سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے دو استاذوں شیخ عبد القادر جیلانی اور شیخ علامہ ابن جوزی سے حاصل کیا۔ ان دونوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ ابو الوفاءعلی بن عقیل الحنبلی سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ اوروالد شیخ ابن عقیل الحنبلی اور شیخ ابو الخطاب الکلوذانی سے حاصل کیا ہے۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ ابو یعلی الفراء سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ ابن حامد الحنبلی سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ ابو بکر البغوی سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ ابو بکر الخلال سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ ابو بکر المروذی سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ امام احمد بن حنبل سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ امام محمد بن ادریس الشافعی سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ شیخ امام مالک بن انس سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ امام نافع سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے حاصل کیا۔ انہوں نے حدیث کا علم اپنے استاذ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کیا۔

[1] اس بارے ہماری کتاب "اسلام اور مستشرقین" ملاحظہ فرمائیں۔

یہ مکالمہ تو اپنے انجام کو پہنچا جبکہ ہمارے ایک دوست کا انکار حدیث کے معاشرتی رویے پر یہ تبصرہ ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام کے واقعے کی جو تفصیلات قرآن مجید میں منقول ہیں، اگر حدیث میں موجود ہوتی تو شرطیہ کہا جا سکتا ہے کہ منکرین حدیث کی وہ جماعت جو اب قرآن میں اس واقعے کے منقول ہونے کی وجہ سے اسے معقول بنانے کے لیے اس کی تاویلیں ہی کرتی رہتی ہیں، حدیث میں وارد ہونے پر جھٹ سے اس کا انکار کر دیتی۔ تو انکار حدیث علمیت نہیں بلکہ ذہنی رویہ ہے۔ اگر یہ علمی رویہ ہوتا تو جن باتوں کے حدیث میں وارد ہونے کی وجہ سے ان کا انکار کیا جاتا ہے، ویسی ہی باتوں کے قرآن مجید میں منقول ہونے پر ان کی تاویل کی جاتی ہے نہ کہ انکار۔[1] ارشاد باری تعالی ہے:

﴿فَانطَلَقَا حَتَّىٰ إِذَا لَقِيَا غُلَامًا فَقَتَلَهُ قَالَ أَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ لَّقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُّكْرًا﴾ [الکھف: 74]

”پھر حضرت موسی علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام دونوں چلے، یہاں تک کہ ایک لڑکے کو ملے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے اس لڑکے کو پکڑ کر قتل کر دیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ کیا آپ نے ایک پاک جان کو بغیر کسی جان کے عوض مار ڈالا؟ بے شک آپ نے تو بڑی ناپسندیدہ حرکت کی۔“

---

[1] انکار حدیث کے رویہ پر مفصل بحث ہم نے اپنی زیر ترتیب کتاب ”مکالمہ“ میں کی ہے۔

باب ششم

اصلاح مسالک

اس باب میں اصلاح مسلک کے ضمن میں تنقید میں اعتدال، اپنے مسلک،جماعت اور تحریک کی اصلاح، دیگر مسالک، جماعتوں اور تحریکوں سے خیر خواہی، فرقہ واریت، غلو ، تعصب اور جنت میں داخل ہونے کے حقیقی راستوں پر گفتگو کی گئی ہے۔

تنقید یا تنقیص؟

آجکل تنقید ایک عام عادت بن چکی ہے۔ تنقید اگر "تنقید برائے تنقید" نہ ہو اور اصلاح کی غرض سے ہو تو واقعتاً ایک مستحسن امر (appreciable) ہے لیکن عموماً دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگ تنقید، خیر خواہی کے جذبہ کے ساتھ نہیں بلکہ دوسروں کی عیب جوئی کے لیے کرتے ہیں۔اور تنقیدی عمل کو دوسروں کی کوتاہیوں کی نشر و اشاعت کے لیے ایک واسطہ اور ذریعہ کے طور استعمال کرتے ہیں۔ کون سے عوامل (factors) ایسے ہیں جو کسی تنقید کو تنقید برائے تنقید (undue criticism) یا تنقیص (humiliation) یا تعییب (faultfinding) سے بالاتر کرتے ہوئے ایک اصلاحی عمل بنا سکتے ہیں؟ ذیل میں ہم ان کا ایک جائزہ لے رہے ہیں:

تنقید کے اسباب اور مقاصد

اکثر ناقدین کے ہاں نقد کرتے ہوئے اسباب اور مقاصد (motives and goals) کا تعین نہیں ہوتا ہے۔ لوگوں کی تنقید کے پیش نظر تنقید برائے تنقید یا تنقیص ہوتی ہے۔ کچھ لوگ تنقید اس لیے کرتے ہیں کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ تنقید کرنا ان کے بنیادی انسانی حقوق میں سے ایک حق ہے اور اسے استعمال کرنا اسی طرح لازم ہے جس طرح کہ ووٹ کے حق کو۔ علاوہ ازیں تنقید کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ کسی نے آپ کی ذات، مسلک، جماعت پر تنقید کی ہے تو آپ نے رد عمل کی نفسیات میں اس پر تنقید شروع کر دی۔

تنقید اکثر و بیشتر خیر خواہی کے جذبہ کے تحت نہیں ہوتی ہے اگرچہ دعوی ہر ناقد کا یہی ہوتا ہے کہ وہ اپنے اس عمل سے اصلاح اور تعمیر کا طلبگار ہے۔ تنقیدی عمل میں کسی بھی ناقد کے لیے ضروری ہے کہ وہ ٹھنڈے دل و دماغ سے اپنی نیت و ارادے اور مقاصد کا جائزہ لے تا کہ یہ نہ ہو کہ جسے وہ اصلاح سمجھ رہا ہو، وہ در حقیقت اُس کی اپنی مایوسی (depression)، ناکامی (frustration)، اور تناؤ (tension) ہو جسے وہ مد مقابل پر نکال رہا ہو۔ یا ناقد فریق مخالف پر اضطراب (anxiety) نکالنے کو اعلی درجے

کی کوئی معاشرتی اور دینی خدمت سمجھ رہا ہو۔ ہماری یہ عادت ہونی چاہیے کہ تنقید کرنے کے بعد تنہائی میں اکثر اپنی تنقید کا تجزیہ کریں۔ اس طرح ناقد کو اپنی بعض باتیں درست معلوم ہوں گی تو بعض رویوں کے بارے احساس پیدا ہو گا کہ یہ صحیح نہیں ہوا اور اس کی اصلاح ہونی چاہیے۔ ہمارے معاشرے کو ہر طبقہ سے ایسے ناقدین چاہییں جو تنقید سے پہلے اپنے مخالف کے حق میں خیر خواہی کے آنسو بہاتے ہوئے دعا گو ہوں اور تنقید کے بعد اپنی طرف سے کسی ممکنہ زیادتی کے شبہے میں روتے ہوئے اپنے لیے استغفار کے طلبگار ہوں۔

تنقید کی تعریف

اکثر لوگ ناقد تو ہوتے ہیں لیکن وہ تنقید کی تعریف سے کماحقہ آشنا نہیں ہوتے۔ پس تنقید ایک اعتبار سے عیب جوئی کا مترادف بن چکا ہے۔ تنقید عربی زبان کا لفظ ہے اور اس کا مادہ (root word) ن۔ق۔د ہے اور اسی سے لفظ نقدی بھی بنا ہے۔ عربی زبان میں "نقد الدراھم" کا معنی درہموں میں چھان پھٹک کے بعد کھوٹے سکوں (coins) کو کھرے سکوں سے علیحدہ کرنا ہے۔ آسان الفاظ میں تنقید صحیح وغلط کی تمیز کا نام ہے۔ پس تنقید میں کسی چیز کا تجزیہ (analysis)، اس کی تشریح (interpretation)، اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا (evaluation) اور پسندیدگی (appreciation) بھی اس میں شامل ہے۔

ایک دفعہ ایم۔اے انگریزی ادب کی کلاس میں پروفیسر صاحب نے فرانسس بیکن کے ایک مضمون پر نقد کرنے کے لیے اسائنمنٹ دی۔ جب مطالعہ کیا تو فرانسس بیکن پر نقد کے نام پر تنقیدی پسندیدگی (critical appreciation) دیکھنے کو ملی یعنی تنقید کے نام پر بیکن کی مدح و ثنا نقل ہو رہی تھی۔ بعد ازاں پروفیسر صاحب نے وضاحت فرمائی کہ ادب میں تنقید (criticism) کا معنی صرف اگلے کی دھلائی کرنا ہی نہیں ہوتا ہے بلکہ اس کی اچھائی بیان کرنا بھی اس پر نقد کی تعریف میں شامل ہے۔

لغوی اعتبار سے بھی یہ بات درست ہے کیونکہ لغت میں بھی نقد کا معنی سکوں میں

سے کھوٹے سکوں کو علیحدہ کرنا ہے۔ پس جب کھوٹے سکے علیحدہ کریں گے تو کچھ کھرے سکے بھی ہوں گے کہ جن کی نشاندہی ہو گی۔ بس کسی شخص پر تنقید کا حقیقی معنی اس کے صحیح کو غلط سے جدا کرنا ہے اور اس معنی میں تنقید ہمارے معاشرے میں بہت کم پائی جاتی ہے۔ ہمارے ہاں تنقید تضحیک، استہزاء، طنز، کسی کی کوتاہی کے بیان اور اس کی نشر واشاعت کا دوسرا نام بن گیا ہے۔ پس تنقید میں کسی کی غلطی اور کوتاہی تو بیان ہو جاتی ہے لیکن اس کی صحیح بات کیا ہے، یہ بیان نہیں کیا جاتا ہے۔

تنقید کی اہلیت

ناقد (critic) کے لیے ایک اہم شرط یہ بھی ہے کہ وہ متعلقہ موضوع میں نقد کی اہلیت بھی رکھتا ہوں۔ اہلیت سے مراد یہ ہے کہ جس موضوع (subject)، فن (art) اور میدان (field) میں نقد کرنا ہو تو اس میں مہارت (skillfulness) اور رسوخ (expertness) حاصل ہونا چاہیے۔ کسی فن سے متعلق عمومی گفتگو کے لیے تو شاید اس فن میں مہارت تامہ اور رسوخ کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن نقد و تنقید ایک اعلی تر علمی کام ہے کہ جس کے لیے ضروری ہے کہ ناقد کا علم محض مبتدیات (foundations) تک محدود نہ ہو۔ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ نقد کا معنی صحیح کو غلط سے جدا کرنا ہے تو کسی بھی فن میں صحیح کو غلط سے جدا کرنے کا کام وہی شخص کر سکتا ہے جو اس فن کے ماہرین میں سے ہو۔ پس ایک میڈیکل فزیشن کی انجینیئرنگ اور ایک انجینیئر کی میڈیکل سائنس میں نقد غیر متعلقہ تنقید کہلائے گی کیونکہ یہ متعلقہ فنون کے رجال کی نقد نہیں ہے۔

ہمارا یہ المیہ ہے کہ سائنسز اور سوشل سائنسز کے ماہرین اپنا یہ حق سمجھتے ہیں کہ وہ مذہب اور مذہبی علوم پر نقد کریں جبکہ انہیں مذہب اور مذہبی علوم کی الف باء کا بھی علم نہیں ہوتا ہے۔ کیا یہ درست طرز عمل ہو گا کہ کوئی شخص گھر بیٹھے میڈیکل سائنس کی چند کتب کے مطالعہ کے بعد سند یافتہ گریجویٹ ڈاکٹروں پر نقد شروع کر دے۔ نفسیات میں پی ایچ ڈی کے ایک طالب علم نے ایک دینی کتاب پر یہ نقد کی کہ یہ کتاب موضوع

سے متعلق نہیں ہے جبکہ اس دینی کتاب کا موضوع اصول قانون تھا۔ انہوں نے اپنی اس تنقید کا جواز یہ پیش کیا کہ تنقید کرنا ان کا بنیادی حق ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ تنقید ہر شخص کا بنیادی حق نہیں ہے بلکہ یہ اس شخص کا حق ہے جو تنقید کا اہل ہے۔ اور جس علم (science) پر نقد کر رہا ہے، اس علم کے ماہرین میں سے ہو۔ بعض علماء نے جو فلسفہ و منطق یا فلکیات و علم کلام میں ناقدانہ تحقیقات پیش کی ہیں تو اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ صدیوں یہ علوم مدارس دینیہ کے نصاب میں شامل رہے ہیں لہذا وہ علماء ان علوم و فنون کے ماہرین میں شمار ہوتے تھے۔

شخصی اور علمی نقد

عام طور تنقید میں کسی شخص کے افکار و نظریات کی بجائے اس کی ذات اور شخصیت کو رگیدا جاتا ہے۔ شخصی تنقید کو دراصل تنقیص کہنا چاہیے۔ اس کی بنیاد عموماً علمی رویہ (academic approach) نہیں ہوتا ہے بلکہ حد سے بڑھا ہوا تعصب، انتہا پسندی اور جذباتی نفسیات ہوتی ہیں۔

اگر دفع مضرت (warding off some harm) کی غرض سے شخصی نقد ناگزیر ہو بھی جائے تو بھی اعلانیہ نہ ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی بھی شخص کی اعلانیہ برائی کو پسند نہیں فرماتے ہیں الا یہ کہ کسی کے ساتھ ظلم ہوا ہو تو مظلوم کے لیے جائز ہے کہ وہ اپنا بدلہ لینے کے لیے ظالم پر اعلانیہ نقد کرے۔ دوسری بات یہ ہے کہ نقد اگر علمی ہو تو اس علمی نقد کی بنیاد بھی تعصب اور گروہی نسبت نہ ہو۔ جب ہم تعصب اور ضد کا نام لیتے ہیں تو فوراً ہمارے ذہن میں اہل مدرسہ آجاتے ہیں۔ بلاشبہ اہل مدرسہ میں بھی تعصب ہے لیکن یونیورسٹی میں بھی تعصب موجود ہے۔

عصر حاضر کے برطانوی ماہر فلکیات اور معروف ریاضی دان اسٹیون ہاکنگ نے لکھا ہے کہ روسی ریاضی دان (mathematicians) محض تعصب کی بنیاد پر امریکی ریاضی دانوں کی تحقیقات کا رد کرتے ہیں۔[1] ان کی سوچ ہی یہ بن چکی ہے کہ چونکہ

[1] Stephen Hawking, A Brief History of Time from Big Bang to Black Holes, Bantam

امریکی محقق مارکسی (Marxist) نہیں ہیں لہذا ہر حال میں ہم نے ان کا رد ہی کرنا ہے۔ یہی رویہ اہل مذہب میں بھی ہے کہ چونکہ فلاں عالم دین، فلاں مکتبہ فکر سے تعلق رکھتا ہے تو اب میرا یہ بنیادی فرض ہے کہ میں اس کی کسی بھی بات کی تائید نہ کروں یا اس کی ہاں میں ہاں نہ ملاؤں، چاہے وہ میرے نزدیک حق ہی کیوں نہ کہہ رہا ہو۔ ہمارے ہاں علمی نقد میں اس اصول کا بہت عمل دخل ہوتا ہے کہ فلاں کا تعلق ہمارے مکتبہ فکر ہے یا نہیں۔ علمی نقد کی بنیاد کسی بھی قسم کا جماعتی، گروہی، قومی، لسانی، شخصی یا ذاتی تعصب نہیں ہونا چاہیے ورنہ ایک غیر متوازن اور غیر معتدل نقد سامنے آئے گی۔ اس معاملہ میں مجھ سمیت ہم سب کو اصلاح کی اشد ضرورت ہے۔

غیر متعلق نقد

ہمارے ہاں اکثر نقد ایسی ہوتی ہے جو غیر متعلق ہوتی ہے۔ مثال کے طور آپ کسی شخص سے مباحثہ کے دوران گرما گرمی میں اس کے خاندان، مسلک اور بڑوں کو رگیدنا شروع کر دیں تو یہ مناسب نہیں ہے۔ میاں بیوی کی لڑائی میں بھی ایک دوسرے کے متعلقین کو نشانے پر دھر لیا جاتا ہے جو کہ ایک غیر مناسب رویہ ہے۔ جب آپ کا مکالمہ کسی شخص سے جاری ہو تو یہ غیر متعلق نقد ہے کہ آپ اس کے متعلقین پر چڑھائی کر دیں۔ غیر متعلقہ تنقید کی مثال یہ بھی ہے کہ آپ نے کسی موضوع پر کسی ایک فن کی روشنی میں گفتگو کی ہے اور اب ایک دوسرے صاحب اس پر ایک دوسرے فن کی روشنی میں نقد شروع کر دیتے ہیں۔ آپ نے تاریخ پر ایک مقالہ لکھا ہے اور ایک صاحب علم نفسیات اور اس کے اصولوں کی روشنی میں اس مقالے کا معیار جانچنے کی کوشش کرتے ہیں اور آپ کے مقالہ کو ایک غیر معیاری مقالہ قرار دے دیتے ہیں۔ اسی طرح کوئی ناقد کسی فلسفی کے فلسفے کو سائنسی تجربہ گاہ میں پرکھنا چاہتے ہیں۔ اور کوئی ناقد کیمسٹری اور بائیالوجی کو علم منطق کے معیارات کی روشنی میں دیکھ رہا ہے۔ دونوں صورتوں میں یہ غیر متعلق نقد ہے۔

Books, 1998, USA, p. 50

اسی طرح جب ماہرین نفسیات نے علم وحی کو علم نفسیات کی روشنی میں سمجھنا چاہا تو انبیا و رسل پر نازل شدہ وحی کو کبھی بچپن کی نامکمل خواہشات، کبھی خوابات اور کبھی جنون سے جوڑ دیا حالانکہ علم وحی اور علم نفسیات کا موضوع کلیتاً الگ ہے۔ اہل سائنس کی مذہب پر نقد کی نوعیت بھی ایسی ہی ہے کہ وہ مذہب کو سائنسی اصولوں کی روشنی میں پرکھنا چاہتے ہیں۔ وہ مافوق العقل (supernatural) کو عقل اور مافوق الحواس کو حواس کے ذریعے جانچنا چاہتے ہیں۔ کسی چیز کے معیار کو پرکھنے کا یہ اسلوب ایک غیر علمی اسلوب ہے۔

غیر متعلقہ تنقید کی مثال وہ نقد بھی ہے جو کسی گفتگو کے موضوع اور مرکزی خیال سے ہٹ کر ہو۔ پس معیاری تنقید کے لیے لازم امر ہے کہ وہ متعلقہ فن کے اصول وضوابط، مبتدیات و معیارات کی روشنی میں ہو۔

اصلاحی تنقید

اگر تو تنقید کا مقصد اصلاح ہو تو کسی شخص کی غلطیاں بیان کرنے سے پہلے اس کی خوبیوں کو سراہا جائے۔ ہمارے ہاں کسی صاحب میں بیسیوں خوبیاں ہوتی ہیں لیکن ہم اس پر نقد کے دوران ان کا ذکر مناسب نہیں سمجھتے۔ اگر خوبیوں کا ذکر نہ بھی کیا جائے اور صرف اتنی بات ہو جائے کہ فلاں صاحب کے کلام میں یہ بات تو درست ہے لیکن فلاں بات سے مجھے اتفاق نہیں ہے تو اس سے بھی اصلاح کے امکانات بہت بڑھ جاتے ہیں۔

ہمارے ہاں عام طور پر نقد کا آغاز اس بات سے ہوتا ہے کہ مجھے فلاں سے یہ اختلاف ہے جبکہ اصلاح کی غرض سے کی جانے والی نقد کا آغاز یوں ہو گا کہ مجھے فلاں سے ان باتوں میں اتفاق ہے لیکن فلاں بات میں نہیں ہے یعنی بات کا آغاز یوں کرنا چاہیے۔ مخالف کی کسی خوبی کی تعریف، اس کی بعض باتوں کو سراہنے اور ان سے اتفاق رائے کر لینے سے ہماری علمی دھاک، معاشرتی مقام اور روحانی مرتبے میں کسی قسم کی کوئی کمی نہیں آئے گی۔ بعض لوگوں کو جیسے یہ وہم ہوتا ہے کہ اگر انہوں نے مخالف کی کچھ تعریف کر دی تو اس کا پلڑا بھاری ہو جائے گا گویا کہ علمی مکالمہ نہ ہو رہا ہو، کوئی دنگل

(wrestling) ہو رہا ہو۔

اگر کسی شخص کی ایک صد تحریریں ہیں اور کوئی صاحب ان کی ایک دو تحریروں سے عدم اتفاق کی بنا پر ان پر نقد شروع کر دیتے ہیں تو یہ نقد ان کا حق تھا لیکن انہیں اس نقد سے پہلے اس شخص کی اکثر تحریروں کا مطالعہ کر لینا چاہیے تھا تا کہ اختلاف کے ساتھ ساتھ اتفاقات بھی سامنے آ جاتے۔ اس تفصیلی مطالعہ کا نتیجہ یہ نکلتا کہ جس پر آپ نقد کر رہے ہوتے ہیں، اس کی شخصیت کا ہر پہلو آپ کے سامنے نکھر کر آ جاتا ہے اور نقد میں توازن پیدا ہو جاتا ہے۔

سطحی تنقید

سطحی تنقید وہ ہے جو مخالف کا اصل موقف سمجھے بغیر کی گئی ہو۔ کسی ایم۔ فل یا پی۔ ایچ۔ ڈی کے مقالہ سے بھی عدم اتفاق دو سطروں میں بھی ہو سکتا ہے لیکن اسے نقد کا نام نہیں دینا چاہیے۔ نقد اپنی نوعیت کے اعتبار سے ایک اعلیٰ تر علمی اور تحقیقی کام ہے نہ کہ عدم اتفاق کا اعلان۔ کسی کو غلط ٹھہرانے کی بنیاد علمی دلائل اور ٹھوس تجزیہ ہونا چاہیے نہ کہ شاہی اسالیب اور جرنیلی لب ولہجہ۔

جذباتی تنقید

جذباتی تنقید کوئی بری چیز نہیں ہے۔ عقل پرستوں نے یہ غلط فہمی عام کر رکھی ہے کہ جس تنقید کی اہمیت کم کرنی ہو اسے جذباتی تنقید کا عنوان دے دیتے ہیں۔ ایمان اور تقویٰ بھی تو ایک جذبہ ہی ہے تو کیا ایمان اور تقویٰ کی بنیاد پر کی جانے والی تنقید غلط تنقید ہو گی؟ اسی طرح خیر خواہی اور غیرت بھی ایک جذبہ ہی ہے اور ان دونوں بنیادوں پر کی جانے والی تنقید میں کوئی حرج نہیں ہے کیونکہ یہ مثبت جذبات ہیں۔ البتہ یہ بات درست ہے کہ بعض جذبات منفی ہوتے ہیں جیسا کہ بغض اور نفرت وغیرہ تو ایسے منفی جذبات کی بنیاد پر کی گئی تنقید مناسب نہیں ہے۔ تنقید ہمیشہ عقلی نہیں ہوتی بلکہ بعض اوقات جذباتی بھی ہوتی ہے۔

مسلکی اور جماعتی نام

اس بارے اہل علم کا اختلاف ہے کہ مسلکی اور جماعتی نام اپنے ساتھ لگانا ضروری ہے یا نہیں۔ بعض اس کو ضروری سمجھتے ہیں جبکہ بعض کے نزدیک اصل چیز سوچ اور رویہ ہے جو کہ صحیح ہونا چاہیے، نام چاہے کچھ بھی ہو، اس سے فرق نہیں پڑتا۔ اگر آپ کا عقیدہ اور اخلاق درست نہیں ہے تو آپ کو اہل حدیث، سلفی، صوفی، دیوبندی، بریلوی، چشتی اور نقشبندی لاحقے آخرت میں کچھ کام نہ آئیں گے۔ پس اصل نام نہیں ہے بلکہ فکر و عمل ہے، وہ درست ہونا چاہیے۔

یہود و نصاریٰ میں بھی ایک وقت میں ناموں کے بارے حساسیت بہت بڑھ گئی تھی، یہاں تک کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے بھی اختلاف کرنے لگے۔ یہودیوں نے کہا کہ وہ یہودی تھے اور عیسائیوں نے کہا کہ عیسائی تھے۔ اس پر اللہ عزوجل کی طرف یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿مَا كَانَ إِبْرَاهِيمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَـٰكِن كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾ [آل عمران: 68]

"حضرت ابراہیم علیہ السلام نہ تو یہودی تھے اور نہ ہی عیسائی بلکہ وہ یکسو مسلمان تھے اور مشرکوں میں سے نہیں تھے۔"

ہمارے ہاں شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کے بارے یہ مکالمہ ہوا ہے کہ وہ بریلوی تھے، دیوبندی یا اہل حدیث۔ ہر مکتبہ فکر نے انہیں اپنا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جبکہ ہمارے خیال میں اس کی ضرورت نہ تھی۔

مسلکی اور جماعتی نام رکھنے کی نہ تو ممانعت ہے اور نہ ہی یہ اسلام میں حرام ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ جب ان ناموں کے بارے حساسیت اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ یہ اسلام کا مترادف قرار پانا شروع ہو جاتے ہیں تو ایسی سوچ شریعت کی نظر میں درست نہیں ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ہم خیر القرون صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تابعین اور تبع تابعین رحمہم اللہ کی زندگیوں کو اپنانے کی کوشش کریں اور دوسروں کو بھی اس کی دعوت دیں۔ اور کوئی آپ

پر کسی مسلک اور جماعت کا لیبل لگاتا ہے یا نہیں یا کسی مسلک اور جماعت میں شامل کرتا ہے یا نہیں، اس سے صرف نظر کرتے ہوئے بس اصلاح کا کام کرتے جائیں۔

عمل نہ ہو تو مسلکی، خانقاہی اور جماعتی نسبتیں کچھ بھی کام نہ آئیں گی۔ کیا نبی کریم ﷺ کے امتی ہونے سے بڑھ کر کوئی نسبت ہو سکتی ہے؟ نہیں ہر گز نہیں! تو یہ نسبت بھی قیامت والے دن صرف اسی صورت کام آئے گی جبکہ کچھ عمل ہاتھ میں ہو گا تو دوسری نسبتوں کا کیا بھروسہ؟ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: لَمَّا أُنْزِلَتْ هَذِهِ الْآيَةُ {وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ}، دَعَا رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قُرَيْشًا، فَاجْتَمَعُوا فَعَمَّ وَخَصَّ، فَقَالَ: «يَا بَنِي كَعْبِ بْنِ لُؤَيٍّ، أَنْقِذُوا أَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ، يَا بَنِي مُرَّةَ بنِ كَعْبٍ، أَنْقِذُوا أَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ، يَا بَنِي عَبْدِ شَمْسٍ، أَنْقِذُوا أَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ، يَا بَنِي عَبْدِ مَنَافٍ، أَنْقِذُوا أَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ، يَا بَنِي هَاشِمٍ، أَنْقِذُوا أَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ، يَا بَنِي عَبْدِ الْمُطَّلِبِ، أَنْقِذُوا أَنْفُسَكُمْ مِنَ النَّارِ، يَا فَاطِمَةُ، أَنْقِذِي نَفْسَكِ مِنَ النَّارِ، فَإِنِّي لَا أَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللهِ شَيْئًا، غَيْرَ أَنَّ لَكُمْ رَحِمًا سَأَبُلُّهَا بِبَلَالِهَا»[1]

"حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی کہ آپ ﷺ اپنے قریبی رشتہ داروں کو ڈرائیں تو آپ ﷺ نے قریش کی دعوت کی۔ پس ان کے عام وخاص سب جمع ہوئے۔ آپ نے کہا: اے بنو کعب! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ اے بنو مرۃ! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ اے بنو شمس! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ اے بنو عبد مناف! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ اے بنو ہاشم! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ اے بنو عبد المطلب! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔ اے فاطمہ بنت محمد ﷺ! اپنے آپ کو جہنم کی آگ سے بچائیں۔ بلاشبہ میں تمہیں اللہ کے مقابلہ میں کچھ کام نہ آؤں گا۔ البتہ جو تمہارے ساتھ رشتہ داری ہے تو اس میں صلہ رحمی کروں گا۔"

[1] صحيح مسلم، كتاب الإيمان، بَابٌ فِي قَوْلِهِ تَعَالَى: وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ، 192/1

مسلکی اور جماعتی نام کی شرعی حیثیت

کچھ دوستوں نے ہماری سابقہ تحریر پر شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ اس بارے ہم یہ وضاحت کیے دیتے ہیں کہ ہم نے یہ نہیں کہا کہ مسلکی یا جماعتی نام نہیں رکھا جا سکتا۔ آپ اپنے ساتھ بریلوی، دیوبندی، سلفی، نقشبندی اور چشتی کا لاحقہ لگائیں، ہمیں کوئی ٹینشن نہیں ہے اور نہ ہمارا اس قسم کے نام رکھنے پر آپ سے کوئی بحث کرنے کا ارادہ ہے۔ ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اگر کچھ لوگ مسلکی نام کے لاحقے کے بغیر اسلام کی فکر کو پھیلانا اور عام کرنا چاہتے ہیں، تو آپ کے پاس وہ کون سی شرعی دلیل ہے کہ جس کے مطابق جماعتی نام رکھ کر ہی اسلام کی دعوت وفکر کو پھیلانا واجب یا فرض قرار پاتا ہے؟

آپ جماعتی اور مسلکی نام رکھنے کی شرعی حیثیت بیان کریں کہ یہ نام رکھنا واجب ہے یا فرض، مستحب یا مباح۔ ہمارے نزدیک اس کا درجہ مباح (allowed) کا ہے۔ آپ کے نزدیک جو درجہ ہے آپ اس کے مطابق کوئی شرعی حکم بیان کریں اور اس کی دلیل بھی نقل فرمادیں۔ ہم اس دلیل پر غور کرلیں گے اور اگر دلیل قابل غور ہوئی تو اپنی بات سے رجوع کرلیں گے۔ اور اگر جماعتی یا مسلکی نام رکھنا فرض یا مستحب ہے تو یہ بھی بیان کردیں کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے یہ فرض یا مستحب پورا کیوں نہ کیا؟

اگر تو آپ بھی جماعتی اور مسلکی نام رکھنے کو مباح اور جائز سمجھتے ہیں تو معلوم نہیں آپ بحث کس چیز پر کرنا چاہ رہے ہیں؟ قانون اسلامی میں مباح کام وہ ہوتا ہے کہ جس کا کرنا جائز ہو اور نہ کرنا بھی جائز ہو۔ اور اگر آپ یہ سمجھتے ہیں کہ صرف جماعتی اور مسلکی نام کا لیبل ہی آپ کی نجات کے لیے کافی ہے تو اس صورت میں آپ کو اس آیت مبارکہ کے معانی ومفاہیم پر غور کرنا چاہیے:

﴿إِنْ هِيَ إِلَّا أَسْمَاءٌ سَمَّيْتُمُوهَا أَنتُمْ وَآبَاؤُكُم مَّا أَنزَلَ اللَّـهُ بِهَا مِن سُلْطَانٍ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْأَنفُسُ وَلَقَدْ جَاءَهُم مِّن رَّبِّهِمُ الْهُدَىٰ﴾ [الشوری: 23]

"وہ تو صرف نام ہی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے گھڑ لئے ہیں۔ خدا نے تو ان کی کوئی سند نازل نہیں کی۔ یہ لوگ محض ظن (فاسد) اور

خواہشات نفس کے پیچھے چل رہے ہیں حالانکہ ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس ہدایت آچکی ہے۔"

فرقہ واریت

صحابہ اور تابعین ایک عقیدے اور منہج کے حامل تھے لیکن انہوں نے اپنے لیے کوئی جماعتی نام مخصوص نہیں کر رکھا تھا۔ اور نام رکھنے میں بھی کوئی حرج نہیں ہے بشرطیکہ اس کا مقصد تعارف ہو۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ [الحجرات: 13]

"اور ہم نے تمہیں قوموں اور قبائل میں تقسیم کیا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کا تعارف حاصل کرو۔ بلاشبہ تم میں سے اللہ کے ہاں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے، جو سب سے زیادہ متقی ہے۔"

اگر تو جماعتی نام مثلاً اہل حدیث کہلوانے کا مقصد اہل الرائے کے بالمقابل اپنا تعارف ہو تو اس مقصد سے مسلکی نام استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ تاریخ فقہ اسلامی کی کتب میں اہل الحدیث اور اہل الرائے کی تقسیم واضح طور موجود ہے۔ اہل الحدیث کا مرکز مدینہ تھا اور ان کے امام، امام مالک رحمہ اللہ تھے جبکہ اہل الرائے کا مرکز کوفہ تھا اور ان کے امام، امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تھے۔

لیکن مسئلہ کسی بھی مسلک کی معاصر جمعیت کا ہے کہ جس کے کچھ امتیازی اخلاقی معیارات، ترجیحات، مقاصد، مناہج دعوت، اسالیب تبلیغ اور باہمی جماعتی نزاعات واختلافات ہوتے ہیں کہ جن میں سے بعض باتوں سے ہمیں اتفاق نہیں ہوتا۔ پس اس مسلک کا اپنے اوپر لیبل چسپاں کرنے کا مطلب یہی سمجھا جاتا ہے کہ ہمیں اس جمعیت کے تمام افکار، رویوں اور سرگرمیوں سے اتفاق ہے۔

پس اگر جماعتی نام سے مقصود فرقہ واریت ہو تو ایسی صورت میں جماعتی نام کو اپنا تشخص بنانا درست معلوم نہیں ہوتا۔ جماعتی ناموں کے فوائد اپنی جگہ لیکن اس میں بھی شک نہیں ہے کہ ان ناموں سے ہمارے معاشرے میں فرقہ واریت بھی پیدا ہوئی

ہے۔ اپنی بات کو ایک مثال سے واضح کرتا ہوں۔ ایک بار رمضان المبارک میں جامعہ البیت العتیق میں نماز تراویح کے وقفے میں بیان کے دوران راقم نے یہ کہا:

"فروعی مسائل میں بعض اوقات ایک سے زیادہ اقوال کی گنجائش نکلتی ہے لہذا ہمیں سختی نہیں کرنی چاہیے جیسا کہ ہمارے ہاں اہل حدیث اہل علم میں بھی اختلاف ہو جاتا ہے مثلاً بعض تشہد کی حالت میں ایک دفعہ انگلی کا اشارہ کرنا کافی سمجھتے ہیں جبکہ بعض مسلسل حرکت دینے کا فتوی جاری کرتے ہیں۔ بعض رکوع کے بعد ہاتھ باندھنے کا فتوی دیتے ہیں جبکہ اکثر رکوع کے بعد ہاتھ کھولنے کا کہتے ہیں۔ اسی طرح بعض رکوع کی رکعت کے قائل ہیں اور اکثر قائل نہیں ہیں۔ اکثر جہری اور سری دونوں نمازوں میں فاتحہ خلف الامام کے قائل ہیں اور بعض صرف سری [خاموش] نمازوں میں اس کے پڑھنے کی اجازت دیتے ہیں کہ جن میں امام خاموشی سے تلاوت کرتا ہے۔"

چار رکعات تراویح کے درمیانی وقفہ میں مجھے ایک اہل حدیث نوجوان ملا اور کہنے لگا کہ آپ نے یہ کیا بیان کر دیا کہ رکوع کی رکعت ہو جاتی ہے۔ میں نے کہا کہ پہلی بات تو یہ ہے کہ میں نے یہ بیان نہیں کیا کہ رکوع کی رکعت ہو جاتی ہے بلکہ یہ کہا ہے کہ بعض اہل حدیث علماء کا فتوی ہے کہ رکوع کی رکعت ہو جاتی ہے مثلاً شیخ بن باز رحمہ اللہ۔

نوجوان نے کہا کہ جب حدیث میں ہے کہ سورہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی تو شیخ بن باز رحمہ اللہ کون ہے؟ اس پر میں نے اپنی مادر علمی کے بعض شیوخ کا تذکرہ کیا کہ جو رکوع کی رکعت کے قائل تھے لیکن وہ نوجوان بضد تھے کہ رکوع کی رکعت ہوتی ہی نہیں، مجتہد اور مفتی کی بھی۔ چلیں! یہاں تک تو بات سمجھ میں آتی ہے کہ اگر اہل علم میں دو آراء ہیں تو آپ ایک رائے کے قائل ہیں لیکن اس نوجوان کا یہ بھی اصرار تھا کہ یہ بات کہ اِس مسئلہ میں اہل حدیث علماء میں اختلاف ہے، بھی بیان نہیں ہونی چاہیے تھی۔ اب اس جذباتیت اور جہالت کا کوئی علاج نہیں ہے۔

اب یہ شدت پسندی ایک ہی مسلک اور فرقے میں زیادہ دیکھنے کو مل رہی ہے اور ایک ہی مسلک اور فرقے سے تعلق رکھنے والے اپنے ہی مسلک اور فرقے کے لوگوں کو

چھوٹے چھوٹے اختلافات کی بنیاد پر مسلک اور فرقے سے اندر باہر کرنے کی عظیم خدمت سرانجام دے رہے ہیں۔اس بدترین فرقہ واریت کا حل یہی ہے کہ ایک مسلک سے وابستہ علماء کو دوسرے مسلک کے اہل علم کے لیے بھی اختلاف کی گنجائش باقی رکھنی چاہیے۔ ورنہ تو فرقہ واریت ایک مزاج ہے، یہ صرف دوسرے فرقے سے نہیں الجھتا بلکہ اپنے فرقے میں بھی موجود ہر دوسرے شخص سے الجھ پڑتا ہے۔

معاملہ یہیں ختم نہ ہوا بلکہ اگلے دن وہ نوجوان چار مناظر اپنے ساتھ لے آئے۔ چار رکعات تراویح کے بعد انہوں نے مجھے اپنے ساتھ بٹھالیا اور سمجھانا شروع کر دیا۔ ایک صاحب کی تو ڈاڑھی بھی نہ تھی، مزدور پیشہ لگتے تھے لیکن بحث میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے تھے۔ اسی طرح اس علمی مناظرہ میں جو سب سے پیش پیش تھے، انہیں ترجمہ قرآن بھی نہ آتا تھا، بس حدیث کی چند ترجمہ شدہ کتابوں کے بعض ابواب کا مطالعہ کیا ہوا تھا۔ میں نے انہیں کئی بار سمجھایا کہ میں مناظرے کے میدان کا آدمی نہیں ہوں، میں نے کچھ غلط بیان نہیں کیا ہے، زیادہ حساسیت کی ضرورت نہیں ہے، لیکن بات ان کے پلے نہیں پڑ رہی تھی۔ اس دوران تراویح کی نماز ہوتی رہی اور ہم مسجد کے صحن میں صف کے آخر میں بیٹھے گفتگو کرتے رہے۔ اس طرح تقریباً بیس منٹ کا قیام اللیل انہوں نے خود بھی ضائع کیا اور میرا بھی کروایا۔ اور یہ اصحاب تقریباً 15 کلو میٹر کا سفر کر کے یہاں آئے تھے، مجھے سمجھانے کے لیے۔ بہر حال میں نے ان سے معذرت کی اور کہا کہ ہمیں اس وقت نماز میں قیام کرنا چاہیے کہ جس پر ہم سب کا اتفاق ہے کہ وہ نیکی کا کام ہے لیکن وہ وفد اس بات پر بضد تھا کہ میں قیام اللیل کی بجائے یہ وقت ان سے مناظرہ میں گزاروں کہ یہ ان کے نزدیک قیام اللیل سے بڑھ کر نیکی کا کام تھا۔ میں معذرت کر کے قیام اللیل میں شامل ہو گیا جبکہ یہ مناظر حضرات آدھ گھنٹہ پیچھے بیٹھ کر آپس میں کھسر پھسر کرتے رہے لیکن انہیں قیام اللیل جیسی نیکی میں شامل ہونے کی توفیق نہ ہوئی۔

اور اگر وہ اپنی اس بد عملی پر اس حدیث سے استدلال کریں کہ عالم کو عابد پر فضیلت

ہے تو اسے جہل مرکب نہ کہیں تو کیا کہیں؟ اسی لیے میں یہ کہتا ہوں جماعتی اور مسلکی مبلغین یہ غور کریں کہ ان کی ترجیحات کیا ہیں؟ مناظرے ومباحثے یا تقوی وللہیت؟ اب اس میں اس نوجوان کا کوئی قصور نہیں ہے کیونکہ اسے اہل حدیث کرنے والوں کے نزدیک اہل حدیث ہونا آٹھ سے دس مسائل کا نام ہے اور اسے جب پوری اہل حدیثیت انہی مسائل کے گرد گھومتی نظر آئے گی تو اس کی زندگی کا مقصد انہی فروعی مسائل کے لیے جینا مرنا ہی قرار پائے گا حالانکہ اکابر اہل حدیث علماء کا فروعی مسائل میں منہج اور رویہ بالکل مختلف تھا۔[1]

یہود پر بھی ایک زمانہ ایسا آیا کہ وہ موسوی شریعت کے ظاہری پہلو میں اس قدر الجھے کہ اپنی باطنی اصلاح سے کلی طور غافل ہو گئے۔ اس زمانہ میں ان میں تورات کے بڑے بڑے فقہاء اور علماء تو موجود تھے اور ظاہر شریعت پر عمل بھی خوب ہو رہا تھا لیکن منکسر المزاجی، تواضع، انکساری، نرم دلی، خدا خوفی، للہیت، خشیت، تقوی اور تقرب الی اللہ جیسے اوصاف حسنہ مفقود تھے تو اللہ تعالی نے ان کی اصلاح اور تربیت کے لیے حضرت عیسی علیہ السلام کو مبعوث فرمایا۔ حضرت عیسی علیہ السلام کے معاصر انجیل میں موجود خطبات سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے علمائے یہود کو اپنے باطن کی اصلاح اور تزکیہ نفس نہ کرنے کی وجہ سے شدید تنقید کا نشانہ بنایا۔ ایک جگہ انجیل میں ہے:

"اس وقت یسوع یعنی حضرت عیسی علیہ السلام نے بھیڑ سے اور اپنے شاگردوں سے یہ باتیں کیں کہ فقیہ اور فریسی [یہودی علماء] موسی علیہ السلام کی گدی پر بیٹھے ہیں۔ پس جو کچھ وہ تمہیں بتائیں وہ سب کرو اور مانو لیکن انکے سے کام نہ کرو کیونکہ وہ کہتے ہیں اور کرتے نہیں۔ وہ ایسے بھاری بوجھ جن کو اٹھانا مشکل ہے، باندھ کر

[1] شیخ الکل فی الکل مولانا نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ نے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو مجتہد اور متبع سنت جبکہ علامہ ابراہیم سیالکوٹی رحمہ اللہ نے اہل سنت کے بزرگ امام قرار دیا۔ مولانا محمد حسین بٹالوی رحمہ اللہ کہتے تھے کہ میں اجتہادی مسائل میں امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا مقلد ہوں جبکہ مولانا اسماعیل سلفی، حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کو اہل الحدیث کا امام اور مجتہد قرار دیتے ہیں۔ تو یہ اکابر اہل حدیث علماء کا احناف کے ائمہ سے حسن سلوک تھا۔ کسی سے اختلاف کا یہ مطلب تھوڑی ہے کہ اخلاق کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا جائے۔

لوگوں کے کندھوں پر رکھتے ہیں مگر آپ ان کو اپنے انگلی سے بھی ہلانا نہیں چاہتے۔ وہ اپنے سب کام لوگوں کو دکھانے کو کرتے ہیں کیونکہ وہ اپنے تعویذ بڑے بناتے اور اپنی پوشاک کے کنارے چوڑے رکھتے ہیں۔ اور ضیافتوں میں صدر نشینی اور عبادت خانوں میں اعلیٰ درجہ کی کرسیاں۔ اور بازاروں میں سلام اور آدمیوں سے ربی [علماء] کہلانا پسند کرتے ہیں... اے ریاکار و فقیہو اور فریسیو [یہودی علماء کی جماعت] تم پر افسوس! کہ آسمان کی بادشاہی لوگوں پر بند کرتے ہو کیونکہ نہ تو آپ داخل ہوتے ہو اور نہ داخل ہونے والوں کو داخل ہونے دیتے ہو۔ اے ریاکار و فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! تم بیواؤں کا گھر دبا بیٹھے ہو اور دکھاوے کے لیے نماز کو طول دیتے ہو، تمہیں زیادہ سزا ہو گی۔ اے ریاکار و فقیہو فریسیو تم پر افسوس! کہ ایک مرید کرنے کے لیے تری اور خشکی کا دورہ کرتے ہو اور جب وہ مرید ہو چکتا ہے تو اسے اپنے سے دُونا جہنم کا فرزند بنا دیتے ہو... اے ریاکار و فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ پودینہ اور سونف اور زیرہ پر تو 'دہ یکی' [زکوۃ] دیتے ہو، پر تم نے شریعت کی زیادہ بھاری باتوں یعنی انصاف اور رحم اور ایمان کو چھوڑ دیا ہے۔ لازم تھا کہ یہ بھی کرتے اور وہ بھی نہ چھوڑتے۔ اے اندھے راہ بتانے والو! جو مچھر چھانتے ہو اور اونٹ نگل جاتے ہو... اے ریاکار و فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس! کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو اوپر سے تو خوبصورت دکھائی دیتی ہیں مگر اندر مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی نجاست سے بھری ہیں۔ اسی طرح تم بھی ظاہر میں تو لوگوں کو راستباز دکھائی دیتے ہو مگر باطن میں ریاکاری اور بے دینی سے بھرے ہو... اے سانپو! اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے؟"[1]

میرا کوئی فرقہ نہیں ہے

ہمارے ہاں یہ جملہ (statement) ایک فیشن کی صورت اختیار کرتا چلا جا رہا ہے کہ میرا کوئی فرقہ نہیں ہے۔ انسان ہمیشہ سے دو انتہاؤں میں جینے کا عادی رہا ہے کہ ایک

[1] متی کی انجیل: باب: 23، آیت: 33-1، بائبل سوسائٹی، انار کلی، لاہور

شر سے نکلا تو دوسرے شر میں جا گھسا اور درمیان میں کوئی مقام اعتدال نہیں ہے کہ جہاں پڑاؤ ڈالا جائے۔ جس طرح فرقہ واریت ایک شر بن چکی ہے، اسی طرح فرقہ واریت کا رد کرنے والے خود ایک بدترین فرقے کا سا رویہ اور اخلاق پیش کر رہے ہیں۔

مثلاً کچھ لوگوں نے کہا کہ ہمارا کوئی فرقہ نہیں ہے، ہم مسلمان ہیں کہ اللہ عزوجل نے قرآن مجید میں ہمارا نام مسلمان رکھا ہے۔ پس انہوں نے اپنے آپ کو "جماعت المسلمین" کہلوانا شروع کیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ اپنی رجسٹرڈ جماعت المسلمین کے چند صد اراکین کے علاوہ سب کو غیر مسلم ہونے کا سرٹیفکیٹ دے دیا۔[1]

یہ ذہن میں رہے کہ فرقہ واریت ایک مزاج ہے جو اس شخص میں بھی ہو سکتی ہے جو صبح و شام فرقہ واریت کے رد میں وعظ کر رہا ہو۔ فرقہ وارانہ مزاج ایک منفی مزاج ہے کہ جس میں ہمیشہ کسی فرد یا مسلک کی کمی کوتاہی کو بیان کر کے اس کی ذات اور جماعت کو مسخ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ کسی کی برائی کو اچھالا جاتا ہے اور اچھائی کو چھپایا جاتا ہے۔ انسان اپنے علاوہ سب کو غلط سمجھتا ہے اور اس کا جینا مرنا دوسروں کا رد بن جاتا ہے۔ اس کا مثبت کام آپ کو دیکھنے کو نہ ملے گا لیکن منفی کام بہت ہو گا۔ یہی وجہ ہے کہ منفی ذہن رکھنے والے لوگ اس کے گرد جمع ہوتے چلے جاتے ہیں اور وہ فرقہ واریت کا رد کرتے کرتے خود ایک فرقہ بن جاتے ہیں کہ اپنے سے اختلاف برداشت ہی نہیں کر پاتے۔ ایسے لوگ اس قدر سمجھدار ہوتے ہیں کہ انہیں تو دوسروں سے اختلاف کا حق

---

[1] جماعت المسلمین رجسرڈ کی بنیاد جناب سید مسعود احمدبی۔ایس۔سی (1915-1997) نے ڈالی۔ موصوف پہلے بریلوی مسلک سے تعلق رکھتے تھے۔ بعد ازاں اہل حدیث ہو گئے۔ پھر بعض اہل حدیث علماء سے بد ظن ہو کر اہل حدیث کو بھی ایک فرقہ قرار دیا اور اپنی جماعت، جماعت المسلمین کی بنیاد رکھی اور یہ دعوی کیا کہ حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی اور اہل حدیث پانچوں مذاہب اسلام کے خلاف ہیں۔ [سید وقار علی شاہ، افکار وعقائد وفتاوی جماعت المسلمین رجسٹرڈ کراچی، ضیاء سنز پرنٹرز، پشاور، 2002ء، ص 39]۔ ان کے علاوہ ایک اور صاحب کیپٹن ڈاکٹر مسعود الدین عثمانی ہیں کہ جو فرقہ واریت کے سخت خلاف ہیں اور اپنے آپ کو مسلمان کہلواتے ہیں اور بریلوی، دیوبندی اور اہلحدیث تینوں کو مشرک قرار دیتے ہیں۔ [خواجہ محمد قاسم، کراچی کا عثمانی مذہب اور اس کی حقیقت، ادارہ اشاعت القرآن والحدیث، پاکستان، ص 124-125]۔

حاصل ہوتا ہے لیکن جب دوسرے ان سے اختلاف کریں تو ان کا دعوی ہوتا ہے کہ دوسروں کے پاس دلیل نہیں ہے لہذا انہیں ہم سے اختلاف کا حق نہیں ہے۔ پس دلیل کیا ہے، کیا نہیں ہے، یہ بھی انہوں نے طے کرنا ہے۔ گویا مدعی بھی خود، گواہ بھی خود اور قاضی بھی خود۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ میں درست ہوں اور باقی سارے غلط ہیں۔

اسی طرح اسلامی تحریکوں کے کارکنان، مسالک کے پیروکاروں پر تو خوب نقد کرتے ہیں کہ مسالک نے فرقہ واریت کو بہت ہوا دے رکھی ہے لیکن خود یہی کارکنان اپنی جماعت کے نظریات کے بارے اسی قسم کے تعصب میں مبتلا ہوتے ہیں کہ جیسا تعصب مسالک کے پیروکار ایک دوسرے کے بارے رکھتے ہیں۔ بعض تحریکیں دوسری تحریکوں کا اسی طرح رد کر رہی ہوتی ہیں جیسا کہ مسالک ایک دوسرے کا رد کرتے ہیں لہذا فرقہ واریت ضروری نہیں کہ صرف مسالک میں ہی ہو بلکہ ہر اُس جگہ ہو سکتی ہے کہ جہاں غلو اور تعصب موجود ہو۔

مذاہب، مسالک اور جماعتوں میں دوسروں کے بارے میں جو سختی، تشدد اور تعصب آ گیا ہے، اسے ختم ہونا چاہیے اور اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے سوائے چند ایک جہلاء کے۔ اور ہر شخص کو کوشش کرنی چاہیے کہ وہ اپنے مذہب، مسلک اور جماعت کی بھی اصلاح کرے اور ہر وقت دوسروں کے مذہب، جماعت اور مسلک کی اصلاح ہی میں نہ لگا رہے۔ فرقہ واریت اور جماعتی تعصب کی بنیاد ہی یہ رویہ ہے کہ ہمارا مسلک اور جماعت تو سو فی صد درست ہے اور دوسرا سو فی صد غلط ہے لہذا ہمیں اپنی نہیں دوسروں کی اصلاح کرنی ہے۔ اگر ہم میں ہر مسلک اور جماعت کے لوگ اپنی تبلیغی مساعی کا تیس فی صد بھی اپنی جماعت اور مسلک کی اصلاح میں لگا دیں گے تو فرقہ واریت اور جماعتی تعصب ختم ہو جائے گا۔ ان شاءاللہ!

اسی طرح اپنے مذہب، جماعت اور مسلک پر ہی ہر وقت تنقید کرتے رہنا بھی متوازن رویہ نہیں ہے۔ اگر آپ کی کسی مذہب، جماعت اور مسلک سے وابستگی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کو اس میں خیر کا پہلو غالب نظر آیا ہے تو آپ اس سے وابستہ

ہیں۔ پس اپنے مذہب، مسلک اور جماعت کے مثبت پہلو کی تعریف کریں اور جہاں اصلاح کی گنجائش ہے تو وہاں اصلاح کے لیے کوشش کریں، چاہے آپ کے مذہب، مسلک اور جماعت کے لوگ آپ کی اصلاح کو پسند کرتے ہیں یا نہیں۔ کسی مذہب، مسلک اور جماعت سے وابستہ رہ کر آپ اس کی جو اصلاح کر سکتے ہیں، اس سے علیحدگی کی صورت میں نہیں کر سکتے کہ اس مذہب، مسلک اور جماعت کے لوگوں کی نفسیات یہ بن جاتی ہے کہ یہ ہم میں سے نہیں ہے لہذا ہم نے اس کی بات سننی ہی نہیں ہے۔ پس مذہب، مسلک اور جماعت سے وابستہ رہتے ہوئے اس کی اصلاح کرنا یہی رویہ متوازن اور مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا﴾ [التحريم: 6]

"اے اہل ایمان! اپنی جانوں کو اور اپنے گھر والوں کو جہنم کی آگ سے بچاؤ۔"

روایت سے تمسک

ایک دوست سے کسی مسئلے میں کچھ بحث ہو رہی تھی اور وہ جو اعتراض کرتے، میں اس کا عقلی و نقلی جواب پیش کر دیتا۔ بحث کے آخر میں انہوں نے کہا کہ آپ ہر بات کا جواب اسی وقت گھڑ لیتے ہیں۔ میں نے کہا کہ ایسے نہ کہیں بلکہ اصل بات یہ ہے کہ میں ایک ایسی علمی روایت (academic tradition) کا حامل اور امین ہوں جو تیرہ صدیوں چلی آ رہی ہے اور اس میں سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں اہل علم کی زندگیاں کھپ گئی ہیں۔ وہ روایت دین کی ایک ایسی جامع تعبیر اور مکمل نظام پیش کرتی ہے کہ جس میں نہ صرف دین کے ہر گوشے کے بارے رہنمائی موجود ہے بلکہ انسان کے ذہن میں اس تعبیر دین پر جس قدر اعتراضات آ سکتے ہیں، ان کا جواب بھی اس روایت کے حاملین صدیوں پہلے نقل کر چکے ہیں۔ پس چونکہ میرا اپنی روایت کا مطالعہ اچھا ہے اور آپ کے اعتراضات نئے نہیں ہیں لہذا آپ کو اس پر حیرانگی ہو رہی ہے کہ ایک شخص کو اتنے اعتراضات کا جواب اتنی جلدی کیسے سوجھ سکتا ہے؟

"عقیدے" میں ہمارے ہاں دو علمی روایات موجود ہیں کہ جن کی تاریخ ہزار سال

سے زائد عرصہ کو محیط ہے۔ یہ روایات سلفی اور غیر سلفی [اشعری ماتریدی] ہیں اور میرا تعلق "سلفی روایت" سے ہے کہ جس کے بانی ائمہ اربعہ ہیں اور اس کے مختصر مطالعہ کے لیے آپ شیخ محمد بن عبد الرحمن الخمیس کی کتاب "اعتقاد الأئمة الأربعة" دیکھ سکتے ہیں۔ میں نے انہیں بتلایا کہ اعتزال، خوارجیت، باطنیت اور جہمیت وغیرہ اگرچہ قدیم نظریات ہیں لیکن ان نظریات کی بنیاد روایت پسندی نہیں بلکہ عقل پرستی (rationalism) ہے۔

اسی طرح فقہ میں دو بڑی علمی روایات موجود ہیں کہ جن کی تاریخ 13سو سال پرانی ہے اور یہ "اہل الاثر" اور "اہل الرائے" کی روایات ہیں۔ میرا تعلق اہل الاثر کی روایت سے ہے کہ جس کے بانی ائمہ ثلاثہ اور فقہائے محدثین ہیں۔ اخلاق واصلاح نفس میں بھی دو قسم کی روایتیں موجود ہیں سلفی اور صوفی۔ اور میرا تعلق سلفی روایت سے ہے کہ جس کے بانی امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ ہیں۔ صوفی روایت کے بانی سیدۃ الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ ہیں اور تصوف کے جو تصورات سید الطائفہ سے تصدیق حاصل نہ کر سکیں تو وہ روایت نہیں عقل پرستی ہے۔

ہم تقلیدی جمود کے حق میں نہیں لیکن علمی روایت سے تمسک کو ضروری سمجھتے ہیں لہذا سب سے پہلا کام کرنے کا یہ ہے کہ کسی دینی روایت سے وابستہ ہو جائیں۔ اور دوسرا کام یہ ہے کہ اس روایت کی اتباع کے ساتھ اس کی اصلاح بھی کریں کیونکہ یہ نبی کی روایت تو ہے نہیں کہ اس میں اصلاح کی گنجائش نہ ہو اور یہ آپ کی روایت کا آپ پر حق بھی ہے۔ اور تیسرا کام یہ ہے کہ متوازی روایت کے حاملین کا احترام کرتے ہوئے ان سے علمی مکالمہ کریں۔ یہ مکالمہ اگر تعصب کے رویے سے نہ ہو گا تو اس سے ایک تو آپ کی علمی روایت میں نکھار اور امتیاز پیدا ہو گا اور دوسرا اصلاح کی گنجائش سے اعتدال کا راستہ ہموار ہو گا۔

ہماری رائے میں کسی نہ کسی علمی روایت سے تمسک بہت ضروری ہے ورنہ تو آپ کٹی پتنگ ہیں اور آج کے دور کے سارے متجددین (modernists) کٹی پتنگیں ہیں۔

اور کٹی پتنگ کو ہمیشہ زوال ہی ہوتا ہے یعنی وہ نیچے ہی آتی ہے، اوپر نہیں جاتی۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ کٹی پتنگ ہوا کے رحم و کرم پر ہوتی ہے، وہ جس طرف چاہے، اُسے لے جائے۔ اگر ہوا تیز ہو گی تو شاید اسے بہت اونچا بھی اڑا لے جائے لیکن یہ اونچی اڑان عارضی ہو گی۔ سر سید اور پرویز وغیرہ جیسے افکار تو یہ ساری کٹی پتنگیں ہیں اور ان کے پیچھے لگنے والوں کی مثال بھی کٹی پتنگ کے پیچھے لگنے والوں کی سی ہے۔

پس حنفی یا حنبلی روایت کے امین اور حامل ہونے کو اپنے لیے قابل فخر سرمایہ سمجھیں لیکن اسے اپنے لیے ایسی عصبیت نہ بنائیں کہ جس کے سبب اسلام کے دائرے میں آپ اکیلے ہی موجود ہوں۔ پس دینی روایات کے حاملین کے مابین ایک دوسرے کے مذاہب اور مسالک کے لیے برداشت ہونی چاہیے لیکن یہ سمجھداری کی بات نہیں ہے کہ اگر مولوی لڑ رہے ہیں، اور وہ غلط کر رہے ہیں، تو میں ہزار سالہ علمی روایات کو چھوڑ کر کٹی پتنگوں کو لوٹنے کے لیے اُن کے پیچھے بھاگتا پھروں۔

اہل روایت (traditionalists) کو چاہیے کہ وہ روایت کے ساتھ تمسک کو لوگوں کے لیے ایک قابل فخر چیز بنائیں اور یہ اسی صورت ممکن ہو گا کہ جب اہل روایت ایک دوسرے کی روایت کا احترام کریں گے۔ اور اہل روایت کو یہ بھی سوچنا چاہیے کہ ان کی تنقیدی کاوشوں کا اصل محاذ کٹی پتنگیں ہیں نہ کہ وہ خود۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿ائْتُونِي بِكِتَابٍ مِّن قَبْلِ هَـٰذَا أَوْ أَثَارَةٍ مِّنْ عِلْمٍ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ﴾ [الأحقاف: 4]

"اگر تم سچے ہو تو [اپنے حق میں دلیل کے طور پر] اس سے پہلے کی کوئی کتاب لے آؤ یا نقل کیے گئے علم سے ہی کچھ لے آؤ۔"

علمی روایت کے بارے ہم نے کچھ مزید گفتگو اسی باب میں "ایک منکر حدیث سے مکالمہ" کے عنوان کے تحت کی ہے۔ اگر اس بارے مزید کچھ بحث ملاحظہ کرنی ہو تو وہ ہماری زیر ترتیب کتاب "مکالمہ" میں دیکھی جاسکتی ہے۔

نیکی پر تعاون

ایک دوست سے گفتگو کے دوران یہ بات سامنے آئی کہ ہمارے معاشرے میں مسلک اور جماعت کا تعصب اس قدر زیادہ ہے کہ ایک مسلک اور جماعت کے لوگ دوسرے مسلک اور جماعت کے لوگوں سے بالکل بھی تعاون نہیں کرتے ہیں۔ اس بارے ہمارے اخلاق اس قدر پستی کا شکار ہیں کہ فیس بک پر کسی کی اچھی تحریر کو اچھا سمجھنے کے باوجود محض اس لیے لائیک نہیں کرتے کہ اس کا تعلق ہمارے مسلک اور جماعت سے نہیں ہے۔

کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے کہ اللہ عزوجل اس امت کے کام کو اس دنیا میں اس وقت تک قبول نہ کریں گے جب تک کہ یہ آپس میں نیکی کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرنا نہ سیکھ لے۔ اور دنیا میں امت کے کام کی قبولیت کا معنی یہ ہے کہ اللہ عزوجل اس کے نتائج نکال دیں۔ ہمارے معاشرے میں کتنی مذہبی جماعتیں اور دینی تحریکیں کام کر رہی ہیں لیکن ان کی محنت کے نتیجے میں معاشرے میں تبدیلی ویسی نہیں ہیں جیسی کہ ہونی چاہیے تھے۔

اب اسی پر غور کر لیں کہ ہمیں دوسروں سے ملاقات کے وقت ہمیشہ اختلافات یاد رہتے ہیں لہذا بات بات پر اپنے اختلاف کو بیان کرنا مذہبی فرض سمجھتے ہیں لیکن ہم یہ غور نہیں کرتے کہ ہم میں اور دوسروں میں کتنی باتیں مشترک اور متفق علیہ ہیں۔ میں تو اکثر اپنے دوستوں سے کہتا ہوں کہ ہمیں تبلیغی جماعت سے اختلاف سہی لیکن ان کی اس بات سے تو اتفاق ہے کہ وہ محلے میں گشت کر کے لوگوں کو مسجد میں نماز کے لیے لاتے ہیں لہذا ہمیں ان سے اس نیکی میں تعاون کرنا چاہیے۔ ہمیں جماعت اسلامی سے بہت اختلاف سہی لیکن اس بات سے تو اتفاق ہے کہ اسمبلی میں دینی ذہن رکھنے والوں کی بھی نمائندگی ہونی چاہیے تاکہ پارلیمنٹ میں ایسی قانون سازی نہ ہو جو کتاب وسنت کے خلاف ہو۔ پس ہمیں جماعت اسلامی کے نمائندگان کے حق میں ووٹ ڈالنا چاہیے۔

تبلیغی جماعت والوں کو تنظیم اسلامی کے طریق کار سے اختلاف سہی لیکن ان کی اس

بات سے تو اتفاق ہو گا کہ وہ لوگوں کو قرآن مجید سیکھنے اور سکھلانے کی طرف راغب کرتے ہیں تو ان سے اس بات میں تعاون کر لیں۔ مدارس کے علماء کو ڈاکٹر ذاکر نائیک، ڈاکٹر فرحت ہاشمی، ڈاکٹر اسرار احمد اور مولانا طارق جمیل وغیرہ جیسے مبلغین سے سینکڑوں فقہی اختلافات سہی لیکن ان کی اس بات سے تو اتفاق ہے کہ ان کی محنت کے نتیجے میں نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد دین کی طرف راغب ہو رہی ہے اور ان کی زندگیاں تبدیل ہو رہی ہیں لہذا اس کی تحسین کر دیں۔

اللہ عزوجل نے ہمیں کسی خاص گروہ، مسلک اور جماعت کے ساتھ نہیں بلکہ نیکی اور تقوی پر تعاون کا حکم دیا ہے۔ ہمارا تعاون کام کی بنیاد پر ہونا چاہیے کہ جو کام اچھا ہے، اس میں تعاون کر دیں، چاہے وہ کسی بھی گروہ، مسلک اور جماعت کا کام ہو۔ اور جو کام اچھا نہیں ہے، اس میں تعاون نہ کریں، چاہے وہ ہمارے گروہ، مسلک اور جماعت کا ہو۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ﴾ [المائدة: 2]

"اور نیکی اور تقوی کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو۔ اور گناہ اور ظلم کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون نہ کرو۔ اور اللہ سے ڈرو۔ بے شک اللہ عزوجل سخت سزا دینے والا ہے۔"

تنقید میں اعتدال کا دامن

مسلم دنیا میں اس وقت افکار کا ایک جنگل آباد ہے کہ جس میں ایک عام مسلمان کنفیوژن کا شکار ہے۔ مسلمانوں میں بھی کئی قسم کے طبقات ہیں۔ کچھ بنیاد پرست (fundamentalists) ہیں تو کچھ روایت پسند (traditionalists) ہیں۔ بعض جدت پسند (modernists) ہیں تو بعض آزاد خیال (liberalists) ہیں۔ ان طبقات کے باہمی اختلافات کے علاوہ خود ان میں بھی مزید تقسیم موجود ہے۔

بنیاد پرستوں میں انقلابی اور جہادی تحریکیں شامل کی جاتی ہیں۔ انقلابیوں میں کچھ

جمہوری ہیں اور کچھ غیر جمہوری۔ جمہوری جیسا کہ جماعت اسلامی والے ہیں جو انتخابات کے راستے انقلاب لانا چاہتے ہیں اور غیر جمہوری وہ ہیں جو احتجاج کے راستے انقلاب لانا چاہتے ہیں جیسا کہ تنظیم اسلامی کا موقف ہے۔ اسی طرح جہادیوں میں کچھ تکفیری ہیں اور کچھ غیر تکفیری۔ تکفیری وہ ہیں جو مسلمان حکمرانوں کو کافر کہتے ہیں اور غیر تکفیری وہ ہیں جو مسلمان حکمرانوں کو کافر نہیں کہتے ہیں۔ اسی طرح روایت پسندوں میں دینی مدارس بھی شامل ہیں اور اور وہ جماعتیں بھی جو دعوت، اصلاح اور تبلیغ کا کام کرتی ہیں۔

روایت پسند اہل تشیع میں بھی ہیں اور اہل سنت میں بھی ہیں۔ اہل تشیع میں کچھ اسماعیلی ہیں، بعض اثنا عشری ہیں اور بعض زیدی۔ اہل سنت میں اہل الحدیث، دیوبندی اور بریلوی تین بڑے مسالک ہیں۔ پھر اہل الحدیث میں کچھ جمہوری ہیں کچھ جہادی۔ جمہوری وہ ہیں جو انتخابات میں حصہ لیتے ہیں جیسا کہ مرکزی جمعیت اہلحدیث ہے اور جہادی وہ ہیں جو جمہوریت کو کفر قرار دیتے ہیں جیسا کہ جماعۃ الدعوۃ ہے۔ دیوبند میں کچھ تھانوی ہیں اور کچھ مدنی، بعض حیاتی ہیں اور بعض مماتی۔ تھانوی علمی اور اصلاحی کام میں ہیں جبکہ مدنی ملکی سیاست سے متعلق رہتے ہیں۔ حیاتی وہ ہیں جو نبی کریم ﷺ کے قبر مبارک میں زندہ ہونے کے قائل ہیں جبکہ مماتی اس کے قائل نہیں ہیں۔ بریلویت میں کچھ مدنی ہیں اور کچھ قادری۔ مدنی جیسا کہ دعوت اسلامی والے ہیں کہ جو اپنے مسلک کی دعوتی اور تبلیغی جماعت شمار ہوتی ہے جبکہ قادری جیسا کہ منہاج القرآن اور پاکستان عوامی تحریک والے ہیں کہ اپنے مسلک کے مطابق انقلاب اور سیاسی تبدیلی کے خواہاں ہیں۔ کچھ تکفیری ہیں کہ دیگر مسالک کو کافر قرار دیتے ہیں اور کچھ تنزیہی ہیں کہ دیگر مسالک کو کافر نہیں کہتے۔

جدت پسندوں میں کچھ پرویزی ہیں اور کچھ غامدی۔ پرویزی وہ ہیں جو حدیث کا انکار کرتے ہیں اور غامدی وہ ہیں جو سنت اور حدیث میں فرق کرتے ہیں اور سنت کو مصدر دین مانتے ہیں جبکہ حدیث کو مستقل مصدر دین نہیں مانتے۔ آزاد خیالوں میں کچھ خدا بیزار ہیں، کچھ مذہب بیزار اور کچھ مسلمان بیزار وغیرہ۔ خدا بیزار وہ ہیں کہ جو خدا کے

موجود ہونے کے ہی قائل نہیں ہیں۔ اور مذہب بیزار وہ ہیں جو کہ خالق کو تو مانتے ہیں لیکن کسی مذہب کو بھی الہامی نہیں مانتے۔ اور مسلمان بیزار وہ ہیں کہ جو خالق اور مذہب دونوں کو مانتے ہیں لیکن مسلمان امت سے رد عمل میں ہیں اور ہر وقت امت پر تنقید کرنے میں یوں مصروف رہتے ہیں جیسے یہ ان کا بہت بڑا دینی فرض ہو۔

ہم متنوع طبقات نہیں بلکہ ایک ہی طبقے مثلاً روایت پسندوں کے مابین مکالمہ کی صورت حال کا جائزہ لے لیں تو ہمیں محسوس ہو گا کہ بہت سی تنقید ایسی ہے جو مبنی بر اعتدال نہیں ہے۔ ہم اس دنیا میں رہتے ہوئے ایک دوسرے کے افکار سے مثبت یا منفی طور متاثر ہوتے ہیں۔ پاکستان ہی کی مثال لے لیں کہ بعض علماء مولانا مودودی رحمہ اللہ پر شدید نقد کرتے ہیں جبکہ بعض ان کی تعریف کرتے ہیں۔ اور بعض ان پر نقد بھی کرتے ہیں اور ان کی تعریف بھی کرتے ہیں۔

کسی بھی شخص کا کلام سو فی صد باطل نہیں ہوتا بلکہ اس میں صحیح اور غلط دونوں موجود ہوتے ہیں۔ پس سلفی ہو یا صوفی، حنفی ہو یا شافعی، وہابی ہو یا اخوانی، جہادی ہو یا تبلیغی، بریلوی ہو یا دیوبندی، سب کے کلام میں خیر اور شر دونوں موجود ہوتے ہیں۔ معصوم تو صرف نبی کی ذات ہے کہ جن کے کلام میں شر کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ باقی سب عام انسان ہیں کہ کچھ کی بات زیادہ درست ہے اور کچھ کی کم۔ بعض کے دعوے میں 70 فی صد صداقت ہے اور بعض میں 30 فی صد سچ۔ پس سید قطب ہوں یا مولانا مودودی، ڈاکٹر ذاکر نائیک ہوں یا ڈاکٹر فرحت ہاشمی، علامہ محمد اقبال ہوں یا ڈاکٹر اسرار احمد، مولانا اشرف علی تھانوی ہوں یا مولانا حسین احمد مدنی، شیخ المدخلی ہوں یا علامہ البانی، مولانا تقی عثمانی ہوں یا مولانا زاہد الراشدی، مولانا طارق جمیل ہوں یا مولانا احمد شاہ نورانی، ان سب کے کلام میں حق اور باطل، خیر اور شر دونوں موجود ہوتے ہیں اور یہ فیصلہ عموماً قاری اور سامع پر چھوڑا جاتا ہے کہ وہ تعین کرے کہ کس کے کلام میں کون سا پہلو غالب ہے، خیر کا یا شر کا؟

کسی شخصیت کے بارے بعض اوقات اہل علم میں اس بارے اختلاف ہو جاتا ہے کہ

اس میں خیر کا پہلو غالب ہے یا شر کا پہلو۔ جو خیر کے پہلو کو غالب سمجھتے ہیں، وہ شر کے منکر نہیں ہوتے ہیں لیکن غالب پہلو کا اعتبار کرتے ہوئے اس شخصیت کے بارے مجموعی طور ایک اچھا حکم لگا دیتے ہیں اور جو شر کا پہلو غالب سمجھتے ہیں، وہ اس شخص میں خیر کے منکر نہیں ہوتے لیکن شر کے پہلو کو غالب سمجھنے کے سبب سے اس پر شر کا حکم لگا دیتے ہیں۔

کسی شخص، جماعت اور فکر پر حکم لگانے میں بہت کم لوگ ایسے ہیں جو محتاط طبیعت کے حامل ہوتے ہیں جبکہ اکثریت کا معاملہ تو ایسا ہی ہے کہ کافر کافر فلاں کافر اور جو نہ مانے وہ بھی کافر۔ کیا اہل حدیث، دیوبندی، بریلوی اور اہل تشیع چاروں مسالک سے وابستہ ایسے علماء موجود نہیں ہیں کہ جنہیں ان کے اپنے ہی مسلک کے علماء نے مسلک سے خارج کرنے کی سنجیدہ کوشش نہ کی ہو؟

پس اگر ایک عالم دین کے نزدیک ایک شخص گمراہ ہے تو اسے یہ نہیں کرنا چاہیے کہ جو دوسرا عالم دین اسی شخص کو گمراہ نہیں سمجھ رہا تو وہ اس عالم دین کو بھی گمراہ کہنا شروع کر دے۔ معاصر علماء اور دینی اسکالرز کی بہت سی دینی خدمات ہیں۔ ان کی جس رائے سے ہمیں اتفاق نہ ہو اس کا رد کریں اور اس سے عدم اتفاق کا اظہار کریں لیکن ان کی کسی رائے سے اختلاف کے سبب سے ان کو اسلام سے باہر یا اندر کرنے کی تحرک چلانا درست نہیں ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی امت کو ان فتنہ پرور رہنماؤں سے ڈرایا ہے جو انہیں گمراہی کے راستے پر ڈال دیں۔ اور یہ وہی لوگ ہیں کہ جنہیں اپنے علاوہ ہر کوئی گمراہ معلوم ہوتا ہے جیسا کہ خوارج تھے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«إِنَّمَا أَخَافُ عَلَى أُمَّتِي الأَئِمَّةَ المُضِلِّينَ»[1]

”مجھے اپنی امت کے بارے جن لوگوں سے خطرہ ہے تو وہ گمراہ کرنے والے لیڈر ہیں۔“

مولانا طارق جمیل صاحب کا ایک جملہ سننے کو ملا کہ جس میں اپنے مکتبہ فکر کے

[1] سنن الترمذي، أَبْوَابُ الْفِتَنِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي الأَئِمَّةِ الْمُضِلِّينَ، 504/4

لوگوں سے خطاب کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ اللہ کی جنت بہت وسیع ہے، صرف دیوبندی اس میں جا کر کیا کریں گے! یہ وسعت ظرفی سب مکاتب فکر کے علماء میں ہونی چاہیے کہ اہل حدیث کے علماء کو سوچنا چاہیے کہ صرف اہل حدیث جنت میں جا کر کیا کریں گے کہ وہ امت کا کتنا فی صد ہیں۔ اور بریلوی علماء کو غور کرنا چاہیے کہ کیا دیوبندی اور اہل حدیث کے جنت میں جانے پر اللہ کے رسول ﷺ کو خوشی ہو گی یا جہنم میں جانے پر، آخر میں وہ بھی اللہ کے رسول ﷺ کی امت ہیں اور آپ ﷺ اپنی امت کے جنت میں جانے کے بارے غمگیں اور دعا گو رہتے تھے نہ کہ کسی خاص گروہ کے بارے۔ اللہ کی جنت بہت وسیع ہے اور وہ صرف آپ کے گروہ کے لیے نہیں بنائی گئی بلکہ اس میں اس امت میں سے بے شمار لوگ جائیں گے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«عُرِضَتْ عَلَيَّ الأُمَمُ، فَجَعَلَ النَّبِيُّ وَالنَّبِيَّانِ يَمُرُّونَ مَعَهُمُ الرَّهْطُ، وَالنَّبِيُّ لَيْسَ مَعَهُ أَحَدٌ، حَتَّى رُفِعَ لِي سَوَادٌ عَظِيمٌ، قُلْتُ: مَا هَذَا؟ أُمَّتِي هَذِهِ؟ قِيلَ: بَلْ هَذَا مُوسَى وَقَوْمُهُ، قِيلَ: انْظُرْ إِلَى الأُفُقِ، فَإِذَا سَوَادٌ يَمْلَأُ الأُفُقَ، ثُمَّ قِيلَ لِي: انْظُرْ هَا هُنَا وَهَا هُنَا فِي آفَاقِ السَّمَاءِ، فَإِذَا سَوَادٌ قَدْ مَلَأَ الأُفُقَ، قِيلَ: هَذِهِ أُمَّتُكَ، وَيَدْخُلُ الجَنَّةَ مِنْ هَؤُلاَءِ سَبْعُونَ أَلْفًا بِغَيْرِ حِسَابٍ»[1]

”مجھ پر جنت میں جانے والی امتیں پیش کی گئیں تو کسی ایک یا دو نبیوں کے ساتھ کچھ لوگ جنت میں جا رہے تھے اور کسی نبی کے ساتھ تو ان کی قوم میں سے ایک بھی جنت میں جانے والا نہیں تھا یہاں تک کہ مجھے ایک بہت بڑی جماعت نظر آئی تو میں نے کہا کہ کیا یہ میری امت ہے؟ تو مجھے بتلایا گیا کہ یہ حضرت موسی علیہ السلام کی قوم ہے۔ پھر مجھے کہا گیا کہ آپ سامنے افق پر دیکھیں تو ایک بہت بڑا ہجوم تھا کہ جس سے تمام افق بھرا ہوا تھا۔ پھر مجھ سے کہا گیا کہ یہاں اور وہاں آسمان کے کناروں میں دیکھیں تو ایک بہت بڑے ہجوم سے آسمان کے کنارے بھرے ہوئے تھے۔ تو مجھے کہا جائے گا کہ یہ آپ کی امت ہے۔ اور ان میں سے ستر ہزار ایسے ہیں جو بغیر حساب کتاب کے جنت میں

[1] صحيح بخاري، كِتَابُ الطِّبِّ، بَابُ مَنِ اكْتَوَى أَوْ كَوَى غَيْرَهُ، 126/7

جائیں گے۔“

ایک اور روایت میں وضاحت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«فَأَرَيْتُهُمْ، فَأَعْجَبَتْنِي كَثْرَتُهُمْ وَهَيْئَتُهُمْ قَدْ مَلَئُوا السَّهْلَ وَالْجَبَلَ، - قَالَ حَسَنٌ: - فَقَالَ: أَرَضِيتَ يَا مُحَمَّدُ؟ فَقُلْتُ: نَعَمْ»[1]

”میں اپنی امت کو دیکھوں گا تو مجھے ان کی کثرت اور حالت پر تعجب ہو گا کہ کوئی پہاڑ اور میدان باقی نہ رہے گا کہ جہاں وہ موجود نہ ہوں۔ اور پھر مجھ سے کہا جائے گا کہ اے محمد ﷺ! کیا اب آپ اپنے رب سے راضی ہیں؟ تو میں کہوں گا: جی ہاں، میں راضی ہوں۔“

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا:

«إِنِّي لَأَرْجُو أَنْ تَكُونُوا نِصْفَ أَهْلِ الجَنَّةِ»[2]

”مجھے امید ہے کہ اہل جنت میں سے نصف میری امت کے لوگ ہوں گے۔“

جہاں معاشرے میں لوگوں کو گمراہ کرنے والے امام ہوں گے، وہاں ہر دور میں قیامت تک علماء کا ایک ایسا گروہ بھی رہے گا کہ جو حق اور اعتدال پر ہوں گے۔ اور بعض لوگ اس گروہ کی مخالفت بھی کریں گے لیکن ان کی مخالفت انہیں کچھ نقصان نہ پہنچا سکے گی۔ اس گروہ کے حق اور اعتدال پر ہونے کی نشانی یہ ہے کہ امت کے دل میں اس گروہ کی عزت اور مقام قیامت تک باقی رہے گا تا کہ حق کے متلاشیوں کے لیے حق تک پہنچنا آسان رہے۔ یہ واضح رہے کہ یہ ایک گروہ کی بات ہو رہی ہے نہ کہ کسی فرد واحد کی۔ اور گروہ سے مراد بھی کوئی متعین گروہ نہیں ہے بلکہ بعض مخصوص صفات کے حامل علماء کا گروہ ہے جو ہر دور میں رہے گا۔ اور ان صفات میں سے اہم تر صفت امت کے دلوں میں ان کا غلبہ اور عزت ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي عَلَى الحَقِّ ظَاهِرِينَ لَا يَضُرُّهُمْ مَنْ يَخْذُلُهُمْ حَتَّى يَأْتِيَ أَمْرُ اللَّهِ»[3]

---

[1] مسند الإمام أحمد بن حنبل: 358/7

[2] سنن الترمذي، أَبْوَابُ تَفْسِيرِ الْقُرْآنِ، بَابٌ: وَمِنْ سُورَةِ الحَجِّ، 322/5

[3] سنن الترمذي، أَبْوَابُ الْفِتَنِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي الأَئِمَّةِ الْمُضِلِّينَ، 504/4

”میری امت میں ہمیشہ ایک گروہ حق پر غالب رہے گا۔ جو انہیں رسوا کرنا چاہے گا تو وہ ان کو کچھ نقصان نہ پہنچا سکے گا یہاں تک کہ اللہ کا حکم آجائے۔“

جماعتی تعصب

آپ کسی اسلامی جماعت کے بانی ہیں، تصوف کے سلسلہ کے خلیفہ مجاز ہیں، ویلفیئر ٹرسٹ کے چیئرمین ہیں، دار العلوم میں شیخ الحدیث ہیں، مذہبی چینل کے مالک ہیں، اصلاحی تحریک کے رہنما ہیں اور آپ کے مرید، شاگرد، کارکنان اور پیروکار ہزاروں بلکہ لاکھوں میں ہیں۔ یہ ارادت مند نہ صرف آپ کو جنتی سمجھتے ہیں بلکہ آپ کے حلقہ ارادت میں شامل ہونے اور آپ سے نسبت رکھنے والوں میں بھی جنت کا ٹکٹ تقسیم کرتے ہیں۔

اگر معاملہ ایسا ہی ہے تو آپ کے لیے یہ واضح ہونا بہت ضروری ہے کہ آپ کو آخرت میں جہنم سے نجات کے لیے اللہ کی رحمت کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی کہ ایک سڑک پر روڑی کوٹنے والے مزدور اور گھروں میں کام کاج کرنے والی ملازمہ کو۔ ہم میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اپنے اعمال کی کثرت کی بدولت جنت میں جائے گا بلکہ ہر کسی نے اللہ کی رحمت سے جنت میں جانا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا:

«لَنْ يُنْجِيَ أَحَدًا مِنْكُمْ عَمَلُهُ» قَالَ رَجُلٌ: وَلَا إِيَّاكَ؟ يَا رَسُولَ اللهِ قَالَ: «وَلَا إِيَّايَ، إِلَّا أَنْ يَتَغَمَّدَنِيَ اللهُ مِنْهُ بِرَحْمَةٍ، وَلَكِنْ سَدِّدُوا»[1]

”تم میں کوئی بھی شخص ایسا نہیں ہے جو محض اپنے عمل کی بدولت نجات پائے گا یہاں تک کہ اللہ کی رحمت اسے ڈھانپ لے۔ ایک شخص نے کہا: اے نبی کریم ﷺ! کیا آپ بھی؟ آپ نے کہا: ہاں! میں بھی۔ اس لیے عمل میں میانہ روی اختیار کرو۔“

اس حدیث پر غور کرنے سے ذہن میں یہ خیال آتا ہے کہ اگر مرید اور پیر دونوں نے، اور استاذ اور شاگرد دونوں نے، اور کارکن اور امیر جماعت دونوں نے، اللہ کی رحمت

[1] صحيح مسلم، كتاب صِفَةِ الْقِيَامَةِ وَالْجَنَّةِ وَالنَّارِ، بَابُ لَنْ يَدْخُلَ أَحَدٌ الْجَنَّةَ بِعَمَلِهِ، 2169/4

ہی سے جنت میں جانا ہے تو پیر، استاذ اور امیر میں ذرہ برابر بھی تکبر ہو سکتا ہے؟

فریق مخالف کا رد یا اس کے لیے دعا؟

کسی صاحب نے کہا کہ کل جب مغرب کی فرض نماز سے فارغ ہوا تو ذکر و اذکار کرتے ہوئے اچانک یہ خیال دل میں پیدا ہوا کہ محدث فورم مکالمہ کے لیے ایک دینی اور مذہبی فورم ہے کہ جہاں پر اکثر اراکین اہل الحدیث مسلک سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور آج کل اس فورم پر ایک فاضل دیوبندی عالم دین جمشید صاحب اور اہل حدیث علماء کے مابین کافی بحث مباحثے ہو رہے ہیں۔ مجھے یہ خیال آیا کہ کیا محدث فورم پر سر گرم کسی اہل حدیث عالم دین نے اخلاص، ہمدردی اور خیر خواہی کے جذبے کے تحت صدق دل سے کبھی اپنے دینی بھائی مولانا جمشید صاحب کے لیے تنہائی میں اللہ سے دعا بھی کی کہ اللہ تعالی ان کے دل کو بھی اُس حق کی طرف پھیر دے کہ جسے میں نے پورے شعور سے حق سمجھ کر اختیار کیا ہے۔ اور یہ دعا اس کیفیت کے ساتھ مانگی ہو کہ جس کیفیت کے ساتھ وہ اپنے کسی ذاتی اور دنیاوی مشکل میں اللہ سے دعا مانگتے ہیں۔

پس جتنا وقت اور ذہن ہم سوشل میڈیا پر ایک دینی بھائی کی تردید (refutation) میں لگا دیتے ہیں، اگر ہم رد عمل کی نفسیات سے نکل کر اس کا نصف وقت بھی اسی بھائی کے لیے دعا پر لگا دیں تو شاید انہیں اپنے ساتھ متفق پائیں۔ ذہن میں یہ بھی بات آتی ہے کہ جب ہم کسی دوسرے کے لیے حق کی طرف ہدایت کی دعا کریں تو اس میں بھی دیانتداری کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حق مراد ہو جو اللہ عزوجل کی نظر میں حق ہے نہ کہ وہ جسے ہم حق سمجھتے ہوں۔ پس اپنے فریق مخالف کے لیے یوں دعا کریں کہ پروردگار! جو آپ کے نزدیک حق ہے، اس کی طرف میری بھی اور میرے بھائی کی بھی رہنمائی فرمائیں۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے:

«دَعْوَةُ الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ لِأَخِيهِ بِظَهْرِ الْغَيْبِ مُسْتَجَابَةٌ، عِنْدَ رَأْسِهِ مَلَكٌ مُوَكَّلٌ كُلَّمَا دَعَا لِأَخِيهِ بِخَيْرٍ، قَالَ الْمَلَكُ الْمُوَكَّلُ بِهِ: آمِينَ وَلَكَ بِمِثْلٍ»[1]

---

[1] صحيح مسلم، كتاب الذِّكْرِ وَالدُّعَاءِ وَالتَّوْبَةِ، بَابُ فَضْلِ الدُّعَاءِ لِلْمُسْلِمِينَ بِظَهْرِ الْغَيْبِ، 2094/4

"ایک مسلمان کی اپنے دوسرے مسلمان بھائی کی غیر موجودگی میں اس کے لیے دعا مقبول (accepted) ہوتی ہے۔اور جب وہ اپنے بھائی کے لیے کسی خیر کی دعا کرتا ہے تو اس کے سَر کے قریب ایک فرشتہ مقرر کر دیا جاتا ہے جو اس کی دعا پر آمین کہتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی کہتا ہے کہ اللہ تعالی تجھے بھی وہ سب کچھ دے جو تو اپنے بھائی کے لیے مانگ رہا ہے۔"

رد عمل کی نفسیات

میں نے محدث اردو فورم پر ایک تحریر لکھی جو کہ درج ذیل تھی:

"ایک تبلیغی دوست کو دعا کرتے سنا تھا کہ اے اللہ! مجھ سے نبیوں والا کام لے لے۔ دعا پسند آئی لہذا اکثر یہ دعا مانگتا ہوں۔ لیکن ساتھ ہی یہ سوال پیدا ہوا کہ نبیوں والا کام کیا ہو سکتا ہے؟ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ نبی ہر خیر کا کام کرتے تھے، دعوت، تعلیم، تربیت، تزکیہ، جہاد، خدمت خلق وغیرہ۔ جب بھی یہ سوال پیدا ہوا تو ہمیشہ دل میں یہی آتا ہے کہ نبیوں والے کام سے مراد دعوت کا کام ہے کہ ان کی زندگی کا غالب حصہ دعوت و تبلیغ میں ہی گزرتا تھا، واللہ اعلم۔ پچھلے دنوں دل میں شدت سے یہ خیال پیدا ہوا کہ عالم تیار کرنے کے لیے دار العلوم اور مدارس ہیں، اصلاح نفس کے لیے خانقاہیں بنائی گئیں، مجاہدین کی تیاری کے لیے معسکرات وجود میں آئے، خدمت خلق کے لیے ویلفیئر ٹرسٹ بنے لیکن داعی تیار کرنے والے ادارے نظر نہیں آتے۔ ایک ایسا ادارہ قائم ہونا چاہیے کہ جس میں ایک سال، چھ ماہ، چار ماہ، تین ماہ، ماہانہ اور ہفتہ وار کورسز کی بنیاد پر داعی تیار کیے جائیں۔ دعوت دینے کا نہ صرف نبوی طریقہ سکھایا جائے بلکہ اس کی عملی مشق (practical) بھی کروائی جائے۔ دعوت دینے میں جو ہچکچاہٹ محسوس ہوتی ہے، اسے تربیت کے ذریعے دور کیا جائے۔ زمانے کے جدید تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے ایک داعی میں دعوت کے ممکنہ جدید وسائل سے استفادہ کرنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ مدعو (invitee) کی نفسیات، مخاطبین کی ذہنی استعداد اور صلاحیت کے اعتبار سے

گفتگو اور دعوت کے اسالیب میں تبدیلی وغیرہ جیسے علمی وفکری نکات کو زیر بحث لایا جائے۔ پس دعوت کو ایک منظم سائنس کے طور متعارف کروایا جائے۔"

اس پر محدث فورم کے ایک دوست نے یہ تبصرہ کیا کہ "یہ تمام ادارے دعوت کا بھی کام کرتے ہیں۔" ان کا کہنا تھا کہ مدارس اور خانقاہیں بھی تو دعوت ہی کا کام کر رہے ہیں لہذا کسی نئے ادارے کی کیا ضرورت ہے؟

یہ تبصرہ پڑھ کر پہلے پہل تو دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اس کا جواب لکھوں اور ذہن میں یہ جواب تھا کہ ان میں سے کوئی بھی ادارہ ایسا نہیں ہے کہ جس کی بنیاد دعوت کا کام کرنے کے لیے رکھی گئی ہو یعنی ان اداروں کے قائم کرنے کے مقاصد اگرچہ دینی تھے لیکن دعوت کے علاوہ کچھ اور تھے۔

بہر حال کسی وجہ سے یہ تحریر نہ کر سکا لیکن اس موضوع پر سوچ وبچار جاری تھی۔ بعد ازاں یہ خیال آیا کہ یہ تمام ادارے بھی تو دعوت کا کام کرتے ہیں اگرچہ ان کا غالب کام دعوت نہیں ہے بلکہ ان کا جزوی کام دعوت ہے۔ اس اعتبار سے میری بات بھی درست تھی اور میرے دوست کی بات بھی درست تھی۔ میں ان اداروں کی کلی حیثیت کو دیکھ رہا تھا جبکہ وہ ان کے جزوی کام کو دیکھ رہے تھے۔ بلاشبہ ہر ادارہ کئی قسم کے کام کرتا ہے لیکن اس کا تشخص (identity) اس کا غالب کام ہی ہوتا ہے جیسا کہ مدارس اسلامیہ ہمارے ہاں بڑی سطح پر ویلفیئر کا کام بھی کرتے ہیں کہ مفت تعلیم، کھانا اور رہائش مہیا کرتے ہیں لیکن ان کا اصل تشخص اور اصل امتیاز علوم دینیہ کی درس وتدریس ہے۔ پس میری مراد بھی یہ تھی کہ دعوت کا ایک ایسا ادارہ ہو کہ جس کا امتیازی کام دعوت ہو اور میرے دوست کا مقصد یہ تھا کہ دوسرے بھی دعوت کا کام کرتے ہیں اگرچہ کم ہی کیوں نہ ہو اور اس کا انکار نہیں ہونا چاہیے۔

پھر یہ بھی کسی وجہ سے تحریر نہ کر سکا لیکن سوچ وبچار جاری رہی اور تیسرے مرحلے میں یہ خیال آیا کہ مجھے کسی قسم کی جوابی تحریر نہیں لکھنی چاہیے کہ کبھی کبھار انسان کے

پاس جواب ہو بھی تو انسان کو اپنی تربیت کے لیے جواب نہیں دینا چاہیے۔ میں نے سوچا مجھے بعض اوقات اپنے مخاطب کی بات میں ایسا مثبت پہلو تلاش کرنا چاہیے کہ مجھے اس کی بات مبنی بر حکمت نظر آنے لگے، چاہے ایسا وقتی طور ہی ہو کیونکہ یہ میری تربیت کے لیے بہت مفید ہے۔ اور عجیب بات ہے کہ یہ غور وفکر اس بات پر منتج ہوا کہ مجھے یہ احساس ہوا کہ میرے مخاطب کی بات درست تھی۔

میں نے اپنے اس سارے سوچ وبچار کے عمل پر غور کیا تو محسوس ہوا کہ ہم جواب عجلت میں دیتے ہیں اور مخاطب کے رد عمل میں سوچتے ہوئے دیتے ہیں۔ اگر ہم دو باتیں نکال دیں: ایک رد عمل اور دوسرا عجلت، تو ہمارا مکالمہ ایک بہترین مکالمہ بن جائے لیکن ہم سب کمزور ہیں۔ کسی مکالمے کو بہترین مکالمہ بنانے کے لیے فریقین کا علم، ذہن اور اخلاق میں بہترین ہونا ضروری ہے۔

ہم میں سے ہر شخص کا مسئلہ ہے کہ وہ اپنے سے زیادہ دوسرے کی تربیت کرنا چاہتا ہے۔ وہ صالح سے زیادہ مصلح بننا چاہتا ہے۔ بحثیت قوم ہماری یہ عادت بن چکی ہے کہ ہم مکالمے میں اپنی ٹینشن، فرسٹریشن اور ڈیپریشن دوسروں پر نکالتے ہیں اور سوشل میڈیا مثلاً فیس بک اور ٹوئٹر وغیرہ پر تو مکالمے کا کم وبیش یہی حال ہے۔ بہترین مکالمہ وہ ہے کہ جس میں بہترین اخلاق اور رویوں کا اظہار ہو۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ادْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ﴾ [فصلت: 34]

"برائی اور بھلائی برابر نہیں ہو سکتی۔ پس آپ سخت کلامی کا جواب اچھے طریقے سے دیں تو وہ جس کے اور آپ کے مابین دشمنی ہے، آپ کا گہرا دوست بن جائے گا۔"

انسان اور غلطی

انسان اور غلطی کا تعلق وہی ہے جو دریا اور پانی کا۔ ایک صاحب نے کہا کہ مجھے لکھتے ہوئے تقریباً دس سال سے اوپر کا عرصہ ہو چکا۔ ایک سو بیس سے زائد تحقیقی، اصلاحی اور

فکری مضامین مختلف دینی مجلات میں اور چھ عدد کتب شائع ہو چکی ہیں۔ میں نے لوگوں پر بہت تنقید کی اور لوگوں نے مجھ پر کی۔ لیکن اب مجھ میں کچھ تبدیلی آ چکی ہے۔ میں سوشل میڈیا پر جب اپنے بعض دوستوں کو اس قسم کی تنقید کرتے دیکھتا ہوں جو کہ میں خود ماضی میں کیا کرتا تھا، تو مجھے اپنا ماضی یاد آ جاتا ہے۔ آج میں اس بات کو دل سے مانتا ہوں کہ میرے تنقید کرنے کے اسلوب میں غلطی تھی اور آج اپنے دوستوں سے بھی یہ توقع کرتا ہوں کہ وہ بھی اپنی تنقید کے اسلوب کو مہذب بنائیں۔

انھوں نے کہا کہ ہمارے معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ ذہنی سطح بہت گر گئی ہے۔ جسے یہ نہیں معلوم کہ تنقید کی تعریف کیا ہے؟ وہ بھی تنقید کر رہا ہے۔ میں خود ایسی حرکتیں کر آیا ہوں کہ اب ان پر افسوس ہوتا ہے۔ لوگ تنقید کے نام پر جو کچھ کرتے ہیں یا جس ذہنی سطح اور منفی جذبے سے کرتے ہیں، ان سب کیفیات اور احوال سے میں بہت پہلے گزر چکا ہوں۔ لیکن میں نے پڑھا، ہر کسی کو پڑھا جیسا کہ بعض دوست کہتے ہیں کہ الم غلم پڑھا۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ الم غلم لیکن یہ کہ ادب، فلسفہ، نفسیات، مذہب جس میدان میں بھی اچھی تحریر پڑھنے کو ملی، اس کو پڑھا۔ آج کل "مجموعہ حسن عسکری" کا مطالعہ کر رہا ہوں۔

اس کے بعد غور کیا۔ اپنے رویوں کی اصلاح کرنے کی کوشش کی۔ اور زبانی اور تحریری اقرار کیا کہ میں غلط تھا، میرا رویہ درست نہ تھا۔ میری تنقید کے مقاصد ٹھیک نہ تھے۔ اپنے رویوں کے محرکات پر اس قدر غور کیا کہ میں دوسرے انسانوں کے رویوں کو بہت قریب اور گہرائی میں سمجھنا شروع ہو گیا۔ یہ نہ چاہنے کے باوجود ہو گیا۔ میں ایسی ہی تنقید کیا کرتا تھا جیسا کہ میرے بعض دوست کر رہے ہیں اور اسی جذبے کے ساتھ۔ لیکن مجھے احساس ہو گیا کہ میں غلط تھا، میں نے اصلاح کی کوشش کی۔

انھوں نے کہا کہ میرے دوستو! میں اس شر کو اس لیے پہچانتا ہوں کہ میں اس کی ساری وادیاں گھوم چکا ہوں۔ لہذا جو بات دوستوں کو سمجھ نہیں آتی، وہ مجھے سمجھ آ جاتی ہے، نہ چاہتے ہوئے بھی، لاشعوری طور۔ دوستو! المیہ یہ ہے کہ جس پر واقعتاً رونا چاہیے

کہ ذہنی سطح بہت گر گئی ہے۔ ہم اس قابل بھی نہیں رہے کہ اگلے کا موقف سمجھ سکھیں۔ ہم ذرا اپنے ڈربوں سے باہر نکل کر کسی کے ساتھ بیٹھیں تو ہمیں معلوم ہو کہ آٹے دال کا بھاؤ کیا ہے۔ ہم کسی ایک شخص کی فکر سے متاثر ہو جاتے ہیں اور ساری زندگی اسی کے گن گانے میں گزار دیتے ہیں۔ اور اس کے گن بھی اس مقصد سے نہیں گاتے کہ وہ بڑا آدمی تھا بلکہ اس لیے کہ اس کی بڑائی کا تذکرہ کر کے ہم اس سے اپنے تعلق کو بنیاد بناتے ہوئے اپنی بڑائی ثابت کرنا چاہ رہے ہوتے ہیں۔ یہ ہم لوگ کرتے ہیں، مذہبی لوگ، لکھنے والے، بولنے والے، علم کی طرف اپنی نسبت کرنے والے۔ یہ میں نے بھی کیا، لہذا جب لوگ کرتے ہیں تو مجھے سمجھ آتی ہے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ دوستو! مجھے اس کا رنج ہونا چاہیے۔ مجھے احساس ہونا چاہیے کہ مجھے اللہ کے ہاں اپنی تحریر کا حساب بھی دینا ہے۔ مجھے سوچنا چاہیے کہ میں کسی عالم دین یا مذہبی اسکالر پر تنقید کر کے کہیں اپنا علمی قد تو اونچا کرنے کی کوشش نہیں کر رہا؟

انھوں نے کہا کہ میرے دوستو! کچھ دوستوں کی صحبت نے مجھ میں یہ فکر پیدا کر دی جب ہم کسی پر تنقید کریں تو تنہائی میں اپنے پر اس سے زیادہ تنقید کریں کہ اس تنقید میں ہمارے محرکات اور مقاصد کیا تھے؟ کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ ہمارا نفس دین کے راستے ہی سے ہمیں دھوکے میں ڈالے گا۔ ہمارے ہاں جب کسی نقاد کو کہا جاتا ہے کہ تم نے جس پر تنقید کی ہے، اسے سمجھا نہیں ہے تو وہ اس بات کو بالکل سنجیدہ نہیں لیتا کیونکہ اخلاق اور علم دونوں کا معیار بہت گر چکا ہے۔

ہمیں ہر لحظہ لوگوں کی اصلاح کرنے کے ساتھ ان سے اصلاح لینے کے بھی تیار رہنا چاہیے۔ یہ احساس ہم میں سے ہر شخص کو رکھنا چاہیے کہ جس شخص میں یہ احساس بیدار نہ ہوا تو وہ علمی تکبر کے مرض میں مبتلا ہو جائے گا۔ اور جس میں یہ احساس بیدار ہو گا تو اللہ اسے علم کی عاجزی کا ذائقہ چکھا دیں گے۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«إِنْ شِئْتَ لَأُحَدِّثَنَّكَ بِأَوَّلِ عِلْمٍ يُرْفَعُ مِنَ النَّاسِ؟ الْخُشُوعُ، يُوشِكُ

أَنْ تَدْخُلَ مَسْجِدَ جَمَاعَةٍ فَلَا تَرَى فِيهِ رَجُلًا خَاشِعًا»[1]

"اگر تم چاہو تو میں تمہیں اس علم کے بارے خبر دوں جو سب سے پہلے اس امت میں سے اٹھایا جائے گا۔ اور یہ خشوع کا علم ہے۔ قریب ہے کہ تم کسی ایسی مسجد میں داخل ہو گے کہ جس میں جماعت ہوتی ہے تو اس میں بھی تمہیں کوئی ایک شخص بھی خشوع والا نظر نہ آئے گا۔"

اور مسجد میں جماعت کے ساتھ نماز ادا کرنے والوں سے بڑھ کر کون دیندار ہو گا لیکن یہ بھی خشوع سے محروم ہوں گے لہذا خشوع کا حصول بہت ضروری ہے، خاص طور علمی معاملات میں۔

اہل حدیث کی اقسام

ہم میں ہر اس شخص کو جو اپنے آپ کو مخلص سمجھتا ہے، اپنے اس مکتبہ فکر کی اصلاح کے بارے کچھ کہنا چاہیے کہ جس کی طرف وہ اپنے آپ کو منسوب کرتا ہے یا لوگ اس کی نسبت اس مکتبہ فکر کی طرف کرتے ہیں۔ اصلاح میں درد دل شامل ہو تو ایک تو وہ اپنے گھر سے شروع ہوتی ہے، اور دوسرا اگر اس میں اخلاص بھی ہو تو اپنے لوگ کبھی بھی اس سے محروم نہیں رہتے۔ جو شخص ساری زندگی دوسرے مسلک کی اصلاح میں لگا رہا تو اس کی اصلاح، اللہ کے لیے نہیں بلکہ اپنے نفس کے لیے ہے، اس پر اسے غور کرنا چاہیے۔ کسی بھی مسلک کے لوگ سو فی صد درست نہیں ہیں، آپ کے مسلک کے لوگ بھی، کیونکہ سو فی صد درست ہونا عصمت (infallibility) ہے اور عصمت انبیاء کا خاصہ ہے نہ کہ مسالک اور جماعتوں کا۔

پس ہمارے معاشرے میں تین قسم کے اہل حدیث پائے جاتے ہیں۔ پہلی قسم عوامی اہل حدیث کہ جن کی اکثریت کے نزدیک اہلحدیثیت کا مفہوم احناف کے رد سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔ دوسری قسم ان علماء اور طلباء کی ہے کہ جو اہل حدیث کو ایک ایسے مسلک کی صورت پیش کرتے ہیں کہ جس کے کچھ امتیازی مسائل مثلاً فاتحہ خلف

---

[1] سنن الترمذي، أَبْوَابُ الْعِلْمِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي ذَهَابِ العِلْمِ، 31/5

الامام، رفع الیدین، آمین بالجہر، سینے پر ہاتھ باندھنا، آٹھ تراویح، تقلید اور ایک مجلس کی تین طلاقیں وغیرہ ہیں۔ ان کی تحقیق کا سارا میدان یہی امتیازی مسائل ہیں۔ جو ان امتیازی مسائل کے قائل ہوں وہ ان کے نزدیک اہل حدیث ہیں اور جو قائل نہ ہوں تو وہ اہل حدیث نہیں ہیں۔ اس گروہ کا زیادہ تر تحقیقی کام تقلید کے رد میں ہے۔ یہ گروہ اپنے امتیازی مسائل میں حد درجے حساس ہے۔ اور ان امتیازی مسائل میں سے کسی مسئلہ سے اختلاف ہی ان کے نزدیک مسلک اہل حدیث میں داخل یا خارج ہونے کا واحد معیار ہے۔

تیسری قسم ان اہل حدیث اہل علم کی ہے جو اہل حدیث کو محض ایک مسلک (school of jurisprudence) نہیں سمجھتے بلکہ اسے عالمی تناظر میں ایک منہج اور (methodology) اور انداز فکر (school of thought) قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک کسی شخص کے اہل حدیث ہونے کی بنیاد اہل الحدیث کا منہج، انداز فکر اور اسلوب استدلال کا قائل ہونا ہے نہ کہ ان کے امتیازی مسائل کا۔ پس اگر کسی شخص کا منہج فکر اور اسلوب استنباط وہی ہے جو ائمہ ثلاثہ اور محدثین عظام کا تھا تو وہ اہل حدیث ہے، چاہے اس کے نتائج فکر مروجہ معاصر اہل حدیث کے امتیازی مسائل سے ملتے ہیں یا نہیں۔ اہل الحدیث اگرچہ ائمہ دین کا مقلد نہ بھی ہو لیکن کسی نہ کسی علمی روایت سے تمسک ضرور رکھتا ہے۔

دو معاصر اکابر اہل حدیث علماء مولانا اسماعیل سلفی اور مولانا سید داؤد غزنوی رحمہما اللہ کے مابین ایک مکالمہ ہوا کہ جس کا موضوع یہ تھا کہ اہل حدیث کون ہے؟ ان میں سے ایک کا کہنا یہ تھا کہ اہل حدیث ہونا چند امتیازی مسائل کے ماننے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک فکر ہے اور جو بھی اس منہج فکر کا حامل ہے، چاہے اس کے نتائج اور فتاوی اہل حدیث کے امتیازی مسائل سے میل نہ بھی کھاتے ہوں، تو وہ اہل حدیث ہے جبکہ دوسرے کا کہنا تھا کہ اہل حدیث مخصوص امتیازی مسائل کے ماننے والا ہے اور جو ان کا قائل نہیں ہے تو وہ جماعت اہل حدیث میں سے نہیں ہے۔

ہمیں ذاتی طور تیسری قسم کے اہل الحدیث سے طبعی مناسبت ہے اور ہم اہل الحدیث کو ایک ایسا منہج فکر سمجھتے ہیں کہ جس میں علم و تحقیق کا میدان محض بیس تیس امتیازی مسائل نہیں ہیں اور نہ ہی فروعی اختلافات میں دوسرے مسالک کے پیروکاروں کو اپنی اجتہادی رائے کا قائل بنانے کے لیے زندگی وقف کر دینا دین کا کوئی تقاضا ہے بلکہ اصل مقصود، علم و تحقیق کے میدان میں استنباط واستدلال کے اس اسلوب کو رائج کرنا ہے جو اہل الرائے کے بالمقابل اہل الحدیث نے دوسری صدی ہجری میں ایک مستقل انداز فکر کی صورت میں پیش کیا تھا۔

اکابر اہل حدیث اہل علم شیخ الکل نذیر حسین دہلوی، محدث العصر عبد اللہ محدث روپڑی، استاذ الاساتذہ حافظ محمد گوندلوی، مناظر الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسری، سید داؤد غزنوی اور مولانا حنیف ندوی رحمہم اللہ کو پڑھیں، اور المیہ یہ ہے کہ لوگ ان کو پڑھتے نہیں ہیں، تو اہل حدیث کا جو تصور ذہن میں آتا ہے وہ معاصر اہل حدیث سے بہت مختلف ہے۔ ہم ذرا ان اکابر اہل حدیث علماء کی زندگی کا تجزیہ کریں کہ ان کی زندگیوں میں رد حنفیت کتنے فی صد ہے اور جو ہے بھی تو اس کا اسلوب و طریق کار کیا ہے؟ اور آج کل کے نوجوان اہل حدیث محقق کو اس کے مقابلے میں دیکھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا نوجوان اپنے ان اکابر کے منہج سے ہٹ چکا ہے۔ اور کچھ بعید نہیں کہ کچھ ہی عرصے بعد نوجوان محققین کی یہ جماعت، احناف پر مناظرہ میں غالب آنے کے لیے اپنے ان اکابر اور محسن علماء کو بھی جماعت اہل حدیث سے خارج قرار دے دیں اور یہ سب کچھ ہونا شروع ہو چکا ہے۔ اس مکالمہ سے کسی بھائی کی دل آزاری ہوئی ہو تو اس کے معذرت خواہ ہوں۔

غیر مقلد اور اہل الحدیث کا فرق

اہل حدیث کا منہج اعتصام بالکتاب والسنۃ کا ہے جیسا کہ امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی کتاب صحیح بخاری میں اس عنوان سے ایک باب باندھا ہے۔ اور صحیح بخاری میں یہ باب دراصل احادیث کی روشنی میں اہل الحدیث کے اصول فقہ کا بیان ہے۔ اب ایک جماعت کا منہج تو یہ ہے کہ وہ غیر مقلد ہیں لیکن متجددین ہیں۔ قرون اولی (early ages) میں

ان کی مثال معتزلہ وغیرہ جیسے گروہ تھے اور عصر حاضر میں منکرین حدیث اور اہل قرآن کے گروہ اسی فکر کے حاملین میں سے ہیں۔

متجددین وہ لوگ ہیں جو تقلید کے تو قائل نہیں ہیں لیکن کتاب وسنت کی چند ایک نصوص سے اپنا ایک نقطہ نظر بنا لیتے ہیں اور اب کتاب وسنت کی بقیہ نصوص کو اپنے نقطہ نظر کے مطابق ثابت کرنے میں ہر قسم کی تاویل سے کام لیتے ہیں۔ یہ لوگ کتاب وسنت کی وہ تعبیر چاہتے ہیں جو ان کی سوچ کے موافق ہو۔ یہ اپنی سوچ کو کتاب وسنت کے تابع نہیں کرتے کہ وہ جہاں چاہیں ان کو لے جائیں بلکہ کتاب وسنت کو اپنی سوچ کے تابع کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کی محدود سوچ، کتاب وسنت کے محدود مطالعہ کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے کہ جس کے سبب وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ وہ اعتصام بالکتاب والسنۃ کے منہج پر قائم ہیں لیکن ان کا منہج اعتصام بالکتاب والسنۃ نہیں ہوتا۔

غیر مقلد ہونے کا یہ مطلب ہر گز نہیں ہے کہ وہ اہل الحدیث بھی ہے۔ اہل الحدیث وہ ہیں کہ جو علمی روایت سے تمسک رکھتے ہیں کہ وہ اپنا شجرہ علمی مدینہ کے مکتبہ فکر اہل الاثر سے جوڑتے ہیں کہ جس کے بانی امام مالک رحمہ اللہ تھے جبکہ غیر مقلد وہ ہیں جو علمی روایت کا انکار کرتے ہیں اور ان کا شجرہ علمی خود ان کی اپنی ذات ہی سے شروع ہوتا ہے۔

اصحاب الحدیث اور تزکیہ نفس

سلف صالحین میں فقہی اختلاف کے سبب سے اہل الاثر اور اہل الرائے کے نام سے دو مکاتب فکر وجود میں آئے۔ پہلے مکتبہ فکر کا مرکز مدینۃ المنورۃ تھا اور اس کی ریاست امام مالک رحمہ اللہ کے حصے میں آئی جبکہ دوسرے کا مرکز کوفہ تھا اور اس کی مسند افتاء پر امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ براجمان ہوئے۔

اہل الاثر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد فقہائے محدثین، اصحاب الحدیث اور ائمہ جرح وتعدیل کے نام سے مزید تین گروہوں میں تقسیم ہوئے۔ اہل الاثر میں فقہائے محدثین وہ تھے جنہوں نے بطور محدث حدیث کی خدمت کے علاوہ بطور مجتہد کے بھی اپنی فقہی آراء کا ایک بہت بڑا ذخیرہ چھوڑا۔ امام مالک رحمہ اللہ، جو فقہائے محدثین کے پہلے

امام بھی ہیں، سے حدیث وفقہ کی یہ امامت امام شافعی، ان سے امام احمد بن حنبل، اور ان سے امام بخاری رحمہم اللہ تک منتقل ہوئی۔ اصحاب الحدیث وہ تھے کہ جن کا اوڑھنا بچھونا حدیث کو روایت اور نقل کرنا تھا اور ان کی شہرت امت میں بطور محدث تو موجود ہے لیکن بطور فقیہ نہیں ہے۔ اس گروہ کے ائمہ میں امام ابن شہاب الزہری، سفیان ثوری اور عبد اللہ بن مبارک رحمہم اللہ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ ان کے علاوہ ایک اور جماعت ائمہ جرح وتعدیل کے نام سے وجود میں آئی جنہوں نے تحقیق حدیث میں اہم خدمات سرانجام دیں۔ اس طبقے کی امامت یحی بن سعید رحمہ اللہ تک پہنچی اور ان کے بعد ان کے تلامذہ میں یحی بن معین اور علی بن مدینی رحمہما اللہ نے اس میں اہم کردار ادا کیا۔

اہل الاثر کی یہ جماعت نہ صرف علم میں امام تھی بلکہ تقوی اور ورع میں بھی امام تھے۔ ہمارا مقصود اس مکتبہ فکر کی زندگی کے اس گوشے کو اجاگر کرنا ہے کہ جسے لوگ بھلا چکے ہیں۔ امام ذہبی رحمہ اللہ کی "سير أعلام النبلاء" کا تحقیق حدیث کی جہت سے مطالعہ کرنے والے تو بہت مل جائیں گے لیکن محض دو چار افراد ہی نے یہ کوشش کی ہے کہ اہل الاثر کے ائمہ کے اُن اقوال کو جمع کیا جائے کہ جن سے باطنی اصلاح اور روحانی زندگی کے احوال وکیفیات پر روشنی پڑتی ہو۔

اکثر اہل حدیث طلباء کو ہم دیکھتے ہیں کہ وہ جرح وتعدیل کے ائمہ کے اقوال نقل کر کے دیگر مسالک کے علماء کو بری طرح رگید رہے ہوتے ہیں۔ سلف بھی ایک دوسرے پر نقد کرتے تھے لیکن ان کے نقد کرنے کا جذبہ اور اسلوب وہ نہیں تھا جو آج ہمارے بعض حلقوں میں بد قسمتی سے رائج ہو چکا ہے۔ کیا وجہ ہے کہ میں ائمہ جرح وتعدیل اور اسلاف کی نقد پڑھوں تو اس نقد سے بھی مجھے روحانیت حاصل ہو اور اصلاح کے پہلو ملیں۔ اور اگر میں ان کی نقد وجرح میں ہفتوں بھی غور کروں تو شاید اس اعتبار سے کم پڑ جائیں کہ وہ اپنی روحانی وباطنی کیفیات کی کن وسعتوں اور ایمانی احوال کی کیسی گہرائیوں کے ساتھ بات کرتے تھے۔

اپنے اسلاف کی اپنے مخالفین پر نقد پڑھتے ہوئے انداز ہوتا ہے کہ وہ ایک نقاد کا فرض

سرانجام دیتے ہوئے بھی احسان کی کیفیت سے خالی نہ ہوتے تھے۔ جیسے ان کی نماز اس کیفیت کے ساتھ ہوتی تھی کہ وہ اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہوں، ویسے ہی ان کی نقد کی بھی یہی حالت ہوتی تھی کہ جیسے اپنے رب کے دربار میں کھڑے ہو کر اپنے مخالف کارد کر رہے ہوں۔ ان کی نقد ایسی ہے کہ اس سے اپنے فریق مخالف کی خیر خواہی کا جذبہ ابل ابل کر سامنے آتا ہے۔ ان کی مثال اس مجاہد کی سی ہے جو اپنے دفاع میں حملہ آور پر ایک ہاتھ سے تلوار اٹھائے تو دوسرے سے اس کے حق میں دعا کرے۔ ان کے ہاں اپنے مخالفین کا شدید رد بھی ان کے لیے ہدایت کی خواہش پر کبھی غالب نہیں آتا تھا۔ وہ اس سوچ کے ساتھ کسی پر جرح کرتے تھے کہ اللہ کو اپنی مخلوق کے جہنم میں جانے سے زیادہ جنت میں جانا محبوب ہے۔ اپنے اسلاف کے نقش قدم پر چلنے کے لیے ہمیں یہ کوشش کرنی چاہیے کہ جب کسی سے مکالمہ ہو تو بحث کے بعد تنہائی میں اپنی ممکنہ زیادتی پر استغفار کریں۔

آج کل کی اکثر وبیشتر نقد کیا ہے؟ نری ظلمت ہی ظلمت ہے۔ آج بد قسمتی سے محققین کی ایسی جماعت وجود میں آچکی ہے، جو اپنے باطن کی اصلاح نہ کر پائے لیکن دوسروں کے ظاہر کی اصلاح پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ دین کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر مناظرے کریں گے لیکن بڑی باتوں مثلاً انصاف، رحم، نرمی، شفقت، الفت، محبت، مودت، مواخات، تواضع، انکسار، صدق اور اخلاص وغیرہ کو چھوڑ دیں گے۔ اب تو تنقید یا تو اپنے غصے کی تسکین کے لیے ہے یا تکبر کے حصول کے لیے ہے۔ دین کے نام پر یہ نقد خدا کے قریب کیا کرے گی، یہ تو خدا سے اور دور کر دے گی۔

حضرت مسیح ابن مریم علیہ السلام کی یہود پر جو نقد تھی وہ ان کی اخلاقی گراوٹ کی وجہ سے ہے ورنہ تو وہ قانون اور ظاہر شریعت پر خوب عمل کرنے والے تھے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی امت کو اس بات سے خبردار کیا ہے کہ جو اخلاقی گراوٹ اور عملی انحطاط یہود میں پیدا ہوا، وہ اس امت میں بھی پیدا ہو کر رہے گا۔ روایت کے الفاظ ہیں:

«لَيَأْتِيَنَّ عَلَى أُمَّتِي مَا أَتَى عَلَى بني إسرائيل حَذْوَ النَّعْلِ بِالنَّعْلِ، حَتَّى

إِنْ كَانَ مِنْهُمْ مَنْ أَتَى أُمَّهُ عَلاَنِيَةً لَكَانَ فِي أُمَّتِي مَنْ يَصْنَعُ ذَلِكَ»[1]

"میری امت پر ہر وہ حال آئے گا جو یہود پر آیا جیسا کہ ایک جوتا دوسرے جوتے کے مشابہہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اگر یہود میں سے کسی نے اپنی ماں سے بدکاری کی تو میری امت میں بھی ایسا بدبخت پیدا ہو گا جو یہ کام کرے گا۔"

توحید کے بیان میں غلو

معتزلہ نے توحید کے بیان میں غلو کیا اور اس غلو کے نتیجے میں توحید اسماء وصفات کا جو حشر کیا وہ اہل علم کے سامنے ہے۔ انہوں نے اللہ عزوجل کی جمیع صفات کا انکار کر دیا۔ معتزلہ کی فکر کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ ان کے پانچ اصولوں میں ان کے نزدیک سب سے اہم اصول "توحید کا اصول" ہے۔ جمیع اہل سنت والجماعت کے نزدیک توحید کے مسئلے میں معتزلہ کی جماعت گمراہی کے راستے پر تھی۔

پس صراط مستقیم سے منحرف جماعتیں جن خوبصورت نعروں کے ساتھ منحرف ہوتی چلی آئی ہیں، ان میں توحید، عدل اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے نعرے بھی شامل ہیں۔ موجودہ زمانے میں بھی جماعت المسلمین یا عثمانی گروپ کے نام سے کچھ لوگوں نے توحید کے بیان میں غلو سے کام لیا۔ غلو کرنے والوں نے امام ابو حنیفہ، امام بخاری اور امام ابن تیمیہ رحمہم اللہ کو بھی مشرک قرار دے دیا، معاذ اللہ۔ پروردگار ہمیں وہ توحید ماننے کی توفیق عطا فرمائیں جو کتاب وسنت سے ثابت شدہ ہے کہ جس میں ہم نص کے سامنے جھکنے کے لیے تیار ہوں، نہ کہ نص سے سمجھے جانے والے اپنے غلط مفہوم کے سامنے لوگوں کو سجدے میں گر جانے کا حکم دیں۔

اہل سنت کی عقیدے کی معروف کتاب "عقیدہ طحاویہ" میں اہل سنت کا یہ عقیدہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ موزوں پر مسح کرنے کے قائل ہیں حالانکہ یہ عملی مسئلہ ہے اور اس کا عقیدے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔[2] پس مسح کرنے کے جزوی مسئلہ ہونے کے باوجود

---

[1] سنن الترمذي، أبواب الإيمان، مَا جَاءَ فِي افْتِرَاقِ هَذِهِ الأُمَّةِ، 323/4

[2] عبد الرحمن بن ناصر البراك، شرح العقيدة الطحاوية، دار التدمرية، 2008 م، ص 279

وقت کے گمراہ فرقوں سے اہل سنت کو ممتاز قرار دینے کے لیے اسے اہل سنت میں شامل ہونے کا معیار قرار دیا گیا۔ پس یہی معاملہ عذاب قبر کے مسئلے کا بھی ہے کہ یہ مسئلہ اہل سنت اور ان کے غیر کے مابین ایک امتیازی مسئلہ ہے۔ اس مسئلے پر ایمان رکھنے اور نہ رکھنے سے یہ معلوم ہو گا کہ کوئی اہل سنت میں داخل ہے یا نہیں۔ آج کے دور میں اہل سنت کے عقیدے کی اگر کوئی جدید کتاب مرتب ہو گی تو اس میں آج کے تناظر میں ان عملی مسائل کو بھی بطور عقیدہ بیان کیا جائے گا کہ جن پر اہل سنت کے علماء کا اتفاق ہو۔

تقوی کی نفسیات میں بگاڑ

معاصر دعوتی، اصلاحی، انقلابی تحریکوں اور مدارس اسلامیہ نے مذہبی اور فلاحی میدانوں میں جو کام سر انجام دیے ہیں، وہ ایک بہت بڑی دینی خدمت ہے۔ ہمیں اسلامی تحریکوں اور مدارس کی ان خدمات کا معترف رہنا چاہیے لیکن چونکہ نبی ﷺ کے بعد کامل ذات کوئی نہیں لہذا اسلامی تحریکوں اور مدارس نے جہاں بہت سے فکری اور عملی خلاء پر کرنے کی کوشش کی، وہاں ان کے تصور دین اور اس کے مطابق ذہن سازی اور تربیت سے تشکیل پانے والے مسلم فرد میں ایک ایسی سختی اور خشکی در آئی ہے جو اصلاً دین کا حصہ نہیں ہے۔

اس کی مثال اس دوا کی سی ہے کہ جس نے اصل بیماری کا علاج تو کسی قدر کیا، سو کیا لیکن اپنے ضمنی اثرات (side effects) بھی چھوڑ گئی۔ اسلامی تحریک سے وابستہ داعیان دین اور مدارس سے فارغ التحصیل طلباء کی ایک جماعت نے ہمارے معاشرے میں تقوی کی ایک ایسی نفسیات پیدا کر دی ہے کہ جس میں اپنی ذات سے زیادہ اپنے مخاطب سے اُس تقوی کا مطالبہ کیا جاتا ہے کہ جو کارکنان اور طلباء کے اپنے ذہن کی تخلیق ہے۔

چلیں! یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ مجھ میں تقوی زیادہ سے زیادہ ہونا چاہیے، لیکن یہ رویہ سمجھ سے بالاتر ہے کہ میں دوسروں میں وہ تقوی دیکھنا چاہتا ہوں، جو آئیڈیل ہے۔ بعض اوقات اسلامی تحریک کے کارکن اور مدرسہ کے فارغ التحصیل طالب علم کا

دعوتی اسلوب اور اصلاحی منہج اس بات کی واضح چغلی کھاتا نظر آتا ہے کہ وہ دین کو اپنی ذات سے زیادہ معاشرے میں دیکھنا چاہتا ہے، وہ اپنے سے زیادہ اپنے مخاطب کو دیندار بنانے پر مصر ہے، وہ اپنے دینی آئیڈیلز کو اپنی ذات میں پورا کرنے کی سعی کرنے کی بجائے اپنے مدعو (invitee) میں پورا کرنے کی جدوجہد میں لگا ہوا ہے۔ تقوی کی نفسیات میں ایک بگاڑ تو یہ ہوا کہ انسان آئیڈل تقوی اپنی ذات میں پیدا کرنے کی بجائے دوسروں میں دیکھنے کو مقصد زندگی بنالے۔

احمد جاوید صاحب کا کہنا ہے کہ کیا افسوس کے لیے یہ کم ہے کہ آج ایک مذہبی شخص کی دوسرے مذہبی شخص سے ملاقات ہو تو اس کی سب سے پہلی نظر اس کی شلوار پر پڑتی ہے کہ اس کا محل ومقام کیا ہے؟ ٹخنوں سے کتنی اوپر یا نیچے ہے؟ اور بعض کا تو بس نہیں چلتا ورنہ تو دوسری ملاقات میں کسی پیمانے سے آپ کی ڈاڑھی بھی ماپ کر دیکھیں کہ پہلی ملاقات کی نسبت کتنی کم ہوئی ہے؟ کیا مخاطب کی شخصیت میں کل دین یہی رہ گیا ہے جو ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔ یہ نفسیاتی رویے ہیں اور انسانی نفسیات کے تناظر میں مذہبی طبقات کو ان رویوں پر غور کرنا چاہیے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«إِنَّكَ إِنِ اتَّبَعْتَ عَوْرَاتِ النَّاسِ أَفْسَدْتَهُمْ، أَوْ كِدْتَ أَنْ تُفْسِدَهُمْ»[1]

"اگر تمہاری نظریں لوگوں کے عیوب کا پیچھا کرنے لگ جائیں گی تو تم انہیں بگاڑ دو گے یا بگاڑ کے قریب کر دو گے۔"

دوسرا بگاڑ یہ ہے کہ اصلاح معاشرہ اور بندگی رب کے نام پر دینی احکامات میں حلال وحرام کے متشددانہ مذہبی تصور کی تبلیغ کی جارہی ہے۔ ایک بچی جو کہ اپنی عمر کے ساتویں سال میں ہے، اس کی حفظ ٹیچر نے ایک دن بچیوں کو کلاس میں کہا کہ بچیوں کو سات سال کی عمر کے بعد اپنے والد کے ساتھ گھر میں اکیلا نہیں رہنا چاہیے حالانکہ اسلام میں کوئی ایسی تعلیم نہیں ہے۔ اور اگر منطقی بات کرنی ہے تو ٹیچر کو یہ بھی کہنا چاہیے تھا کہ ماں بھی سات سال کے بعد بیٹے کے ساتھ گھر میں اکیلی نہ رہے۔ اور اسی طرح بہن بھائی بھی

[1] سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب في النهي عن التجسُّس، 250/7

سات سال کی عمر کے بعد گھر میں اکیلے نہ رہیں۔ ایسے ہی متشددانہ دینی تصورات کے بارے اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے:

«يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِيَّاكُمْ وَالْغُلُوَّ فِي الدِّينِ، فَإِنَّهُ أَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمُ الْغُلُوُّ فِي الدِّينِ»[1]

"اے لوگو! دین میں غلو کرنے سے بچو۔ تم سے پہلی قومیں اسی لیے ہلاک ہوئیں کہ انہوں نے اپنے دین میں غلو کیا۔"

غلو سے مراد دینی حکم میں سختی یا اضافہ کرنا ہے اور اس سے اللہ کے رسول ﷺ نے سختی سے منع فرمایا ہے۔ دین میں سختی اور غلو لوگوں کو دین سے دور کرنے کا سبب تو بن سکتا ہے، دین کی طرف مائل کرنے کا نہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے نماز میں امامت کروانے والے ائمہ حضرات کو لمبی نماز پڑھانے سے منع کیا تا کہ لوگ دین سے بیزار نہ ہوں۔ روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي مَسْعُودٍ الأَنْصَارِيِّ، قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: يَا رَسُولَ اللَّهِ، إِنِّي وَاللَّهِ لَأَتَأَخَّرُ عَنْ صَلاَةِ الغَدَاةِ مِنْ أَجْلِ فُلاَنٍ، مِمَّا يُطِيلُ بِنَا فِيهَا، قَالَ: فَمَا رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَطُّ أَشَدَّ غَضَبًا فِي مَوْعِظَةٍ مِنْهُ يَوْمَئِذٍ، ثُمَّ قَالَ: «يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّ مِنْكُمْ مُنَفِّرِينَ، فَأَيُّكُمْ مَا صَلَّى بِالنَّاسِ فَلْيُوجِزْ، فَإِنَّ فِيهِمُ الكَبِيرَ، وَالضَّعِيفَ، وَذَا الحَاجَةِ»[2]

"حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص نے اللہ کے رسول ﷺ سے کہا کہ میں فلاں امام کی وجہ سے فجر کی نماز جماعت سے ادا نہیں کرتا کیونکہ وہ بہت لمبی نماز پڑھاتا ہے۔ حضرت ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ بات سن کر آپ ﷺ اس طرح شدید غصے میں آگئے کہ میں نے اس سے پہلے آپ کو اتنا غصے میں نہیں دیکھا۔ اور آپ نے لوگوں کو نصیحت کرتے ہوئے کہا: تم میں سے بعض وہ ہیں جو لوگوں کو دین سے متنفر کرنے والے

---

[1] سنن ابن ماجه، كِتَابُ الْمَنَاسِكِ بَابُ قَدْرِ، حَصَى الرَّمْيِ، 1008/2

[2] صحيح البخاري، كِتَابُ الأَحْكَامِ، بَاب هَلْ يَقْضِي القَاضِي أَوْ يُفْتِي وَهُوَ غَضْبَانُ، 9/65-66

ہیں۔ تم میں سے جس نے بھی امامت کروانی ہو تو اپنی نماز کو مختصر رکھے کیونکہ اس کے پیچھے بوڑھے، کمزور اور ضرورت مند بھی ہوتے ہیں۔"

اسلامی تہذیب کے دو ستون: دینی مدارس اور اسلامی تحریکیں

اسلامی تہذیب آج جن دو ستونوں پر قائم ہے، وہ دینی مدارس اور اسلامی تحریکیں ہیں۔ کوئی بھی تہذیب، علم اور طاقت (power and knowledge) کے بغیر دنیا میں اپنا تشخص تو کجا، وجود بھی برقرار نہیں رکھ سکتی۔ اسلامی تہذیب کا علمی ستون مدارس دینیہ اور عملی ستون اسلامی تحریکیں ہیں۔

اگر ہم نے اپنے علمی ستون یعنی مدارس اسلامیہ کو برقرار رکھنے میں کسی کوتاہی کا مظاہرہ کیا تو اس کا نتیجہ جدیدیت (modernism) یا مابعد جدیدیت (post-modernism) کی صورت میں نکلے گا۔ اور عملی ستون یعنی اسلامی تحریکوں کا انکار کرنے کی صورت میں اسلامی معاشرے لبرل ازم (liberalism) کی تصویر پیش کرنا شروع کر دیں گے۔ ہمیں دینی مدرسے کے طالب علم اور اسلامی تحریک کے کارکن پر فخر ہونا چاہیے۔ دین اسلام کا اعتدال علم و عمل کے اتفاق میں ہے اور یہ اسی صورت پیدا ہو گا جبکہ مدارس اور اسلامی تحریک کے مابین پیدا شدہ غلط فہمیاں دور ہوں گی۔

مدارس دینیہ سے ہماری مراد روایتی مدارس ہیں، جو ٹھوس دینی علوم کے محافظ اور امین ہیں۔ اور اسلامی تحریکوں سے ہماری مراد وہ اصلاحی، تبلیغی اور انقلابی جماعتیں ہیں جو اسلامی معاشروں میں پُر امن ذرائع سے تبدیلی کے حوالے سے اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔ ہم نے بعض دوستوں کو دیکھا ہو گا کہ وہ مدارس اسلامیہ اور دینی تحریکوں پر نقد میں مبالغہ سے کام لیتے ہیں کہ ان کے منفی کا ذکر چھوڑتے نہیں ہیں جبکہ ان کے مثبت کا ذکر کرتے نہیں ہیں۔

اللہ کے رسول ﷺ کے بعد کوئی معصوم تو ہے نہیں، اور یہ بھی کہ مدارس دینیہ اور اسلامی تحریکوں میں بھی بعض کمیاں کوتاہیاں ہیں کہ جن کی اصلاح کی اشد ضرورت ہے اور ہم خود بھی اس کی طرف بعض اوقات توجہ دلاتے رہتے ہیں اور یہ دلانا ضروری بھی

ہے۔ لیکن یہ بھی تو ذہن میں رہے کہ تنقید کا معنی کھوٹے سکوں کو کھروں سے علیحدہ کرنا ہے۔ اب اگر آپ کی تنقید میں مدارس دینیہ اور اسلامی تحریکوں کی برائی ہی برائی ہو تو وہ تنقیص تو ہے تنقید نہیں ہے۔ تنقید میں کھوٹے کی نشاندہی کریں لیکن ساتھ میں کھرا بھی تو بتلائیں۔ اور یہی تو اعتدال ہے۔

مدارس دینیہ اور اسلامی تحریکوں میں اگر کمی کوتاہی ہے تو یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ شر محض بھی نہیں ہیں کہ سو فی صد شر ہی شر ہیں۔ تو اگر آپ کی تنقید کا انداز ایسا ہو کہ پہلے ان کی خدمات کی تحسین کریں اور پھر کسی کمی کوتاہی کی نشاندہی کریں گے تو لوگ اسے قبول بھی کریں گے۔ وگرنہ تو آپ رد عمل کی ایک ایسی فضا پیدا کر دیں گے جو اصلاح سے زیادہ فساد کی طرف لے جائے گی۔

میں اپنے اکثر دوستوں سے کہتا ہوں کہ میں جب کسی عالم دین، مذہبی اسکالر، تبلیغی جماعت اور اسلامی تحریک کی تعریف کرتا ہوں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ میں اس سے سو فی صد متفق ہوں۔ سو فی صد اتفاق تو میاں بیوی، والدین اور بچوں میں بھی نہیں ہوتا۔ اس کا مطلب صرف اتنا ہوتا ہے کہ میرے نزدیک ان کا غالب کام خیر کا ہے، ورنہ تو شر کے مواقع اور امکانات کس میں نہیں ہیں؟

پس اگر کسی کا نوے فی صد کام خیر کا ہو اور آپ کو اس کے دس فی صد سے اختلاف ہو، اور آپ اس سے دس فی صد اختلاف کو بنیاد بنا کر اس کے خلاف تنقید کی مہم پر نکل کھڑے ہوں اور اس کے نوے فی صد کا ذکر اور قدر نہ کریں تو آپ کی نقد آپ کے مریدوں کے علاوہ کوئی قبول نہ کرے گا۔ اور صورت حال ایسی ہی ہو گی کہ آپ فرقوں کا رد کرتے کرتے خود ایک ایسا فرقہ بن جائیں گے کہ جس کے افکار کو پسند کرنے والے صرف آپ ہی کے مرید ہوں گے۔

جنت میں داخل کرنے والے اعمال

عام طور کسی مسلک، گروہ اور جماعت سے وابستگی کی بنیاد یہ ہوتی ہے کہ ہم اس نسبت کو جنت میں داخل ہونے کا ایک ذریعہ سمجھ رہے ہوتے ہیں۔ اگر آپ ایک عامی

ہیں اور مسالک کی باہمی ردوقدح سے پریشان ہیں اور یہ سمجھ نہیں آرہی کہ ان میں سے کون صحیح ہے اور کون غلط، تو ایک ذمہ داری تو یہ ہے کہ آپ ممکن حد تک تحقیق کریں۔ اور اگر امکان بھر تحقیق کے بعد بھی الجھن باقی رہے تو استخارہ کرکے اس رائے پر عمل کر لیں کہ جس پر دل ودماغ کو اطمینان حاصل ہو۔ اور زیادہ کوشش یہ کریں کہ دین کی ان ہدایات پر عمل ہو سکے کہ جو سب کے نزدیک متفق علیہ بھی ہیں اور جنت میں داخل ہونے کا یقینی راستہ بھی ہیں۔

ہمارے دین میں کچھ اعمال ایسے ہیں کہ جو ہر مسلک، گروہ اور جماعت کے نزدیک جنت میں داخل کرنے والے اعمال ہیں۔ اور یہ اعمال ایسے ہیں کہ جن کے بارے نبی کریم ﷺ نے یہ گواہی دی ہے کہ ان کے کرنے والے جنت میں داخل ہوں گے۔ ہمیں چاہیے کہ ان نیکیوں کو اپنا معمول بنالیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کی گواہی سے بڑھ کر کس کی گواہی ہو گی۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«اجْتَمَعَ حُذَيْفَةُ، وَأَبُو مَسْعُودٍ، فَقَالَ حُذَيْفَةُ: رَجُلٌ لَقِيَ رَبَّهُ، فَقَالَ: مَا عَمِلْتَ؟ قَالَ: مَا عَمِلْتُ مِنَ الْخَيْرِ إِلَّا أَنِّي كُنْتُ رَجُلًا ذَا مَالٍ، فَكُنْتُ أُطَالِبُ بِهِ النَّاسَ فَكُنْتُ أَقْبَلُ الْمَيْسُورَ، وَأَتَجَاوَزُ عَنِ الْمَعْسُورِ، فَقَالَ: تَجَاوَزُوا عَنْ عَبْدِي، قَالَ أَبُو مَسْعُودٍ: هَكَذَا سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ»[1]

"نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ پچھلی قوموں میں ایک شخص کی روح قبض کرنے کے بعد فرشتوں نے اس سے کہا کہ کوئی نیکی کا کام بھی کیا ہے؟ تو اس نے جواب میں کہا کہ مجھے یاد نہیں ہے۔ فرشتے پھر کہیں گے کہ یاد کرو۔ تو وہ جواب میں کہے گا کہ ایک نیکی یاد ہے کہ میں لوگوں کو قرض دیتا تھا اور جب قرض واپس لینے کا وقت ہوتا تھا تو اپنے غلاموں کو یہ حکم دیتا تھا کہ دیکھنا جو تنگدست ہو، اس کو مزید مہلت دے دینا اور جو قرض ادا نہ کر سکتا ہو، اس کو معاف کر دینا۔ اللہ نے اس عمل پر اس کو جنت میں داخل کر دیا۔"

---

[1] صحیح مسلم، كِتَابُ الْمُسَاقَاةِ، بَابُ فَضْلِ إِنْظَارِ الْمُعْسِرِ، 1195/3

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

«عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: بَيْنَمَا رَجُلٌ يَمْشِي عَلَى طَرِيقٍ وَجَدَ غُصْنَ شَوْكٍ، فَقَالَ: لَأَرْفَعَنَّ هَذَا لَعَلَّ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ يَغْفِرُ لِي بِهِ، فَرَفَعَهُ، فَغَفَرَ اللهُ لَهُ بِهِ، وَأَدْخَلَهُ الْجَنَّةَ»[1]

"نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ایک شخص نے مسلمانوں کے راستے میں ایک کانٹے دار شاخ کو دیکھا تو اس نے کہا کہ اللہ کی قسم! میں اسے مسلمانوں کے راستے سے صاف کر دوں گا تاکہ کسی مسلمان کو تکلیف نہ ہو۔ تو اللہ نے اس عمل پر اسے معاف کر دیا اور جنت میں داخل کر دیا۔"

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

«مَنْ قَرَأَ آيَةَ الْكُرْسِيِّ دُبُرَ كُلِّ صَلَاةٍ مَكْتُوبَةٍ لَمْ يَمْنَعْهُ مِنْ دُخُولِ الْجَنَّةِ إِلَّا أَنْ يَمُوتَ»[2]

"نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جس شخص نے ہر فرض نماز کے بعد آیت الکرسی پڑھنے کو اپنا معمول بنا لیا تو اس کے جنت میں داخل ہونے میں صرف ایک ہی رکاوٹ ہے، اور وہ اس کی موت ہے۔"

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

«عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: سَيِّدُ الِاسْتِغْفَارِ أَنْ تَقُولَ: اللَّهُمَّ أَنْتَ رَبِّي لاَ إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ، خَلَقْتَنِي وَأَنَا عَبْدُكَ، وَأَنَا عَلَى عَهْدِكَ وَوَعْدِكَ مَا اسْتَطَعْتُ، أَعُوذُ بِكَ مِنْ شَرِّ مَا صَنَعْتُ، أَبُوءُ لَكَ بِنِعْمَتِكَ عَلَيَّ، وَأَبُوءُ لَكَ بِذَنْبِي فَاغْفِرْ لِي، فَإِنَّهُ لاَ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ. قَالَ: «وَمَنْ قَالَهَا مِنَ النَّهَارِ مُوقِنًا بِهَا، فَمَاتَ مِنْ يَوْمِهِ قَبْلَ أَنْ يُمْسِيَ، فَهُوَ مِنْ أَهْلِ الجَنَّةِ، وَمَنْ قَالَهَا مِنَ اللَّيْلِ وَهُوَ مُوقِنٌ بِهَا، فَمَاتَ قَبْلَ أَنْ يُصْبِحَ، فَهُوَ مِنْ أَهْلِ الجَنَّةِ»[3]

"آپ ﷺ سے مروی ہے کہ سید الاستغفار یہ ہے کہ تم یہ کہو: اے اللہ! آپ

---

[1] مسند الإمام أحمد بن حنبل: 198/16

[2] الألباني، محمد ناصر الدين، صحيح الجامع الصغير وزياداته، المكتب الإسلامي، مصر، 1103/2

[3] صحيح البخاري، كِتَابُ الدَّعَوَاتِ، بَابُ أَفْضَلِ الِاسْتِغْفَارِ، 67/8

ہی میرے رب ہیں اور آپ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ آپ ہی نے مجھے پیدا کیا ہے اور میں آپ ہی کا غلام ہوں۔ اور میں اپنی استطاعت کے مطابق اُس عہد پر قائم ہو کہ جو میں نے آپ سے کیا ہے۔ میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں، اُس گناہ اور برائی کے شر سے کہ جو میں نے پیدا کی ہے۔ میں اپنے وجود پر آپ کی نعمتوں کا احسان مند ہوں اور ساتھ ہی آپ کا گناہ گار ہونے پر شرمندہ بھی ہوں۔ اے مالک! مجھے معاف فرمادے۔ بے شک آپ کے علاوہ میرے گناہوں کو کوئی معاف کرنے والا نہیں ہے۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص صبح کے وقت یقین کے ساتھ ایک مرتبہ سید الاستغفار پڑھ لے اور اس دن میں اس کی وفات ہو جائے تو وہ جنتی ہے۔ اور اگر شام میں یقین کے ساتھ پڑھ لے اور اس رات میں اس کی وفات ہو جائے تو وہ جنتی ہے۔"

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

«قال رسـولُ الله -صـلى الله عليه وسـلم-: أنا زعِيم بِبيتٍ في رَبَضِ الجنةِ، لمن تركَ المِراء وإن كان مُحِقًّا، وببيتٍ في وسَـطِ الجنةِ لمن تركَ الكـذِبَ وإن كانَ مازحاً، وببيتٍ في أعلى الجنـةِ لمن حسَّـنَ خُلُقَه»[1]

"نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں اس شخص کو جنت کے کنارے گھر کی بشارت دیتا ہوں کہ جو جھگڑا چھوڑ دے، چاہے اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہو۔ اور اس کو جنت کے وسط میں گھر کی بشارت دیتا ہوں جو جھوٹ کو چھوڑ دے، چاہے مزاح میں ہی کیوں نہ ہو۔ اور اس شخص کو جنت کے اعلی درجوں میں گھر کی بشارت دیتا ہوں کہ جو اپنے اخلاق کو بلند کر لے۔"

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ رَسُـولِ اللَّهِ صَـلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَـلَّمَ قَالَ: «مَنْ يَضْـمَنْ لِي مَا بَيْنَ لَحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ أَضْمَنْ لَهُ الجَنَّةَ»[2]

[1] سنن أبي داود، كتاب الأدب، باب في حسن الخلق، 7/178-179

[2] صحيح البخاري، كِتَابُ الرِّقَاقِ، بَابُ حِفْظِ اللِّسَانِ، 8/100

”نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جو مجھے اپنی شرم گاہ اور زبان، دو چیزوں کی حفاظت کی ذمہ داری دیتا ہے تو میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں۔“

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «الْعُمْرَةُ إِلَى الْعُمْرَةِ كَفَّارَةٌ لِمَا بَيْنَهُمَا، وَالْحَجُّ الْمَبْرُورُ لَيْسَ لَهُ جَزَاءٌ إِلَّا الْجَنَّةُ»[1]

”نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ ایک عمرہ دوسرے عمرہ تک تمام گناہوں کا کفارہ ہے اور مقبول حج کی جزا تو جنت ہے۔“

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

قَالَ: رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «وَأَنَا وَكَافِلُ اليَتِيمِ فِي الجَنَّةِ هَكَذَا» وَأَشَارَ بِالسَّبَّابَةِ وَالوُسْطَى، وَفَرَّجَ بَيْنَهُمَا شَيْئًا»[2]

”نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ میں اور یتیم کی کفالت کرنے والا جنت میں ایک ساتھ ہوں گے۔ اور آپ ﷺ نے شہادت کی انگلی اور درمیانی انگلی سے اِس طرح اشارہ کرکے دکھایا کہ ان دونوں کے مابین کچھ فاصلہ تھا۔“

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَنْ كَانَ آخِرُ كَلَامِهِ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ دَخَلَ الْجَنَّةَ»[3]

”نبی کریم ﷺ نے فرمایا کہ جس کا آخری کلام لا الہ الا اللہ ہو گا، وہ جنت میں داخل ہو گا۔“

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: إِنَّ اللَّهَ يَقُولُ: «إِذَا أَخَذْتُ كَرِيمَتَيْ عَبْدِي فِي الدُّنْيَا لَمْ يَكُنْ لَهُ جَزَاءٌ عِنْدِي إِلَّا الجَنَّةَ»[4]

”اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالی یہ فرماتے ہیں کہ اگر میں اپنے

---

[1] موطأ الإمام مالك، كِتَابُ الْحَجِّ، بَابُ جَامِعِ مَا جَاءَ فِي الْعُمْرَةِ، 346

[2] صحيح البخاري، كِتَابُ الطَّلاَقِ، بَابُ اللِّعَانِ، 53/7

[3] سنن أبي داود، كِتَاب الْجَنَائِزِ، بَابٌ فِي التَّلْقِينِ، 190/3

[4] سنن الترمذي، أَبْوَابُ الزُّهْدِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي ذَهَابِ البَصَرِ، 602/4

بندے کی دو آنکھیں لے لوں تو اس پر صبر کا بدلہ صرف جنت ہے۔"

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ: أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «يَقُولُ اللَّهُ تَعَالَى: مَا لِعَبْدِي المُؤْمِنِ عِنْدِي جَزَاءٌ، إِذَا قَبَضْتُ صَفِيَّهُ مِنْ أَهْلِ الدُّنْيَا ثُمَّ احْتَسَبَهُ، إِلَّا الجَنَّةُ»[1]

"حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالی فرماتے ہیں کہ جب میں اپنے بندے کے جگر گوشے کی روح قبض کر لوں تو اس پر صبر کا بدلہ میرے پاس صرف جنت ہے۔"

❁❁❁❁❁❁❁

[1] صحيح البخاري، كِتَابُ الرِّقَاقِ، بَابُ العَمَلِ الَّذِي يُبْتَغَى بِهِ وَجْهُ اللَّهِ، 90/8

باب ہفتم

اصلاح میڈیا

اس باب میں اصلاح میڈیا کے ضمن میں سوشل میڈیا، فیس بک اور فلم انڈسٹری کی اصلاح پر گفتگو کی گئی ہے۔

سوشل میڈیا اور نیٹ فورمز کے جہادی

سوشل میڈیا پر کچھ ایسے نوجوان بھی دیکھنے سننے کو ملتے ہیں جو معاصر جہادی تحریکوں مثلاً داعش، حماس، طالبان پاکستان وغیرہ کی حمایت میں اس قدر لکھتے اور بولتے ہیں کہ اپنے جہادی بیانات کے ذریعے میدان جنگ کے مجاہدین کو بھی مات دے دیں۔ لیکن قابل افسوس بات یہ ہے کہ فیس بک، ٹوئٹر اور نیٹ فورمز کے ان جہادیوں کی اکثریت کی حالت یہ ہے کہ ایک طرف تو یہ حضرات عوام الناس کو جہاد نہ کرنے کا الزام اور مذہبی، اصلاحی، تبلیغی جماعتوں کو صرف دعاؤں پر اکتفا کرنے پر لعن طعن کر رہے ہوں گے یا پھر مسلمان علماء پر بزدل اور مرجئہ ہونے کے الزامات اور مسلمان حکمرانوں کو کافر قرار دینے کے دلائل دے رہے ہوں گے اور دوسری طرف ٹورنٹ (torrent) کے ذریعے ہالی وڈ (Hollywood) کی دو چار فلمیں ڈاون لوڈ پر لگائی ہوں گے۔ جیسے ہی ادھر سے مولانا فیس بک کے جہاد سے فارغ ہوئے تو دوسری طرف موویاں دیکھنا شروع کر دیں گے۔

ایک ایسے ہی مجاہد نوجوان کو جب رمضان میں روزے رکھنے کی طرف توجہ دلائی گئی تو اس کا جواب تھا کہ فلسطین میں یہ ہو رہا ہے، وہ ہو رہا ہے اور آپ لوگ ابھی نماز روزے سے ہی نہیں نکل رہے۔ اسی قسم کے ایک جہادی نوجوان تو فیس بک پر پوسٹیں (posts) لگاتے ہوئے یہ تاثر دے رہے تھے کہ شاید میدان جنگ میں بیٹھے ہوں۔ پہلے تو حیرانگی ہوئی کہ میدان جنگ میں فیس بک استعمال کر رہے ہیں؟ پھر کچھ عرصہ بعد ایک پوسٹ میں ایک غلطی کر بیٹھے تو ان کا معمہ کھلا کہ حضرت نے فیس بک کے میدان میں پڑاؤ ڈالا ہوا ہے۔ اسی طرح ایک اور جہادی کے بارے معلوم ہوا جو کہ حکمرانوں کو کافر نہ کہنے پر دوسروں کو کوستے رہتے تھے اور عموماً اس جہاد کے بعد انڈین گانے اور غزلیں سننے کا شوق فرمایا کرتے تھے۔

یہ جہاد عموماً ایسی آئی ڈیز کے ساتھ ہوتا ہے جو مبہم ہوتی ہیں لہذا ایسے مجاہدین کے دعووں، تقوی، دینداری اور اخلاقی حالت وغیرہ معلوم کرنے کے لیے قارئین کے پاس

کوئی ذریعہ نہیں ہوتا۔ یہ حضرات اپنی شناخت چھپانے کے حق میں اپنی سیکورٹی کے گھسے پٹے دلائل پیش کرتے ہیں حالانکہ ان کی شناخت چھپانے کی اصل وجہ سیکورٹی نہیں، ان کا معاشرے میں وہ دینی کریکٹر ہوتا ہے کہ جس کی وجہ سے وہ اخلاقی طور اس قابل نہیں ہوتے کہ اپنی شناخت کے ساتھ کوئی بات کر سکیں۔

ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو فرض نماز نہیں پڑھتے لیکن پوسٹوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے صبح و شام دو مرتبہ شہادت کے مرتبے پر فائز ہو رہے ہوں۔ کیا یہ کھلا تضاد نہیں ہے؟ جن مجہول (anonymous) آئی ڈیز کے ساتھ یہ لوگ گفتگو کرتے ہیں، اس جہالت کے ساتھ دین کی کوئی روایت قبول نہیں ہوتی۔[1] لہذا ایسے مجہول العین (anonymous) سوشل میڈیا کے جہادیوں سے دین لینا یا دین کی بات نقل کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی مجہول راوی کی روایت پر مہر تصدیق ثبت کرنا۔ اب کیا مجاہیل (anonymous) کی جماعت ہمیں یہ بتائے گی کہ ہمارا دین کیا ہے؟

سلف صالحین کے جہاد میں ہمیں وہ سختی، درشتگی اور بے رحمی نظر نہیں آتی جو سوشل میڈیا کے ان جہادیوں میں نظر آتی ہے۔ اور اس کی وجہ ان کی بے عملی اور بد عملی دونوں ہے جس نے ان کے دلوں کو دوسروں کے لیے پتھر سے زیادہ سخت کر دیا ہے۔ اللہ عزوجل ہماری امت کو سوشل میڈیا کے ایسے جہادیوں سے محفوظ فرمائے۔ آمین یا رب العالمین۔

خودکش حملوں میں کلمہ گو مسلمانوں کو مارنا تو جہاد نہیں، فساد ہے لیکن اگر کہیں کافروں کے ساتھ بھی جہاد ہو رہا ہوتا تو یہ سوشل میڈیا کے مجاہدین میدان جنگ میں جا کر مسلمانوں کی طرف سے نہ لڑتے کیونکہ یہ ایک ایسا کردار (character) ہے کہ جو

---

[1] ایک عمل ہے اپنی شاخت کو چھپانا ہے اور اس سے شناخت چھپانے والا مجہو ل بن جاتا ہے۔ اور ایک ہے اپنا غلط تعارف کروانا یعنی کسی۔کا نام زید حامد ہے اور وہ اپنا نام علی عاصم بتلائے تو یہ جھوٹ ہے اور یہ عمل بھی کسی۔ شخص کی ذات کو مجروح کر دیتا ہے ۔ اور ایک ہے کہ انسان اپنی شناخت چھپانے کی کوشش نہ کرے تو یہ معروف ہے، چاہے اسے کچھ لوگ نہ بھی جانتے ہوں۔ مجہول اسے کہتے تھے کہ جس کے حالات کے بارے جانکاری کی کوشش کی جائے اور اس کے بعد بھی اس کے حالات واضح نہ ہوں۔

ایسے نفاق پر پلتا ہے کہ جسے شیطان خوبصورت ایمان کی صورت میں اُن پر پیش کر رہا ہوتا ہے۔ یہ کردار اللہ کے رسول ﷺ کے دور میں بھی موجود تھا۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَلَوْ أَرَادُوا الْخُرُوجَ لَأَعَدُّوا لَهُ عُدَّةً وَلَٰكِن كَرِهَ اللَّهُ انبِعَاثَهُمْ فَثَبَّطَهُمْ وَقِيلَ اقْعُدُوا مَعَ الْقَاعِدِينَ ﴿46﴾ لَوْ خَرَجُوا فِيكُم مَّا زَادُوكُمْ إِلَّا خَبَالًا وَلَأَوْضَعُوا خِلَالَكُمْ يَبْغُونَكُمُ الْفِتْنَةَ وَفِيكُمْ سَمَّاعُونَ لَهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ﴾ [التوبة: 47]

"اور اگر ان کا اللہ کے راستے میں نکلنے کا ارادہ ہوتا تو وہ ضرور اس کی اچھی طرح تیاری کرتے لیکن اللہ نے ان کے جہاد میں نکلنے کو ناپسند جانا اور انہیں سستی میں ڈال دیا۔ اور ان سے کہا گیا کہ تم بھی پیچھے بیٹھ رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔ اور اے مسلمانو! اگر وہ تمہارے ساتھ جہاد میں نکل بھی جاتے تو سوائے تمہارے مابین خرابی پیدا کرنے کے اور کچھ نہ کرتے۔ وہ تمہارے درمیان گھوڑے دوڑاتے پھرتے تاکہ تمہیں فتنے میں مبتلا کر سکتے۔ اور اے مسلمانو! تم میں اب بھی کچھ ایسے لوگ ہیں جو ایسے لوگوں کی باتیں غور سے سنتے ہیں۔ اور دیکھو! اللہ تعالی ایسے ظالموں سے خوب واقف ہے۔"

فیس بک کا نشہ

ماہرین نفسیات نے نشہ کی دو قسمیں بیان کی ہیں: کیمیائی اور غیر کیمیائی۔[1] پہلی قسم کو مادی اور دوسری کو کرداری نشہ[2] یا پہلی کو ادویاتی اور دوسری کو غیر ادویاتی نشہ[3] کا نام بھی دیا جاتا ہے۔ کیمیائی نشہ میں ہیروئن، چرس، افیون، الکحل، شراب، نشہ آور ادویات، نشہ آور انجکشن، شیشہ، گٹکا وغیرہ کو شامل کیا جاتا ہے جبکہ غیر کیمیائی نشہ میں انٹرنیٹ، گیمز، موویز اور فیس بک کا نشہ، کھانے پینے کا نشہ، سیکس اور کام کا نشہ، محبت اور عشق کا نشہ، اور جوئے کا نشہ وغیرہ شامل ہیں۔

ماہرین نفسیات کا کہنا ہے کہ حد سے زیادہ انٹرنیٹ، گیمز، کام، کھیل، محبت، جواء

---

[1] chemical and non-chemical addiction

[2] substance and behavioral addiction

[3] drug non-drug addiction

کھیلنے کی صورت میں انسانی دماغ سے ایک مادہ خارج ہو سکتا ہے جسے وہ بیٹا اینڈروفائن (beta-endorphins) کا نام دیتے ہیں۔ اس مادے کا کام یہ ہے کہ یہ انسان میں یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ وہ کچھ خاص ہے۔ اور اپنے کچھ خاص ہونے کا یہی احساس بڑھتے بڑھتے ایک جنون بن جاتا ہے اور انسان اپنے دماغ ہی کے پیدا کردہ مواد کے نشہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ آج ہمارے علم میں ہے کہ اپنے اسمارٹ فون سے مہم جوئی کرتے ہوئے اچھی سیلفی (selfie) لینے کے نشہ کے سبب ہر ماہ کتنے لوگ موت کے منہ میں پہنچ جاتے ہیں؟

ہمارے بچے موبائل اور انٹرنیٹ پر جس طرح گیمز کے نشے میں مبتلا ہوتے ہیں، اس کا اندازہ صرف اس تجربے سے لگایا جا سکتا ہے کہ جب والدین انہیں اس حالت میں کوئی کام کرنے کو کہتے ہیں تو ان کا کیا ردعمل ہوتا ہے۔ اگر آپ باقاعدگی سے فیس بک پر بیٹھتے ہیں تو اپنے آپ سے یہ سوال ضرور کریں کہ آپ "فیس بک کے نشہ" میں تو مبتلا نہیں ہیں۔ اس سوال کا جواب حاصل کرنے کا آسان طریقہ یہ ہے کہ جب آپ فیس بک پر ہوتے ہیں اور کوئی آپ کو اپنی طرف متوجہ کرے تو آپ کا کیا ردعمل ہوتا ہے؟

تو کیا فیس بک استعمال کرنا چھوڑ دیں؟ کچھ دوستوں کی یہی رائے ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ سوشل میڈیا نے ہماری حقیقی سوشل لائف کو ختم کر دیا ہے کہ اب ہمارے گھروں میں خاندان کے افراد کے مابین باہمی تعلق ختم ہو کر رہ گیا ہے۔ جس کے فیس بک پر پانچ ہزار دوست ہیں، حقیقی زندگی میں پانچ بھی نہیں ہیں۔ شام کو گھر کا منظر یہ ہے کہ والد صاحب لیپ ٹاپ پر مصروف ہیں، والدہ اسمارٹ فون میں کھوئی ہیں اور بچے ٹیبلٹ، آئی فون اور ایل سی ڈی پر بیٹھے ہیں۔ اور تینوں ایک آدھ گھنٹے کے بعد ایک دوسرے کی طرف ایک نظر اٹھا کر دیکھ لیتے ہیں۔

پہلے کسی کے ہاں بطور مہمان جاتے تھے تو یہ معلوم کرتے تھے کہ بچوں کا کیا حال ہے؟ اور آج یہ معلوم کرتے ہیں کہ وائے فائے کا پاسورڈ کیا ہے؟ اور اگر کبھی نیٹ کی تار خراب ہو جائے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے زندگی ختم ہو گئی ہو۔ اور کسی کا فیس بک

اکاؤنٹ چرالیا جائے، تو اس کی تو جیسے موت (virtual death) ہی ہو گئی ہو۔ جہاں تک اس مذہبی ذہن کی بات ہے کہ جو یہ کہتا ہے کہ ہم سوشل میڈیا پر دین کی تبلیغ کے لیے موجود ہیں تو اس بارے میں خود بھی سوچتا ہوں کہ سوشل میڈیا پر دین کے نام پر تبلیغ کم اور مباحثہ زیادہ ہوتا ہے اور اس مباحثے کا کیا فائدہ کہ جس کی دلیلیں نماز میں سوجھ رہی ہوں۔

بہر حال فیس بک کو استعمال کرنا یا نہ کرنا، اس بارے میں ہر شخص کو خود سے ہی کوئی فیصلہ کرنا ہے البتہ میرے ذہن میں ایک تدبیر ہے، اگر اس پر عمل کر لیا جائے تو اس نشے کی لت اور اس کے مضر اثرات پر بہت حد تک قابو پایا جا سکتا ہے۔ اور وہ تدبیر یہ ہے کہ یہ فیصلہ کر لیں، کہ میں نے فیس بک طلوع آفتاب کے بعد اور غروب آفتاب سے پہلے استعمال کرنی ہے، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ میری رات میرے گھر والوں اور پروردگار کے لیے ہے اور دن دنیا والوں کے لیے ہے۔ شاید اسی سے ہم اپنی ذات، اپنے پروردگار، اپنی حقیقی سماجی زندگی اور ورچوئل سوشل لائف کے مابین توازن قائم کر سکتے ہیں۔

فوٹو اور کامیڈی

فیس بک پر سب سے زیادہ پسندیدگیاں (likes) فوٹو کو ملتی ہیں اور سب سے زیادہ پھیلاؤ (shares) کامیڈی کو۔ اگر آپ فیس بک پر دین کی زیادہ سے زیادہ تبلیغ چاہتے ہیں تو اسلام کا ایک فوٹو ورژن تیار کر لیں اور کامیڈین بننے کی پریکٹس شروع کر دیں۔ فیس بک پر لکھنے والے زیادہ اور پڑھنے والے کم ہیں۔ اور وہ وقت بھی جلد آنے والا ہے کہ جب لکھنے والے سب ہوں گے اور پڑھنے والا ڈھونڈنا پڑے گا۔ اور یوزر پوسٹ لکھنے کے بعد اس کا پہلا اور آخری ریڈر ہوا کرے گا۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَذَرِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَلَهْوًا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهِ أَن تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ﴾ [الأنعام: 70]

"اور ایسے لوگوں سے بالکل کنارہ کش رہیں جنہوں نے اپنے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا ہے اور دنیوی زندگی نے انہیں دھوکہ میں ڈال رکھا ہے۔ البتہ یہ قرآن

مجید سنا کر لوگوں کو نصیحت اور تنبیہ کرتے رہیں تاکہ کوئی شخص اپنے کرتوتوں کے وبال میں گرفتار نہ ہو جائے۔"

اب تو کتابیں پڑھنا بھی فخر کی ایک علامت بن گیا ہے۔ ہر کوئی دوسرے کو یہ باور کرانے میں لگا ہے کہ میں نے یہ کتاب بھی پڑھی ہے، وہ بھی پڑھی ہے، تم نے کیا پڑھا ہے؟ کہیں دوستوں کی محفل ہو تو اس کا ایک پسندیدہ موضوع ان کتابوں کی فہرست بتلانا ہوتا ہے جو آپ پچھلے کچھ عرصے میں پڑھ یا دیکھ چکے ہوں۔ اور قاری کو کتابوں کی یہ فہرست بتلانے کی بے چینی اتنی ہی ہوتی ہے جتنی کہ شاعر کو اپنا کلام سنانے کی۔ اور عمل پر غور کریں تو وہ لکھ نہیں ہے۔ ایک صاحب کہ جو کتابیں پڑھنے کے بہت شوقین ہیں، نے عمل کی نیت سے کتابیں پڑھنی شروع کیں تو یہ حالت ہو گئی کہ قرآن مجید اور صحاح ستہ کے علاوہ کسی کتاب کو ہاتھ لگانے کو دل ہی نہیں کرتا تھا۔

ہالی وڈ انڈسٹری اور دہریت
(Hollywood and Atheism)

تہذیبوں اور قوموں کے مابین جنگیں میڈیا اور قلمی جنگ میں بھی داخل ہو چکی ہیں۔ الحاد اور دہریت (atheism) نے عرصہ دراز سے ہالی وڈ کی فلم انڈسٹری کو اپنے ردی افکار کی تبلیغ کا ایک ذریعہ بنایا ہوا ہے۔ اب فلم صرف تفریح نہیں ہے بلکہ فکری جنگ ہے، پروپیگنڈا ہے، افکار کی تبلیغ کا ذریعہ ہے، معاشروں میں تشدد اور بے حیائی پیدا کرنے کا ہتھیار ہے، وغیرہ۔

مغرب میں فلم بنانے والے ڈائریکٹرز ذہین ترین لوگوں میں سے ہوتے ہیں۔ وہ فلم انڈسٹری کے ذریعے صرف کاروبار نہیں کر رہے، یا لوگوں کو محض تفریح نہیں مہیا کر رہے بلکہ وہ ذہنوں کو مسخر کر رہے ہیں، معاشروں کو تبدیل کر رہے ہیں اور ملکوں پر حکومت کر رہے ہیں۔ انہیں یہ اچھی طرح معلوم ہے کہ فلم میں کہاں انہوں نے آپ کو رُلانا ہے، کہاں ہنسانا ہے اور کہاں اور کس منظر میں آپ کے ذہن میں کون سی بات اس طرح ڈالنی ہے کہ آپ کو احساس بھی نہ ہو کہ آپ کی ذہن سازی کی گئی ہے۔ وہ آپ

کے ذہن میں میوزک کے پس منظر اور فلمی ڈائیلاگ کے راستے اپنا پیغام چھوڑ جاتے ہیں کہ جو پھلتا پھولتا رہتا ہے یہاں تک کہ کچھ عرصہ بعد وہ آپ کی پختہ فکر بن کر سامنے آتا ہے۔ فلم انڈسٹری کا کمال یہ ہے اس نے مذہب، سماج، معاشرتی اقدار اور اخلاقیات وغیرہ کے سارے ذہنی فلٹرز بے کار کر دیے ہیں کہ جن کے بے کار ہو جانے سے ہر گندگی اور نجاست انسانی خیالات اور تصورات میں شامل ہوتی چلی جا رہی ہے۔

یہ تو اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے کہ کوشش کے باوجود ہمارے بچے انگریزی نہیں سمجھتے، ورنہ کب کا ہمارا معاشرہ ہالی وڈ فلمز، اینیمیٹڈ موویز اور کارٹونز کے راستے خدا بیزار بن چکا ہوتا۔ ایک سروے رپورٹ کے مطابق کوئی پچاس کے قریب ہالی وڈ کی فلمیں ایسی ہیں جو خدا بیزاری (atheism) کی تبلیغ کرتی ہیں۔[1]

اللہ ہمیں موویاں دیکھنے کے فتنے سے بچائے رکھے تو یہ اس کی خاص توفیق اور نعمت ہے۔ البتہ پرنٹ میڈیا کے تبصروں کے مطالعہ کے ذریعہ اس میدان کے فنکاروں سے جانکاری رکھنی چاہیے تاکہ لوگوں کو ان کے فتنے سے بچایا جا سکے۔ اللہ سبحانہ وتعالی نے شر کو پیدا کیا ہے اور یہ قیامت تک باقی رہے گا۔ ہماری محنت سے یہ ختم نہیں ہو سکتا البتہ کم ہو سکتا ہے۔ اور ہم سے ہمارے رب کا یہی مطالبہ ہے کہ ہم اسے کم کرنے کے لیے محنت اور کوشش کریں۔ اور شر کو کم کرنے میں یہ بھی شامل ہے کہ موویز دیکھنے والوں کو ان کے برے اثرات سے آگاہ کیا جائے تاکہ وہ انہیں دیکھ کر مذہب بیزار نہ ہو جائیں۔

ارشاد باری تعالی ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يُحِبُّونَ أَن تَشِيعَ الْفَاحِشَةُ فِي الَّذِينَ آمَنُوا لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ﴾ [النور: 19]

"جو لوگ چاہتے ہیں کہ ایمان لانے والوں کے گروہ میں بے حیائی پھیلے وہ دنیا اور آخرت میں دردناک سزا کے مستحق ہیں، اللہ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔"

---

[1] http://www.rationalresponders.com/atheism_movies

فلم بنانا

ایک دوست نے ایک دفعہ سوال کیا کہ کیا فلم یا مووی بنانا جائز ہے؟ میں نے ہنستے ہوئے پوچھا: عورت اور گانے کے بغیر فلم بنالیں گے؟ اور پھر وہ بھی ہٹ ہو جائے؟ انہوں نے کہا: بعض ہٹ فلمیں ایسی ہیں کہ جن میں نہ عورت ہے نہ گانا۔ میں نے کہا: ایک آدھ کا نام تو بتلائیں؟ انہوں نے کہا: ریمبو ون۔ میں نے حیرانگی سے کہا کہ کیا اس فلم میں بالکل بھی عورت نہیں ہے؟ انہوں نے کہا: دو منظر ایسے ہیں کہ جن میں عورت بس چلتے پھرتے میں موجود ہے، باقی اس فلم کے مرکزی یا ذیلی کردار کے طور عورت شامل نہیں ہے۔

انہوں نے یہ بھی ذکر کیا کہ ایک فرانسیسی ڈرامہ کہ جسے فلمایا بھی گیا ہے، غودو کے انتظار میں (waiting for godot) کے نام سے ہے۔ اس میں لڑکی کا کردار نہیں ہے اور یہ مختلف زبانوں میں بیسیوں مرتبہ فلمایا جاچکا ہے۔ ابھی پچھلے ہی دنوں کراچی میں ضیا محی الدین کی ہدایت میں فلمایا گیا ہے۔ روسی افسانہ نگار چیخوف کا سب سے معروف ترین افسانہ (the bet) کئی ملکوں میں فلمایا ہے اس میں بھی عورت کا کردار نہیں ہے۔ ایک اور فلم ہے کہ جس کا نام (twelve anger men) ہے اور اس فلم کو بی بی سی نے پچھلی صدی کی سو بہترین فلموں میں رکھا ہے جبکہ اس میں بھی عورت کا کردار نہیں ہے۔

انہوں نے کہا کہ اسی طرح امریکی ناول نگار ہیمنگ وے کا ناول بوڑھا آدمی اور سمندر (the old man and the sea) بھی ایک اور ایسی مثال ہے کہ جسے فلمایا گیا ہے۔ اور لارنس آف عربیہ (lawrence of arabia) بھی اس بارے ایک عمدہ مثال ہے۔ چیخوف کے اس افسانے پر پی ٹی وی نے بھی ڈرامہ بنایا تھا اور اسے ایوارڈ ملا تھا۔ اس لیے ڈارمے اور فلم کا ہٹ ہونا مسئلہ نہیں، البتہ بس یہ ضروری ہے کہ وہ آرٹ ضرور ہو۔ اسی طرح ایک فلم "بابا عزیز" کا بیان علامتی ہے اور آرٹ کو آرٹ رہنے دیا گیا ہے۔ حسن عسکری نے ڈرامہ کی جو پہلی شرط لگائی ہے کہ وہ بہترین تفریح ہونے

چاہیے، نہ کہ اصلاح، آرٹ میں اس کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔

انہوں نے کہا کہ جس طرح فٹبال کا بنیادی مقصد کھیل ہے، لیکن ہم اس سے اور مقاصد بھی وابستہ کر سکتے ہیں، صحت بہتر بنائی جائے تاکہ جہاد کی تیاری رہے وغیرہ۔ باقی اچھی تفریح بذاتِ خود ایک مقصد ہے، جس معاشرے میں تفریح کا رجحان ختم ہو جائے، اس معاشرے میں پژمردگی (sadism) آجاتا ہے۔ شعر سننا اور سنانا ایک تفریح ہے لیکن یہ ایک ایسا عمل بھی ہے جو طبعیت اور ذہن دونوں کو بلند کرتا ہے۔

ایک اور دوست نے تبصرہ کیا کہ ایک مووی (The Objective) کے نام سے ہے کہ جس میں افغانستان میں غیر مرئی قوتوں کے ہاتھوں ہلاک ہونے والے چھ امریکی میریز کی سچی داستان فلمائی گئی ہے۔ اس میں صرف ایک منظر میں عورت ہے اور وہ بھی افغان جو افغانی برقعے میں مکمل طور پر چھپی ہوئی ہے۔ ایک اور دوست نے تبصرہ کیا کہ صرف ڈاکومینٹری فلم بنانا جائز ہے جبکہ کسی اور قسم کی فلم بنانا بالکل بھی جائز نہیں ہے۔

ڈرامہ، فلم اور مووی وغیرہ میں جو چیز واضح طور ممنوع ہے، وہ فحش منظر نگاری، گانا بجانا، تشدد اور رومانس وغیرہ ہیں۔ اگر کسی ڈرامے، فلم اور مووی کا مقصد اچھا اور تعمیری ہو اور وہ کسی تاریخی، معاشرتی، معاشی، سیاسی یا مذہبی تصور کی اصلاح کے موضوع پر ہوں تو یہ اصلاح معاشرہ کا ایک اچھا ذریعہ ہیں۔ واللہ اعلم۔ اور یہ بات تو واضح ہے ہی کہ جس فلم اور مووی کا بنانا جائز ہے، اسے دیکھنا بھی جائز ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَائِشَةَ، قَالَتْ: «لَقَدْ رَأَيْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَوْمًا عَلَى بَابِ حُجْرَتِي وَالحَبَشَةُ يَلْعَبُونَ فِي المَسْجِدِ، وَرَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَسْتُرُنِي بِرِدَائِهِ، أَنْظُرُ إِلَى لَعِبِهِمْ»[1]

”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے ایک دن اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے حجرے کے دروازے پر کھڑا دیکھا جبکہ کچھ حبشی مسجد نبوی میں کھیل رہے تھے۔ اور میں نے ان حبشیوں کا کھیل دیکھا جبکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے

[1] صحيح البخاري، كِتَابُ الصَّلاَةِ، بَابُ أَصْحَابِ الحِرَابِ فِي المَسْجِدِ، 98/1

اپنی چادر میں چھپایا ہوا تھا۔"

سائنسی حق

فیس بک پر بعض دوستوں کا مطالبہ ہے کہ ان کا دینی حق تسلیم کیا جائے اور وہ دینی حق یہ ہے کہ ائمہ دین چونکہ معصوم نہیں ہیں لہذا انہیں ان ائمہ پر تنقید کا حق حاصل ہے۔ انہیں یہ شکایت ہے کہ ان کی تنقید کو "فیس بکی عالم" کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے۔ اس مطالبے سے مجھے اپنا سائنسی حق یاد آ گیا جو آج تک میں استعمال نہ کر سکا۔ وہ یہ کہ چونکہ میں سائنسی دور کی پیدائش ہوں لہذا یہ میرا سائنسی حق ہے کہ میں ائمہ سائنس نیوٹن، آئن سٹائن اور اسٹیون ہاکنگ پر تنقید کروں۔ زیادہ سے زیادہ لوگ "فیس بکی سائنسدان" ہی کہہ دیں گے ناں؟

یہ بات کرنے کا مقصد صرف اتنا ہے کہ ہر میدان میں، چاہے وہ مذہب ہو یا سائنس، سماجی علوم ہوں یا انتظامی علوم، اگر اہل لوگ (experts) مکالمہ کریں گے تو فائدہ ہو گا، ورنہ ایسے ہی طعنے سننے کو ملیں گے۔ ہمارے ہاں ہر میدان مثلاً فزکس، میڈیکل سائنس، ریاضی اور انجنیئرنگ وغیرہ میں علمی نقد کرنے کے لیے ایک معیار مقرر ہے لیکن مذہب میں تو ہر شخص، چاہے اس کا کوئی معیار ہو یا نہ ہو، تنقید کرنا اپنا دینی حق سمجھتا ہے۔ اگر ائمہ دین پر تنقید کا دینی حق ایک یونیورسٹی گریجویٹ کو ہونا چاہیے تو ایک مدرسہ فارغ التحصیل کو بھی ائمہ سائنس پر تنقید کا برابر حق حاصل ہونا چاہیے۔

اور اگر اہل مدرسہ مذہب کی روشنی میں سائنس پر نقد کرتے ہیں تو اس پر اعتراض نہیں بنتا کہ اہل سائنس بھی تو سائنس کے اصولوں کی روشنی میں مذہب کو پرکھ رہے ہوتے ہیں۔ فقہ کی کتاب سے فزکس کے کسی نظریہ پر تنقید کرنا اتنا ہی بامعنی ہے جتنا کہ مذہب کو سائنسی اصول کی روشنی میں پرکھنا۔ یہ اصول کی بات ہے، گر سمجھ میں آئے تو۔

اور دینی معاملات میں بغیر علم کے کوئی رائے دینے پر بڑی سخت وعید جاری ہوئی ہے۔ اور اسے قیامت کی نشانی قرار دیا گیا ہے کہ علماء اٹھا لیے جائیں گے اور جہلاء فتوے جاری کریں گے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«إِذَا لَمْ يَتْرُكْ عَالِمًا، اتَّخَذَ النَّاسُ رُءُوسًا جُهَّالًا، فَسُئِلُوا فَأَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ، فَضَلُّوا وَأَضَلُّوا»[1]

"جب دنیا میں علماء باقی نہ رہیں گے تو لوگ جاہلوں کو اپنا پیشوا بنالیں گے۔ ان جہلاء سے سوال پوچھے جائیں گے اور وہ بغیر علم کے فتوے دیں گے۔ اس طرح وہ خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔"

مرغیاں

ایک دفعہ ملحدوں اور دہریوں (atheists) کے ایک فیس بک پیج پر آنا جانا ہوا تو احساس ہوا کہ یہ میرے بارے یہ خیال رکھتے ہیں کہ جیسے اُن کی مرغیاں چرا کر لے جاؤں گا۔[2] دیکھنے میں آیا ہے کہ جب بھی کوئی نیا ملحد کسی بحث میں کنارے لگنے لگتا ہے تو پرانے ملحد اُس کے ارد گرد جمع ہونا شروع ہو جاتے ہیں اِس ڈر سے کہ کہیں میں اُن کی مرغی بھگا نہ لے جاؤں۔

خوف کا یہ احساس ہر طبقے، جماعت اور مسلک کے لوگوں میں موجود ہوتا ہے کہ کوئی اُن کے دڑبے کی مرغی اپنے دڑبے میں نہ لے جائے۔ جہاں چور اُچکوں سے اپنی مرغیوں کی حفاظت بہت ضروری ہے وہاں اپنی مرغیوں کے بارے زیادہ غیرت کھانا بھی مناسب نہیں ہے کہ تھی تو ہماری تو فلاں کی دیوار (wall) پر کیوں چلی گئی؟

آپ کی مرغیوں کے بارے مجھے یہ عرض کرنا ہے کہ اگر تو آپ روایت پسند (tradionalist) ہیں تو میں ہر گز آپ کی مرغی نہیں چرانے والا اور اگر وہ غلطی سے میری وال پر آگئی اور آپ کو اندیشہ ہوا کہ یہ واپس آپ کے گھر نہیں جائے گی تو آپ مجھے ایک میسج کر دیجیے گا، میں اسے آپ کی وال پر باعزت طریقے سے پہنچا دوں گا۔

اور اگر آپ روایت پسند نہیں ہیں، لبرل اور سیکولر ہیں، تو پھر آپ کی مرغی میری

[1] صحیح مسلم، کتاب الْعِلْمِ، بَابُ رَفْعِ الْعِلْمِ وَقَبْضِهِ وَظُهُورِ الْجَهْلِ وَالْفِتَنِ فِي آخِرِ الزَّمَانِ، 2058/4

[2] یہاں مرغی سے مراد وہ نوجوان ہیں کہ جو نئے نئے ملحد ہوئے ہیں اور پرانے ملحدین ان نوجوانوں کی مذہبی مبلغین سے ایسے ہی حفاظت کرتے ہیں جیسا کہ مرغی کا مالک اپنی مرغیوں کی حفاظت کرتا ہے۔

مرغی۔ پوری کوشش کروں گا کہ آپ کی وال سے بھاگے اور میری وال میں پناہ لے۔ اور پھر اسے خوب کھلا پلا کر موٹا تازہ کر کے آپ کی وال پر مرغا بنا کر واپس بھیجوں گا کہ تہجد اور اشراق کے وقت بھی باقاعدگی سے آپ کی وال پر بانگیں دے گا۔

❁❁❁❁❁❁❁

باب ہشتم

اصلاح تصوف

اس باب میں اصلاح تصوف کے ضمن میں تصوف کی تاریخ، وحدت الوجود، وحدت الشہود، کتبِ تصوف کی اصلاح اور تجدیدِ تصوف پر گفتگو کی گئی ہے۔

تصوف اور چار ادوار

تصوف کی ایک پوری تاریخ ہے جیسا کہ فقہ اسلامی کی ہے اور اس کا ہم چار ادوار کے اعتبار سے جائزہ لے سکتے ہیں۔ پہلا دور وہ ہے جو خیر القرون (best ages) کا زمانہ ہے۔ امام ابن حجر رحمہ اللہ نے صحیح بخاری کی شرح اور امام نووی رحمہ اللہ نے صحیح مسلم کی شرح میں کہا ہے کہ خیر القرون سے مراد صحابہ، تابعین اور تبع تابعین کا زمانہ ہے۔[1] امام سیوطی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا دور بعثت نبوت سے لے کر 120 ہجری تک کا ہے کہ اور اس سن میں آخری صحابی کی وفات ہوئی۔ اور تابعین عظام رحمہم اللہ کا دور تقریباً 100-170ھ تک کا ہے۔ اور تبع تابعین رحمہم اللہ کا دور تقریباً 220ھ تک کا ہے۔[2]

یہ وہ دور ہے کہ جس میں تصوف کی اصطلاح وضع نہیں ہوئی تھی بلکہ آسان الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ صحابہ اور تابعین کی جماعت میں نیکی اور نیک بننے کا حد درجہ شوق کرنے والے کچھ لوگ تھے جو زہاد، صلحاء اور عباد کہلاتے تھے۔ محدثین میں سے امام عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ نے اس بارے "کتاب الزهد والرقائق"، امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ نے "کتاب الزهد"، امام وکیع بن جراح رحمہ اللہ نے "کتاب الزهد"، امام ابو داود رحمہ اللہ نے "کتاب الزهد"، اور امام بیہقی رحمہ اللہ نے "الزهد الکبیر" مرتب کیں۔[3]

ہماری یہ کتاب خیر القرون اور سلف صالحین کے تزکیہ نفس اور اصلاح احوال کے منہج پر مرتب کی گئی ہے کہ جس دور میں نہ کوئی خانقاہ تھی اور نہ ہی گدی نشین، نہ کوئی سلسلہ تھا اور نہ ہی خلیفہ مجاز، نہ کوئی مرشد تھا اور نہ ہی بیعت کا نظام لیکن اس کے باوجود

---

[1] ابن حجر، أحمد بن علي أبو الفضل العسقلاني الشافعي، فتح الباري شرح صحيح البخاري، دار المعرفة، بيروت، 1379ء، 6/7؛ النووي، أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف، المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج، دار إحياء التراث العربي، بيروت، 1392ء، 85-84/16

[2] علي بن محمد، الملا القاري، مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح، دار الفكر، بيروت، 2002م، 3878/9

[3] امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ ان کتب میں امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کی کتاب سب سے بہتر ہے جبکہ امام عبد اللہ بن مبارک رحمہ اللہ کی کتاب میں کچھ منکر روایات بھی نقل ہو گئی ہیں۔ [مجموع الفتاوی: 580/11]

ان لوگوں کا تزکیہ نفس ہوا اور ایسا ہوا کہ انہیں اللہ کے نبی ﷺ نے رہتی دنیا تک بہترین لوگ قرار دیا۔ آپ کا ارشاد ہے:

«خَيْرُ النَّاسِ قَرْنِي، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُمْ، ثُمَّ يَجِيءُ أَقْوَامٌ تَسْبِقُ شَهَادَةُ أَحَدِهِمْ يَمِينَهُ، وَيَمِينُهُ شَهَادَتَهُ»[1]

"بہترین لوگ وہ ہیں جو میرے زمانے کے لوگ ہیں یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم۔ اس کے بعد وہ لوگ بہترین ہیں جو میرے بعد کے زمانے میں ہوں گے یعنی تابعین عظام رحمہم اللہ۔ اور اس کے بعد وہ لوگ بہترین ہیں جو ان کے بعد کے زمانے میں ہوں گے یعنی تبع تابعین رحمہم اللہ۔ اور اس کے بعد تو وہ لوگ ہوں گے کہ جن کی قسم ان کی گواہی سے پہلے اور ان کی گواہی ان کی قسم سے پہلے زبان پر ہو گی۔"

تصوف کا دوسرا دور وہ ہے کہ جس میں اصلاح نفس کے لیے خیر القرون کے منہج کو اختیار کرنے پر زور دیا گیا۔ اس دور میں عمومی اعتبار سے خیر کا پہلو غالب نظر آتا ہے اور اس دور کے صوفیاء میں سب سے بڑا خیر یہ ہے کہ انہوں نے شریعت اور سنت پر عمل ہی کو اپنا اصل مقصود قرار دیا۔ اس دور کے بڑے صوفیاء میں ابراہیم بن ادھم متوفی 160ھ، فضیل بن عیاض متوفی 187ھ، معروف کرخی متوفی 200ھ، ابو سلیمان دارانی متوفی 215ھ، ذوالنون مصری متوفی 245ھ، سہل تستری متوفی 283ھ، جنید بغدادی متوفی 297ھ، ابو طالب مکی متوفی 386ھ، ابو عبد الرحمن سلمی متوفی 412ھ، علی ہجویری متوفی 465ھ، ابو حامد غزالی متوفی 505ھ، عبد القادر جیلانی متوفی 561ھ رحمہم اللہ وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن اس دور میں غالب خیر کے باوجود زہد و تقوی کے نام پر تصوف کے ادارے میں کچھ ایسے نظریات اور اعمال وافعال کی آمیزش ہوئی کہ جو خیر القرون اور سلف صالحین میں نہیں تھے بلکہ یہ ائمہ اربعہ اور فقہائے محدثین کے مذاہب سے بھی انحراف پر مبنی تھے جیسا کہ سماع اور رقص کو تزکیہ کا ذریعہ قرار دینا۔ اس دور میں خیر القرون کے منہج کے سب سے زیادہ قریب سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ ہیں

[1] صحيح البخاري، كتاب الشهادات، باب لاَ يَشْهَدُ عَلَى شَهَادَةِ جَوْرٍ إِذَا أُشْهِدَ، 171/3

کہ جنہوں نے ایک طرف حسین بن منصور الحلاج متوفی 309ھ کی شطحیات سے بیزاری کا اعلان کیا ہے اور دوسری طرح تزکیہ نفس کے لیے سماع اور رقص کو غیر مسنون طریق کار قرار دیا۔ یہی وجہ ہے کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ توحید کے باب میں جو صوفیاء حضرت شیخ جنید بغدادی رحمہ اللہ کے مسلک پر ہیں تو وہ ہدایت پر ہیں اور جو شیخ ابن عربی کے مسلک پر ہیں تو وہ گمراہی میں ہیں۔[1]

تیسرا دور وہ ہے کہ جس میں تصوف کے نام پر کفریہ نظریات کو یونانی اور ایرانی فلسفہ سے کشید کر کے اسلامی عقیدہ کے طور متعارف کروانے کی ناکام کوششیں کی گئیں۔ اس دور میں وحدت الوجود کا نظریہ پیش کیا گیا کہ جس کے بانی شیخ ابن عربی متوفی 638ھ ہیں۔ علاوہ ازیں جلال الدین رومی متوفی 672ھ، شیخ مصلح الدین سعدی متوفی 694ھ، حافظ شمس الدین شیرازی متوفی 792ھ کا شمار ان شعراء میں ہوتا ہے کہ جن کے فارسی کلام سے یونانی افکار اور ایرانی مزاج تصوف کے نام پر برصغیر میں عام ہوئے۔ اس دور میں تصوف عمل سے زیادہ ایک نظریہ بن گیا اور صوفی کے ہاں اصلاح نفس سے زیادہ خاتم ولایت، غوث اعظم، قطب عالم بننا زیادہ اہم مسئلہ ٹھہرا۔ شیخ ابن عربی سے لے کر شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ تک ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ صوفی اپنا روحانی مقام متعین کرنے اور اسے لوگوں سے منوانے کا جیسے بہت زیادہ خواہش مند ہے۔

چوتھا دور درباروں اور گدی نشینوں کا دور ہے جہاں تصوف کا ادارہ جرائم پیشہ افراد کی سرپرستی میں خوب ترقی کر رہا ہے۔ اور تصوف حب جاہ، ریاکاری، مذہبی استحصال، شرعی احکام کی پامالی، اذیت نفس، شعبدہ بازیوں، سیاسی مفادات کے حصول، جنت کے ٹکٹ بانٹنے اور مریدوں کی تعداد میں اضافے وغیرہ کا دوسرا نام بن کر رہ گیا ہے۔ پاکستان میں

---

[1] وَلِهَذَا كَانَ الْجُنَيْد رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ سَيِّدُ الطَّائِفَةِ إمَامَ هُدًى فَكَانَ قَدْ عَرَفَ مَا يَعْرِضُ لِبَعْضِ السَّالِكِينَ فَلَمَّا سُئِلَ عَنْ التَّوْحِيدِ قَالَ: التَّوْحِيدُ إفْرَادُ الْحُدُوثِ عَنْ الْقِدَمِ. فَبَيَّنَ أَنَّهُ يُمَيِّزُ الْمُحْدَثَ عَنْ الْقَدِيمِ تَحْذِيرًا عَنْ الْحُلُولِ وَالِاتِّحَادِ. فَجَاءَتْ الْمَلَاحِدَةُ كَابْنِ عَرَبِيٍّ وَنَحْوِهِ فَأَنْكَرُوا هَذَا الْكَلَامَ عَلَى الْجُنَيْد؛ لِأَنَّهُ يُبْطِلُ مَذْهَبَهُمْ الْفَاسِدَ. والْجُنَيْد وَأَمْثَالُهُ أَئِمَّةُ هُدًى وَمَنْ خَالَفَهُ فِي ذَلِكَ فَهُوَ ضَالٌّ. [ابن تيمية، تقي الدين أبو العباس أحمد بن عبد الحليم، مجموع الفتاوى، مجمع الملك فهد، المملكة العربية السعودية، 1416هـ/1995م، 5/491-492]

بڑے بڑے گدی نشین یا تو سیاست دان ہیں، یا جاگیر دار، یا بزنس مین۔ اس بارے جناب امیر حمزہ صاحب کی چشم کشا روئیداد ''مذہبی اور سیاسی باوے'' ایک عمدہ کتاب ہے کہ جس میں پاکستان کی تمام بڑے بڑے مزاروں اور گدیوں کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا گیا ہے۔

ہماری رائے یہ ہے کہ تصوف کی اصطلاح استعمال کرنے میں اگرچہ کوئی ممانعت نہیں تھی کیونکہ ''لا مشاحة في الاصطلاح''، کہ اصطلاح کے استعمال میں کوئی بخل نہیں ہے لیکن مذکورہ بالا تاریخی پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے اس اصطلاح کے ساتھ جو لوازمات ملحق ہو چکے ہیں، ان کی وجہ سے اسے استعمال نہ کرنا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اور تصوف کا جو مقصود ہے یعنی اصلاح نفس تو اس سے کسی کو انکار نہیں ہے اور اس کے لیے قرآن مجید کی بہترین اصطلاح ''تزکیہ نفس'' ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا﴾ [الشمس: 9]

''تحقیق اس نے فلاح پائی کہ جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کیا۔''

یہ واضح رہے کہ جب سلفی حضرات، تصوف کی مخالفت کرتے ہیں تو ان کا مقصود یہ نہیں ہوتا کہ وہ زہد، تقوی، للہیت، خشیت، اصلاح نفس، اصلاح احوال، اصلاح باطن کے قائل نہیں ہیں بلکہ ان کی تردید کا مقصود وہ جملہ شرکیہ عقائد اور بدعی اعمال وافعال ہوتے ہیں جو تصوف کے ادارے کا بدقسمتی سے ایک جزو لاینفک بن چکے ہیں۔ ''مثنوی معنوی''، ''سماع'' اور ''وجد'' سے جب تلاوت قرآن مجید کی نسبت زیادہ احوال پیدا ہوں گے تو رد عمل تو ضرور ہو گا۔

البتہ صوفیاء کو اپنے ناقدین سے یہ شکایت رہتی ہے کہ انہوں نے تصوف کے متبادل کے طور کتاب و سنت کا تصورِ تزکیہ نفس کسی جامع نظام کی صورت متعارف نہیں کروایا۔ ہماری رائے میں یہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے کہ سلف صالحین کے منہج پر کتاب وسنت کے تصورِ تزکیہ نفس اور اصلاح احوال کے پروگرام کو ایک مکمل نظام کی صورت پیش کیا جائے تاکہ طبیعتوں اور مزاج میں وہ تقوی، خشیت اور للہیت پیدا ہو جو

صحابہ وتابعین کے ہاں تھی۔اور ہماری یہ کتاب اسی سلسلے کی ایک کاوش ہے کہ جس کی ابتداء امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ سے ہوئی یہاں تک کہ حال ہی میں الشیخ محمد بن ابراہیم التویجری نے اس منہج پر چار جلدوں میں دلوں کے احوال پر ایک انسائیکلوپیڈیا "موسوعة فقه القلوب" کے نام سے مرتب کیا ہے۔

وحدت الوجود اور شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ

تصوف کی تاریخ میں دو شخصیات ایسی ہو گزری ہیں کہ جنہیں تصوف کے میدان میں مجدد کا مقام حاصل ہے۔ان میں سے ایک شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ متوفی 1034ھ ہیں اور دوسرے مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ متوفی 1943ء ہیں۔ شیخ ابن عربی متوفی 638ھ کی شطحیات (ecstatic utterance) سے تصوف کے ادارے میں وحدت الوجود کا جو نظریہ عام ہو گیا تھا، اس کی اصلاح کا کام شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ سے لیا گیا جبکہ عملی تصوف میں جن غیر اسلامی اعمال کی آمیزش ہو گئی تو ان کی بہت حد تک اصلاح مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے فرمائی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین عظام، تبع تابعین، فقہاء، محدثین، متکلمین اور متقدمین صوفیاء میں سے کوئی بھی نظریہ وحدت الوجود کا قائل نہیں رہا تھا بلکہ سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی رحمہ اللہ کو جب حسین بن منصور الحلاج کی بعض شطحیات کا علم ہوا تو انہوں نے توحید کی تعریف "إِفْرَادُ الْحُدُوثِ عَنْ الْقِدَمِ" کے الفاظ سے بیان فرمائی اور شیخ ابن عربی توحید کی اِس تعریف کا انکار کرتے رہے کہ یہ ان کے نظریہ وحدت الوجود کے خلاف تھی۔[1]

شیخ ابن عربی کے نظریہ وحدت الوجود کا حنفی، مالکی، شافعی اور حنبلی، سلفی، اشعری اور ماتریدی علماء کی ایک جماعت نے سختی سے رد فرمایا اور اسے کفر قرار دیا۔ شیخ ابن عربی کے ابتدائی ناقدین میں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ متوفی 728ھ اور علامہ سعد الدین التفتازانی رحمہ اللہ متوفی 792ھ کی نقد کو بہت اہمیت حاصل رہی ہے کہ انہوں نے شرع کے علاوہ

---

[1] مجموع الفتاوی: 491/5

عقل و منطق کی روشنی میں بھی اس نظریے کا خوب رد کیا ہے۔ان دونوں ائمہ کے علاوہ چالیس کے قریب فقہاء اور متکلمین نے اس نظریہ کی مخالفت میں مستقل کتب تصنیف کیں لیکن شیخ مجدد الف ثانی رحمہ اللہ وہ پہلے شخص ہیں کہ جنھوں نے تصوف کی روایت میں معروف ذریعہ علم یعنی مراقبہ اور مکاشفہ کے ذریعے اس نظریے کے باطل ہونے پر مہر ثبت فرمائی۔ حضرت شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اور جس شخص نے مسئلہ وحدت وجود کو ابواب و فصول میں لکھا ہے اور صرف ونحو کی مانند اس کو تالیف کیا ہے وہ شیخ محی الدین ہی ہیں، اور اس مسئلہ کے بعض دقیق معارف کو اپنی طرف منسوب کیا ہے حتی کہ انہوں نے کہا کہ خاتم النبوت بعض علوم و معارف کو خاتم الولایت سے اخذ کرتا ہے۔ اور خاتم ولایت محمدی اپنے آپ کو جانتے ہیں۔ان کے شارحین نے اس کی توجیہ میں کہا ہے کہ اگر بادشاہ اپنے خزانچی سے کوئی چیز لے لے تو کیا نقصان ہے۔"[1]

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

"فقیر کے نزدیک ممکنات کے آئینوں میں حق جلا وعلا کا وہ شہود جس کو صوفیہ کی ایک جماعت کمال جانتی ہے اور تشبیہ و تنزیہ کے درمیان جمع ہونا خیال کرتی ہے وہ درحقیقت حق جلا وعلا کا شہود نہیں ہے۔ان آئینوں میں اس کا مشہود ان کے خیالی اور من گھڑت تصور کے سوا کچھ نہیں ہے... ہرگز ہرگز صوفیہ کی اس قسم کی ترہات یعنی باطل خلاف شرع باتوں پر فریفتہ نہ ہونا چاہیے اور حق جل سلطانہ کے غیر کو حق نہ جاننا چاہیے۔اگرچہ یہ لوگ غلبہ حال کی وجہ سے معذور ہیں، اور خطاکار مجتہد کی طرح مواخذہ سے بری ہیں لیکن ان کے مقلدوں کے ساتھ قیامت کے روز معلوم نہیں کس طرح معاملہ کریں۔"[2]

شیخ احمد سرہندی رحمہ اللہ نے وحدت الوجود کے بالمقابل وحدت الشہود کا نظریہ پیش

---

[1] مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی، دفتر اول، حصہ دوم، مولانا سید زوار حسین شاہ، مکتبہ مجددیہ، کراچی، مکتوب 272، ص 310

[2] ایضاً: ص314

کیا کہ جس کے بارے شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ نے کہا کہ یہ دونوں ایک ہی ہیں حالانکہ دونوں میں جوہری فرق موجود ہے۔ شیخ ابن عربی کا کہنا ہے کہ مخلوق کی حقیقت علم الٰہی میں موجود "اعیان ثابتہ" ہیں جبکہ مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ مخلوق کی حقیقت اسمائے الہیہ کے "اعدام متقابلہ" ہیں کہ اس طرح حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے مخلوق کے وجود کو اللہ کی صفت علم کے رستے اللہ ہی کا وجود قرار دینے کی بحث سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نکال باہر کیا۔

شیخ ابن عربی اور مجدد الف ثانی رحمہ اللہ میں اس لحاظ سے موافقت ہے کہ وجود ایک ہے لیکن مخلوق کے وجود کی حقیقت کیا ہے تو اس بارے ان کا اختلاف زمین و آسمان کا اختلاف ہے۔ شیخ ابن عربی کے ہاں مخلوق کا وجود اور خالق کا وجود ایک ہی وجود ہے جبکہ مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے ہاں وجود خالق کا ہی ہے اور مخلوق کے وجود کی حقیقت، عدم ہے۔ شیخ ابن عربی کے ہاں حقائقِ موجودات، اعیان ہیں جبکہ مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے ہاں حقائقِ موجودات، اعدام ہیں۔[1]

مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے مکتوبات میں وحدت الوجود اور وحدت الشہود کے بارے جو ابحاث ہیں، ان کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نقطہ نظر میں اس بارے کافی ارتقاء ہوا تھا اور اس بارے ایک مستقل تحقیقی مقالے کی ضرورت ہے کہ جس کے بیان کا یہ موقع نہیں ہے۔ شروع میں وہ وحدت الوجود اور وحدت الشہود دونوں نظریات کو درست سمجھتے تھے۔ بعد میں صرف وحدت الشہود ہی کو درست سمجھتے رہے۔ اور آخر وقت میں تو علماء اور فقہاء کے موقف کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ واللہ اعلم۔

ہماری رائے یہ ہے کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ نے وحدت الشہود کا جو نظریہ پیش فرمایا تو یہ اہل تصوف کو وحدت الوجود کے کفریہ نظریہ کے غلبے سے باہر نکالنے کی ایک موثر تدبیر تھی نہ کہ حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کے پیش نظر وحدت الوجود کی جگہ

---

[1] وجود باری تعالی کے بارے فلاسفہ، متکلمین، صوفیاء، فقہاء اور محدثین کے کیا کیا موقف ہیں اور ان میں کیا باہمی اختلاف ہے، اس بارے چار اقساط میں ہمارا تفصیلی مقالہ سہ ماہی حکمت قرآن اکتوبر تا دسمبر 2015ء اور بعد کے شمارہ جات میں ملاحظہ فرمائیں۔

وحدت الشہود کے نظریے کو رواج دینا تھا۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ عقیدے میں اشعری المسلک ہیں اور اشاعرہ کا توحید اسماء وصفات میں جو موقف ہے، وہ وحدت الوجود کے تو خلاف ہے ہی جبکہ وحدت الشہود سے بھی میل نہیں کھاتا۔ وجود کے بارے سلفی، ماتریدی اور اشعری موقف ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ وجود دو قسم پر ہے: واجب الوجود اور ممکن الوجود۔ پہلا خالق کا وجود ہے اور دوسرا مخلوق کا ہے۔اور وجود کے بارے یہی موقف جمیع فقہاء، محدثین، متکلمین، اور متقدمین صوفیاء کا ہے۔

فتاوی عزیزی، از شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، صفحہ 125 پر کسی سائل نے سوال پوچھا: مسئلہ وحدت وجود میں علماء کرام کیا فرماتے ہیں۔ جو مسلمان عاقل بالغ وحدت وجود کا اعتقاد رکھے اور یہ کہے کہ ہمہ اوست یعنی سب وہی اللہ تعالی ہے تو اس کلام سے وہ مسلمان کافر ہو جائے گا۔ یا نہیں؟ آپ علماء کرام اس مسئلہ کا جواب فرمائیں۔

جواب: وحدت وجود اور ہمہ اوست کا ظاہر معنی خلاف شرع ہے۔ جو شخص اس کا قائل ہوا گر اس کا اعتقاد ہو کہ حق تعالی نے تمام چیزوں میں حلول فرمایا ہے۔ یا اس شخص کا عقیدہ ہو کہ تمام اشیاء اس ذات مقدس کے ساتھ متحد ہے تو اس کلام سے کفر لازم آتا ہے... مسئلہ وحدت وجود کا ذکر شرع میں صراحتہ نہیں، مسئلہ وحدت وجود کی تصریح نہ قرآن شریف میں ہے، نہ حدیث شریف میں ہے۔ مسئلہ وحدت وجود کی بنا حضرات صوفیاء کے صرف کشف و شہود پر ہے۔ صفحہ 148 پر لکھتے ہیں، عوام کو اس مسئلہ کی تلقین کرنا گویا الحاد کا دروازہ کھولنا ہے۔

تجدید تصوف اور مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ

تصوف کے ہزار سالہ لٹریچر کے مطالعہ کے بعد جب کوئی شخص مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی ان تحریروں کا مطالعہ کرتا ہے جو تصوف کی اصلاح میں لکھی گئی ہیں تو فکر صالح اور علم راسخ ہو تو بلاشبہ اس نتیجے تک پہنچ سکتا ہے کہ اگر تصوف کے ادارے کو دو چار اور حکیم الامت رحمہ اللہ مل جاتے تو یہ تصوف خیر القرون کے منہج پر استوار ہو جاتا لیکن افسوس کہ ان کے خلفاء میں سے کسی میں وہ شجاعت نہیں ہے کہ وہ ان کی اصلاح تصوف

کی تحریک کو دو چار قدم ہی آگے لے جائے۔

تصوف کے ادارے کی تاریخ میں حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ بہت بڑی شخصیت ہیں اور شیخ ابن عربی وغیرہ تو ان کے آگے کچھ بھی نہیں ہیں بلکہ وہ تو شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ سے بھی بڑے آدمی ہیں۔ مثلاً جو عاجزی حکیم الامت رحمہ اللہ کی تحریروں میں نظر آتی ہے، وہ شیخ ابن عربی اور شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کی تحریروں میں نہیں ملتی۔ اور یہ وہی عاجزی ہے جو ہمیں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ادعیہ ماثورہ میں نظر آتی ہے۔ اپنے آپ کو خاتم اولیاء کہنا اور قطب عالم ہونے کا دعوی کرنا، نبوی مزاج تھوڑا ہے؟

جہاں تک علوم دینیہ کی بات ہے تو بلاشبہ یہ بات درست ہے کہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ، حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے بہت بڑی شخصیت ہیں جبکہ تزکیہ اور اخلاق ایک دوسرا میدان ہے۔ اس میدان میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی خدمات اور مقام حضرت شاہ صاحب رحمہ اللہ کی خدمات اور مقام سے بہت بڑھ کر ہے۔ اگر موازنہ کرنا چاہیں تو شاہ صاحب رحمہ اللہ کی "فیوض الحرمین" اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی "شریعت اور طریقت" پڑھ کر دیکھ لیں۔ پس فقہی مسائل میں حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ کی رائے زیادہ صائب معلوم ہوتی ہے اور اصلاح نفس کے ذرائع میں حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی رائے زیادہ درست معلوم ہوتی ہے۔

بعض دوستوں نے اس تحریر پر تبصرہ کیا کہ آپ نے یہ کیا ظلم کیا کہ حضرت تھانوی رحمہ اللہ کو حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ پر ترجیح دے دی۔ اس بارے ہمیں یہی کہنا ہے کہ ہمارے ہاں لوگوں کے ذہنوں میں علماء اور اولیاء کے مقام اور مرتبے کی ایک درجہ بندی (hierarchy) قائم ہے اور اس درجہ بندی پر لوگ اسی طرح ایمان رکھتے ہیں کہ جس طرح نبیوں پر ایمان رکھا جاتا ہے۔ معلوم نہیں آخرت میں کس کا کیا مقام ہو؟ یہ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ کے ہاں کسی دیہاتی ان پڑھ متقی شخص کا مقام حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ اور مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ سے بڑھ کر ہو؟

تصوف کے بارے ایک خلط مبحث

ایک صاحب علم دوست نے اپنی ایک تحریر میں مروجہ تصوف میں تزکیہ کے طریقوں اور مشقوں کو علوم دینیہ کے حصول کے ذرائع سے تشبیہ دے کر یہ سوال پیدا کیا ہے کہ بتلائیں تو سہی دونوں میں کیا فرق ہے کہ ایک جائز اور دوسرا ناجائز؟

عرض یہ ہے کہ بدعت دین میں اس اضافے کو کہتے ہیں کہ جس کا مقصود تقرب الی اللہ ہو۔ اور ضرب یضرب کی گردان کسی عالم دین نے تقرب الی اللہ کا ذریعہ نہ تو بتلائی ہے اور نہ ہی اس مقصد کے لیے سکھائی جاتی ہے جبکہ مراقبہ اور لطائف کا صریح مقصد تقرب الی اللہ ہی بتلایا جاتا ہے اور اسی مقصد سے ان کی مشق کروائی جاتی ہے۔

تقرب الی اللہ کے ذرائع وہی ہیں جو خود اللہ کے دین نے متعین کر دیے ہیں نہ کہ وہ جنہیں انسان متعین کرے۔ اگر تقرب الی اللہ کے ذرائع انسانوں پر چھوڑ دیے جائیں تو ہر مذہب، چاہے وہ سماوی ہو یا غیر سماوی، کا مقدمہ ثابت ہو جائے گا۔ سماوی مذاہب، چاہے یہودیت ہو یا عیسائیت، کا بنیادی دعوی تقرب الی اللہ ہی کا ہے۔ آسمانی مذاہب میں فرق تو سارا ذرائع ہی سے پڑا ہے کہ اللہ عزوجل تک پہنچانے والے رستے اور طریقے کون سے ہیں، اس میں اختلاف ہے، ورنہ مقصود تو سب کے ہاں ایک ہی ہے۔

علم اصول فقہ اور مصطلحات تصوف

ایک دوست کا کہنا ہے کہ جس طرح علماء نے اصول فقہ کی اصطلاحات مرتب کیں، اسی طرح صوفیاء نے تصوف کی اصطلاحات وضع کیں۔ ہماری رائے میں علماء اور صوفیاء کے کام میں ایک بڑا فرق ہے کہ اصولیین نہ صرف بڑا دماغ تھے بلکہ کتاب وسنت میں رسوخ بھی رکھتے تھے اور ان دو بنیادوں پر انہوں نے اپنے مدون کردہ علم کو کتاب وسنت کے دلائل سے آخری درجے میں ثابت کر کے دکھا دیا۔ مثال کے طور علامہ آمدی رحمہ اللہ کی "الإحکام" اور امام زرکشی رحمہ اللہ کی "البحر المحیط" میں سے چند مباحث کا مطالعہ کر لیں۔

دوسری طرف اہل تصوف نے تصوف کی مصطلحات کی ایک ڈکشنری تو بنا دی لیکن

ان اصطلاحات کو کتاب وسنت سے ثابت کرنا تو کجا اشارتاً جوڑنے میں بھی نہ صرف بری طرح ناکام ہیں بلکہ ہر دور میں یہ تسلیم کرتے نظر آتے ہیں کہ ہماری مصطلحات کا ماخذ کشف ووجدان ہے نہ کہ کتاب وسنت۔ مثال کے طور محمد شاہ ذوقی صاحب کی ''سر دلبراں'' کو دیکھ جا سکتا ہے۔ عصر حاضر میں تصوف کا مجدد ہے وہ شخص جو تصوف کی کوئی ایسی لغت مرتب کردے کہ جس میں تزکیہ نفس اور اصلاح احوال کے ضمن میں کتاب وسنت کی اصطلاحات کو بنیاد بنایا گیا ہو۔

مثال کے طور اللہ عزوجل نے اپنے نیک بندوں کے لیے قرآن مجید میں جو اصطلاحات استعمال کی ہیں، وہ صديقين، شهداء، مسلمين، مومنين، محسنين، صالحين، مصلحين، متقين، صادقين، خاشعين، قانتين، مقربين، ربانيين، مهتدين، عابدين، مفلحين، اولياء الله، عباد الرحمن وغیرہ جیسی اصطلاحات ہیں۔ اور اللہ کے رسول ﷺ نے ان اصطلاحات میں ''أهل الله'' اور ''أصحاب القرآن'' جیسی اصطلاحات کا اضافہ کیا ہے۔ اور صوفیاء کے ہاں معروف غوث، قطب، ابدال، اوتاد اور قلندر وغیرہ کی اصطلاحات نہ تو قرآن مجید میں موجود ہیں اور نہ ہی ان کا ذکر کسی صحیح حدیث میں نقل ہوا ہے اور نہ ہی ان کے مقام اور مرتبے کے بارے کوئی مستند شيء روایت کی گئی ہے لہذا ان اصطلاحات کی حیثیت چند ناموں سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہے۔

تزکیہ نفس کے سلفی منہج میں قرآن مجید کی مذکورہ بالا اصطلاحات کو سامنے رکھتے ہوئے ان کا اہل بننے کے لیے مجاہدہ کیا جائے گا۔ قرآن مجید نے کئی ایک مقامات پر ان اصطلاحات کا استعمال کرتے ہوئے ان کی صفات بھی بیان فرمائی ہیں جیسا کہ عباد الرحمن ان بندوں کو کہا گیا ہے کہ جن میں دس صفات پائی جاتی ہوں۔ اور ان لوگوں کا مقام اور مرتبہ بھی قرآن مجید ہی میں بیان کر دیا گیا ہے کہ جن میں یہ صفات ہوں۔ سلفی منہج پر اخلاق ورذائل اور تزکیہ واصلاح کی ڈکشنری دیکھنی ہو تو وہ بارہ جلدوں میں ''نضرة النعيم في مكارم أخلاق الرسول الكريم'' ہے۔

کتب تصوف کی اصلاح اور تہذیب

تصوف کی کتابوں میں، اگرچہ ان میں سے بعض کے مصنفین بہت بڑا نام رکھتے ہیں، لیکن اس کے باوجود ان میں ایسی بیہودہ حکایتیں، بے سروپا کہانیاں اور الف لیلوی داستانیں نقل ہو گئی ہیں کہ جنہیں پڑھ کر خود اس کے ماننے والوں کے ہاں تصوف کے بارے کسی فخر کی بجائے شرمندگی کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ تصوف سے محبت رکھنے والوں کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ تصوف کے خلاف معاصر سلفی تحریک بے بنیاد نہیں ہے کہ عالم عرب میں تصوف مخالف کتابوں کا ایک سیلاب ہے، جو دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس تحریک سے اہل تصوف کا مکمل اتفاق نہ سہی لیکن اس کی بعض باتیں ان کے ہاں بھی بہت وزن رکھتی ہیں کہ جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ کتب تصوف فحش مواد، الف لیلوی داستانوں اور بے سروپا اساطیر سے بھری پڑی ہیں۔

ہر روایت کو اصلاح کی ضرورت رہتی ہے اور تصوف کی روایت کو تو بہت زیادہ اصلاح کی ضرورت ہے، اس لیے کہ ان کا میدان اور تخصص ہی یہی ہے۔ اہل تصوف کو چاہیے کہ تصوف کے لٹریچر کی تہذیب اور تنقیح کر کے اس کو از سر نو اس طرح مرتب کریں کہ اخلاق اور رذائل کی بحثیں اس کا اصل موضوع قرار پائیں۔ اور اہل تصوف میں سے جو شخص یہ کام کرے گا، وہی اس میدان کا مجدد قرار پائے گا۔

ہم نے جب بعض صوفیاء کے حق میں کلمہ خیر کہا تو انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی، اسلام آباد کے ایک طالب نے ہمیں کتاب "ارواح ثلاثہ" سے ایک انتہائی گھٹیا اور فحش حکایت کو اسکین شدہ صفحہ پر بھیج کر یہ سوال کیا کہ کیا آپ اس قسم کے تصوف کی اصلاح میں وقت ضائع کر رہے ہیں؟ ایسی حکایتوں کا تو کسی شریف آدمی کے لیے پڑھنا بھی مشکل ہے کہ جنہیں اولیاء اللہ کے کارناموں کے طور نقل کر دیا گیا ہے۔ اس حکایت کے مطابق ایک نابینا صوفی سید شاہ صاحب اپنے ایک مرید کے ساتھ بازار سے گزر رہے تھے کہ کہیں شور کی آواز سنی اور اپنے مرید سے کہا کہ جاؤ دیکھ کر آؤ کہ کیا معاملہ ہے؟ مرید گیا اور واپس آکر عرض کی:

"حضرت ایک فقیر بیٹھا ہوا ہے اور اپنے عضو تناسل کو تانے ہوئے اور اس میں ڈورا باندھے ہوئے ہے۔ اور یہ کہہ رہا ہے کہ نعوذ باللہ یہ الف ہے اللہ کا۔ شاہ صاحب نے فرمایا کہ جاؤ اور اس کی کمر میں اتنی زور سے لات مارو کہ وہ گر پڑے۔ اور کہو او بے وحدت خود منڈے، کیا بکتا ہے۔ الف خالی ہوتا ہے اور اس کے نیچے دو نکتے ہیں... غرض ان حکمتوں سے شاہ صاحب نے باطل کو شکست دی۔"[1]

یہ بات درست ہے کہ بعض کتب تصوف کی اصلاح ممکن نہیں ہے کہ ان میں غالب طور شر موجود ہے لہذا ایسی کتابوں کی اشاعت منکرات میں سے ہے۔ اور "ارواح ثلاثہ" تو اس بارے کچھ بھی نہیں ہے، اگر "تذکرہ غوثیہ" کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم پڑتا ہے کہ ہمارے اولیاء نے اپنی کرامات میں یونان کے دیوتاؤں اور ہندوؤں کے خداؤں کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ شاہ گل حسن قادری صاحب لکھتے ہیں کہ

"ایک باباجی میں یہ کمال تھا کہ جو بات منہ سے نکالتا، وہی ہو جاتی۔ راجہ نے اس سے پوچھا کہ مہاراج آپ کو یہ کمال کیونکر حاصل ہوا۔ اُس نے جواب دیا کہ میں بارہ برس سے اپنا پیشاب پاخانہ کھاتا پیتا ہوں۔ اُسی کی بدولت میری زبان کو یہ تاثیر ہے کہ ایک فقیر کو بادشاہ یا راجہ کہہ دوں تو فوراً ہو جاوے۔"[2]

ہمارے ایک تبلیغی دوست کا کہنا ہے کہ عجیب بات ہے جب سے ہوائی جہاز بنا ہے، ہمارے اولیاء نے ہوا میں اڑنا چھوڑ دیا ہے۔ بھئی! اولیاء اللہ کسی زمانے میں ہوا میں نہیں اڑتے تھے، یہ جھوٹی کہانیاں ہیں جو اولیاء اللہ کے مقام اور مرتبے میں مبالغہ کرنے کے لیے گھڑ کر پھیلا دی گئی ہیں، ورنہ تو آج اُن کے اڑنے میں کیا رکاوٹ قائم ہے؟ اور جو اڑتے تھے، وہ بھی شعبدہ باز تھے، نہ کہ اولیاء اللہ۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بڑھ کر کوئی اللہ کا ولی ہو سکتا ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی ہوا میں نہیں اڑتا تھا۔

اور عرض یہ ہے کہ ہم "ارواح ثلاثہ" جیسی کتابوں کے پڑھنے کے نہ خود قائل ہیں

---

[1] اشرف علی تھانوی، مولانا، ارواح ثلاثۃ، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ص 37

[2] شاہ گل حسن قادری، مولوی، تذکرہ غوثیہ، ملک سراج الدین اینڈ سنز، لاہور، ص 349

اور نہ ہی کسی کو اس کی ترغیب دیتے ہیں اور اگر آپ نے صوفیاء کی کتابیں پڑھنی ہی ہیں تو ان کتابوں کو پڑھیں کہ جن کا موضوع اخلاق اور رذائل ہیں۔ آپ "شریعت وطریقت" جیسی کتابوں کا مطالعہ کر لیا کریں۔[1] "ارواح ثلاثہ" اور "تذکرہ غوثیہ" جیسی کتابیں اصلاح نفس کی بجائے اساطیر (Mythology) کی کتابیں ہیں۔ صوفیاء کی اساطیر پر ہندوانہ اور یونانی اساطیر (Greek Mythology) کا کیسے اور کتنا اثر رہا ہے، اس بارے تحقیق کرنی ہو تو ان کتابوں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

ایک حنفی صوفی سے مکالمہ

صوفیاء کی مجالس میں شرکت کا موقع ملتا رہتا ہے۔ ایک دفعہ ایک دوست کی وساطت سے ایک حنفی المسلک صوفی صاحب سے ملاقات ہوئی جو کہ بیعت لیتے تھے۔ دوران ملاقات انہوں نے کہا کہ تزکیہ نفس کے لیے بیعت کرنا فرض ہے۔ اور بیعت کے بغیر تزکیہ نہیں ہو سکتا۔

میں نے عرض کی کہ کیا امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا تزکیہ ہوا تھا؟ جناب خاموش ہو گئے، مرتے کیا نہ کرتے، جواب دیا کہ ہوا تھا۔ میں نے کہا ان کی بیعت کس سے تھی؟ وجد میں آ گئے اور اسی وجد کی کیفیت میں مجھے مسجد کے دروازے تک پہنچانے آئے۔ میں نے جاتے جاتے عرض کیا کہ میں اسی طرح اپنا تزکیہ چاہتا ہوں جیسا کہ امام صاحب اور ان کے شاگردوں قاضی ابو یوسف اور امام محمد رحمہما اللہ نے کیا تھا۔

---

[1] شریعت وطریقت کے نام سے دو کتابیں معروف ہیں اور دونوں کا مطالعہ ضروری ہے کہ دونوں بڑے علماء کی ہیں اور دونوں کتابیں تصوف کا ایک رخ پیش کر رہی ہیں۔ دونوں کو ملا کر پڑھنے سے تصویر مکمل ہوتی ہے۔ اس نام سے ایک کتاب مولانا عبد الرحمن کیلانی رحمہ اللہ کی ہے جبکہ دوسری مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ کی ہے۔ کیلانی صاحب کی کتاب میں تصوف میں غالب پہلو شر کو قرار دیا گیا ہے جبکہ تھانوی صاحب کی کتاب میں تصوف میں غالب پہلو خیر کو قرار دیا گیا ہے۔ سلفیوں نے شر کے پہلو کی بنا پر اس کا رد کیا جبکہ صوفیوں نے خیر کے پہلو کی بنا پر اس کا دفاع کیا جبکہ حقیقت یہ ہے کہ تصوف کے نام سے جو کچھ ہمارے پاس موجود ہے، اس میں خیر بھی ہے اور شر بھی۔ تصوف میں اخلاق ورذائل اور افعال القلوب کے بارے جو ابحاث موجودہیں، وہ اس کا خیر کا پہلو ہے اور وحدت الوجود، صوفیاء کی شطحیات اور حکایات اولیاء کے حوالے سے اس میں جو بحثیں موجود ہیں تو وہ شر کا پہلو ہیں۔

اللہ کے دین میں کسی شیء کو فرض اور حرام قرار دینے کے لیے ایسی دلیل چاہیے کہ جو واضح اور دوٹوک ہو۔ بہت سے علماء اور بہت سے صوفیاء بہت سی ایسی چیزوں کو فرض یا حرام قرار دے دیتے ہیں کہ جس کے فرض یا حرام ہونے کی کوئی صریح دلیل شریعت میں موجود نہیں ہوتی ہے۔ اللہ عزوجل نے اسے اپنے اوپر بہتان قرار دیا ہے کہ اللہ کے دین میں کسی ایسی شیء کو فرض یا حرام قرار دے دیا جائے کہ جس کی فرضیت اور حرمت کے بارے اللہ نے کوئی واضح حکم نازل نہ کیا ہو۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَـٰذَا حَلَالٌ وَهَـٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوا عَلَى اللَّـهِ الْكَذِبَ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّـهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ﴾ [النحل: 116]

"اور یہ جو تمہاری زبانیں جھوٹے احکام لگایا کرتی ہیں کہ یہ چیز حلال ہے اور وہ حرام، تو اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ نہ باندھا کرو۔ جو لوگ اللہ پر جھوٹے بہتان باندھتے ہیں وہ ہر گز فلاح نہیں پائیں گے۔"

امام ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "إعلام الموقعين عن رب العالمين" کے نام سے مرتب کی ہے کہ جس کا معنی یہ ہے کہ ان لوگوں کے لیے تنبیہ کہ جو رب العالمین کی طرف سے دستخط کرنے والے ہیں۔ علماء اور مفتیان کرام جب کوئی فتوی جاری کرتے ہیں تو وہ یہ دعوی کر رہے ہوتے ہیں کہ ہمارے فتوی میں جو بات ہے، وہ رب العالمین کا دین ہے لہذا انہیں فتوی دیتے ہوئے بہت زیادہ ڈرنا چاہیے کہ فتوی دراصل رب العالمین کی طرف سے دستخط کرنے کے مترادف ہے اور یہ دستخط اسی صورت ہونے چاہییں جبکہ قیامت والے دن انسان ان دستخطوں کی توجیہ بیان (justify) کر سکنے کے قابل ہو۔

تصوف کا وکیل

جب بھی اپنے معزز اور قابل احترام دوستوں سے تصوف کے کسی پہلو پر گفتگو ہوتی ہے تو وہ یوں کہتے ہیں کہ یہ لطائف اور مراقبہ پر آپ نے اعتراض کیا تو بھائی یہ تو صوفیاء کے نزدیک ذریعہ ہیں، مقصود ہر گز نہیں ہیں۔ اور رہی بیعت تو بھائی یہ لازم نہیں ہے اور اس کے بغیر بھی تزکیہ ہو جاتا ہے۔ رہا وحدت الوجود اور وحدت الشہود! او میرے

بھائی! یہ تصوف کی بحثیں کہاں ہیں؟ ان کو کہاں تصوف میں گھسیڑ لائے ہو؟۔ اور سماع؟ بھائی! اس میں تو خود صوفیاء میں اختلاف ہے۔ اچھا تو یہ تصور شیخ کیا ہے؟ بھئی! یہ تو ذہنی یکسوئی کا ایک ذریعہ ہے، بس!، اور صوفیاء کی شطحیات؟ تو ان کا رد تو خود صوفیاء بھی کرتے رہتے ہیں۔ اور صوفیاء کے بارے یہ دیومالائی حکایتیں اور کہانیاں؟ اوہو، یہ تو مریدوں کی محبت ہے، اور تھوڑا بہت غلو ہے، بس! وغیرہ وغیرہ

بھائی! اگر آپ ایسے تصوف کے داعی ہیں کہ جس میں مراقبہ، لطائف، بیعت، وحدت الوجود، وحدت الشہود، ذکر جہری، پاس نفاس، تصور شیخ، شطحیات، حکایات، وجد اور سماع وغیرہ کے بغیر بھی تزکیہ ہو جاتا ہے تو آئیں ان کے بغیر تزکیہ نفس کے لیے تصوف کی مہم چلائیں، میں آپ کے ایسے تصوف کا زبردست وکیل ہوں....

کیا ایسا تصوف موجود ہے؟ تو ہماری رائے میں تو تصوف کا یہ ورژن بھی موجود ہے اور یہ تبلیغی جماعت میں ہے۔ اگر تبلیغی جماعت کے نصاب میں سے کچھ حکایات نکال دی جائیں، تو یہ وہی تصوف ہے کہ جو مطلوب ہو سکتا ہے کہ نیکی کا شوق کرنے والے لوگ ہیں جو دوسروں کو بھی نیکی کی ترغیب دے رہے ہیں۔

تصوف اور تاریخ اسلام

ایک صاحب علم دوست نے سوال کیا کہ اگر تصوف کو اسلام کی تاریخ سے نکال دیا جائے تو کتنا اسلام باقی رہ جائے گا؟ ہمیں یہ کہنا ہے کہ اس قسم کے سوالات سے یہ غلط فہمی پیدا کی جاتی ہے جمیع فقہاء، محدثین اور اصولیین صوفی تھے حالانکہ خیر القرون میں تصوف کی اصطلاح ہی موجود نہیں تھی۔

پس اس سوال کے جواب میں عرض یہی ہے کہ اگر ہم تصوف کے حاملین کو تاریخ اسلام سے نکال دیں تو باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین عظام رحمہم اللہ، تبع تابعین رحمہم اللہ، امام ابو حنیفہ، قاضی ابو یوسف، امام محمد، امام مالک، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام ابن جریر طبری، امام بخاری، امام مسلم، امام ترمذی، امام ابو داود، امام نسائی، امام ابن ماجہ، امام ابو الحسن الاشعری، امام ابو منصور ماتریدی، امام ابن حزم ظاہری رحمہم اللہ... بہت لمبی فہرست ہے جو

باقی بچ جاتا ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ وہ بیان کر دیا جائے جو نکل جاتا ہے۔

کہنے کا مقصد یہ ہے کہ تصوف کی حمایت کا یہ انداز سطحی ہے۔ متوازن رویہ یہ ہے کہ آپ اپنے اندر حوصلہ پیدا کرتے ہوئے یہ کہنے کی جرات کر سکیں کہ اصل تصوف اخلاق ورذائل اور افعال القلوب کی بحثیں ہیں اور باقی سب تماشہ یاد کا نداری ہے۔

❁❁❁❁❁❁❁

باب نہم

اصلاح علماء

اس باب میں اصلاح علماء کے ضمن میں فتوی سے اصلاح معاشرہ، فقاہت کی تعریف، غیر نافع علم، فقہی جمود، فقہی حیلے اور علم کی فضیلت کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

اہل فتویٰ کی خدمت میں

فتویٰ کا لفظ فتوۃ سے نکلا ہے کہ جس کے عربی زبان میں معانی نوجوانی کے ہیں۔[1] فتویٰ کا مقصد یہ ہے کہ اگر کسی غلط سوچ یا عملی بگاڑ کی وجہ سے مسلم معاشرہ دینی اور اخلاقی اعتبار سے کمزور ہو رہا ہے تو کسی قانونی اور فقہی رائے کے بیان کے ذریعے معاشرے کو دوبارہ سے جوان اور توانا کر دیا جائے۔ سلف صالحین اور متاخرین کے فتویٰ کے اسلوب میں یہ نمایاں فرق نظر آتا ہے کہ سلف کے ہاں قانونی بحث میں بھی تزکیہ نفس اور اصلاح معاشرہ کے پہلو (aspects) کو ملحوظ رکھا جاتا تھا جبکہ متاخرین میں یہ خشک قانونی بحثیں ہیں کہ جن کا مقصد یا تو دوسرے مسلک کے علماء پر لعن طعن کرنا ہے یا لوگوں کے لیے ڈھونڈ ڈھونڈ کر ایسے مشکل حل تجویز کرنا ہے کہ جس سے وہ شریعت کی رخصتوں کو انجوائے کرنے کے بجائے اس کے بارے وحشت میں مبتلا رہیں۔ مطر وراق کہتے ہیں کہ میں نے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے ایک مسئلہ پوچھا تو انہوں نے اس بارے جو مناسب سمجھا، جواب دے دیا۔ میں نے کہا:

> يَا أَبَا سَـعِيدٍ يَأْبَى عَلَيْكَ الْفُقَهَاءُ وَيُخَالِفُونَكَ , فَقَالَ: «ثَكِلَتْكَ أُمُّكَ مَطَرُ , وَهَلْ رَأَيْتَ فَقِيهًا قَطُّ؟ وَهَلْ تَدْرِي مَا الْفَقِيهُ؟ الْفَقِيهُ الْوَرِعُ الزَّاهِدُ الَّذِي لَا يَسْـخَرُ مِمَّنْ أَسْـفَلَ مِنْهُ , وَلَا يَهْمِزُ مَنْ فَوْقَهُ , وَلَا يَأْخُذُ عَلَى عِلْمٍ عَلَّمَهُ اللَّهُ حُطَامًا.[2]
>
> ”اے ابو سعید! فقہاء تو اس مسئلے میں آپ کا رد اور مخالفت کرتے ہیں۔ تو حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا: اے مطر! تیری ماں تجھے گم پائے، کیا تم کوئی فقیہ دیکھا بھی ہے؟ اور تجھے معلوم ہے کہ فقیہ کسے کہتے ہیں؟ فقیہ تو وہ ہے جو اللہ سے ڈرنے والا اور دنیا سے بے رغبتی رکھنے والا ہے۔ جو اپنے سے کم علم رکھنے والوں کا مذاق نہیں اڑاتا اور اپنے سے بڑے علماء کو لعن طعن نہیں کرتا۔ اور نہ ہی اس علم کے

---

[1] الزَّبيدي، محمّد بن محمّد بن عبد الرزّاق الحسيني، تاج العروس من جواهر القاموس، دار الهداية، 39: 213-212

[2] الآجُرِّيُّ، أبو بكر محمد بن الحسين بن عبد الله البغدادي، أخلاق العلماء، رئاسة إدارات البحوث العلمية والإفتاء والدعوة والإرشاد، السعودية، ص 74-75

ذریعے کہ جو اللہ نے اسے عطا کیا ہے، وہ لوگوں کو رگید تا ہے۔"

معاصر مفتی حضرات کے فتاوی پڑھ کر ایک چیز کی بہت کمی محسوس ہوتی ہے اور وہ اصلاح معاشرہ ہے۔ گویا کہ فتاوی کے مقاصد میں اصلاح معاشرہ غائب ہے اور محض قانونی اور فقہی نکتے باقی رہ گئے ہیں۔ مثلاً طلاق کے مسئلہ کو لے لیں۔ حنفی فقہ میں ایک مجلس کی تین طلاقیں بدعت ہیں لیکن واقع ہو جاتی ہیں۔ واقع ہو جانا تو اس وقت ہمارا موضوع نہیں ہے لیکن جہاں تک بدعت ہونے کی بات ہے تو شاذ و نادر ہی آپ کی نظر سے کوئی ایسا فتوی گزرے کہ جس میں بیک وقت دی گئی تین طلاق کے واقع ہو جانے سے پہلے اس عمل کے بدعت ہونے' اس کے حرام ہونے' اس کی شناعت و برائی اور یا اس کے بارے تحذیر اور نکیر موجود ہو تا کہ سوسائٹی کی اصلاح ہو سکے۔

اب مفتی صاحب یہ فتوی تو جاری کر دیتے ہیں کہ طلاق ہو گئی ہے لیکن یہ نہیں بتلاتے کہ یہ کام بدعت تھا' ناجائز تھا' یا جو بھی حنفی فقہ میں مقام ہے وہ بتلا دیا جائے۔

فتوی جو کہ اصلاح معاشرہ کا ایک ذریعہ تھا' آج بد قسمتی سے معاشرے میں دین سے وحشت پیدا کرنے کا سب سے بڑا ذریعہ بن چکا ہے۔ اور پھر جو کام شریعت میں ناجائز ہوتے ہیں' ان کے بتلانے میں بھی نبوی شفقت' نرمی اور حکمت کا پہلو مد نظر نہیں رکھا جاتا بلکہ فتاوی کی زبان ایسی ہی ہوتی ہے جیسے لوگوں کی گردنوں پر تلوار لٹکا دی گئی ہو۔ کئی لوگ کسی دینی مسئلے میں رہنمائی کے لیے جب مجھ سے رابطہ کرتے ہیں تو میں انہیں کسی دار العلوم کی طرف بھیجنا چاہتا ہوں تو ان پر خوف کی ایک کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ نہ معلوم وہاں ہمارے ساتھ کیسا سلوک ہو۔ عام آدمی کا خیال یہی ہے کہ اگر میں اپنے کسی گناہ کا کفارہ معلوم کرنے کے لیے کسی دار الافتاء سے رہنمائی لینا چاہوں گا تو کم از کم جو فتوی مجھے ملے گا' وہ جہنمی ہونے کا ہے اور زیادہ تر میں تو کچھ بھی داخل ہو سکتا ہے۔

اس طرح ہمارے علماء نے یہ جو نکتے اٹھائے ہیں کہ کیا ایک چور جو چوری کرنے کے لیے سفر پر نکلا ہے' وہ نماز میں قصر کر سکتا ہے یا نہیں' ان میں توازن موجود نہیں

ہے۔ ہمارے علماء کو ایسے سوالات کو سنجیدہ ہی نہیں لینا چاہیے۔ اب اگر ہم چور کے بارے یہ بحث تو کتاب وسنت کی روشنی میں کریں کہ وہ شرعاً مسافر ہے یا نہیں اور اس کے لیے نماز قصر ہو گی یا نہیں؟ اور متعلقہ فتوی میں اس کی چوری کی برائی کے بارے کوئی لفظ موجود نہ ہو تو یہ ایک غیر متوازن رویہ کہلائے گا ہے۔ اس قسم کے مسائل میں اگر مفتی کو جواب دینا ہو تو سب سے پہلے نرمی، حکمت اور دوستی کے لب و لہجے میں شرعی حکم کی خلاف ورزی پر متنبہ کرے اور پھر دو چار لائنوں میں جو جواب متعلقہ مسئلے کا اس کی رائے میں بنتا ہے، وہ دے دے۔

بعض اہل علم نے کہا ہے کہ مزدوری کرنے والی عورتوں کے لیے پردے کے احکامات میں رخصت کا پہلو موجود ہے۔ پردہ یا حجاب تو بعد کی بات ہے، پہلے یہ واضح کریں کہ عورتوں کا کھیتوں میں کام کرنا یا بھٹے پر مزدوری کرنا یا سڑکوں پر روڑی کوٹنا ان پر ظلم ہے اور یہ ان کے مرد، ولی، سرپرست، معاشرے اور ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان سے اس ظلم کو دور کرے اور انہیں ان کے بنیادی حقوق فراہم کرے۔ اب مفتی صاحب اس تمہید کے بعد اگر ایک دو لائنوں میں متعلقہ مسئلہ میں کوئی رائے دے دیں کہ بھئی اب وہ بیچاری مجبور ہے تو کوئی حرج نہیں کہ ایسا کر لے یا ویسا کر لے تو یہ رویہ متوازن کہلائے گا۔ کبھی کبھی احساس ہوتا ہے کہ وقت کی ایک اہم ضرورت ہے کہ ہم علم اخلاق اور اصلاح نفس کی روشنی میں ایک فتاوی مرتب کریں کہ یہ شرعی احکام کو دیکھنے کی پانچویں جہت (fifth dimension) ہے کہ جسے عرصہ دراز سے نظر انداز کیا گیا ہے۔ پہلی تین جہتیں، کتاب اللہ، سنت رسول، اصول فقہ اور مقاصد شریعت کی ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ حنفیہ میں مفتی بہ قول یہی ہے کہ لڑکی کا ولی کی اجازت کے بغیر نکاح کفو اور برابری میں جائز اور غیر کفو میں ناجائز ہے لیکن عموماً یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ مفتی صاحب کورٹ میرج، کہ جس سے ہماری مراد ولی کے بغیر نکاح ہے، سے متعلقہ مسائل میں جواز کے بارے فتوی جاری کرتے ہوئے معاشرتی اقدار اور

اصلاح معاشرہ کے پہلو کو بالکل بھی ملحوظ نہیں رکھتے۔ اگر کسی لڑکی نے اپنے گھر سے بھاگ کر کفو اور برابری میں کسی لڑکے سے نکاح کر لیا ہے تو فقہی طور تو مفتی صاحب یہی کہیں گے کہ فقہ حنفی میں جائز ہے یا اس کے جواز کے یہ دلائل ہیں لیکن اس فتوی میں کہیں یہ موجود نہ ہو گا کہ متعلقہ لڑکے اور لڑکی کی جن حرکتوں (activities) کا نتیجہ کورٹ میرج کی صورت میں نکلا ہے' وہ فقہ حنفی میں بھی قانونی طور حرام ہیں۔ لڑکا اور لڑکی کسی اتفاق (by chance) سے تو کورٹ میں یہ بیان دینے نہیں پہنچ جاتے کہ انہوں نے اپنی آزاد مرضی سے نکاح کیا ہے بلکہ لڑکی کے گھر سے بھاگنے سے پہلے اس کی لڑکے سے موبائل فون وغیرہ پر گھنٹوں بات چیت ہوتی ہے' تنہائی میں ملاقاتیں ہوتی ہیں' پارکوں میں تاریخیں طے (dates) ہوتی ہیں' ہوٹلوں میں اکٹھے کھانا کھایا جاتا ہے' ہاتھوں میں ہاتھ ڈالنے سے لے کر بوس و کنار تک معلوم نہیں اس میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی مقرر کردہ کون کون سی حدود کو توڑا اور پامال نہیں کیا جاتا؟ پھر کسی لڑکے میں اگر کچھ شرم و حیاء ہو تو وہ لڑکی سے شادی پر رضامند ہو جاتا ہے ورنہ تو ٹشو پیپر کی طرح استعمال کر کے اگلی کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ یہ ہمارے معاشروں کا واہیات کلچر ہے کہ جس سے مفتی صاحب بھی واقف ہیں۔ اس پس منظر کے نتیجے میں کہیں لڑکی گھر سے بھاگتی ہے اور کسی یار سے نکاح کر لیتی ہے۔ اب اگر اس کا نکاح فقہ حنفی میں جائز ہے تو کم از کم فتوی میں مفتی صاحب کی طرف سے اس پر تو تنبیہ ہونی چاہیے کہ نکاح کے انعقاد سے پہلے جو کچھ اس جوڑے نے کیا ہے' وہ ناجائز اور حرام ہے۔

فقیہ کون ہے؟

أَخْبَرَنَا أَبُو بَكْرٍ، أَخْبَرَنَا أَبُو بَكْرٍ عَبْدُ اللَّهِ بْنُ عَبْدِ الْحَمِيدِ، أَخْبَرَنَا هَارُونُ الْحَمَّالُ، أَخْبَرَنَا سَيَّارٌ، أَخْبَرَنَا جَعْفَرُ بْنُ سُلَيْمَان، أَخْبَرَنَا مَطَرٌ الْوَرَّاقُ قَالَ: سَأَلْتُ الْحَسَنَ عَنْ مَسْأَلَةٍ، فَقَالَ فِيهَا، فَقُلْتُ: يَا أَبَا سَعِيدٍ يَأْبَى عَلَيْكَ الْفُقَهَاءُ وَيُخَالِفُونَكَ. فَقَالَ: «ثَكِلَتْكَ أُمُّكَ مَطَرُ، وَهَلْ رَأَيْتَ فَقِيهًا قَطُّ؟ وَهَلْ تَدْرِي مَا الْفَقِيهُ؟ الْفَقِيهُ الْوَرِعُ

الزَّاهِدُ الَّذِي لَا يَسْخَرُ مِمَّنْ أَسْفَلَ مِنْهُ، وَلَا يَهْمِزُ مَنْ فَوْقَهُ، وَلَا يَأْخُذُ عَلَى عِلْمٍ عَلَّمَهُ اللَّهُ حُطَامًا»[1]

"ہمیں ابو بکر محمد بن الحسین نے خبر دی، وہ کہتے ہیں ہمیں عبد اللہ بن عبد الحمید واسطی نے خبر دی، وہ کہتے ہیں ہمیں ہارون حمال نے خبر دی، وہ کہتے ہیں ہمیں سیار نے خبر دی، وہ کہتے ہیں ہمیں جعفر بن سلیمان نے خبر دی، وہ کہتے ہیں ہمیں مطر وراق نے خبر دی اور وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت حسن بصری رحمہ اللہ سے ایک مسئلہ پوچھا تو انہوں نے اس بارے جو مناسب سمجھا، جواب دے دیا۔ میں نے کہا: اے ابو سعید! فقہاء تو اس مسئلے میں آپ کا رد اور مخالفت کرتے ہیں۔ تو حسن بصری رحمہ اللہ نے کہا: اے مطر! تیری ماں تجھے گم پائے، کیا تم نے کوئی فقیہ دیکھا بھی ہے؟ اور تجھے معلوم ہے کہ فقیہ کسے کہتے ہیں؟ فقیہ تو وہ ہے جو اللہ سے ڈرنے والا اور دنیا سے بے رغبتی رکھنے والا ہے۔ جو اپنے سے کم علم رکھنے والوں کا مذاق نہیں اڑاتا اور اپنے سے بڑے علماء کو لعن طعن نہیں کرتا۔ اور نہ ہی اس علم کے ذریعے کہ جو اللہ نے اسے عطا کیا ہے، وہ لوگوں کو رگیدتا ہے۔"

سلف صالحین اور آج کی کتابوں میں فرق یہ ہے کہ وہ ہر بات سند سے نقل کرتے تھے یہاں تک کہ اگر انہوں نے کسی صحابی، تابعی، تبع تابعی اور امام کا قول اپنی کسی کتاب میں بیان کرنا ہوتا تھا تو اپنے سے لے کر اس تک مکمل سند بیان کرنے کا اہتمام کرتے تھے۔ آپ محدثین عظام کی کتابیں اٹھا کر دیکھ لیں یا متقدمین صلحاء کی، دونوں نے اقوال کے بیان میں سند کا اہتمام کیا ہے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ جب سند کے بیان کا رواج ختم ہوتا چلا گیا تو مصنفین نے اپنی کتابوں میں اقوال تو کجا احادیث کو بھی بغیر حوالہ درج کرنا شروع کر دیا۔ اور وہ زمانہ بھی آ گیا کہ اپنے منگھڑت نظریات ثابت کرنے کے لیے سلف صالحین، ائمہ دین، متقدمین صلحاء بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف بھی جھوٹی باتیں منسوب کر کے مسلم معاشروں میں رائج کی گئیں۔ معاصر مؤلفین کو قرآن، حدیث اور سلف

[1] أخلاق العلماء: ص 74-75

صالحین کی بات کرتے ہوئے سند نہ سہی کم از کم حوالہ بیان کرنے کا تو اہتمام کرنا چاہیے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا یہ قول بہت ہی خوبصورت ہے کہ جس میں انہوں نے فقاہت اور علم کے جوہر کو بیان کر دیا ہے اور وہ تقویٰ اور زہد ہے کہ تقویٰ اور زہد کے بغیر تو یہ علم کسی کام کا نہیں، نرا کتابوں کا بوجھ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿مَثَلُ الَّذِينَ حُمِّلُوا التَّوْرَاةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ أَسْفَارًا﴾ [الجمعة: 5]

"مثال ان لوگوں کی کہ جنہیں تورات دی گئی اور پھر انہوں نے اسے اٹھانے کا حق ادا نہ کیا، ان کی مثال اس گدھے کی سی ہے کہ جس پر کتابوں کا بوجھ لادا گیا ہو۔"

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ کا کہنا یہ ہے کہ ایک فقیہ اور عالم کی فقاہت اور علم کا اس وقت پتہ چلتا ہے، جب وہ دوسروں پر نقد کرتا ہے۔ جن پر وہ نقد کرتا ہے، یا تو وہ اس سے علم میں بہتر ہوں گے تو وہ ان کی بے ادبی نہیں کرتا یا وہ اس سے علم میں کم ہوں گے تو وہ ان کا مذاق نہیں اڑاتا۔ چونکہ وہ اپنے علم کو اللہ کی نعمت سمجھتا ہے لہذا اس علم کو دوسروں کی تنقیص اور عیب جوئی کے لیے استعمال نہیں کرتا۔ کسی فقیہ یا عالم کو یہ صفت اسی صورت حاصل ہوتی ہے جبکہ وہ متقی اور زاہد ہو۔ وہ اپنے علم کے معاملے میں اللہ سے ڈرتا ہو اور اپنے علم کے حوالے سے دنیا سے بے رغبت ہو کہ اس علم کو خود نمائی کا ذریعہ نہ بننے دے۔ کیا خوب فرمایا!

«وَهَلْ رَأَيْتَ فَقِيهًا قَطُّ؟»

"کیا تم نے کبھی کوئی فقیہ دیکھا بھی ہے؟"

غیر نافع علم

پنجاب یونیورسٹی میں عربی زبان وادب کے ایک مشفق استاذ پروفیسر خورشید رضوی صاحب تھے جو صرف ونحو (Arabic Grammar) کی تدوین اور تالیف (compilation) کے بارے ایک خوبصورت مثال پیش کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ بڑھئی جب خام لکڑی کی تراش خراش سے میز بناتا ہے تو اس میں سے ایک تو میز نکلتی

ہے اور دوسرا برادہ (sawdust)۔ اصلاً مقصود تو میز ہی ہوتا ہے لیکن برادہ ساتھ میں مفت حاصل ہو جاتا ہے۔

جب علوم عالیہ یعنی کتاب وسنت کی خدمت کے لیے علوم آلیہ یعنی لغت و منطق، صرف و نحو، بلاغت و کلام وغیرہ کی تدوین کا دور شروع ہوا تو جہاں یہ علوم مدون ہوئے وہاں کتابوں میں کچھ برادہ بھی اکٹھا ہو گیا اور وقت کے ساتھ ساتھ لوگوں نے اس برادے کو ہی اصل علم سمجھ لیا۔

عربی زبان وادب اور صرف و نحو کی جو کتب مدارس میں پڑھائی جاتی ہیں، ان کی بہت سی ابحاث ایسی ہیں کہ جن کا تعلق کتاب وسنت کے سمجھنے سمجھانے سے نہیں ہے یا عربی سمجھنے سمجھانے سے بھی نہیں ہے جیسا کہ نحو میں توجیہات کا ایک پورا میدان ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ مدارس میں درس نظامی کی تدریس میں علوم آلیہ نے علوم عالیہ کی جگہ لے لی۔ پس جتنی منطق اور صرف و نحو پڑھائی جاتی ہے، اُس تناسب سے قرآن اور حدیث نہیں پڑھایا جاتا۔

یہ متوازن رویہ نہیں ہے، اس کو تبدیل ہونا چاہیے کہ جن علوم کو سمجھنے کے لیے صرف نحو، منطق اور بلاغت پڑھتے ہیں، اُن پر سے تو خیبر میل کی رفتار سے گزر جائیں اور جو علوم اصلاً مقصود نہ ہوں تو اُن پر آٹھ سال حالت اعتکاف میں گزار دیں۔ ہمیں یونانی منطق اور اختلافی فقہی مسائل سے زیادہ قرآن مجید کی تعلیم کے لیے طلباء کو تیار کرنا چاہیے کہ معاشرے میں جا کر قرآنی بنیادوں پر اصلاح اور دعوت کا کام کریں۔ مدارس سے فارغ ہونے والے اکثر طلباء کو قرآن مجید کا ترجمہ نہیں آتا اگرچہ اختلافی فقہی مسائل کے دلائل خوب ازبر ہوں گے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ اکثر یہ دعا مانگا کرتے تھے:

«اللهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ، وَمِنْ قَلْبٍ لَا يَخْشَعُ، وَمِنْ نَفْسٍ لَا تَشْبَعُ، وَمِنْ دَعْوَةٍ لَا يُسْتَجَابُ لَهَا»[1]

---

[1] صحيح مسلم، كتاب الذِّكْرِ وَالدُّعَاءِ وَالتَّوْبَةِ، بَابُ التَّعَوُّذِ مِنْ شَرِّ مَا عُمِلَ وَمِنْ شَرِّ مَا لَمْ يُعْمَلْ، 2088/4

"اے اللہ! میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں ایسے علم سے کہ جس کا کوئی فائدہ نہ ہو، اور ایسے دل سے کہ جس میں خشوع نہ ہو، اور ایسے نفس سے کہ جو کبھی سیر نہ ہو، اور ایسی دعا سے کہ جو کبھی قبول نہ ہو۔"

فقہی جمود

جامعہ بنوریہ کراچی کی ویب سائیٹ پر جامعہ کے دار الافتاء سے جاری کردہ ایک فتوی دیکھنے کو ملا کہ جس کے مطابق ولی کے بغیر نکاح فقہ حنفی میں جائز لیکن بے غیرتی ہے۔ معلوم نہیں ان مفتی حضرات کو کیا ہو گیا ہے کہ فتوی جاری کرتے وقت سوچتے بھی نہیں کہ کیا لکھ رہے ہیں۔ کیا اس فتوی کے ذریعے مفتی صاحب سائل کو یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ فقہ حنفی بے غیرتی کی تعلیم دیتی ہے؟ مفتی حضرات کا اصل مسئلہ یہ ہے کہ وہ تقلیدی جمود کا شکار ہیں کہ وہ فتاوی جو فقہاء نے ایک خاص ماحول اور قت میں دیے تھے، وہ آج انہی فتاوی کو بعینہ لاگو کیے جا رہے ہیں حالانکہ آج عرف، ماحول اور معاشرہ تبدیل ہو چکا ہے اور بعض کلاسیکل فقہاء کی بعض آراء کو بعینہ جاری کرنے سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ پس مفتی حضرات کی یہ جماعت تقلیدی جمود کی وجہ سے فقہاء کے قول سے بھی باہر نہیں نکل پاتی اور مفتی بہ قول کے مطابق فتوی جاری کرنے سے پیدا ہونے والے معاشرتی بگاڑ کا بھی انکار نہیں کر سکتے۔

یہ واضح رہے کہ شریعت اور فقہ میں بنیادی فرق یہی ہے کہ شریعت کو دوام حاصل ہے جبکہ فہم شریعت یعنی فقہ کو دوام حاصل نہیں ہے کیونکہ وہ منزل من اللہ نہیں ہے۔ فقہ، شریعت ہی کی سوجھ بوجھ کا نام ہے جو افراد اور حالات کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہے لہذا کسی خاص فرد اور حالات کے شریعت کے فہم کو قیامت تک کے لیے واجب العمل سمجھنا تقلیدی جمود کی علامت ہے۔

اور اس بارے اصولیین کی رائے کو فقہاء کی رائے پر ترجیح حاصل ہے کہ حکم شرعی نص کا فہم نہیں بلکہ نص کی عبارت ہے کیونکہ نص کے فہم میں تو فقہاء کا اختلاف ہو جاتا ہے لہذا شریعت ایک سے زائد ہو جائے گی جو کہ درست نہیں ہے۔ پس "أقیموا

الصلوۃ" حکم شرعی ہے یعنی شریعت ہے اور یہ دائمی ہے اور ان قرآنی الفاظ سے فقہاء کو جو سمجھ آئی ہے، وہ فقہ ہے اور اس میں زمان و مکان کی تبدیلی کی صورت میں اختلاف ہو سکتا ہے کیونکہ یہ فہم شریعت ہے نہ کہ شریعت۔

ان مفتی حضرات کی ایک بڑی غلطی یہ بھی ہے کہ یہ اپنی فقہ کے بنیادی مصادر کا مطالعہ نہیں کرتے ہیں۔ اگر یہ اپنی فقہ کے ابتدائی ماخذ کا مطالعہ کر لیں تو انہیں وہاں ہی اتنی وسعت مل جائے کہ وہ تقلیدی جمود کے نتیجے میں اِس قسم کی شطحیات جاری کرنے کی بجائے اَصحاب ترجیح کی طرح فقہی ذخیرے میں سے اُن اقوال کا انتخاب کر کے فتوی جاری کریں کہ جن میں معاشرے کی اصلاح کا پہلو نکلتا ہو۔

لڑکی کا نکاح ولی کے بغیر ہوتا ہے یا نہیں، اس بارے فقہ حنفی میں سات اقوال مروی ہیں جیسا کہ شرح ہدایہ فتح القدیر میں یہ ساتوں روایات موجود ہیں۔ دو امام ابو حنیفہ سے ہیں۔ دو امام محمد سے اور تین قاضی ابو یوسف رحمہم اللہ سے ہیں۔

ایک روایت کے مطابق امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا موقف یہ ہے کہ باکرہ کا اپنے ولی کے بغیر نکاح کرنا مطلقاً جائز ہے اور یہ ظاہر الروایہ ہے۔ امام صاحب سے مروی دوسری روایت کے مطابق کفو اور برابری میں جائز ہے جبکہ غیر کفو میں نہیں۔ امام محمد رحمہ اللہ سے ایک روایت ہے کہ ولی کی اجازت پر نکاح موقوف ہو جائے گا یعنی ولی اجازت دے گا تو منعقد ہو جائے گا اور اگر نہیں دے گا تو باطل رہے گا۔ انہی سے مروی دوسری روایت ہے کہ انہوں نے ظاہر الروایہ کی طرف رجوع کر لیا تھا یعنی ولی کے بغیر نکاح مطلقاً جائز ہے۔ قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ کے ایک قول کے مطابق ولی کے بغیر نکاح بہر صورت باطل ہے۔ دوسری روایت ہے کہ کفو اور برابری میں جائز ہے اور غیر کفو میں نہیں۔ تیسری روایت ہے کہ مطلقاً جائز ہے۔ اب یہ ساتوں روایات امام صاحب اور صاحبین سے کتب فقہ میں منقول ہیں۔

اب مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ امام صاحب اور صاحبین کے متعدد اقوال میں سے پہلا کون سا ہے اور بعد والا کون سا ہے۔ اب اس کے لیے "اصحاب ترجیح" کی طرف رجوع کیا گیا۔

یہاں پہلا سوال تو یہ پیدا ہوا کہ یہ تقرری کون کرے گا کہ فلاں "اصحاب ترجیح" میں سے ہے اور فلاں نہیں ہے؟ تو جس نے یہ طے کیا تو اصل تقلید اس کے قول کی ہوئی حالانکہ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ ایک صاحب جو حنفی مدرسہ سے دس سال لگا کر مفتی کی ڈگری حاصل کرتے ہیں، آپ انہیں تلفیق کی نہ سہی کم از کم اتنی اجازت تو دیں کہ وہ اپنے مذہب یعنی فقہ حنفی ہی میں موجود مختلف اقوال میں سے کسی ایک قول کو ترجیح دے کر سائل کر مسئلہ حل کر سکیں نہ کہ آپ اپنے فقہی ذخیرے میں موجود متنوع اقوال میں سے بھی ایک ہی قول کا پابند بنا کر مفتیوں کو بھی تقلید جامد پر لگا دیں۔ اگر مفتی صاحب نے دس سال لگانے کے بعد بھی اپنے مذہب میں ایک قول کو دوسرے قول پر ترجیح دینے کی اہلیت نہیں ہے اور انہوں نے "فتاوی شامی" دیکھ کر ہی فتوی بتلانا ہے تو بہتر یہی تھا کہ فتاوی شامی کا آسان فہم اردو ترجمہ اور شرح شائع کر دی جاتی کہ عوام براہ راست استفادہ کر لیتے۔

اور عجیب بات یہ ہے کہ جن مسائل میں "اصحاب ترجیح" کوئی ترجیح قائم کر چکے ہیں وہاں اس ترجیح کا ریوائز کرنا بھی ممنوع ہے۔ بہر حال اس مسئلے میں اہل ترجیح کا اختلاف ہو گیا کہ متقدم قول کون سا ہے اور متاخر کون سا ہے۔ مثلاً قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ کے معاملہ میں امام طحاوی رحمہ اللہ نے کہا کہ متقدم ترین قول ولی کے بغیر مطلقاً نکاح کے جواز کا ہے جبکہ متاخر ترین قول ولی کے بغیر نکاح بہر صورت نہ ہونے کا ہے یعنی امام طحاوی رحمہ اللہ کی ترجیح کے مطابق قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ کا موقف وہی ہے جو ائمہ ثلاثہ اور اہل الحدیث کا ہے۔ امام سرخسی رحمہ اللہ نے کہا کہ قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ کا متقدم قول ولی کہ بغیر بہر صورت نکاح نہ ہونے کا ہے جبکہ متاخر ترین قول ولی کے بغیر مطلقاً نکاح کے جائز ہونے کا ہے۔ پس ان دونوں "اصحاب ترجیح" میں اختلاف ہو گیا اور یہ ترجیح قائم کرنے کے لیے دلائل دونوں کے پاس نہیں ہیں۔

اب بات یہاں ختم نہیں ہو جاتی، اب ایک اور صاحب ترجیح آتے ہیں جو یہ بتلاتے ہیں کہ قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ سے مروی اقوال میں طحاوی رحمہ اللہ اور سرخسی رحمہ اللہ کی

ترجیح میں سے سرخسی رحمہ اللہ کی ترجیح کو ترجیح دی جائے گی۔ اس کی دلیل کیا ہے؟ کچھ معلوم نہیں۔ اب سرخسی کی ترجیح کو ترجیح قرار دینے والے کی بات کو بنیاد بناتے ہوئے قاضی ابو یوسف رحمہ اللہ کا موقف متعین ہوتا ہے۔

اس سارے میکانزم میں اصل کون ہے؟ وہ ابن عابدین شامی رحمہ اللہ متوفی 1252ھ ہیں جو بلاشبہ بہت راسخ عالم دین ہیں لیکن امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ بہر حال نہیں ہیں کہ ان سے اختلاف نہ کیا جا سکے۔ اور معاصر مفتی حضرات "فتاوی شامی" اور "فتاوی عالمگیری" سے آگے نہیں بڑھتے۔ یہی وہ تقلیدی جمود ہے کہ جس کے رد عمل میں برصغیر میں اہل حدیث کی تحریک پیدا ہوئی۔ اور مفتی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ ہم انہیں ایک ڈربے سے دوسرے ڈربے میں شامل کرنے کی خواہش رکھتے ہیں کہ وہ فقہ حنفی چھوڑ کر اہلحدیث ہو جائیں بلکہ ہم یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ اہل حدیث کو حنفی فقہاء کے فقہی ذخیرے سے استفادہ کرنا چاہیے اور حنفی علماء کو اہل الحدیث اور دیگر فقہی مذاہب کے علمی ذخیرہ سے بھی استفادہ کرنا چاہیے۔ کسی مسئلے میں تقابلی فقہی مطالعہ سے اس کے جمیع پہلو نکھر کر سامنے آجاتے ہیں اور ایک معتدل رائے اختیار کرنے میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی اور محدثین کی فقہ، سب اسلامی فقہ ہے اور ہمارے علماء کو بغیر کسی تعصب کے اس اسلامی فقہی ذخیرے سے یکساں طور استفادہ کرنا چاہیے۔ اور اس عظیم اسلامی فقہی ذخیرے سے عصر حاضر کے مسائل کا جواب دیا جائے گا تو فتوی بہت حد تک معتدل ہو گا۔ اور اگر آپ اس اسلامی فقہی ذخیرے کی کسی ایک شاخ میں اپنے آپ کو محدود کر لیں گے تو پھر اسی قسم کے فتاوی سامنے آئیں گے کہ جس کی مثال ہم اوپر بیان کر چکے۔

فقہی حیلے

حیلہ عربی زبان کا لفظ ہے اور یہاں اس سے مراد قانونی چالاکی ہے۔ قوموں کی تاریخ میں یہ عادت بہت پرانی چلی آ رہی ہے کہ اللہ عزوجل کے احکامات کو پس پشت ڈالنے کے لیے چالاکی اور فریب سے کام لیا جائے۔ مسلمان امتوں میں حیلوں کا رواج سب سے

پہلے یہود میں ملتا ہے کہ انہوں نے اللہ عزوجل کے احکامات کو اپنی قانونی چالاکیوں کے ذریعے مذاق بنانے کی کوشش کی۔ ایک دوست نے ایک دفعہ رابطہ کیا اور کہا کہ میرے پاس بینک میں کچھ رقم پڑی تھی جبکہ آمدن کا کوئی ذریعہ نہیں تھا لہذا اس کی زکوۃ نکالنے میں کچھ ہچکچاہٹ تھی۔ انھوں نے لاہور کی ایک بہت بڑی جامعہ کے مفتی صاحب سے رابطہ کیا تو مفتی صاحب نے اس کا حل یہ نکالا کہ وہ زکوۃ تو ادا کریں گے کہ یہ ان پر فرض ہے البتہ یہ کرلیں کہ کسی ایسے شخص کو زکوۃ ادا کردیں کہ جو ان کو بعد میں وہی رقم واپس ہبہ کردے۔ اس میں مفتی صاحب کی دلیل یہ تھی کہ جب زکوۃ ادا کرنے والے نے اپنی زکوۃ کسی مستحق کو پکڑا دی تو اب مستحق اس زکوۃ کی رقم کا مالک ہے، وہ جہاں چاہے اسے خرچ کر سکتا ہے، اور اگر زکوۃ لینے والا وہ رقم مالک بن جانے کے بعد زکوۃ دینے والے ہی کو واپس ہبہ کردے تو یہ بھی کر سکتا ہے۔ اب میرے دوست کا دل مفتی صاحب کے اس حل پر مطمئن نہیں ہو رہا تھا لہذا مجھ سے پوچھ لیا تو میں نے تو کہا کہ یہ تو سیدھی سادھی اللہ عزوجل سے چالاکی کرنے والی بات ہے لہذا اس سے بچنا ہی چاہیے۔ اس طرح کے حیلے کے نتیجے میں زکوۃ کے حکم کا جو شرعی مقصد تھا یعنی غربا، مساکین اور محتاجوں کی امداد یا صاحب مال کا تزکیہ نفس وغیرہ، تو وہ فوت ہو جاتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کی یہ سنت ہے کہ زکوۃ کسی بستی کے امراء سے وصول کی جائے اور غریبوں کی طرف لوٹا دی جائے۔[1] اگر کوئی عالم دین ایسے حیلے اختیار کرے کہ جن سے وہ زکوۃ دوبارہ امراء کی طرف واپس لوٹ جائے تو یہ حیلے شرعاً ناجائز ہوں گے۔

اسی طرح ایک دفعہ ایک دوست نے حج کے ایک مسئلے کے بارے دریافت فرمایا کہ اس کا شرعی حکم جامعہ کے دار الافتاء سے پوچھ کر آنا ہے۔ مسئلہ یہ تھا کہ ایک شخص کی کمائی صریحاً حرام سے تھی اور وہ شخص اپنے اس حرام مال سے اپنے والد صاحب کو حج پر بھیجنا چاہتا تھا جبکہ والد صاحب اس پر راضی نہ تھے۔ راقم الحروف نے دار الافتاء میں

[1] «تُؤْخَذُ مِنْ أَغْنِيَائِهِمْ فَتُرَدُّ عَلَى فُقَرَائِهِمْ» [صحيح بخاري، كِتَابُ الزَّكَاةِ، بَابُ أَخْذِ الصَّدَقَةِ مِنَ الأَغْنِيَاءِ وَتُرَدَّ فِي الفُقَرَاءِ حَيْثُ كَانُوا، 128/2]

موجود مفتی صاحب سے اس مسئلے کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے فوراً فقہ کی کتابیں کھنگالیں اور کہا کہ حرام کی کمائی سے حج نہیں ہوتا لہذا اس کے والد کے لیے حج پر جانا جائز نہیں ہے۔ یہ جواب حاصل کر کے ابھی کھڑا ہی ہوا تھا کہ مفتی صاحب کہنے لگے کہ ایک حیلہ بھی بتا دوں۔ تو مجھے تعجب ہوا کہ یہ کیا ہے تو ایسے میں ہی کہا کہ وہ بھی بتا دیں۔ تو مفتی صاحب نے کہا کہ ان کے والد صاحب سے کہیں کہ کسی سے قرض لے کر حج پر چلیں جائیں اور اس قرض کی ادائیگی ان کا بیٹا کر دے۔

قرآن کے بیان کے مطابق ساحل سمندر پر واقع یہود کی ایک بستی پر ہفتے کے دن مچھلیوں کا شکار منع تھا تا کہ وہ اس دن میں اللہ کی عبادت کریں۔ دوسری طرف اللہ عزوجل نے انہیں آزمائش میں اس طرح ڈالا کہ ہفتے والے دن تو مچھلیاں پانی کی سطح پر آ جاتی تھیں اور بستی والوں کو شکار کی دعوت دیتی تھیں جبکہ باقی دنوں میں گہرے پانی میں چلی جاتی تھیں۔ یہود کا ایک گروہ اس آزمائش میں پورا نہ اترا اور اس نے ہفتے کے دن مچھلیاں پکڑنے کے لیے ایک حیلہ ایجاد کیا۔ انہوں نے سمندر کے ساحل کے نزدیک چھوٹے چھوٹے گڑھے کھود ڈالے اور ان گڑھوں کو پانی کی نالیوں کے ذریعے سمندر سے ملا دیا۔ جب ہفتے کا دن ہوتا تھا تو یہ لوگ مچھلیوں کو سمندر سے ان گڑھوں کی طرف ہانک دیتے تھے اور اتوار والے دن جا کر پکڑ لیتے تھے۔ اس طرح بظاہر وہ اللہ کے حکم کی پابندی کر رہے تھے کہ انہوں نے ہفتے والے دن مچھلیوں کا شکار نہیں کیا لیکن اللہ کے اس حکم کا جو مقصود تھا یعنی ہفتے والے دن کو اللہ کی عبادت کے لیے مخصوص کرنا' وہ یہاں پورا نہ ہو رہا تھا۔ ایک دوسرے گروہ نے اس پہلے گروہ کو حیلہ کرنے سے منع کیا اور انھیں اس معاملے میں اللہ سے ڈرایا لیکن پہلا گروہ نہ مانا۔ ایک تیسرا گروہ ان لوگوں کا بھی تھا جو دوسرے گروہ کو کہتے تھے کہ پہلے گروہ کو سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ یہ لوگ نہ تو پہلے گروہ والوں کی طرح حیلے سے مچھلیاں پکڑتے تھے اور نہ ہی ان کو اس فعلِ بد سے منع کرتے تھے۔ اللہ عزوجل نے شرعی حکم سے بچنے کے لیے کیے جانے والے اس حیلے کے سبب پہلے گروہ پر عذاب نازل کیا کہ جس کا تذکرہ قرآن میں ان الفاظ میں موجود

ہے۔ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَاسْأَلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِي كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ إِذْ يَعْدُونَ فِي السَّبْتِ إِذْ تَأْتِيهِمْ حِيتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَيَوْمَ لَا يَسْبِتُونَ لَا تَأْتِيهِمْ كَذَٰلِكَ نَبْلُوهُم بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ ﴿163﴾ وَإِذْ قَالَتْ أُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُونَ قَوْمًا اللَّهُ مُهْلِكُهُمْ أَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيدًا قَالُوا مَعْذِرَةً إِلَىٰ رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿164﴾ فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَئِيسٍ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ﴾ [الأعراف: 165]

"اور آپ ان یہود سے اس بستی والوں کا حال پوچھیں جو سمندر کے کنارے آباد تھی جبکہ وہ لوگ ہفتے کے دن ظلم کرتے تھے۔ان کے پاس ان کی مچھلیاں ان کے ہفتے والے دن پانی کی سطح پر آجاتی تھیں اور جس دن ہفتہ نہ ہوتا تھا تو وہ ان کے سامنے نہ آتی تھیں۔اسی طرح ہم ان کی آزمائش کررہے تھے اس وجہ سے کہ وہ نافرمان تھے۔جب اس بستی کے ایک گروہ نے دوسرے سے کہا کہ تم اس جماعت کو کیوں نصیحت کرتے ہو کہ جس کو اللہ تعالی ہلاک کرنے والا ہے یا سخت عذاب دینے والا ہے تو انہوں نے کہا: تاکہ تمہارے رب کے ہاں معذرت پیش کرسکیں [کہ ہم نے تو انہیں سمجھایا تھا] اور شاید ان میں سے کچھ لوگ ڈر جائیں [اور اس قسم کے حیلوں سے باز آجائیں]۔پس جب انہوں نے اس نصیحت کو بھلادیا کہ جس کی ان کو نصیحت کرائی گئی تھی تو ہم نے ان لوگوں کو بچالیا جو کہ برائی سے منع کرتے تھے اور جن لوگوں نے ظلم کیا تھا ہم نے ان کو ان کی نافرمانی کے سبب سخت عذاب میں پکڑلیا۔"

ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَنَسٍ قَالَ: لَمَّا حُرِّمَتِ الْخَمْرُ قَالَ: إِنِّي يَوْمَئِذٍ لَأَسْقِيهِمْ لَأَسْقِي أَحَدَ عَشَرَ رَجُلًا، فَأَمَرُونِي، فَكَفَأْتُهَا، وَكَفَأَ النَّاسُ آنِيَتَهُمْ بِمَا فِيهَا حَتَّى كَادَتِ السِّكَكُ أَنْ تُمْتَنَعَ مِنْ رِيحِهَا، قَالَ أَنَسٌ: وَمَا خَمْرُهُمْ يَوْمَئِذٍ إِلَّا الْبُسْرُ وَالتَّمْرُ مَخْلُوطَيْنِ. قَالَ: فَجَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: إِنَّهُ كَانَ عِنْدِي مَالُ يَتِيمٍ فَاشْتَرَيْتُ بِهِ خَمْرًا،

أَفَتَأْذَنُ لِي أَنْ أَبِيعَهُ، فَأَرُدَّ عَلَى الْيَتِيمِ مَالَهُ؟ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «قَاتَلَ اللهُ الْيَهُودَ حُرِّمَتْ عَلَيْهِمُ الثُّرُوبُ فَبَاعُوهَا، وَأَكَلُوا أَثْمَانَهَا، وَلَمْ يَأْذَنْ لَهُمُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فِي بَيْعِ الْخَمْرِ»[1]

”حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جن دنوں شراب حرام ہوئی، ان دنوں میری شراب پلانے کی ذمہ داری تھی اور میں گیارہ گیارہ لوگوں کو شراب پلایا کرتا تھا۔ پس میں اپنے برتن کی شراب بہادی اور لوگوں نے بھی اپنے برتنوں کی شراب انڈیل دی یہاں تک کہ مدینہ کی گلیوں میں شراب کی بدبو کے سبب گزرنا مشکل ہو گیا۔ ان دنوں شراب کچی اور پکی کھجور سے تیار ہوتی تھی۔ پس ایک شخص اللہ کے رسول ﷺ کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ میرے پاس یتیم کا مال تھا اور میں نے اس کی شراب خرید لی تھی [یعنی یتیم کے مال کو شراب کی تجارت میں لگایا تھا تاکہ یتیم کو فائدہ ہو اور خریداری کے وقت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی]۔ کیا آپ مجھے اجازت دیتے ہیں کہ میں وہ شراب بیچ کر یتیم کا مال سے واپس کر دوں۔ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ یہود کو ہلاک کرے کہ ان پر حلال جانوروں کے معدہ اور آنتوں سے لگی ہوئی چربی کا کھانا حرام کیا گیا تو انہوں نے اس کو پگھلا کر بیچ ڈالا اور اس کی قیمت کھانے لگ گئے۔ پس آپ ﷺ نے اس شخص کو شراب بیچنے کی اجازت نہ دی۔“

فقہاء کا اس بات پر اتفاق ہے کہ ایسے تمام حیلوں کو اختیار کرنا کہ جن سے شرعی احکام باطل ہو جاتے ہوں یا حرام کو حلال بنایا جاتا ہو، ناجائز ہے لیکن یہ بھی امر واقعہ ہے کہ ایسی کتابیں لکھی گئی ہیں کہ جن میں ایسے سینکڑوں حیلے سجھائے گئے کہ جن کے ذریعے شرعی احکام سے جان چھڑائی جا سکتی ہے۔[2] مثال کے طور اگر کسی شخص کے پاس دس لاکھ روپیہ گیارہ ماہ سے پڑا ہے اور وہ شخص زکوۃ سے بچنے کے لیے سال گزرنے سے

---

[1] مسند الإمام أحمد بن حنبل: 8/21

[2] احمد حسن، ڈاکٹر، جامع الأصول ترجمہ واضافہ الوجیز فی أصول الفقہ، مطبع مجتبائی، لاہور، ص 421

ایک دو ہفتے پہلے وہی مال اپنی بیوی کو ہبہ کر دیتا ہے تو اب اس پر زکوۃ نہ ہو گی کیونکہ اس رقم پر ایک مکمل سال نہیں گزرا۔ اسی طرح اگلے سال اس کی بیوی سال گزرنے سے پہلے یہی رقم اپنے شوہر کو ہبہ کر دیتی ہے اور اس طرح وہ مال پھر زکوۃ سے بچ جاتا ہے۔ حال ہی میں بعض علماء نے اس طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ مروجہ اسلامی بینکاری میں بھی بڑی تعداد میں حیلوں کو استعمال کیا گیا ہے۔ علمائے احناف کے ایک متفقہ فتوی کے الفاظ ہیں:

> ''مروجہ اسلامی بینکاری کی غیر اصلی اور عارضی بنیادیں چونکہ مرابحہ و اجارہ ہیں۔ ان عارضی بنیادوں پر بینکاری کرنے کو اور ان عارضی حیلوں کو مستقل ذریعہ تمویل بنانے کو اسلامی بینکاری کہنا اور سمجھنا شرعاً و اخلاقاً جائز کہنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اس کی چند وجوہات یہ ہیں: ۱۔ غیر اصلی بنیادیں (مرابحہ و اجارہ) محض حیلے ہیں اور حیلوں کو مستقل نظام بنانا ناجائز ہے' ایسے حیلوں کے ذریعے انجام پانے والا معاملہ بھی ناجائز ہی کہلاتا ہے۔ جیسے امام محمدؒ کے ہاں 'بیع عینہ' کا حیلہ ناجائز ہے اسی طرح مرابحہ و اجارہ کے حیلے اور ان کو ذریعہ تمویل بنانا بھی ناجائز ہے... ۲۔ یہ حیلے صرف مخصوص حالات اور وقتی عبوری دور کے لیے علماء نے بتائے تھے۔ ۳۔ یہ بہت ہی نازک اور خطرناک حیلے ہیں' ذرا سی بے احتیاطی اس کو سودی نظام سے ملا دیتی ہے۔ ۴۔ ان حیلوں کو دائمی نظام کے طور پر استعمال کرنا نہ صرف یہ کہ غلط ہے بلکہ ناجائز بھی ہے۔ ۵۔ اسلامی بینکاری میں مرابحہ اور اجارہ کا حجم ختم ہونا ضروری ہے' ورنہ کوئی اسلامی بینک ''اسلامی بینک'' کہلانے کا حقدار نہیں ہو گا۔ بلکہ ''حیلہ بینک'' کہلانے کا بجا طور پر حقدار ہو گا۔''[1]

[1] مروجہ اســـلامی بینکاری کے بارے میں علماء کرام اورمفتیان عظام کا متفقہ فتوی: ص 3-4۔ آٹھ صفحات پر مشـتمل اس فتوے کی بعد میں پریس ریلیز جار ی کی گئی جبکہ فتوی ایک پمفلٹ کی صورت میں عام کیا گیا۔ یہ فتوی معروف انگریزی روزنامہ اخبار ڈیلی نیوز کے 29 اگست 2008ء کے شمارہ میں شائع ہوا ہے اور اس کا خلا صہ جامعہ بنوری ٹاؤن کی ویب سائیٹ پر بھی موجود ہے۔ اس اجلاس میں جامعہ اشرفیہ لاہور سے حضرت مفتی حمید اللہ جان صاحب، جامعہ بنوری ٹاؤن کراچی سے حضرت مولانا مفتی عبد المجید دین پوری صاحب،حضرت مولانا مفتی رفیق احمد

علم کی فضیلت

اللہ عزوجل نے دینی علم کے حصول کی بہت فضیلت بیان کی ہے لہذا ہم میں سے ہر شخص کو دین کا کچھ نہ کچھ علم ضرور حاصل کرنا چاہیے۔ ایک روایت میں اس شخص کی بہت فضیلت بیان ہوئی ہے جو صرف اللہ کو راضی کرنے کے لیے دین کا علم حاصل کرتا ہے۔ دین کا علم حاصل کرنے سے اس کا مقصود دنیا کمانا نہیں ہوتا اور نہ ہی بطور عالم دین شہرت اس کو مطلوب ہوتی ہے۔ قیس بن کثیر رحمہ اللہ سے روایت ہے:

قَدِمَ رَجُلٌ مِنَ المَدِينَةِ عَلَى أَبِي الدَّرْدَاءِ، وَهُوَ بِدِمَشْقَ فَقَالَ: مَا أَقْدَمَكَ يَا أَخِي؟ فَقَالَ: حَدِيثٌ بَلَغَنِي أَنَّكَ تُحَدِّثُهُ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: أَمَا جِئْتَ لِحَاجَةٍ؟ قَالَ: لَا، قَالَ: أَمَا قَدِمْتَ لِتِجَارَةٍ؟ قَالَ: لَا، قَالَ: مَا جِئْتُ إِلَّا فِي طَلَبِ هَذَا الحَدِيثِ؟ قَالَ: فَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: «مَنْ سَلَكَ طَرِيقًا يَبْتَغِي فِيهِ عِلْمًا سَلَكَ اللَّهُ بِهِ طَرِيقًا إِلَى الجَنَّةِ، وَإِنَّ المَلَائِكَةَ لَتَضَعُ أَجْنِحَتَهَا رِضَاءً لِطَالِبِ العِلْمِ، وَإِنَّ العَالِمَ لَيَسْتَغْفِرُ لَهُ مَنْ فِي السَّمَوَاتِ وَمَنْ فِي الأَرْضِ حَتَّى الحِيتَانُ فِي المَاءِ، وَفَضْلُ العَالِمِ عَلَى العَابِدِ، كَفَضْلِ القَمَرِ عَلَى سَائِرِ الكَوَاكِبِ، إِنَّ العُلَمَاءَ وَرَثَةُ الأَنْبِيَاءِ، إِنَّ الأَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوا دِينَارًا وَلَا دِرْهَمًا إِنَّمَا وَرَّثُوا العِلْمَ، فَمَنْ أَخَذَ بِهِ أَخَذَ بِحَظٍّ وَافِرٍ»[1]

"قیس بن کثیر رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ ایک شخص حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ کے

صاحب اور حضرت مولانا مفتی شعیب عالم صاحب، جامعہ فاروقیہ سے حضرت مولانا سلیم اللہ خان صاحب، مولانا ڈاکٹر منظور احمد مینگل صاحب، حضرت مولانا مفتی سمیع اللہ صاحب، حضرت مولانا مفتی احمد خان صاحب،' جامعہ اسلامیہ کلفٹن سے حضرت مفتی حبیب اللہ شیخ صاحب، خیر المدارس ملتان سے مفتی مولانا عبد اللہ صاحب، دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک سے حضرت مفتی غلام قادر صاحب، جامعہ خلفائے راشدین کراچی سے حضرت مفتی احمد ممتاز صاحب، جامعہ أحسن العلوم کراچی سے حضرت مفتی زر ولی خان صاحب، جامعہ رشیدیہ بلوچستان سے حضرت مولانا مفتی احتشام الحق آسیا آبادی صاحب وغیرہ نے شرکت کی ہے۔ حیلوں کے جواز کے بارے شبہات پر ہم نے مفصل گفتگو اپنی ایک علیحدہ تحریر بعنوان اسلامی بینکاری: ایک تجزیاتی مطالعہ میں کی ہے جو ششماہی رشد جنوری 2015ء میں شائع ہوئی ہے۔

[1] سنن الترمذي، أَبْوَابُ الْعِلْمِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي فَضْلِ الفِقْهِ عَلَى العِبَادَةِ، 48/5

پاس مدینہ سے دمشق میں آیا۔ تو حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا کہ کس وجہ سے تو نے مدینہ سے دمشق تک کا سفر کیا ہے؟ اس شخص نے کہا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ آپ کے پاس نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث ہے اور میں وہ جاننے آیا ہوں۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے پھر سوال کیا کہ کیا اس کے علاوہ بھی تمہیں یہاں کوئی کام ہے؟ اس نے جواب دیا: نہیں۔ انہوں نے پھر سوال کیا کہ کیا تو یہاں تجارت کے لیے تو نہیں آیا؟ اس نے جواب دیا: نہیں۔ اور کہا کہ میں صرف اور صرف حدیث معلوم کرنے کے لیے آیا ہوں۔ حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو شخص بھی علم حاصل کرنے کے لیے کسی راستے پر چلا تو اللہ تعالی اسکے لیے جنت کا راستہ آسان فرمادیں گے۔ اور فرشتے طالب علم کو خوش کرنے کے لیے اپنے پر بچھاتے ہیں۔ اور عالم دین کے لیے زمین اور آسمان کی ہر مخلوق مغفرت کی دعا مانگتی ہے یہاں تک کہ مچھلیاں پانی میں عالم دین کے دعا کرتی ہیں۔ اور عالم کی عابد پر ایسی ہی فضیلت ہے جیسی کہ چاند کی تمام ستاروں پر ہے۔ یقیناً علماء ہی انبیاء کے وارث ہیں۔ انبیاء اپنی وراثت میں درہم اور دینار نہیں چھوڑتے بلکہ علم چھوڑتے ہیں۔ پس جو کوئی انبیاء کی وراثت سے لینا چاہے تو خوب بڑا حصہ لے۔"

یہ علم دین ہی ہے جو انسان کے دل میں اللہ کی معرفت کے راستے خشیت پیدا کرتا ہے۔ علم کی حقیقت، تقدیر ہے جبکہ اس کا حال، خشیت ہے۔ اگر علم پڑھنے سے خشیت حاصل نہ ہو تو یقینی طور جان لے کہ اس نے یا تو علم حاصل نہیں کیا یا علم تو حاصل کیا ہے لیکن اس کے حصول کی نیت اور ارادہ درست نہ تھا۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿إِنَّمَا يَخْشَى اللَّهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمَاءُ﴾ [الفاطر: 28]

"اللہ کے بندوں میں سے علماء ہی اللہ عزوجل کی خشیت اختیار کرتے ہیں۔"

اور اگر دین کا علم شہرت اور دنیا کے لیے حاصل کیا جائے تو یہ اتنا ہی بڑا وبال ہے کہ جتنا اس کا ثواب ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

ابْنُ كَعْبِ بْنِ مَالِكٍ، عَنْ أَبِيهِ، قَالَ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: «مَنْ طَلَبَ العِلْمَ لِيُجَارِيَ بِهِ العُلَمَاءَ أَوْ لِيُمَارِيَ بِهِ السُّفَهَاءَ أَوْ يَصْرِفَ بِهِ وُجُوهَ النَّاسِ إِلَيْهِ أَدْخَلَهُ اللَّهُ النَّارَ»[1]

"کعب بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جو علم اس لیے حاصل کرے کہ اس علم کے ذریعے علماء سے مقابلہ کرے اور جاہلوں پر رعب جمائے اور لوگوں کی توجہ حاصل کرے تو اللہ تعالی اس کو آگ میں داخل کریں گے۔"

اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جنہیں دنیا عالم سمجھتی ہے لیکن حقیقت میں وہ جہلاء ہیں۔ اور انہی کے بارے ایک روایت میں کہا گیا ہے کہ لوگ ان کو اپنا مذہبی پیشوا بنا لیں گے اور یہ ان کو خوب گمراہ کریں گے۔ روایت کے الفاظ ہیں:

عَبْدَ اللهِ بْنَ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ، يَقُولُ: سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، يَقُولُ: «إِنَّ اللهَ لَا يَقْبِضُ الْعِلْمَ انْتِزَاعًا يَنْتَزِعُهُ مِنَ النَّاسِ، وَلَكِنْ يَقْبِضُ الْعِلْمَ بِقَبْضِ الْعُلَمَاءِ، حَتَّى إِذَا لَمْ يَتْرُكْ عَالِمًا، اتَّخَذَ النَّاسُ رُءُوسًا جُهَّالًا، فَسُئِلُوا فَأَفْتَوْا بِغَيْرِ عِلْمٍ، فَضَلُّوا وَأَضَلُّوا»[2]

"حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ اللہ تعالی علم کو لوگوں میں سے ایک ساتھ نہیں اٹھائیں گے بلکہ علم کو اس طرح اٹھائیں گے کہ علماء کو اٹھا لیں گے یہاں تک کوئی عالم دین باقی نہ بچے گا اور لوگ جاہلوں کو اپنا پیشوا بنا لیں گے۔ اور ان سے سوال کریں گے اور وہ بغیر علم کے جواب دیں گے اور خود بھی گمراہ ہوں گے اور دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے۔"

[1] سنن الترمذي، أَبْوَابُ الْعِلْمِ، بَابُ مَا جَاءَ فِيمَنْ يَطْلُبُ بِعِلْمِهِ الدُّنْيَا، 32/5

[2] صحيح مسلم، كتاب الْعِلْمِ، بَابُ رَفْعِ الْعِلْمِ وَقَبْضِهِ وَظُهُورِ الْجَهْلِ وَالْفِتَنِ فِي آخِرِ الزَّمَانِ، 2058/4

باب دہم

تزکیہ اور تصوف

اس باب میں مراقبہ، لطائف نفس، فناء اور بقاء، قوائے ثلاثہ، سماع
اور وجد، مبشرات، کرامت اور شطحیات کے بارے سلفی اور صوفی
فکر کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔

مراقبہ اور صوفیاء

دو چار دنوں سے مراقبہ (meditation) سے متعلق مباحث کے مطالعہ میں تقریباً مراقبہ کی سی کیفیت رہی ہے۔ مراقبہ کا ایک تصور سلف صالحین کا ہے اور ایک صوفیاء کا اور دونوں میں کافی فرق ہے۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے اپنی کتاب "مدارج السالکین" میں ایک فصل "المراقبة" کے نام سے قائم کی ہے۔ یہ فصل سلف صالحین کے تصور مراقبہ کو بیان کر رہی ہے اور یہی وہ مراقبہ ہے کہ جس کی صدائے بازگشت آج بھی خطبات حرمین میں بھی ملے گی۔ اس مراقبہ کے جواز میں تو کوئی اختلاف نہیں ہے۔

مراقبہ کا ذکر ہندو ویدوں (vedas) میں ملتا ہے اور دنیا کی معلوم تاریخ میں ہندو مت ہی وہ پہلا مذہب ہے جہاں مراقبہ کو مذہبی شعائر کی حیثیت سے شروع کیا گیا۔ اس کے بعد بدھ مت میں اس کو بہت اہمیت دی گئی۔ سنسکرت زبان میں مراقبہ کے لیے "بھوانا" اور تبت کی زبان میں "گوم" کا لفظ مستعمل ہے۔ سب سے پہلے ہندو مذہبی ادب "اُپنشد" میں ہمیں مراقبہ کا ذکر ملتا ہے۔[1] بدھ مت میں مراقبہ بہت زیادہ ہے بلکہ ان کے ہاں تو اصل عبادت ہی یہی ہے کہ ہفتوں بارہ بارہ گھنٹے مراقبہ ہوتا ہے۔[2]

متقدمین صوفیاء میں مراقبہ رائج نہیں تھا جبکہ متاخرین نے اسے ایک پوری سائنس بنا دیا ہے کہ جس سے بیماریوں کا علاج تک کیا جاتا ہے۔ اس مراقبہ کے لیے درجات، قسمیں، اوقات اور ہدایات کی لمبی چوڑی تفصیلات ہیں۔ مثال کے طور وہ کہتے ہیں کہ مراقبہ کا بہترین وقت طلوع آفتاب سے پہلے ہے یا غروب آفتاب کے بعد اور اس کی ایک معقول وجہ ان کے پاس یہ ہے کہ لاشعوری حواس (unconsciousness) اس وقت میں متحرک ہوتے ہیں یا ہونا شروع کر دیتے ہیں اور شعور سکون میں چلا جاتا ہے یا جانا شروع کر دیتا ہے۔ مراقبہ کے جدید تصور کو جاننے کے لیے سلسلہ چشتیہ عظیمیہ کے روحانی پیشوا خواجہ شمش الدین عظیمی صاحب کی کتاب "مراقبہ" ایک عمدہ تحریر

---

[1] Alexander Berzin, Meditation Methods, Moscow: The Berzinarchives, 2005

[2] موسی بھٹو، محمد، مراقبہ، سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ، حیدر آباد، ص 29

ہے کہ جس میں انہوں نے روشنیوں کے مراقبے کا تصور دیا ہے۔

صوفیاء کے نزدیک مراقبہ کا اوسط وقت 20 تا 45 منٹ ہوتا ہے اور اس وقت میں آپ نے ایک کم روشنی والی جگہ میں سکون واطمینان سے بیٹھ جانا ہے اور اپنے حواس معطل کر دینے ہیں۔ آنکھیں، کان اور سوچ کو بند کرتے ہوئے خالی الذہن ہو جائیں۔ اور خالی الذہن ہونے سے مراد تمام سوچوں کو معطل کر کے ایک نقطے پر مرکوز کرنا ہے۔ اوسط مراقبے چار مہینے تک جاری رہتے ہیں لیکن اس طرح کے مراقبوں میں پہلے مہینے میں ہی انسان کو عجیب و غریب مشاہدات کا سامنا ہوتا ہے۔ صوفیاء مراقبوں کے ذریعے عالم مثال، عالم برزخ اور عالم امر کی سیر کرتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ جسے ہماری سیر کا یقین نہ آئے وہ خود سے تجربہ کر کے دیکھ لے۔

صوفیاء یہ کہتے ہیں کہ ظاہری حواس معطل کر دینے سے اور ذہن کو ایک نقطہ پر مرکوز کر دینے سے لاشعوری طاقتیں (five senses of the soul) نفس میں بیدار ہو جاتی ہیں اور ان کے ذریعے انسان باطنی دنیا کو دیکھنا شروع کر دیتا ہے یعنی وہ دنیا جو وہ موت کے بعد دیکھے گا۔ امام غزالی رحمہ اللہ سے لے کر شاہ ولی اللہ دہلوی رحمہ اللہ تک بڑے بڑے نام ملتے ہیں جو اس تصور مراقبہ کی کسی نہ کسی درجے میں نہ صرف حمایت کرتے نظر آتے ہیں بلکہ عملاً اس کی مشق بھی کرتے رہے ہیں اور بعض تو باطنی آنکھ کے کھلنے پر قسم کھاتے بھی نظر آتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص فجر کی نماز کے بعد مسجد میں بیٹھ کر پندرہ بیس منٹ کے لیے آنکھیں بند کر کے اپنے حواس معطل کر دے اور ذہن صرف اسی نقطہ پر مرکوز کر دے کہ اللہ تعالی مجھے دیکھ رہا ہے تو کیا یہ شرعاً جائز ہو گا؟ اور دلیل اس میں حدیث جبرئیل کو بنائے کہ میں وہ کیفیت حاصل کرنے کے لیے مشق کر رہا ہوں کہ اللہ کی ایسے عبادت کروں کہ اللہ تعالی مجھے دیکھ رہے ہوں، اور اگر اس سوال میں ایک اضافہ یہ بھی کر لیا جائے کہ اگر اس مشق سے واقعتاً اس کو بہت فائدہ ہوتا ہو جیسا کہ صوفیاء نے دعوی کیا ہے کہ مراقبہ سے احسان کی کیفیات قطعی طور حاصل ہوتی ہیں تو کیا مقصد شرعی کے

حصول کے لیے ایسا کرنا جائز ہو گا؟

ہماری رائے میں اس قسم کے مراقبہ کا ثبوت سنت، صحابہ وتابعین، ائمہ دین، خیر القرون، سلف صالحین اور متقدمین صوفیاء سے نہیں ملتا لہذا ایک بات تو یقینی ہے کہ اس مراقبہ میں کوئی ایسی خیر نہیں ہے جو اس کے بغیر حاصل نہ ہو سکتی ہو۔ اس لیے اس طریقہ کار سے اجتناب کرنا چاہیے کیونکہ اس امت کے متقدمین کو جو خیر حاصل تھا، متاخرین اس کو کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ اور وہ خیر متقدمین کو مراقبہ کے بغیر ہی حاصل ہوا تھا۔ دین نے نہ صرف خیر کے بارے بتلایا ہے کہ وہ کیا ہے بلکہ خیر کے حصول کے ذرائع بھی دین ہی کا موضوع ہیں اور دین نے اُن ذرائع کو بھی تفصیل سے بیان کر دیا ہے کہ جن سے وہ خیر حاصل ہو گا، جو آخرت میں نجات کے لیے ضروری ہے۔

صوفیاء کہتے ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ نے غار حراء میں مراقبہ کیا تھا لیکن یہ بات ثابت نہیں ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ آپ ﷺ نبوت سے پہلے غار حراء میں دین ابراہیمی کی بچی کھچی روایات کے مطابق اللہ سبحانہ وتعالی کی عبادت کرتے تھے۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ سے یہ ثابت نہیں ہے کہ نبوت ملنے کے بعد آپ نے کبھی غار حراء کا رخ کیا ہو لہذا آپ کا نبوت کے ملنے کے بعد کا عمل اصلاً حجت ہے۔ اسی طرح نبی کریم ﷺ، صحابہ کرام، سلف صالحین اور متقدمین صوفیاء نے مراقبہ کو تقرب الی اللہ کا نہ تو خود ذریعہ بنایا ہے اور نہ ہی اس کی تعلیم دی ہے۔

صوفیاء مراقبہ کے ذریعے سیر الی اللہ، فناء فی اللہ، سیر من اللہ، بقاء باللہ کے مراتب سے گزرتے ہیں۔ ان کے بقول وہ مقام اعراف کو دیکھتے ہیں، اپنے رب کا دیدار کرتے ہیں، موت کے بعد کی زندگی کا مشاہدہ کرتے ہیں اور فوت شدگان سے ملاقات کرتے ہیں وغیرہ۔ اور اس سب کچھ کے مشاہدے پر قسمیں کھاتے ہیں۔ یہ دعوے ہزار سال سے بہت لوگ کر رہے ہیں۔ بعض سلاسل میں تو کشف قبور بھی ان کے امتیازات میں شامل ہے جیسا کہ سلسلہ نقشبندیہ اویسیہ کے سالکین کا یہ دعوی ہے کہ وہ قبر میں مردے کو ہونے والی جزا و سزا کے بارے بھی بتلا سکتے ہیں۔

ہمارے نزدیک وہ جمیع موضوعات کہ جن کا تعلق مشاہدات اور مکاشفات سے ہے، علم نفسیات کے تحت داخل ہیں اور انہیں دین کا موضوع نہیں سمجھنا چاہیے لہذا مراقبہ دین کا نہیں بلکہ سائیکالوجی کا موضوع ہے۔ اگر یہ دین کا موضوع ہوتا تو صحابہ، تابعین، تبع تابعین اور ائمہ دین نے اس پر کچھ نہ کچھ تو گفتگو کی ہوتی جبکہ سائیکالوجی میں مراقبہ (meditation) ایک پورا میدان ہے اور مغرب میں تواب پیرا سائیکالوجی، یوگا، ٹیلی پیتھی اور میڈی ٹیشن وغیرہ ایک پوری سائنس بن چکا ہے۔

البتہ نبی اور رسول کے مشاہدات اور مکاشفات پر جب بات ہو گی تو اس وقت یہ دین کا موضوع ہوں گے اور ان پر ایمان لانا واجب ہو گا کیونکہ نبی اور رسول ان مشاہدات اور مکاشفات کے لیے مراقبے کے راستے تکلف اور تصنع کام نہیں لیتے تھے۔ اور جہاں تک صوفیاء کے مشاہدات اور مکاشفات کی بات ہے تو ہمیں جدید علم نفسیات (modern psychology) کی روشنی میں بھی ان کو سمجھنے کی کوشش کرنی ہو گی کہ خود صوفیاء کا ان مشاہدات اور مکاشفات میں اتفاق نہیں اور وہ اس بارے ایک دوسرے کا رد بھی کرتے ہیں کہ جس کے بیان کا یہاں موقع نہیں ہے۔

جہاں تک کشف قبور کی بات ہے تو اسے صوفیاء کے بعض حلقوں کی جانب سے ایسے پیش کیا جاتا ہے جیسے یہ کوئی بہت بڑا روحانی مقام ہو حالانکہ محققین صوفیاء نے کشف اور کرامت کو صوفی کا حیض اور نقص قرار دیا ہے۔[1] شیخ احمد الرفاعی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> الولي لا يظهر الكرامة ولا ترغب للكرامات وخوارق العادات فإن الأولياء يستترون من الكرامات كما تستتر المرأة من الحيض.[2]
>
> "ولی کبھی بھی اپنی کرامت ظاہر نہیں کرتا اور نہ ہی اسے کرامات اور خوارق عادت (supernatural) کے اظہار میں کوئی دلچسپی ہوتی ہے۔ اولیاء اللہ تو اپنی کرامات کو یوں چھپاتے پھرتے ہیں جیسے کہ عورت اپنے حیض کو۔"

---

[1] الألوسي، شهاب الدين محمود بن عبد الله الحسيني، روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني، دار الكتب العلمية، بيروت، 1415 هـ، 167/6

[2] أحمد بن علي بن ثابت الرفاعي، البرهان المؤيد، دار الكتاب النفيس، بيروت 1408هـ، ص 128

حیض کی دو تعبیریں کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ جیسے عورت اپنے حیض کو چھپاتی ہے، ایسے ہی صوفی بھی اپنے کشف اور کرامت کو چھپاتا ہے۔ دوسری تعبیر جو نسبتاً زیادہ بہتر ہے، یہ ہے کہ جیسے حیض کے جاری ہونے پر عورت کا اختیار نہیں ہے اور اس کا جاری ہونا اس کے لیے تکلیف، اذیت اور ناپسندیدگی کا باعث ہوتا ہے تو اسی طرح صوفی کو کشف اور کرامت کے جاری ہونے سے کراہت ہوتی ہے۔ پس وہ کوئی بھی ایسا راستہ اختیار نہیں کرتا کہ جو اس کی ذات سے کسی کشف یا کرامت کے صدور کا ذریعہ بنے۔

اصولی بات یہی ہے کہ کرامت تو کجا نبی کا معجزہ بھی اختیاری نہیں ہوتا ہے بلکہ اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ جب اللہ چاہتے ہیں، معجزے کا صدور ہوتا ہے۔ اسی طرح نبی کی برکت بھی اختیاری نہیں ہوتی بلکہ اللہ کے اذن سے جاری ہوتی ہے کہ ایک بندے کا کھانا ایک جماعت کو کفایت کر جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ نبی اور ولی اپنے ارادے سے جب چاہیں، معجزہ اور کرامت دکھا دیں یا برکت جاری کر دیں بلکہ یہ اسی وقت ہو گا جبکہ اللہ کا اذن اور حکم جاری ہو گا۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَإِن كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ إِعْرَاضُـهُمْ فَإِنِ اسْـتَطَعْتَ أَن تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْأَرْضِ أَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَاءِ فَتَأْتِيَهُم بِآيَةٍ وَلَوْ شَاءَ اللَّـهُ لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدَىٰ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْجَاهِلِينَ﴾ [الأنعام: 35]

”اور اگر ان کی رُو گردانی آپ پر گراں گزرتی ہے تو اگر آپ کر سکیں تو زمین میں کوئی سرنگ ڈھونڈ نکالیں یا آسمان میں سیڑھی (تلاش کریں)، پھر ان کے پاس کوئی معجزہ لائیں۔ اور اگر خدا چاہتا تو سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا پس آپ ہر گز نادانوں میں نہ ہو جائیں۔“

چلیں! مان لیا کہ آپ کو کشف قبور ہو جاتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اب کیا کریں؟ ایک صوفی سے جب یہ سوال کیا گیا کہ اگر مجھے آپ کے سلسلہ میں شامل ہو جانے کے بعد کشف قبور ہونا شروع ہو گیا تو اس کے بعد مجھے کیا کرنا ہو گا؟ تو صوفی کا جواب یہی تھا کہ شریعت پر عمل کرنا۔ اور یہ جواب بالکل صحیح ہے لیکن ہمارا کہنا یہ ہے کہ اس کی دعوت تو دوسرے لوگ کشف قبور کے مقام پر پہنچنے سے پہلے سے ہی دے رہے ہیں۔

اگر وہاں پہنچنے کے بعد بھی یہی کام کرنا ہے تو اس مشق (exercise) کا فائدہ؟

اسی طرح مراقبے کے ذریعے صوفیاء کو جو مشاہدات ہوتے ہیں، ان میں ایک مشاہدہ "مشاہدہ حق" یا "مشاہدہ وجود" بھی ہے۔ صوفیاء کی ایک بڑی جماعت کا دعوی ہے کہ ہم اس دنیا میں رہتے ہوئے اللہ عزوجل کو یا صفت وجود حق سبحانہ وتعالی کو اپنی روح کی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں لیکن اس کے لیے روح کی پرواز کی مشق کرنی پڑے گی اور وہ مراقبہ سے ہو گی۔ اس کا دعوی بھی کافی صوفیوں نے کیا ہے۔ اس سے اتنی بات تو کہی جا سکتی ہے کہ وہ کچھ دیکھتے ضرور ہیں، لیکن کیا دیکھتے ہیں؟ اس میں بحث ہو سکتی ہے؟ مثلاً آپ ابھی اگر اپنا سر جھکا کر اپنی آنکھیں کچھ دیر کے لیے بند کر لیں تو کچھ نہ کچھ تو نظر آنا شروع ہو ہی جائے گا کیونکہ انسانی ذہن کی بنیادی ساخت ہی کچھ ایسی ہے کہ وہ کچھ نہ کچھ تصور (imagination) کرتا رہے، چاہے نیند میں ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ مشاہدات میں اختلاف نہیں ہے کہ وہ ہوتے ہیں کیونکہ انسان اور اس کا دماغ بہت ہی پر اسرار شیء ہے جس کا کسی قدر اندازہ سائیکالوجی کے طالب علموں کو ہے۔

اس بارے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جس طرح ظاہری حواس (senses) خطا کرتے ہیں جسے خطائے حس (hallucination) کہتے ہیں، اسی طرح باطنی حواس بھی خطا کر جاتے ہیں۔ یہ بات رجال تصوف میں سے بھی بعض محققین نے کی ہے جیسا کہ حضرت شیخ مجدد الف ثانی رحمہ اللہ کی مثال دی جا سکتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> "عجب کاروبار ہے کہ ان لوگوں میں سے بہت سے اس راہ کے مدعی اس شہود ومشاہدہ پر بھی قناعت نہیں کرتے بلکہ اس شہود کو تنزل خیال کر کے اس جہاں میں رویت بصری کے بھی قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم واجب الوجود جل سلطانہ کی ذات بیچون کو دیکھتے ہیں اور یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ دولت جو ہمارے پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام کو شب معراج میں ایک دفعہ حاصل ہوئی تھی ہم کو ہر روز میسر ہے اور وہ نور جو ان کے دیکھنے میں آتا ہے اس کو صبح کی سفیدی سے تشبیہ دیتے ہیں اور اس نور کو مرتبہ بے کیفی خیال کرتے ہیں، اور مراتب عروج کی نہایت اس نور کے ظہور تک تصور کرتے ہیں۔ اللہ تعالی سبحانہ اس

بات سے جو ظالم کہتے ہیں، بہت بڑا ہے۔ اور نیز حضرت حق جل شانہ کے ساتھ اپنا کلام و مکالمہ کرنا ثابت کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ حق تعالی نے ایسا ایسا فرمایا ہے، کبھی اپنے دشمنوں کے حق میں حضرت عز سبحانہ کی طرف سے کئی کئی قسم کی وعیدیں یعنی بہت سے عذاب نقل کرتے ہیں، اور کبھی اپنے دوستوں کو بشارتیں دیتے ہیں۔ اور ان میں سے بعض اس طرح کہتے ہیں کہ رات کے بقیہ تہائی یا چوتھائی حصہ سے لیکر صبح کی نماز تک میں حق سبحانہ وتعالی کے ساتھ کلام کرتا رہا اور ہر طرح کی باتیں پوچھتا رہا اور جواب لیتا رہا، ان لوگوں نے اپنے آپ میں تکبر کیا اور بڑی سرکشی کی۔ ان لوگوں کی باتوں سے مفہوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ اس نور مرئی کو عین جل سلطانہ سمجھتے ہیں اور اس نور کو حق تعالی کی ذات تصور کرتے ہیں، نہ یہ کہ اس کے ظہورات میں سے کوئی ظہور یا اس کے ظلال میں سے کوئی ظل جانتے ہوں۔ اس میں کوئی کچھ شک نہیں کہ اس نور کو حق جل سلطانہ کی ذات کہنا محض افتراء، صرف الحاد اور خالص زندقہ ہے۔ یہ اللہ تعالی جل شانہ کا نہایت ہی حلم و تحمل ہے کہ اس قسم کے مفتریوں کے لیے طرح طرح کے عذابوں میں جلدی نہیں کرتا اور ان کی بیخ کنی نہیں فرماتا۔"[1]

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

"اور حضرت موسی علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام کی قوم صرف رویت کی طلب ہی کی وجہ سے ہلاک ہوگئی اور حضرت موسی علی نبینا وعلیہ الصلاۃ والسلام نے طلب رویت کے بعد لن ترانی کا زخم کھایا اور بیہوش ہو کر گر پڑے اور اس طلب سے تائب ہوئے۔ اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و علی آلہ وسلم کو محبوب رب العالمین اور تمام اولین و آخرین موجودات میں سے بہترین ہیں باوجودیکہ معراج بدنی سے مشرف ہوئے اور عرش و کرسی سے گذر کر مکان

[1] مکتوبات حضرت مجدد ألف ثانی، دفتر دوم، مکتوب نمبر 1، مترجم مولانا سید زوار حسین شاہ، مکتبہ مجددیہ، کراچی، ص 315-316

وزمان سے بھی بالا چلے گئے، باوجود قرآنی اشاروں کے آنحضرت علیہ الصلاۃ والسلام کی رویت میں بھی علماء کا اختلاف ہے اور اکثر علماء آنحضرت علیہ و علی آلہ الصلاۃ والسلام کی عدم رویت کے قائل ہیں، چنانچہ حضرت امام غزالی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: صحیح یہی ہے کہ آنحضرت علیہ و علی آلہ الصلاۃ والسلام نے معراج کی شب میں اپنے رب کو نہیں دیکھا۔ لیکن یہ بے سروسامان اپنے خیال باطل میں ہر روز خدائے جل شانہ کو دیکھتے ہیں جبکہ حال یہ ہے کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالی علیہ و علی آلہ وسلم کے ایک مرتبہ دیدار میں بھی علماء قیل و قال کر رہے ہیں۔ اللہ تعالی ان کو خوار کرے، کس قدر جاہل ہیں۔"[1]

ماہرین نفسیات کی ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ اس قسم کے تجربات میں سالک، حالت مراقبہ میں اپنے ہونے کی شعوری کیفیت عارضی طور کھو دیتا ہے۔ اور یہی ہماری رائے میں اس کیفیت کا صحیح تجزیہ ہے۔ صوفیاء میں عام طور اس کیفیت کو فناء (annihilation) اور سائیکالوجی میں نفسیاتی موت (psychic death) کہہ دیتے ہیں۔ اس بارے جدید علم نفسیات میں شعور کی تبدیل شدہ کیفیات اور حالتوں میں سے خود د گر بینی (depersonalization)، وجد (religious ecstacy)، تجربہ بیرون جسم (out of body experience) اور تخلیہ روح (astral projection) کا مطالعہ مفید رہے گا۔

مراقبہ اور ارتکاز ذہنی

مراقبہ میں ایک چیز اہم ہے اور وہ حواس ظاہری (five senses) کے تعطل کی مشق کرنا کہ اس سے مقصود یہ ہو کہ عبادت میں توجہ اللہ عزوجل ہی کی طرف مبذول رہے۔ باقی رہے اس کے اوقات یا ہیئت تو یہ درست نہیں ہے۔ مثال کے طور ہیئت کے بارے صوفیاء کا کہنا ہے کہ مراقبہ میں آنکھیں بند ہونی چاہییں۔ ہماری رائے میں اس کا تعلق مراقبے سے نہیں ہونا چاہیے کیونکہ حواس کا تعطل کھلی آنکھوں بھی حاصل ہو جاتا

[1] ایضاً: ص 316

ہے۔ بعض لوگوں کی سوتے میں آنکھیں کھلی ہوتی ہیں۔ اسی طرح اگر ہم سڑک پر سفر کر رہے ہوں تو راستے میں سینکڑوں چیزیں دیکھتے ہیں اور جن چیزوں میں ہماری دلچسپی نہیں ہوتی، انہیں دیکھنا یا نہ دیکھنا ہمارے لیے برابر ہوتا ہے۔ پس اصل مقصود توجہ کو مرکوز (concentrate) کرنا ہے نہ کہ آنکھیں بند کرنا۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ، صحابہ و تابعین یا ائمہ و محدثین ایسے مراقبہ نہیں کرتے تھے جیسا کہ معاصر صوفیاء کرتے ہیں لہذا تزکیہ نفس کے لیے اس طرح کے مراقبے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ سلف صالحین کا تزکیہ اس قسم کی مشقوں کے بغیر ہوا ہے۔ البتہ صوفیاء کی بعض باتیں قابل توجہ معلوم ہوتی ہیں جیسا کہ ان کا یہ کہنا ہے کہ اللہ کی طرف کامل توجہ کے لیے حواس ظاہری کو معطل کر دینے کی مشق کرنا۔ اس بنیاد کو سامنے رکھتے ہوئے اگر ہم مراقبے کی بہترین صورت متعین کرنا چاہیں تو وہ تہجد کی نماز ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کو سورۃ المزمل میں تہجد کی نماز پڑھنے کا حکم دینے کے بعد فرمایا گیا:

﴿إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْئًا وَأَقْوَمُ قِيلًا ۝7 إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا ۝8 وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ إِلَيْهِ تَبْتِيلًا﴾ [المزمل: 9]

”یقیناً رات کا قیام نفس کو کچلنے میں سب سے زیادہ معاون اور بات کہنے میں سب سے زیادہ سیدھا ہے۔ بے شک دن میں آپ کے بہت سے کام ہیں۔ [پس رات کے قیام میں] آپ اپنے رب کے نام کا ذکر کریں اور سب کچھ سے کٹ کر صرف اسی کے ہو رہیں۔“

امام ابن قیم رحمہ اللہ ”تبتل“ کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

قُلْتُ: التَّبَتُّلُ يَجْمَعُ أَمْرَيْنِ اتِّصَالًا وَانْفِصَالًا. لَا يَصِحُّ إِلَّا بِهِمَا. فَالِانْفِصَالُ: انْقِطَاعُ قَلْبِهِ عَنْ حُظُوظِ النَّفْسِ الْمُزَاحِمَةِ لِمُرَادِ الرَّبِّ مِنْهُ. وَعَنِ الْتِفَاتِ قَلْبِهِ إِلَى مَا سِوَى اللَّهِ، خَوْفًا مِنْهُ، أَوْ رَغْبَةً فِيهِ، أَوْ مُبَالَاةً بِهِ، أَوْ فِكْرًا فِيهِ، بِحَيْثُ يُشْغَلُ قَلْبُهُ عَنِ اللَّهِ. وَالِاتِّصَالُ: لَا يَصِحُّ إِلَّا بَعْدَ هَذَا الِانْفِصَالِ. وَهُوَ اتِّصَالُ الْقَلْبِ بِاللَّهِ، وَإِقْبَالُهُ

عَلَيْهِ، وَإِقَامَةُ وَجْهِهِ لَهُ، حُبًّا وَخَوْفًا وَرَجَاءً، وَإِنَابَةً وَتَوَكُّلًا.[1]

"میری رائے میں تبتل میں دو چیزیں شامل ہیں۔ ان میں سے ایک انقطاع (detachment) ہے اور دوسرا اتصال (attachment)۔ ان دونوں کے بغیر تبتل ممکن نہیں ہے۔ انقطاع سے مراد یہ ہے کہ سالک اور عابد کا دل اپنے رب کی مراد تک پہنچنے میں حائل ہونے والے نفس سے اس طرح کٹ جائے کہ اس کا دل اللہ کے ماسوا کی طرف مشغول نہ ہو اور اللہ کے علاوہ کی طرف اس کے دل کی توجہ بھی ختم ہو جائے، چاہے اللہ کے غیر میں یہ توجہ کسی خوف کے سبب سے ہو یا رغبت کی قبیل سے ہو، پرواہ کی غرض سے ہو یا غور فکر کی وجہ سے ہو۔ اور اتصال اُسی وقت ممکن ہے جبکہ پہلے انقطاع ہو۔ اور اتصال سے مراد دل کو اللہ کی طرف لگانا، اپنے دل اور چہرے کو اس کی طرف متوجہ کرنا، اس کی محبت، اس کے خوف، اس سے امید، اس کی طرف رجوع اور اس پر توکل کرتے ہوئے۔"

پس ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "تبتل" سے مراد دنیا وما فیہا سے ایسا کامل انقطاع (total detachment) ہے جو اللہ کی طرف توجہ کامل (complete devotion) کا سبب بنے گا۔ یہ وہی بات ہے جسے نبی کریم ﷺ نے «أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ، فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ» کے الفاظ میں بیان کیا ہے یعنی اللہ کی ایسے عبادت کرو گویا کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، یا کم از کم ایسے کہ اللہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔[2]

مراقبہ کا مقام نماز ہے۔ اور نماز میں بھی خاص طور تہجد کی نماز جبکہ مکمل خاموشی ہوتی ہے کیونکہ فرض نمازوں میں کامل توجہ کی کیفیت حاصل ہونا مشکل ہے۔ فرض نمازوں میں اللہ کے رسول ﷺ بچے کے رونے کی آواز سن کر نماز ہلکی کر دیتے تھے۔ مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ فرائض میں

---

[1] مدارج السالكين: 32/2

[2] صحيح البخاري، كِتَابُ الإِيمَانِ بَابُ سُؤَالِ جِبْرِيلَ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَنِ الإِيمَانِ، 19/1

استغراق مطلوب نہیں ہے۔[1]

مراقبے کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ انسان تہجد کی نماز میں قرآن مجید کی تلاوت کرے اور تلاوت، قیام، رکوع، سجود اور اِن میں پڑھی جانے والی تسبیحات میں تبتل اور انقطاع یعنی دنیا اور مافیہا سے کٹ جانے کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کرے۔ اگر انقطاع حاصل نہ ہو رہی ہو تو آنکھیں بھی بند کی جاسکتی ہیں جیسا کہ امام ابن قیم رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ نماز میں خشوع وخضوع کے حصول لیے آنکھیں بند کرنا جائز ہے[2] کیونکہ خشوع وخضوع کا حصول نماز کے فرائض میں شامل ہے لیکن مستحب اور پسندیدہ امر یہی ہے کہ نماز میں آنکھیں کھولے رکھے۔ توجہ الی اللہ کا پہلا قدم دنیا اور مافیہا سے انقطاع ہے۔ دنیا و مافیہا سے انقطاع ہو گا تو توجہ کے حصول کا آغاز ہو گا۔ انقطاع کے بعد توجہ میں بہتری کے لیے قرآن مجید کی آیات اور تسبیحات کے معنی و مفہوم پر غور کرے۔ اگر انقطاع نہیں ہو گا تو نماز میں توجہ بھی قائم نہ ہو گی۔

ایک شبہ یہ ہو سکتا ہے کہ مراقبے میں تو کسی ایک تصور پر غور کیا جاتا ہے تاکہ ارتکاز ذہنی (concentration) حاصل ہو تو قرآن مجید کی آیات کے معانی و مفاہیم میں غور کرنے کی صورت میں سالک متنوع مضامین پر غور کرے گا تو مرکزیت کیسے قائم ہو گی؟ ذہن تو اِدھر اُدھر منتقل ہوتا رہے گا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید اللہ کی صفت ہے۔ اور صفت الٰہی ہونے کے اعتبار سے وہ ایک ہے، اگرچہ مضامین کے اعتبار سے تنوع ہے۔ قرآن مجید میں غور و فکر ایک اعتبار سے صفت کلام میں غور کرنا ہے۔

اس دنیا میں اللہ کی ذات کے تعارف کا سب سے بڑا ذریعہ اس کی صفات ہی ہیں کہ جسے ہم توحید اسماء وصفات کا نام دیتے ہیں اور اس کے قرب کا ذریعہ بھی اس کی صفات ہی ہیں۔ اور ان جمیع صفات میں اللہ اور انسان کے مابین تعلق قائم کرنے کے لیے جو اہم ترین صفت ہے، وہ صفت کلام ہے یعنی قرآن مجید۔ پس تہجد کی نماز میں لمبے قیام کے

---

[1] شریعت وطریقت: ص 314

[2] زاد المعاد: 285/1

ساتھ قرآن مجید کی آیات میں غور و فکر ہی مراقبہ کی بہترین صورت ہے۔

مشارطہ، مراقبہ اور محاسبہ

مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے مراقبہ نماز کا اہتمام سے ذکر کیا ہے۔ انہوں نے مراقبہ کے ساتھ مشارطہ اور محاسبہ دو اور اصطلاحات بھی نقل کی ہیں۔ ان سے پہلے علامہ ابن جوزی رحمہ اللہ نے بھی یہ اصطلاحات بیان کی ہیں۔[1]

مشارطہ، شرط سے باب مفاعلہ ہے۔ صبح اٹھ کر اپنے نفس کو یہ تلقین کرے کہ آج کے دن میں یہ خیر کا کام کرنا ہے اور اس شر سے بچنا ہے تو یہ مشارطہ ہے۔ اور مراقبہ سے مراد یہ ہے کہ اپنے نفس کو کی گئی اس تلقین کی دن بھر نگہداشت اور نگرانی کرے۔ محاسبہ یہ ہے کہ رات کو یہ معلوم کرنے کے لیے بیٹھے کہ جس خیر کے حصول اور شر سے اجتناب کے مقصد سے صبح مشارطہ کیا تھا، وہ مقصد حاصل ہوا یا نہیں۔[2] حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے صوفیاء کے مراقبے کو سنت کے قریب کر دیا ہے۔ مراقبے کے اس تصور میں اختلاف نہیں ہے۔

اندر کا سکون

ایک دوست نے مذکورہ بالا تحریر پر سوال کیا کہ اگر جم جوائن کرنا جائز ہے تو مراقبہ کیوں نہیں ہو سکتا۔ اس کے جواب میں ہمیں یہی عرض کرنا ہے کہ فریقین عموماً ایک دوسرے کی تحریر غور سے پڑھتے نہیں اور سرسری طور نظر ڈال کر ایسے اعتراض وارد کر دیتے ہیں، جو بنتے نہیں ہیں۔ ہمیں آپ کے مراقبہ کرنے پر کوئی اعتراض نہیں ہے، روزانہ کریں، صبح و شام کریں۔

ہم بار بار یہ نکتہ پیش کر رہے ہیں کہ ایک ذہن ہے کہ مراقبہ کو ذہنی سکون کے لیے اختیار کیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اور دوسرا ذہن ہے کہ مراقبہ تقرب الی اللہ کے

---

[1] ابن جوزی، عبد الرحمن علامہ، منہاج القاصدین، تلخیص ابن قدامہ مقدسی احمد بن محمد بن عبد الرحمن، مترجم محمد سلیمان کیلانی، ادارہ معارف اسلامی، لاہور، 1985، ص 523-524

[2] شریعت وطریقت: ص 278

ذرائع میں سے ہے، تو بہت حرج ہے۔ اگر آپ یوگا اپنی صحت کے لیے کریں گے تو کوئی حرج نہیں لیکن اگر آپ یہ کہیں گے کہ میں یوگا اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے کر رہا ہوں، تو بہت حرج ہے۔ اسی طرح آپ اپنی جسمانی صحت کے لیے جم جوائن کریں تو کوئی حرج نہیں لیکن آپ اس لیے جم جوائن کریں کہ یہ تقرب الی اللہ کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے، تو بہت حرج ہے۔

تقرب الی اللہ کے ذرائع ہمارے دین نے طے کر دیے ہیں، اور وہ ایمان، نماز، قرآن مجید، سجدہ، دعا، صدقہ، صلہ رحمی اور اخلاق وغیرہ ہیں۔ ان کے علاوہ کسی ذریعے کو اللہ کا تقرب حاصل کرنے کا ذریعہ بنانا درست نہیں ہے۔ اور اگر آپ کو باطنی اطمینان اور ذہنی سکون کے لیے مراقبہ کرنا ہی ہے، تو پھر صوفیاء سے زیادہ بہتر ہندو جوگی اور بدھ بھکشو ہیں کہ جن کا یہ خاص میدان ہے۔ اگر آپ مراقبے کے تصور پر تصوف، ہندومت اور بدھ مت کا تقابلی مطالعہ کریں تو احساس پیدا ہو گا کہ ہمارے صوفیاء اس سائنس میں غیر مسلموں سے کافی پیچھے ہیں۔ مثال کے طور آپ کسی سلسلے کے معاصر پیر طریقت کے ساتھ مراقبہ میں بیٹھ جائیں اور اس کے بعد کسی ہندو جوگی کی باتیں سنیں، اور جوگی تو خیر بہت آگے ہو گا، آپ ایک ہندو نوجوان سندیپ مہیش واری کے بیانات ہی سن لیں جو کہ آپ کو یوٹیوب پر مل جائیں گے تو آپ کو اندازہ ہو گا، کہ مراقبے کی لذات، کیفیات اور ثمرات جو ان کے ہاں ہیں، وہ یہاں کہاں؟[1]

لیکن حقیقت یہ ہے کہ تہجد کی نماز میں قرآن مجید کی تلاوت اور لمبے سجود میں لمبی دعاؤں میں جو ایمانی کیفیات اور اثرات ہے، وہ مراقبہ میں کہاں؟ اور اس پر قسم کھائی جا سکتی ہے کہ ہندومت اور بدھ مت کے طریقوں سے وہی متاثر ہو گا جو اسلام کے

---

[1] آجکل بابا رام دیو اور سری سری راوی شنکر مراقبہ کروانے کےحوالے سے کافی معروف ہندو گرو ہیں۔ دونوں کے ایسے پیروکار لاکھوں میں ہیں کہ جنہیں مراقبہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جمعیت علمائے ہند کے اترپردیش میں 2009ء کے سالانہ اجلاس میں بابا رام دیو کی مراقبہ، پاس انفاس اور لطائف پر تقریر سننے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں یہ طریقے ہندو مت سے آئے ہیں۔ خیر یہ دونوں گرو تو پھر میڈیا کے لوگ ہیں جبکہ جنگلوں، پہاڑوں اور دریاؤں کے کنارے سنیاسی اور بھکشو تو اس کے علاوہ ہیں کہ جن کے عجیب وغریب مکاشفات ہیں۔

طریقوں سے محروم رہا۔ ایک دوست نے بائبل پڑھی تو بہت متاثر ہوئے اور کہنے لگے کا بائبل کا کورس کرنے کا ارادہ ہے، آپ کا کیا مشورہ ہے؟ میں نے کہا کہ قرآن مجید پڑھا ہے؟ کہنے لگے کہ نہیں! میں نے کہا کہ پہلے قرآن مجید اچھی طرح پڑھ لیں۔ اور اگر آپ نے قرآن مجید پڑھا ہی نہیں تو آپ کو بائبل ہی سب کچھ معلوم ہو گی۔ تو ہندو جوگیوں اور بدھ بھکشوؤں کا تو یہ عذر ہے کہ وہ اصلاح نفس کے اسلام کے طریقوں سے واقف نہیں ہیں لیکن مسلمان تو واقف ہیں اور ان کو پریکٹس میں نہیں لاتے اور دوسرے طریقوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔

اور اگر آپ کو زندگی میں ایک بار بھی تہجد میں اللہ سبحانہ وتعالی کو مکمل قرآن مجید سنانے کا موقع نہیں ملا تو آپ مراقبے کی کیفیات کو بہت بڑا جانیں گے کہ جس نے دیسی گھی کی لذت نہ لی ہو تو اسے توڈالڈا ہی میں سب ذائقے معلوم ہوں گے۔ اللہ کے رسول ﷺ یہ کہیں کہ بندہ سجدے کی حالت میں جتنا اپنے رب کے قریب ہوتا ہے، اتنا کسی اور حالت میں نہیں ہوتا اور ہم مراقبے کی حالت میں تقرب کی منازل طے کر رہے ہوں تو اس سے بڑی محرومی اور کیا ہو گی؟ روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «أَقْرَبُ مَا يَكُونُ الْعَبْدُ مِنْ رَبِّهِ، وَهُوَ سَاجِدٌ، فَأَكْثِرُوا الدُّعَاءَ»[1]

"حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ بندہ اپنے رب کے سب سے زیادہ قریب سجدے کی حالت میں ہوتا ہے۔ پس اس حالت میں بہت زیادہ دعائیں کیا کرو۔"

اور اللہ کے رسول ﷺ نے تقرب الی اللہ کا سب سے بڑا ذریعہ فرائض پر عمل کو قرار دیا ہے۔ اور فرائض کے بعد اللہ کا قرب حاصل کرنے کا دوسرا ذریعہ نوافل ہیں۔ اور تیسرا کوئی ذریعہ ہمارے دین نے بیان نہیں کیا لہذا مراقبہ، لطائف، پاس انفاس، تصور شیخ، سماع اور وجد "بزرگ" بننے کے ذرائع تو ہو سکتے ہیں لیکن "بندہ" بننے کے نہیں۔ جسے بزرگی چاہیے، وہ تصوف کے ذرائع پر عمل کر لے، بزرگ بن جائے گا۔ اور جسے

[1] صحیح مسلم، كِتَابُ الصَّلَاةِ، بَابُ مَا يُقَالُ فِي الرُّكُوعِ وَالسُّجُودِ، 350/1

بندگی چاہیے، وہ دین کے ذرائع پر عمل کر لے، اللہ عزوجل "عباد الرحمن" میں شامل فرمائیں گے، ان شاءاللہ!۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «إِنَّ اللَّهَ قَالَ: مَنْ عَادَى لِي وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالحَرْبِ، وَمَا تَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدِي بِشَيْءٍ أَحَبَّ إِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ، وَمَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّى أُحِبَّهُ، فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ: كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ، وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ، وَيَدَهُ الَّتِي يَبْطِشُ بِهَا، وَرِجْلَهُ الَّتِي يَمْشِي بِهَا، وَإِنْ سَأَلَنِي لَأُعْطِيَنَّهُ، وَلَئِنِ اسْتَعَاذَنِي لَأُعِيذَنَّهُ، وَمَا تَرَدَّدْتُ عَنْ شَيْءٍ أَنَا فَاعِلُهُ تَرَدُّدِي عَنْ نَفْسِ المُؤْمِنِ، يَكْرَهُ المَوْتَ وَأَنَا أَكْرَهُ مَسَاءَتَهُ»[1]

"حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے میرے کسی ولی سے دشمنی کی تو میرا اس کے خلاف اعلان جنگ ہے۔ اور میرے بندے کے پاس، تقرب کے اُن ذرائع میں سے کہ جو مجھے محبوب ہیں، فرائض سے بڑھ کر کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے کہ جس وہ میرا تقرب حاصل کر سکے۔ اور میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا تقرب حاصل کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ میرا محبوب بن جاتا ہے۔ اور جب وہ میرا محبوب بن جاتا ہے تو میں اس کی سماعت بن جاتا ہوں کہ جس سے وہ سنتا ہے۔ اور میں اس کی بصارت بن جاتا ہوں کہ جس سے وہ دیکھتا ہے۔ اور میں اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں کہ جس سے وہ پکڑتا ہے۔ اور میں اس کے پاؤں بن جاتا ہوں کہ جس سے وہ چلتا ہے۔ اور اگر مجھ سے سوال کرے تو ضرور اس کا سوال پورا کرتا ہوں۔ اور مجھ سے پناہ مانگے تو ضرور اس کو پناہ دیتا ہوں۔ مجھے اپنے کسی کام میں تردد نہیں ہوتا لیکن مومن کی جان قبض کرنے میں تردد ہوتا ہے کہ مومن موت کو ناپسند جانتا ہے اور مجھے مومن کی ناپسندیگی گراں گزرتی ہے۔"

اس حدیث میں اولیاء اللہ انہی کو قرار دیا گیا ہے جو فرائض اور نوافل کے راستے اللہ کا

[1] صحيح البخاري، كِتَابُ الرِّقَاقِ، بَابُ التَّوَاضُعِ، 105/8

تقرب حاصل کرتے ہیں۔ اوران کی ایک علامت ان کا مستجاب الدعوات ہونا اور دوسری موت کو ناپسند جاننا ہے۔ اگر موت پسند ہو تو پھر بزرگی کے راستے پر ہے، بندگی پر نہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کے الفاظ میں غور کیا جائے تو بہت بلیغ ہیں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَنْ أَحَبَّ لِقَاءَ اللهِ، أَحَبَّ اللهُ لِقَاءَهُ، وَمَنْ كَرِهَ لِقَاءَ اللهِ، كَرِهَ اللهُ لِقَاءَهُ» فَقُلْتُ: يَا نَبِيَّ اللهِ أَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ؟ فَكُلُّنَا نَكْرَهُ الْمَوْتَ، فَقَالَ: «لَيْسَ كَذَلِكِ، وَلَكِنَّ الْمُؤْمِنَ إِذَا بُشِّرَ بِرَحْمَةِ اللهِ وَرِضْوَانِهِ وَجَنَّتِهِ، أَحَبَّ لِقَاءَ اللهِ، فَأَحَبَّ اللهُ لِقَاءَهُ، وَإِنَّ الْكَافِرَ إِذَا بُشِّرَ بِعَذَابِ اللهِ وَسَخَطِهِ، كَرِهَ لِقَاءَ اللهِ، وَكَرِهَ اللهُ لِقَاءَهُ»[1]

”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ جسے اللہ سے ملنا محبوب ہو تو اللہ کو بھی اس سے ملنا پسند ہے۔ اور جسے اللہ سے ملاقات ناپسند ہو تو اللہ کو بھی اس سے ملاقات ناپسند ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ میں نے کہا: اے نبی ﷺ! کیا اللہ سے ملاقات کو ناپسند جاننے سے مراد موت کو ناپسند جاننا ہے تو ہم تو موت کو ناپسند جانتے ہیں۔ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ ایسا نہیں ہے بلکہ بندہ مومن کو آخر وقت میں جب اللہ کی رحمت، اس کی رضا اور جنت کی بشارت دی جاتی ہے تو اس کا اللہ سے ملاقات کا شوق بڑھ جاتا ہے اور اللہ بھی اس کی ملاقات کو پسند کرتے ہیں۔ اور کافر کو جب اللہ کے عذاب اور غضب کی بشارت دی جاتی ہے تو وہ اللہ سے ملاقات کو ناپسند جانتا ہے اور اللہ عزوجل بھی اس سے ملاقات کو پسند نہیں کرتے ہیں۔“

تزکیہ نفس اور لطائف

صوفیاء کے نزدیک اصلاح نفس میں لطائف کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ صوفیاء کی اصطلاح میں لطائف سے مراد روح انسانی کے اعضائے رئیسہ (major parts)

[1] صحیح مسلم، کتاب الذِّكْرِ وَالدُّعَاءِ وَالتَّوْبَةِ، بَابُ مَنْ أَحَبَّ لِقَاءَ اللهِ أَحَبَّ اللهُ لِقَاءَهُ، 2065/4

ہیں۔اور آسان الفاظ میں ان کے نزدیک انسانی بدن میں کچھ مقامات ایسے ہیں کہ جو انوار کا محل اور مقام ہیں اور انہیں اذکار کے ذریعے روشن کیا جاتا ہے۔ نقشبندیہ میں عموماً چھ لطائف معروف ہیں۔ قلب، روح، سر، خفی، اخفی اور نفس۔[1] بعض نے سلطان الاذکار کو بھی شامل کرتے ہوئے سات بیان کیے ہیں۔[2] بعض نے ان کی تعداد پانچ یا دس بھی بیان کی ہے جبکہ بعضوں کے نزدیک ان کی تعداد تیس سے اوپر ہے۔

نقشبندیہ میں لطائف ستہ میں سے ایک کا مقام دل، دوسرا دل سے کچھ اوپر، تیسرا دل کے سامنے دائیں جانب، چوتھا دل کے سامنے سے کچھ اوپر، اور پانچواں ان دونوں کے اوپر درمیان میں اور چھٹا پیشانی میں ہے۔ درج بالا تصویر نقشبندیہ کے نزدیک انسانی بدن میں لطائف ستہ کے مقامات کو بیان کر رہی ہے۔ چشتیہ نے بھی ان کی تعداد چھ ہی بیان کی ہے لیکن تین لطائف کے مقامات میں اختلاف کیا ہے۔انہوں نے معدے، ناف اور دماغ کو بھی اس میں شامل کیا ہے۔



کیا اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی لطائف پر توجہ کروائی یا ان کے لطائف روشن کروائے؟ اس سوال کا جواب نفی میں ہے۔ صرف صحابہ ہی نہیں بلکہ تابعین، تبع تابعین اور فقہائے محدثین کے زمانے میں بھی لطائف کا کوئی تصور موجود نہیں تھا بلکہ صوفیاء میں معروف رائے کے مطابق حضرت بہاؤالدین نقشبند رحمہ اللہ متوفی 791ھ سے پہلے تصوف کی تاریخ میں لطائف کا تصور موجود نہیں تھا۔

صوفیاء کے اس تصورِ لطائف میں ایک چیز قابل توجہ ہے اور وہ لطیفہ قلب ہے۔ بلاشبہ اللہ کے رسول ﷺ کی بیسیوں روایات ایسی ہیں جو اس مقام یا عضو کی اصلاح اور

[1] ذوقی، سید محمد شاہ، سر دلبراں، الفیصل ناشران، لاہور، 2005، ص 356

[2] محمد اکرم اعوان، لطائف اور تزکیہ نفس، دار العرفان، چکوال، ص 2

اس پر توجہ کے بارے میں مروی ہیں جیسا کہ ایک روایت میں اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے کہ جب دل صالح ہو جاتا ہے تو انسان کا سارا جسم صالح ہو جاتا ہے اور اگر اس میں فساد ہو جائے تو سارا جسم فساد والا ہو جاتا ہے۔[1] لہذا قلب کو توجہ کا مرکز بنانا اور اسے اللہ کی طرف متوجہ رکھنے کی کوشش کرنا، یہ بات درست معلوم ہوتی ہے۔

لطائف کو روشن کرنے کا ایک طریقہ تو صوفیاء نے متعارف کروایا کہ جس سے ہمیں اتفاق نہیں ہے کہ جس میں مراقبہ، ذکر جہری، پاس انفاس، ذکر خفی اور ضرب قلب جیسے ذرائع سے لطائف روشن کرنے کی کوشش کی جاتی ہے اور یہ سب ذرائع اس معنی میں غیر مسنون ہیں کہ خیر القرون میں ان پر عمل نہیں تھا، لیکن اس کے برعکس ان سات لطائف یعنی قلب، ذہن، زبان، آنکھیں، کان، معدہ اور ناف کو ہم فرائض کی پابندی اور نوافل پر دوام کی صورت میں روشن کرنے کی بات کریں تو یہ مسنون ذریعہ ہے۔ لطیفہ قلب کی روشنی تو یاد الہی میں ہے اور لطیفہ زبان کے روشن کرنے سے مراد آفات سے اس کی حفاظت اور ذکر الہی سے رطب اللسان رکھنا ہے۔ لطیفہ دماغ اس وقت روشن ہو گا جبکہ خالص توحید کا حامل ہو اور ہر قسم کے شرکیہ اور کفریہ افکار و نظریات سے پاک ہو۔ لطیفہ سماعت اور بصارت کا روشن ہونا بھی ان کے شریعت کے مطابق استعمال کے بقدر ہے۔ لطیفہ معدہ کی روشنی حرام سے اجتناب اور لطیفہ ناف کی روشنی ہر قسم کی شہوات سے اجتناب سے حاصل ہوتی ہے۔ من جملہ اگر انسان شریعت اسلامیہ پر عمل کرے اور دل کو اللہ کی طرف متوجہ رکھنے کے لیے، زبان و دماغ کے ساتھ، دوام ذکر و فکر الہی کی عادت ڈالے تو اس کے جمیع لطائف روشن ہو جائیں گے۔

شیخ الکل فی الکل علامہ نذیر حسین دہلوی رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ صلوات خمسہ یعنی پانچ نمازیں ہی لطائف خمسہ ہیں اور قرآن مجید سلطان الاذکار ہے۔ بعض صوفیاء چونکہ سلطان الاذکار کو الگ سے لطیفہ شمار نہیں کرتے لہذا شیخ الکل نے بھی لطائف کی تعداد پانچ بیان

[1] «أَلاَ وَإِنَّ فِي الجَسَدِ مُضْغَةً: إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الجَسَدُ كُلُّهُ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الجَسَدُ كُلُّهُ، أَلاَ وَهِيَ القَلْبُ» [صحيح البخاري، كِتَابُ الإِيمَانِ، بَابُ فَضْلِ مَنِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ، 20/1]

کرتے ہوئے چھٹے لطیفے یا سلطان الاذکار سے مراد قرآن مجید لی ہے۔ یہ لطائف کی سلفی تعبیر ہے یعنی جس نے اپنے پانچ لطائف روشن کرنے ہوں وہ اپنی نمازوں کو بہتر سے بہتر بنائے یہاں تک کہ انہیں درجہ احسان تک لے آئے اور جس نے سلطان الاذکار کو روشن کرنا ہو تو وہ قرآن مجید کی تلاوت کو بہتر کرے یہاں تک کہ حدیث کے الفاظ کے مطابق "أهل الله" میں اور "أصحاب القرآن" میں شامل ہو جائے۔[1] نمازوں کے لطائف سے انسان کا باطن اس قدر روشن ہو گا کہ اس کا یہ نور قیامت والے دن بھی باقی رہے گا۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

عَنْ بُرَيْدَةَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: «بَشِّرِ الْمَشَّائِينَ فِي الظُّلَمِ إِلَى الْمَسَاجِدِ بِالنُّورِ التَّامِّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ»[2]

"حضرت بریدہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے نبی ﷺ نے فرمایا: جو لوگ اندھیروں میں کثرت سے مسجد کا رخ کرتے ہیں، انھیں قیامت والے دن میں مکمل نور کی خوشخبری دے دو۔"

حدیث کی روشنی میں لطائف آٹھ ہیں کہ جن میں چار انسانی جسم میں ہیں اور چار اس کے جسم سے باہر ہیں۔ اور یہ دو کاموں سے روشن ہوتے ہیں، ایک فجر کی نماز باجماعت ادا کرنے سے اور دوسرا ان کے روشن ہونے کی دعا مانگنے سے۔ اللہ کے رسول ﷺ فجر کی نماز کے لیے مسجد جاتے ہوئے یا فجر کی نماز میں یہ دعا مانگا کرتے تھے:

«اللَّهُمَّ اجْعَلْ فِي قَلْبِي نُورًا، وَاجْعَلْ فِي لِسَانِي نُورًا، وَاجْعَلْ فِي سَمْعِي نُورًا، وَاجْعَلْ فِي بَصَرِي نُورًا، وَاجْعَلْ خَلْفِي نُورًا، وَأَمَامِي نُورًا، وَاجْعَلْ مِنْ فَوْقِي نُورًا، وَمِنْ تَحْتِي نُورًا اللَّهُمَّ، وَأَعْظِمْ لِي نُورًا»[3]

"اے اللہ! میرے دل کو نور سے بھر دے اور میری زبان میں نور رکھ دے۔

---

[1] عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «إِنَّ لِلَّهِ أَهْلِينَ مِنَ النَّاسِ» قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ، مَنْ هُمْ؟ قَالَ: «هُمْ أَهْلُ الْقُرْآنِ، أَهْلُ اللَّهِ وَخَاصَّتُهُ» [سنن ابن ماجة، افتتاح الكتاب في الإيمان وفضائل الصحابة والعلم، بَابُ فَضْلِ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ، 78/1]

[2] سنن أبي داود، كِتَاب الصَّلَاةِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي الْمَشْيِ إِلَى الصَّلَاةِ فِي الظَّلَامِ، 154/1

[3] سنن أبي داود، أَبْوَابُ قِيَامِ اللَّيْلِ، بَابٌ فِي صَلَاةِ اللَّيْلِ، 44/2

اور میری سماعت میں نور فرمادے اور میری بصارت کو نور بنادے۔ اے اللہ! میرے آگے نور فرمادے، پیچھے نور فرمادے، اوپر نور فرمادے اور نیچے نور فرما دے۔ اے اللہ! میرے نور کو بڑھادے۔"

قوائے ثلاثہ

علماء کا کہنا ہے کہ اللہ عزوجل نے ہر انسان میں تین قوتیں رکھی ہیں: عقل کی قوت، غضب کی قوت اور شہوت کی قوت۔ ان تینوں قوتوں میں افراط و تفریط یعنی زیادتی اور کمی (extremes) ظلم ہے جبکہ اعتدال یعنی میانہ روی مطلوب ہے۔

عقل کی قوت ایسی قوت ہے کہ جس کے ذریعے انسان غور و فکر کرتا ہے۔ عقل کی قوت میں تفریط اور کمی یہ ہے کہ جہاں اسے استعمال کرنا چاہیے وہاں ہم اسے استعمال نہ کریں۔ اور اس سے کند ذہنی اور حماقت (stupidity) جنم لیتی ہے۔ اور عقل کی قوت میں افراط اور زیادتی یہ ہے کہ ہم اِس کا وہاں بھی استعمال کریں جہاں اس کا استعمال کرنا بے معنی اور لایعنی ہو اور اسے سوفسطائیت (sophistry) کہتے ہیں۔ اور اگر عقل کی قوت میں اعتدال ہو تو اسے حکمت (wisdom) کہتے ہیں جو کہ مطلوب ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَن يَشَاءُ وَمَن يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ﴾ [البقرة: 269]

"اللہ عزوجل جس کو چاہتے ہیں، حکمت عطا فرماتے ہیں۔ اور جسے حکمت جیسی نعمت دی گئی تو اُسے تو بہت زیادہ خیر دے دیا گیا۔ اور اِس بات سے صرف وہی نصیحت حاصل کرتے ہیں جو عقل والے ہیں۔"

غضب کی قوت میں اگر تفریط اور کمی ہو تو اسے بزدلی کہتے ہیں اور اگر افراط اور زیادتی ہو تو اسے رعونت کہتے ہیں اور اگر اعتدال ہو تو اسے شجاعت کہتے ہیں جو کہ مطلوب ہے۔ بس اگر کسی کو غصہ نہ آئے تو وہ بزدل ہے بلکہ بے غیرت ہے اور غصہ کا نہ آنا کوئی شریعت کا مطالبہ نہیں ہے۔ اور جسے بلاوجہ غصہ آئے اور ایسی جگہ غصہ کھائے جہاں غصہ نہیں کھانا چاہیے تھا تو یہ رعونت ہے۔ اور جو اللہ کے دین کے لیے غصہ کرتا ہے اور

اپنے نفس کے لیے غصہ پی جاتا ہے تو یہ اعتدال ہے اور اسی کا نام شجاعت ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے:

«وَاللَّهِ مَا انْتَقَمَ لِنَفْسِهِ فِي شَيْءٍ يُؤْتَى إِلَيْهِ قَطُّ، حَتَّى تُنْتَهَكَ حُرُمَاتُ اللَّهِ، فَيَنْتَقِمُ لِلَّهِ»[1]

"اللہ کی قسم! اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کے لیے کبھی بھی کسی سے انتقام نہیں لیا۔ البتہ اگر اللہ کی حدود میں سے کسی حد کی حرمت پامال کی جاتی تو آپ اللہ کے لیے انتقام لیتے تھے۔"

بعض اوقات انسان غصہ اپنے نفس کے لیے کر رہا ہوتا ہے لیکن نام دین کا لیتا ہے، یہ بھی غلط ہے بلکہ زیادہ خطرناک ہے۔ غضب کی قوت سے صرف غصہ نہیں پیدا ہوتا بلکہ بغض، نفرت، عداوت اور رعونت وغیرہ جیسے کئی قسم کے رذائل پیدا ہوتے ہیں۔

شہوت کی قوت میں اگر تفریط اور کمی ہو تو یہ سستی ہے بلکہ مردانگی کے خلاف ہے۔ اور اگر شہوت کی قوت میں افراط اور زیادتی ہو تو ہوس ہے اور اگر اس میں اعتدال ہو تو یہ عفت ہے اور یہی دین میں مطلوب ہے۔ یعنی ہمارا دین نہ تو ہم سے یہ چاہتا ہے کہ ہم اپنی شہوت کی قوت کو دبا دیں اور نہ یہ کہ اسے جڑ سے ہی ختم کر دیں۔ ان دونوں صورتوں کا نتیجہ نسل انسانی کا خاتمہ ہے جو کہ فطرت کے خلاف ہے۔ اسی طرح ہمارے دین کا یہ بھی تقاضا نہیں ہے کہ ہم اپنی شہوت کو بے لگام چھوڑ دیں کہ حلال و حرام کی پرواہ نہ رہے۔ اور اگر شہوت کی قوت کو حلال میں استعمال کیا جائے جیسا کہ نکاح وغیرہ میں اور حرام سے بچایا جائے تو اسے عفت کہتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَأَنكِحُوا الْأَيَامَىٰ مِنكُمْ وَالصَّالِحِينَ مِنْ عِبَادِكُمْ وَإِمَائِكُمْ إِن يَكُونُوا فُقَرَاءَ يُغْنِهِمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿32﴾ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِينَ لَا يَجِدُونَ نِكَاحًا حَتَّىٰ يُغْنِيَهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ﴾ [النور: 33]

"اور تم میں سے جو مرد اور عورتیں بغیر نکاح کے ہیں، ان کے نکاح کروا دو۔ اور

---

[1] صحيح البخاري، كتاب الحدود، بَابُ إِقَامَةِ الحُدُودِ وَالِانْتِقَامِ لِحُرُمَاتِ اللَّهِ، 160/8

اپنے غلاموں اور لونڈیوں میں سے نیکوکاروں کا بھی نکاح کروادو۔ اور اگر وہ غریب ہوں گے تو اللہ تعالی انہیں اپنے فضل سے مالدار کر دے گا۔ اور اللہ تعالی فراخی دینے والا اور جاننے والا ہے۔ اور جو لوگ نکاح کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے تو انہیں چاہیے کہ وہ عفت اختیار کریں یہاں تک کہ اللہ عزوجل انہیں اپنے فضل سے غنی کر دے۔"

شہوت کی قوت سے بھی صرف شہوت ہی پیدا نہیں ہوتی بلکہ لالچ، حرص، طمع اور ہوس وغیرہ جیسے کئی قسم کے رذائل پیدا ہوتے ہیں۔ پس اسلام کا مقصود اُن قوتوں کا خاتمہ نہیں ہے کہ جن کی افراط و تفریط سے نفس میں رذائل پیدا ہوتے ہیں بلکہ ان قوتوں کو قابو کرنا اور اعتدال کے ساتھ ان کا استعمال ہمارے دین کی تعلیم ہے۔ جسم انسانی میں ان تین قوتوں اور جبلتوں کی مثال تین جنریٹروں (generators) کی سی ہے۔ اگر تو تزکیہ نفس کے عمل میں ان تین جبلتوں (inborn characters) کو کمزور کرنے کی کوشش کی جائے گی تو اس سے تفریط پیدا ہو گی جو اسلام میں مطلوب نہیں ہے۔ اور دوسری صورت لاپرواہی اور غفلت سے ان جبلتوں کو قوی کرنا یعنی افراط ہے اور یہ بھی مطلوب نہیں ہے۔ پس اخلاق حسنہ ہوں یا رذائل (vices) دونوں انہی جبلتوں اور قوتوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر یہ جبلتیں یعنی عقل، غضب اور شہوت اعتدال میں ہوں تو اخلاق حسنہ پیدا ہوتے ہیں اور اگر یہ افراط و تفریط میں ہوں تو رذائل پیدا ہوتے ہیں۔ پس یہ قوتیں اخلاق اور رذائل کی جنریٹر ہیں لہذا ان کی تربیت ضروری ہے اور ان کی تربیت کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ اعتدال میں رہیں۔ واللہ اعلم

ایک اور بات یہ بھی ذہن میں آتی ہے کہ ہمیں وہ اسباب بھی اختیار نہیں کرنے چاہییں جو ان جبلتوں میں افراط و تفریط کا باعث بنیں۔ مثلاً ضرورت سے کم کھانا انسان میں شہوت کی جبلت کو تفریط میں لے جانے کا سبب بنتا ہے اور ضرورت سے زائد کھانا انسان میں شہوت کی قوت میں افراط کا باعث ہے لہذا نہ تو ضرورت سے کم کھانا تقوی ہے اور نہ ہی ضرورت سے زائد کھانا نیکی ہے بلکہ کھانے میں اعتدال ہونا چاہیے تا کہ

شہوت کی قوت میں بھی اعتدال رہے۔ واللہ اعلم

بعض علماء کا کہنا ہے کہ شہوت کی قوت اس لیے رکھی گئی کہ انسان اس کے ذریعے اپنے نفس کے واسطے نفع بخش چیزیں حاصل کرے۔ اور غضب کی قوت کا مقصد یہ ہے کہ انسان اس کے ذریعے اپنی ذات سے ضرر رساں چیزوں کو دور کرے۔ اور عقل کی قوت کا مقصد یہ ہے کہ وہ نفس کے لیے نفع بخش اور ضرر رساں چیزوں میں فرق کرے۔ پس یہ تینوں قوتیں دراصل انسان کے فائدے کے لیے پیدا کی گئی ہیں۔ پس اس قول کے درست ہونے کی صورت میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ نفس انسانی کی وہ تین جہات ہیں کہ جن سے جمیع اخلاق اور رذائل پیدا ہوتے ہیں۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اگر انسان میں دنیا، مال اور جاہ کی طلب (desire) پیدا ہو تو یہ شہوت کی قوت کی وجہ سے ہے۔ اگر یہ طلب اعتدال میں رہے تو یہی مطلوب ہے اور اگر شدید ہو جائے تو اسے حرص، لالچ اور طمع کہتے ہیں جو آزمائش بن جاتی ہے۔ اگر انسان شدید طلب کے بعد دنیا، مال اور جاہ حاصل کر لے تو اس سے بخل اور کنجوسی پیدا ہوتی ہے اور اگر معتدل طلب کے بعد یہ چیزیں حاصل ہوں گی تو بخل اور کنجوسی پیدا نہ ہو گی۔ اور اگر ایسا ہو کہ طلب تو شدید ہو لیکن انسان کو دنیا، مال اور جاہ حاصل کرنا مشکل ہو یہاں تک کہ اسے ان کے حصول کے لیے اپنی قوت غضب استعمال کرنی پڑے تو اس سے فخر، تکبر، ظلم اور عداوت پیدا ہوتی ہے۔ واللہ اعلم

اور اگر انسان اپنے آپ سے کسی ضرر رساں چیز کو دور کرنا چاہے تو اس کے لیے قوت غضب کو استعمال کرتا ہے مثلاً کسی نے اسے گالم گلوچ کی اور اب وہ اس لعن طعن کو اپنے سے دور کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے غضب کی قوت کو استعمال کرے گا۔ اگر وہ اس ضرر رساں چیز کو اپنے سے دور نہ کر سکے تو اس سے بغض پیدا ہوتا ہے اور اگر انسان کسی اور کو دیکھے کہ وہ تو اپنے نفس سے ضرر کو دور کرنے اور فائدہ پہنچانے کی قدرت رکھتا ہے لیکن وہ خود اس اہل نہیں ہے تو اس سے حسد پیدا ہوتا ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں آتی ہے کہ جذبہ انتقام بھی قوت غضب کے افراط سے پیدا ہوتا ہے۔ واللہ اعلم

فناء اور بقاء

صوفیاء نے تزکیہ نفس میں فناء اور بقاء کی اصطلاحات استعمال کی ہیں۔ متقدمین صوفیاء کا تصور فناء وبقا سادہ تھا۔ فناء سے ان کی مراد رذائل نفس سے اپنی ذات کو پاک کرنا اور بقاء سے مراد اخلاق حمیدۃ سے اپنے نفس کو متصف کرنا تھا۔ فناء کی اصطلاح رذائل کے لیے تھی اور بقاء کی اخلاق عالیہ کے لیے۔ شیخ علی ہجویری رحمہ اللہ نے اس بارے گفتگو کرتے ہوئے اپنے زمانے کے ان صوفیوں کو جاہل قرار دیا ہے کہ جو ''فنائے کلی'' کا بدعی تصور رکھتے ہیں۔[1]

متاخرین صوفیاء میں ایک ایسی جماعت پیدا ہوئی کہ جنہوں نے تصوف کو عمل سے زیادہ نظریہ بنادیا۔ انہوں نے فناء فی اللہ اور بقاء باللہ کو سالک کی منازل قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک فناء فی اللہ عروج ہے اور بقاء باللہ زوال ہے۔ پس سالک اپنے تزکیہ نفس میں اپنے قلب وذہن کو اللہ کے غیر سے اس طرح پاک کرلے کہ اللہ کا غیر، سالک کے ہاں درجہ علم میں نہ رہے۔ اور سالک کو خالق کے علاوہ کچھ محسوس نہ ہو۔ ایسا سالک اپنے آپ کو اللہ کی ذات میں فناء کردیتا ہے بایں معنی کہ اس پر اللہ کے تصور اور محبت کا اس قدر غلبہ ہوتا ہے کہ غیر کا وجود اس کے دل ودماغ میں باقی نہیں رہتا۔ فناء فی اللہ کے بعد بعض سالکین کو بقاء باللہ کا مرتبہ دیا جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ سالک اپنے دل ودماغ کو جب اللہ کی ذات میں فناء کردیتا تو مخلوق اس کے لیے ایک اعتبار سے معدوم ہوگئی ہے۔ اب اللہ کی طرف سے تبلیغ ودعوت یا کسی دوسری مصلحت کے سبب سے سالک کو دوبارہ مخلوق کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے اور وہ اللہ کے تصور کے ساتھ غیر کا تصور اپنے ذہن میں اور اللہ کی محبت کے ساتھ مخلوق کی محبت بھی اپنے دل میں محسوس کرتا ہے۔ اس طرح مخلوق جو کہ فناء فی اللہ میں سالک کے لیے معدوم ہوچکی تھی، اگرچہ حقیقت میں وہ موجود تھی، تو

[1] علی بن عثمان بن ابی علی الجلابی الغزنوی الھجویری، کشف المحجوب، مترجم فضل دین گوہر، مزدور پرنٹنگ پریس، لاہور، 1972ء، ص227-230

بقاء باللہ میں وہ مخلوق دوبارہ سالک کے قلب وذہن میں آموجود ہوتی ہے۔[1]

ہمیں فناء وبقاء کی ان دونوں تعبیرات سے دلچسپی نہیں ہے۔ پہلی تعبیر اگرچہ اپنے مقصود میں تو شرعی ہے یعنی رذائل کا خاتمہ اور اخلاق عالیہ سے متصف ہونا لیکن یہ تعبیر فناء اور بقاء کے الفاظ کا دور کا معنی معلوم ہوتا ہے۔ اور فناء وبقاء کی دوسری تعبیر تو شرعی اعتبار سے بھی مطلوب نہیں ہے کیونکہ اس تعبیر کو مان لینے کی صورت میں فناء فی اللہ کا عروج استغراق (self-absorption) اور سکر (senselessness) قرار پاتا ہے جو شرعی اعتبار سے مطلوب صفات نہیں ہیں۔ استغراق اگر مطلوب ہوتا تو اللہ کے رسول ﷺ جماعت کی نماز میں بچے کی رونے کی آواز سن کر نماز مختصر نہ کرتے۔ عین نماز کی حالت میں بھی نبی کریم ﷺ اللہ کی طرف بھی کامل درجے میں متوجہ رہتے تھے اور اپنی امت سے بھی غافل نہ تھے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«إِنِّي لَأَقُومُ فِي الصَّلَاةِ أُرِيدُ أَنْ أُطَوِّلَ فِيهَا، فَأَسْمَعُ بُكَاءَ الصَّبِيِّ، فَأَتَجَوَّزُ فِي صَلَاتِي كَرَاهِيَةَ أَنْ أَشُقَّ عَلَى أُمِّهِ»[2]

”میں نماز پڑھانے کے لیے کھڑا ہوتا ہوں اور میرا دل چاہتا ہے کہ میں اپنی نماز لمبی کروں۔ پس اسی دوران مجھے کسی بچے کے رونے کی آواز سنائی دیتی ہے تو میں اپنی نماز مختصر کر دیتا ہوں تاکہ اُس کی ماں زیادہ دیر تکلیف میں نہ رہے۔“

اور امام ابن قیم رحمہ اللہ نے درست کہا کہ اس تعبیر کو مان لینے کی صورت میں مقام فناء میں جب سالک ﴿إِيَّاكَ نَعْبُدُ وَإِيَّاكَ نَسْتَعِينُ﴾ کی تلاوت نماز میں کرے گا تو کس ذہنی شعور کے ساتھ اپنی عبدیت کا اقرار کر پائے گا؟[3]

اگر ہم کتاب وسنت سے فناء وبقاء کا تصور لیں تو وہ اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے کہ فناء وبقاء سے مراد اللہ کے قرب کے شوق میں اپنی جان کو قربان کر دینا ہے۔ اللہ کے راستے میں جان دے دینا، جسے ہم شہادت کہتے ہیں، سے بڑھ کر انسان کیا مرتبہ فناء حاصل

[1] شریعت وطریقت: ص 307
[2] صحيح البخاري، كتاب الآذان، بَابُ مَنْ أَخَفَّ الصَّلاَةَ عِنْدَ بُكَاءِ الصَّبِيِّ، 143/1
[3] مدارج السالكين: 171/1

کرے گا؟ اور اس فناء یا شہادت کے بعد اللہ کے عرش کے نیچے قندیلوں میں رات گزارنے سے بڑھ کر بقاء باللہ کا کیا تصور ہمارے قلب وذہن میں آسکتا ہے کہ جسے کتاب وسنت کی تصدیق بھی حاصل ہو۔ شہید در اصل مقام فناء سے گزر کر بقاء کا ایسا مقام حاصل کرلیتا ہے کہ جس کو پھر زوال نہیں ہے۔ اور یہاں فناء زوال ہے اور بقاء عروج ہے۔ اللہ عزوجل کا ارشاد ہے:

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ﴿169﴾ [آل عمران]

”اور تم ان لوگوں کو مردہ خیال مت کرو جو اللہ کے راستے میں مارے گئے بلکہ وہ زندہ ہیں اور اپنے رب کے ہاں رزق دیے جاتے ہیں۔“

جبکہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

«أَرْوَاحُ الشُّهَدَاءِ عِنْدَ اللَّهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِي حَوَاصِلِ طَيْرٍ خُضْرٍ، لَهَا قَنَادِيلُ مُعَلَّقَةٌ بِالْعَرْشِ، تَسْرَحُ فِي أَيِّ الْجَنَّةِ شَاءُوا، ثُمَّ تَرْجِعُ إِلَى قَنَادِيلِهَا فَيُشْرِفُ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ فَيَقُولُ: أَلَكُمْ حَاجَةٌ؟ تُرِيدُونَ شَيْئًا؟ فَيَقُولُونَ: لَا، إِلَّا أَنْ نَرْجِعَ إِلَى الدُّنْيَا فَنُقْتَلَ مَرَّةً أُخْرَى»[1]

”شہداء کی ارواح قیامت کے دن تک اللہ کے پاس رہتی ہیں اور انہیں سبز پرندوں کے پیٹوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔ اُن کی رہائش کے لیے عرش کے ساتھ لٹکی ہوئی قندیلیں ہیں۔ یہ ارواح جنت میں جہاں چاہتی ہیں، چرتی چگتی ہیں اور پھر شام کو عرش کے نیچے اپنی قندیلوں میں واپس آجاتی ہیں۔ پس اُن کا رب اُنہیں جھانک کر دیکھتا ہے اور اُن سے پوچھتا ہے کہ تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہے، کچھ چاہیے؟ تو وہ کہتی ہیں: نہیں، کچھ نہیں چاہیے سوائے اس کے کہ ہم دنیا میں ایک بار دوبارہ بھیجی جائیں اور ہمیں دوبارہ اُسی طرح قتل کیا جائے۔“

فناء وبقاء کا یہ تصور انسان کے وجود میں سرمستی وسرشاری، امید وحیات اور اپنے رب پر بار بار نثار ہونے کی جو احوال اور کیفیات پیدا کر دیتا ہے، وہ کسی اور تصور سے پیدا

[1] الدارمي، عبد الله بن عبد الرحمن بن الفضل بن بَهرام بن عبد الصمد، مسند الدارمي دار المغني للنشر والتوزيع، المملكة العربية السعودية، 2000ء، 1560/3

ہونی ممکن ہیں کیا؟

سماع اور وجد

صوفیاء کے نزدیک سماع سے مراد غنائیہ اشعار کو آلات اور رقص کے ساتھ خوبصورت آواز کی صورت میں پیش کرنا ہے۔[1] مروجہ قوالی اور دھمال، سماع اور وجد ہی کی ارتقائی صورتیں ہیں۔ بعض صوفیاء کا کہنا ہے کہ سماع سے انسان کے دل میں چھپا ہوا شوق، وجد، ہیجان، رقت اور قلق بیدار ہو جاتا ہے اور اس طرح گویا سماع سے دل میں ایسی حرکت پیدا ہوتی ہے جو تقرب الی اللہ کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ سلاسل میں سے نقشبندیہ سماع سے اجتناب جبکہ چشتیہ اس کے جواز کے قائل ہیں۔[2]

ائمہ اربعہ اور محدثین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آلات موسیقی حرام ہیں۔[3] اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیا نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سماع، وجد اور رقص کو تقرب اور تزکیہ کا ذریعہ بنایا؟ تو اس کا جواب نفی میں ہے۔ کیا ہم نبی کریم ﷺ یا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بارے یہ تصور بھی کر سکتے ہیں کہ وہ قوالی سنتے اور دھمال ڈالتے ہوں گے؟ نہیں، ہر گز نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ امام شافعی، امام احمد بن حنبل، قاضی ابو الطیب الشافعی، امام قرطبی المالکی، امام طرطوشی المالکی، امام الشاطبی المالکی، امام ابن الصلاح الشافعی، امام ابن تیمیہ الحنبلی، امام ابن القیم الحنبلی رحمہم اللہ نے صوفیاء کے سماع اور رقص کو بدعت قرار دیا ہے۔ حنفی فقیہ ابن نجیم مصری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

وَعَنْ قَيْسِ بْنِ عُبَادَةَ قَالَ كَانَ أَصْحَابُ رَسُولِ اللَّهِ - صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - يَكْرَهُونَ الصَّوْتَ عِنْدَ ثَلَاثٍ: الْجَنَائِزُ، وَالْقِتَالُ، وَالذِّكْرُ، وَالْمُرَادُ بِالذِّكْرِ الْوَعْظُ وَقَالَ الْإِمَامُ شَمْسُ الْأَئِمَّةِ السَّرَخْسِيُّ فَفِي هَذَا الْحَدِيثِ بَيَانُ كَرَاهَةِ رَفْعِ الصَّوْتِ عِنْدَ سَمَاعِ الْقُرْآنِ، وَالْوَعْظِ فَتَبَيَّنَ بِهِ أَنَّ مَا يَفْعَلُهُ الَّذِينَ يَدَّعُونَ الْوَجْدَ، وَالْمَحَبَّةَ مَكْرُوهٌ وَلَا

---

[1] الغزالي، أبو حامد محمد بن محمد، إحياء علوم الدين، دار المعرفة، بيروت، 2/268-306

[2] شریعت اور طریقت: ص 295-296

[3] الألباني، محمد ناصر الدين، تحريم آلات الطرب، مؤسسة الريان، بيروت، الطبعة الثالثة، 1426هـ/2005ء، 98-105

أَصْلَ لَهُ فِي الدِّينِ وَتَبَيَّنَ بِهِ أَنَّهُ يُمْنَعُ الْمُتَقَشِّفَةُ وَحَمْقَى أَهْلِ التَّصَوُّفِ مِمَّا يَعْتَادُونَهُ مِنْ رَفْعِ الصَّوْتِ وَتَمْزِيقِ الثِّيَابِ عِنْدَ السَّمَاعِ؛ لِأَنَّ ذَلِكَ مَكْرُوهٌ فِي الدِّينِ عِنْدَ سَمَاعِ الْقُرْآنِ، وَالْوَعْظِ فَمَا ظَنُّك عِنْدَ سَمَاعِ الْغِنَاءِ.[1]

''قیس بن عبادہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے صحابہ تین مقامات پر آواز بلند کرنے کو ناپسند جانتے تھے: جنازے کے وقت، لڑائی کے وقت اور ذکر کے وقت کہ جس سے مراد وعظ ہے۔ شمس الائمہ امام سرخسی ؒ کا کہنا ہے کہ یہ روایت اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن اور وعظ سنتے وقت بلند آواز نکالنا مکروہ ہے۔اس سے یہ بھی واضح ہو گیا کہ جسے یہ [صوفیاء] وجد اور محبت کا نام دے کر کرتے ہیں، وہ بھی مکروہ ہے۔اور دین میں اس کی کوئی بنیاد موجود نہیں ہے۔اور اس سے یہ بھی واضح ہوا کہ اہل تصوف میں موجود اس قسم کے زاہدوں اور احمقوں کو سماع کے وقت آوازیں بلند کرنے اور کپڑے پھاڑنے سے منع کیا جائے کیونکہ یہ تو قرآن اور وعظ کے سماع کے وقت جائز نہیں ہے تو غناء کے سماع کے وقت کیسے جائز ہو گا؟''

احادیث میں آلات موسیقی سے اجتناب کا حکم اس لیے بھی ہے کہ یہ انسان کو بے خودی اور مدہوشی کی ایسی کیفیت میں لے جاتے ہیں کہ اگر سامع کا رخ مخلوق کی طرف ہو تو شراب اور زنا جیسی منکرات میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اگر خالق کا قصد ہو تو وجد اور سکر میں مبتلا ہو کر شطحیات میں پڑ جاتا ہے۔ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«لَيَكُونَنَّ مِنْ أُمَّتِي أَقْوَامٌ، يَسْتَحِلُّونَ الحِرَ وَالحَرِيرَ، وَالخَمْرَ وَالمَعَازِفَ»[2]

''میری امت میں ایسے لوگ پیدا ہوں گے جو زنا، ریشم، شراب اور آلات موسیقی کو حلال کر لیں گے۔''

---

[1] ابن نجيم المصري، البحر الرائق شرح كنز الدقائق، دار الكتاب الإسلامي، 82/5

[2] صحيح البخاري، كِتَابُ الأَشْرِبَةِ، بَابُ مَا جَاءَ فِيمَنْ يَسْتَحِلُّ الخَمْرَ وَيُسَمِّيهِ بِغَيْرِ اسْمِهِ، 106/7؛ تحريم آلات الطرب: 38-51

ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ نَافِعٍ، قَالَ: سَمِعَ ابْنُ عُمَرَ، مِزْمَارًا قَالَ: فَوَضَعَ إِصْبَعَيْهِ عَلَى أُذُنَيْهِ، وَنَأَى عَنِ الطَّرِيقِ، وَقَالَ لِي: يَا نَافِعُ هَلْ تَسْمَعُ شَيْئًا؟ قَالَ: فَقُلْتُ: لَا، قَالَ: فَرَفَعَ إِصْبَعَيْهِ مِنْ أُذُنَيْهِ، وَقَالَ: «كُنْتُ مَعَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَمِعَ مِثْلَ هَذَا فَصَنَعَ مِثْلَ هَذَا»[1]

"حضرت نافع رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے مزمار کی آواز سنی تو اپنے دونوں کانوں میں اپنی انگلیاں ڈال لیں اور دوسرا راستہ اختیار کر لیا۔ اور مجھ سے پوچھا: کیا اب آواز آرہی ہے؟ میں نے کہا: نہیں۔ تو انہوں نے اپنی انگلیاں اپنے کانوں سے باہر نکال لیں اور کہا: میں اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھا کہ آپ کو ایسی ہی آواز سنائی دی تو آپ نے ایسا ہی کیا جیسا کہ میں نے کیا ہے۔"

رہی صوفیاء کی نیت، زمان، مکان اور اخوان کی شروط کے ساتھ سماع کے جواز کی بات تو ان شروط کے عدم جواز کے بارے عبد الرحمن بن عبد الرحیم القرشی کے مقالہ "السماع عند الصوفية: عرض ونقد على ضوء عقيدة أهل السنة والجماعة" کا مطالعہ مفید رہے گا۔

پس جائز سماع وہی ہے جو قرآن مجید کا ہے جیسا کہ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، أَنَّهُ قَالَ: «يَا أَبَا مُوسَى لَقَدْ أُعْطِيتَ مِزْمَارًا مِنْ مَزَامِيرِ آلِ دَاوُدَ»[2]

"اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو موسی اشعری رضی اللہ عنہ سے کہا: تجھے آل داود کے مزامیر میں سے ایک مزمار (sweet melodious voice) دیا گیا ہے۔"

یہی قرآن کا سماع ہے جو انسان کے دل میں وہ کیفیات اور احوال پیدا کرتا ہے جو تزکیہ اور تقرب کا ذریعہ بنتی ہیں جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ﴾

---

[1] سنن أبي داود، كِتَاب الْأَدَبِ، بَابُ كَرَاهِيَةِ الْغِنَاءِ وَالزَّمْرِ، المكتبة العصرية، بيروت، 281/4

[2] سنن الترمذي، أَبْوَابُ الْمَنَاقِبِ، بَابُ مَنَاقِبِ أَبِي مُوسَى الأَشْعَرِيِّ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ، 693/5

[الأنفال: 2]

”اور جب اُن پر قرآن مجید کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں تو وہ آیات اُن کے ایمان میں اضافہ کر دیتی ہیں۔“

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿إِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُ الرَّحْمَٰنِ خَرُّوا سُجَّدًا وَبُكِيًّا ۩﴾ [مريم: 58]

”اور جب اُن پر رحمن کی آیات کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ روتے ہوئے سجدے میں گر جاتے ہیں۔“

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿إِنَّمَا يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا الَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِهَا خَرُّوا سُجَّدًا وَسَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُونَ ۩﴾ [السجدة: 15]

”ہماری آیات پر ایمان لانے والے لوگ تو صرف وہی ہیں کہ جنہیں اللہ کی آیات کے ذریعے نصیحت کی جائے تو سجدے میں گر جاتے ہیں اور اپنے رب کی حمد کے ساتھ تسبیح بیان کرتے ہیں اور تکبر نہیں کرتے۔“

صوفیاء کو سماع سے جو احوال نصیب ہوتے ہیں، ان میں سے ”وجد“ ان کے ہاں قیمتی ترین حال شمار ہوتا ہے۔ ”وجد“ سے مراد بے خودی اور مدہوشی کی وہ کیفیت ہے کہ جس میں انسان کو اپنے نفس پر قابو نہ رہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ بے خودی اور مستی کی یہ کیفیات اگر قرآن مجید سن کر طاری ہوں تو پھر بھی ہمارے دین میں مطلوب نہیں ہیں چہ جائیکہ سماع کے ناجائز ذریعے سے یہ احوال پیدا کیے جائیں۔ اللہ عزوجل کو اپنے بندوں سے جو احوال مطلوب ہیں، وہ وہی ہیں جو قرآن مجید میں بیان کر دیے گئے ہیں۔ جو احوال اللہ کے رسول ﷺ پر طاری نہ ہوئے ہوں تو وہ رحمان کے نہیں شیطان کے احوال ہیں۔

ارشاد باری تعالی ہے:

﴿ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَىٰ ذِكْرِ اللَّهِ﴾ [الزمر: 23]

”اور قرآن مجید کو سن کر اُن لوگوں کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔ پھر اُن کی کھالیں اور ان کے دل اللہ کے ذکر کی طرف مائل ہو

جاتے ہیں۔"

معروف تابعی حضرت قتادہ رحمہ اللہ اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

هَـذَا نَعْـتُ أَوْلِيَـاءِ اللَّهِ، نَعَتَهُمُ اللَّهُ بِـأَنْ تَقْشَـعِرَّ جُلُودُهُمْ، وَتَبْكِيَ أَعْيُنُهُمْ، وَتَطْمَئِنَّ قُلُوبُهُمْ إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ، وَلَمْ يَنْعَتْهُمْ بِذَهَابِ عُقُولِهِمْ وَالْغَشَيَانِ عَلَيْهِمْ، إِنَّمَا هَذَا فِي أَهْلِ الْبِدَعِ، وَهَذَا مِنَ الشَّيْطَانِ.[1]

"یہ اولیاء اللہ کی صفت ہے۔ اللہ نے اپنے اولیاء کی یہ صفت بیان کی ہے کہ اللہ کی یاد میں اُن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اُن کی آنکھیں سے آنسو بہہ پڑتے ہیں اور اُن کے دل اللہ کی یاد سے مطمئن ہو جاتے ہیں۔ اور اللہ عزوجل نے اپنے اولیاء کی یہ صفت بیان نہیں کی کہ اللہ کی یاد میں ان کی عقل رخصت ہو جاتی ہے یا وہ بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ اور یہ تو اہل بدعت کے احوال ہیں اور یہ شیطان کی طرف سے وارد ہوتے ہیں۔"

اسی طرح حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے سوال کیا گیا:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَـالِـكٍ، أَنَّـهُ سُـئِـلَ عَنِ الْقَوْمِ يُقْرَأُ عَلَيْهِمِ الْقُرْآنُ فَيَصْعَقُونَ. فَقَالَ: «ذَلِكَ فِعْلُ الْخَوَارِجِ»[2]

"کچھ لوگ جب قرآن مجید سنتے ہیں تو بے ہوش ہو کر گر جاتے ہیں تو انہوں نے جواب دیا کہ یہ خوارج کی صفت ہے۔"

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کا ایک عراقی سے گزر ہوا جو کہ زمین پر گرا پڑا تھا اور لوگ اُس کے ارد گرد جمع تھے تو انہوں نے پوچھا:

مَرَّ ابْنُ عُمَرَ بِرَجُلٍ مِنْ أَهْلِ الْعِرَاقِ سَـاقِطًا، وَالنَّاسُ حَوْلَهُ، فَقَالَ: «مَا هَذَا؟» فَقَالُوا: إِذَا قُرِئَ عَلَيْهِ الْقُرْآنُ أَوْ سَمِعَ اللَّهَ يُذْكَرُ خَرَّ مِنْ خَشْيَةِ اللَّهِ. فَقَالَ ابْنُ عُمَرَ: «وَاللَّهِ إِنَّا لَنَخْشَى اللَّهَ وَمَا نَسْقُطُ»[3]

---

[1] ابن كثير، إسماعيل بن عمر القرشي، تفسير القرآن العظيم، دار طيبة للنشر والتوزيع، الطبعة الثانية، 1420هـ-1999ء، 95/7

[2] القاسم بن سلاّم بن عبد الله الهروي البغدادي، أبو عُبيد، (المتوفى: 224هـ)، فضائل القرآن، دار ابن كثير، بيروت، الطبعة الأولى، 1415 هـ-1995ء، ص 215

[3] أيضاً: ص 214

"اسے کیا ہوا ہے۔ لوگوں نے جواب دیا کہ جب اس پر قرآن مجید کی تلاوت کی جاتی ہے یا وہ اللہ کا ذکر سنتا ہے تو خشیت الٰہی سے زمین پر گر پڑتا ہے تو ابن عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: اللہ کی قسم، خشیت تو ہم پر بھی طاری ہوتی ہے لیکن ہم اس طرح زمین پر نہیں گرتے۔"

اسی طرح معروف تابعی حضرت عکرمہ رحمہ اللہ سے مروی ہے:

عَنْ عِكْرِمَةَ، قَالَ: سُئِلَتْ أَسْمَاءُ هَلْ كَانَ أَحَدٌ مِنَ السَّلَفِ يُغْشَى عَلَيْهِ مِنَ الْخَوْفِ؟ فَقَالَتْ: «لَا، وَلَكِنَّهُمْ كَانُوا يَبْكُونَ»[1]

"حضرت اسماء بنت ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہا سے یہ پوچھا گیا کہ کیا سلف [صحابہ] میں سے کوئی ایسا تھا کہ جسے خوف خدا کی وجہ سے غشی کے دورے پڑتے ہوں تو انہوں نے کہا: نہیں، لیکن اُن کا خوف تو رونا تھا۔"

حضرت ہشام بن حسان رحمہ اللہ سے مروی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کہا گیا:

عَنْ هِشَامِ بْنِ حَسَّانَ، قَالَ: قِيلَ لِعَائِشَةَ: إِنَّ قَوْمًا إِذَا سَمِعُوا الْقُرْآنَ صَعِقُوا. فَقَالَتْ: الْقُرْآنُ أَكْرَمُ أَنْ تَنْزِفَ عَنْهُ عُقُولُ الرِّجَالِ، وَلَكِنَّهُ كَمَا قَالَ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ {تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُودُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِينُ جُلُودُهُمْ وَقُلُوبُهُمْ إِلَى ذِكْرِ اللَّهِ}.[2]

"کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جب قرآن مجید سنتے ہیں تو بے ہوش ہو جاتے ہیں۔ انہوں نے کہا: قرآن مجید اس سے پاک ہے کہ اُسے سن کر لوگوں کی عقل جاتی رہی [یعنی عقل کا جاتے رہنا تو نقص ہے نہ کہ خوبی اور قرآن مجید کے استماع سے نقص تو پیدا ہونے سے رہا] لیکن جیسا کہ اللہ کا ارشاد ہے کہ جو لوگ اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں تو قرآن مجید سن کر اُن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔"

پس قرآن مجید کو خوبصورت آواز میں پڑھنا اور سننا یہی سماع ہے جو اہل ایمان سے مطلوب ہے۔ اور اس سماع سے پیدا ہونے والے احوال قرآنی احوال کہلاتے ہیں کہ جو

---

[1] أيضاً: ص 214

[2] أيضاً: ص 214-215

عبادالرحمن کے احوال ہیں۔ایک روایت کے الفاظ ہیں:

الْبَرَاءَ بْنَ عَازِبٍ، يُحَدِّثُ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «زَيِّنُوا الْقُرْآنَ بِأَصْوَاتِكُمْ»[1]

”حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ قرآن مجید کو اپنی آوازوں سے خوبصورت کرو۔“

اور قرآن مجید کو خوبصورت طور پڑھنے سے مراد اس کو پڑھتے ہوئے منہ کے زاویے بنانے میں تکلف کرنا نہیں بلکہ لب و لہجے میں خشوع اور للہیت کا ہونا ہے۔ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ جَابِرٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «إِنَّ مِنْ أَحْسَنِ النَّاسِ صَوْتًا بِالْقُرْآنِ، الَّذِي إِذَا سَمِعْتُمُوهُ يَقْرَأُ، حَسِبْتُمُوهُ يَخْشَى اللَّهَ»[2]

”حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: بہترین آواز میں قرآن پڑھنے والا وہ ہے کہ جب تم اسے قرآن پڑھتے سنو تو یہ محسوس کرو کہ وہ قرآن پڑھتے ہوئے اللہ سے ڈر رہا ہے۔“

اور عصر حاضر میں اللہ عزوجل نے بعض عرب قراء کو جن خوبصورت الحان میں قرآن مجید پڑھنے کی توفیق دی ہے، امر واقعہ یہ ہے کہ انہیں سن کر انسان میں بندگی کے احوال تازہ ہو جاتے ہیں۔ ماہر المعیقلی، سعد الغامدی، ادریس ابکر، الشریم، السدیس، مشاری راشد، صدیق المنشاوی، عبدالباسط وغیرہ جیسے کتنے نامور قاری ہیں کہ جن کی تلاوت انسانی روح میں نشاط کی عجب کیفیات پیدا کر دیتی ہے۔[3]

کبھی آپ تنہائی میں، اکیلے کمرے میں، ہلکی روشنی میں، مکمل خاموشی میں، اونچی آواز سے ماہر المعیقلی کی آواز میں قرآن مجید کا کچھ حصہ سن کر دیکھیں اور پھر اپنے آپ

---

[1] سنن ابن ماجه، كِتَابُ إِقَامَةِ الصَّلَاةِ، وَالسُّنَّةُ فِيهَا، بَابٌ فِي حُسْنِ الصَّوْتِ بِالْقُرْآنِ، 426/1

[2] سنن ابن ماجه، كِتَابُ إِقَامَةِ الصَّلَاةِ، وَالسُّنَّةُ فِيهَا، بَابٌ فِي حُسْنِ الصَّوْتِ بِالْقُرْآنِ، 425/1

[3] ان قراء کی تلاوت درج ذیل ویب سائیٹ سے ڈاون لوڈ کی جا سکتی ہیں۔ http://www.tvquran.com/en/

سے سوال کریں کہ کیا قرآن مجید سے بڑھ کر کوئی ذریعہ ایسا ہو سکتا ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم والی بندگی کے احوال زندہ کر دے؟ اور اگر آپ وہ دو چار رکوع کہ جن کی تلاوت آپ نے سنی ہو، ان کا ترجمہ بھی جانتے ہوں یا سننے سے پہلے ان کا لفظی ترجمہ ایک بار دیکھ لیں تو پھر آپ کو اصلاح نفس کے لیے قرآن مجید کے علاوہ کسی ذریعے کی طرف دیکھنے کی خواہش بھی محسوس نہ ہو گی۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «إِنَّ لِلَّهِ أَهْلِينَ مِنَ النَّاسِ» قَالُوا: يَا رَسُولَ اللَّهِ، مَنْ هُمْ؟ قَالَ: «هُمْ أَهْلُ الْقُرْآنِ، أَهْلُ اللَّهِ وَخَاصَّتُهُ»[1]

"حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے کہا: لوگوں میں سے کچھ ایسے ہیں جو اللہ کے لیے گھر والے ہیں۔ صحابہ نے پوچھا: اللہ کے گھر والے کون ہو سکتے ہیں؟ تو آپ نے کہا: قرآن سننے اور سنانے والے، اللہ کے گھر والے اور اس کے خاص لوگ ہیں۔"

علائق دنیا

اہل تصوف میں فکر و عمل کی جو بے اعتدالیاں پیدا ہوئیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ انہوں نے انسانوں سے محبت کو اللہ سے محبت کے منافی سمجھا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ دنیا کی محبت کا معنی دنیا کی کسی شیء سے محبت ہو جانا ہے، چاہے وہ بیوی بچوں اور والدین ہی کیوں نہ ہوں۔ لہذا ان میں سے بعض نے اولاد سے محبت کو پسند نہیں کیا کہ یہ دنیا کی محبت ہے اور اللہ کی محبت میں رکاوٹ ہے۔ اس قسم کے خیالات عیسائی راہبوں اور بدھ بھکشوؤں میں بھی ملتے ہیں اور ان کا دین اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حضرت مجدد الف ثانی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

"اے عزیز سنو، مخدوم شیخ فرید شکر گنج سے نقل کیا گیا ہے کہ جب ان کے لڑکوں میں سے ایک لڑکے کا انتقال ہو گیا اور اس کی موت کی خبر آپ کو پہنچائی گئی تو آپ پر رنج و غم سے متعلق کچھ تغیر نہ ہوا اور فرمایا سگ بچہ مر گیا ہے، اس

---

[1] سنن ابن ماجه، الكتاب في الإيمان وفضائل الصحابة والعلم، بَابُ فَضْلِ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ، 78/1

کو باہر پھینک دو۔ اور جب حضرت سید البشر علیہ و علی آلہ الصلوۃ والسلام کے صاحبزادے حضرت ابراہیم رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو حضرت پیغمبر علیہ و علی آلہ الصلوۃ والسلام اس قدر غمگیں ہوئے کہ آنسو نکل آئے اور فرمایا: اے ابراہیم، ہم تیری جدائی کی وجہ سے بہت غمگیں ہیں اور بڑے مبالغے اور تاکید کے ساتھ غم واندوہ کا اظہار فرمایا۔ فرمائیں کہ حضرت شکر گنج رحمہ اللہ بہتر ہیں یا حضرت سید البشر صلی اللہ علیہ وسلم؟ عوام کالانعام کے نزدیک پہلا معاملہ بہتر ہے اور اس کو بے تعلق جانتے ہیں اور دوسرے کو عین تعلق اور اولاد سے لگاؤ خیال کرتے ہیں۔"[1]

گواتم بدھا متوفی 400 قبل مسیح نے اپنے غور و فکر کے نتیجے میں جو صداقتیں معلوم کیں اور ان کی روشنی میں اپنے مذہب بدھ مت کی بنیاد رکھی، ان میں سے ایک یہ تھی کہ دنیا میں دکھ ہی دکھ ہے۔ دوسری یہ تھی کہ دنیا کے دکھوں کا سبب دنیاوی اشیاء تعلق اور اس کی خواہش ہے کہ جب انسان کا کوئی دنیاوی تعلق ٹوٹ جاتا ہے یا اس کی کوئی خواہش پوری نہیں ہوتی تو اسے دکھ پہنچتا ہے۔ اور تیسری صداقت اس نے یہ معلوم کی کہ انسان اگر اپنے دکھ کا علاج کرنا چاہتا ہے تو اسے چاہیے کہ دنیا کی چیزوں سے ہر قسم کا تعلق ختم کر لے اور اپنی خواہشات کو مار دے۔ پس جب نہ تعلق (attachment) رہے گا اور نہ ہی خواہش (desire) تو تعلق کے ٹوٹنے اور کسی خواہش کے پورا نہ ہونے پر جو دکھ پہنچتا ہے، تو وہ کبھی نہ پہنچے گا۔

دین اسلام میں تعلقات اور خواہشات کو ختم کرنے کی بجائے، انسانی تعلقات کو اللہ کے تعلق کے تابع رکھنے اور خواہشات کو قابو میں رکھنے کا حکم ہے۔ مال و دولت، بیوی بچوں اور مقام و عہدے کی محبت تو خود اللہ تعالی نے انسان میں رکھی ہے اور مطالبہ یہ نہیں کیا کہ انہیں اپنے دل سے نکال باہر کرو بلکہ یہ کہا ہے کہ انہیں اللہ کی محبت کے تابع رکھو۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿قُلْ إِن كَانَ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ وَإِخْوَانُكُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَالٌ اقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا

[1] مکتوبات حضرت مجدد الف ثانی، دفتر اول، حصہ دوم، مکتوب 272، ص 320

أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ اللَّــهِ وَرَسُولِهِ وَجِهَادٍ فِي سَبِيلِهِ فَتَرَبَّصُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفَاسِقِينَ﴾ [التوبة: 24]

"اے نبی ﷺ کہہ دیں کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے، اور تمہارے بھائی، اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز و اقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں، اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے، اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا۔"

مبشرات

اللہ کے رسول ﷺ نے خواب میں بشارت کو نبوت کا چھیالیسواں حصہ قرار دیا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ خواب تین قسم کے ہوتے ہیں:

عَنْ عَوْفِ بْنِ مَالِكٍ، عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، قَالَ: «إِنَّ الرُّؤْيَا ثَلَاثٌ: مِنْهَا أَهَاوِيلُ مِنَ الشَّيْطَانِ لِيَحْزُنَ بِهَا ابْنَ آدَمَ، وَمِنْهَا مَا يَهُمُّ بِهِ الرَّجُلُ فِي يَقَظَتِهِ، فَيَرَاهُ فِي مَنَامِهِ، وَمِنْهَا جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَأَرْبَعِينَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ»[1]

"حضرت عوف بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ خواب تین قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ ہیں کہ جو شیطان کی طرف سے ڈراوا ہیں تاکہ وہ ان کے ذریعے انسان کو پریشان رکھے۔ دوسرا وہ خواب ہیں کہ جو کچھ ہم بیداری میں دیکھتے ہیں تو وہ خواب میں نظر آتا ہے۔ اور تیسرا وہ خواب ہیں جو نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہیں۔"

پس کچھ خواب اللہ کی طرف سے ہوتے ہیں اور سچے خواب ہوتے ہیں لیکن ضروری نہیں ہے کہ ہر خواب، اللہ ہی کی طرف سے ہو۔ بعض خواب شیطان کی طرف سے بھی ہوتے ہیں اور بعض خواب انسان کی دن بھر کی سوچیں ہوتی ہیں جو نیند میں خواب کی

[1] سنن ابن ماجة، كِتَابُ تَعْبِيرِ الرُّؤْيَا، بَابُ الرُّؤْيَا ثَلَاثٌ، 1285/2

صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ جب بھی کوئی خواب دیکھے تو پہلے اس بات کا تعین کرے کہ اس کا مصدر کیا ہے؟ دن بھر کے خیالات، شیطان کا وسوسہ یا اللہ عزوجل کی طرف سے الہام۔ اس کے بعد اس کی کوئی مناسب تعبیر کر لے۔

اگر کوئی خواب اللہ کی طرف سے ہو تو وہ مبشرات میں سے ہے اور اس نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے۔ مبشرات کا معنی یہ ہے کہ اس خواب میں بندہ مومن کے لیے کوئی خوشخبری ہے جیسا کہ خواب میں اللہ کے رسول ﷺ کی زیارت کا نصیب ہونا۔ اور دوسرا یہ ہے کہ آپ ﷺ نے اسے نبوت کا چھیالیسواں حصہ قرار دیا ہے کہ نبوت کے علم کا جو ماخذ (source) ہے، وہ اور اچھے خواب کا ماخذ ایک ہی ہے کہ بعض خواب ایسے ہوتے ہیں کہ جن میں انسان کو مستقبل کے کسی واقعے کی خبر خواب میں ہو جاتی ہے، تو یہ اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اگر وہ واقعہ خوشگوار ہے تو انسان اللہ کا شکر ادا کرے اور اگر ناگوار ہے تو اس سے اللہ کی پناہ مانگے اور صدقہ کرے تا کہ اس کی آزمائش ٹل جائے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«لَمْ يَبْقَ مِنَ النُّبُوَّةِ إِلَّا المُبَشِّرَاتُ» قَالُوا: وَمَا المُبَشِّرَاتُ؟ قَالَ: «الرُّؤْيَا الصَّالِحَةُ»[1]

"نبوت میں سے کچھ باقی نہیں رہا سوائے مبشرات کے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ مبشرات کیا ہیں؟ تو آپ نے فرمایا: اچھے خواب۔"

مبشرات بھی کسی شخص کے صراط مستقیم پر ہونے کی نشانی ہیں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ جنتی بھی ہے۔ اس کا مطلب صرف اتنا ہی ہے کہ جس وقت میں اسے یہ خواب آیا ہے، اس وقت میں وہ صراط مستقیم پر ہے یا اس کی جستجو میں ہے لہذا اس حال پر استقامت اختیار کرے۔

اب تو شر اس قدر پھیل گیا ہے کہ مرید اپنے سلسلے کی ایڈورٹزمنٹ کے لیے اپنے پیر صاحب کے بارے نہ صرف خواب گھڑتے ہیں بلکہ کرامتیں بھی وضع کی جاتی ہیں۔ اللہ

---

[1] صحيح البخاري، كِتَابُ التَّعْبِيرِ، بَابُ المُبَشِّرَاتِ 31/9

کے جنتی بندے تو وہ ہیں جو اپنے مبشرات کو چھپاتے ہیں اور لوگوں میں بیان کر کے جھوٹا مقام حاصل کرنے کی خواہش نہیں رکھتے بلکہ وہ تو اپنے مبشرات کو شبہ کی نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں کہ معلوم نہیں شیطان کی طرف سے نہ ہوں اور ہمیں شیطان نے کسی دھوکے میں ڈالنے کی کوشش نہ کی ہو۔

بعض لوگوں کو اللہ کے رسول ﷺ کی زیارت نصیب ہوتی ہے تو اس بارے آپ ﷺ کا فرمان ہے کہ جس نے مجھے خواب میں دیکھا تو اس نے مجھے ہی دیکھا ہے۔ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«مَنْ رَآنِي فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَآنِي، فَإِنَّ الشَّيْطَانَ لَا يَتَمَثَّلُ بِي»[1]

”جس نے مجھے خواب میں دیکھا تو اس نے مجھے ہی خواب میں دیکھا کہ شیطان میری صورت اختیار نہیں کر سکتا ہے۔“

البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص نے اللہ کے رسول ﷺ کے بارے کوئی خواب نہ دیکھا ہو لیکن وہ لوگوں میں شہرت حاصل کرنے کے لیے یہ جھوٹ بولے کہ اسے اللہ کے رسول ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی ہے۔لہذا ہمارے پاس تصدیق کا کوئی ایسا ذریعہ نہیں ہے کہ جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ کسی شخص کو واقعتاً خواب میں اللہ کے رسول ﷺ کی زیارت ہوئی ہے یا نہیں؟ مبشرات انسان کی اپنی ذات کی حد تک تو ایک خوشخبری ہو سکتے ہیں لیکن دوسروں نے جب کسی کے بارے رائے قائم کرنی ہے تو اس کا ایک ہی معیار ہے اور وہ اس کا ظاہر شریعت پر عمل پیرا ہونا ہے۔

اب اگر کسی شخص کو اللہ کے رسول ﷺ خواب میں آئیں اور اسے شک ہو جائے کہ یہ اللہ کے رسول ﷺ ہی تھے یا اسے کوئی وہم لاحق ہوا ہے تو اس بارے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اگر اللہ کے رسول ﷺ کے خواب میں نظر آنے پر خشوع کی کیفیات حاصل ہوں تو اس نے واقعتاً اللہ کے رسول ﷺ ہی کو خواب میں دیکھا ہے۔مثال کے طور کسی صاحب نے اللہ کے رسول ﷺ کو خواب میں دیکھا تو ایک دو دن تک اس زیارت کے نتیجے میں

[1] صحيح مسلم، كتاب الرُّؤْيَا بَابُ قَوْلِ النَّبِيِّ عَلَيْهِ الصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ مَنْ رَآنِي فِي الْمَنَامِ فَقَدْ رَآنِي، 1775/4

ان پر مسلسل گریہ کی کیفیت طاری رہی کہ جس میں ہر وقت آنکھوں سے آنسو جاری رہتے تھے اور سینہ جیسے نور سے بھر دیا گیا ہو۔

اس قسم کے مبشرات بعض اوقات کسی جماعت کے ساتھ وابستہ لوگوں کو بھی ہوتے ہیں۔ اگر تو کسی مذہبی جماعت کے کارکنان جھوٹے خوابوں کے بیان کے ذریعے اپنی جماعت کی ایڈورٹزمنٹ نہیں چاہ رہے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ عزوجل اپنے کمزور بندوں کے بارے یہ چاہتے ہیں کہ اس قسم کے جماعتی مبشرات کے نتیجے میں وہ کسی ایسی دینی جماعت کے ساتھ وابستہ ہو جائیں کہ جس میں خیر کا پہلو غالب ہو اور اس وابستگی کے نتیجے میں زمانے کے فتنوں سے بچ جائیں۔ ان مبشرات کا ہر گز یہ مقصد نہیں ہوتا کہ وہ اکیلی ہی ایسی جماعت ہے جو اللہ کی نظر میں پسندیدہ ہے۔ اس قسم کا خیال بھی اللہ کی پناہ کو واجب کر دیتا ہے۔ اور شیاطین کے اس قسم کے وسوسوں سے پناہ مانگنے کے بہترین نبوی الفاظ یہ ہیں کہ جن کے ساتھ صبح وشام تین مرتبہ اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے:

«أَعُوذُ بِكَلِمَاتِ اللَّهِ التَّامَّةِ، مِنْ غَضَبِهِ وَعِقَابِهِ، وَشَرِّ عِبَادِهِ، وَمِنْ هَمَزَاتِ الشَّيَاطِينِ وَأَنْ يَحْضُرُونِ»[1]

"میں اللہ کی پناہ مانگتا ہوں پورے ہو کر رہنے والے کلمات کے ساتھ، اس کے غضب اور عذاب سے، اس کے بدترین بندوں سے، اور شیاطین کے وسوسوں سے، اور اس بات سے کہ وہ شیاطین میرے پاس آئیں۔"

کرامت اور عقیدت

مجھے حضرت حسین احمد مدنی رحمہ اللہ کا ایک واقعہ انہی کی زبانی پڑھ کر بڑی حیرانی ہوئی کہ ہم نے جو واقعہ حضرت مدنی رحمہ اللہ کی کرامت کے طور کئی بار سنا تھا کہ اُنہوں نے مالٹا کی اسیری کے زمانے میں رمضان شریف میں ایک ماہ میں قرآن مجید یاد کر لیا تھا، خود اُنہوں نے اپنی ایک تحریر میں اس واقعے کا انکار کیا ہوا تھا۔ اُن کی زندگی میں ہی اُن کی یہ کرامت اس قدر معروف ہو گئی تھی کہ اُنہیں اس کا انکار کرنا پڑا کہ ایسی ویسی کوئی کرامت

[1] الموطأ، باب مَا يُؤْمَرُ بِالتَّعَوُّذِ، 1386/5

مجھ میں نہیں ہے۔[1]

اسی طرح حضرت تھانوی رحمہ اللہ کی جو کتابت مولانا دریابادی رحمہ اللہ سے ہوئی ہے تو اس میں مولانا دریابادی رحمہ اللہ نے حضرت تھانوی رحمہ اللہ سے اصرار کیا کہ آپ صاحب کشف ہیں اور مجھے بتلادیں کہ آپ صاحب کشف ہیں۔ حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے جواب میں لکھا کہ لوگوں نے عام کر دیا، میں آپ کو سچ بتلا رہا ہوں کہ میں صاحب کشف نہیں ہوں، میں اس پر قسم کھانے کو بھی تیار ہوں لیکن آپ یقین نہیں کریں گے کیونکہ اس وقت آپ میرے بارے یہی سمجھنے کے موڈ میں ہیں۔

دو بزرگ علماء کے یہ واقعات اس بات کی دلیل ہیں کہ کرامات کیسے وجود میں آتی ہیں؟ امر واقعہ یہ ہے کہ حکایات اولیاء کے نام سے جس قدر دیومالائی کرامات تصوف کی کتابوں میں نقل ہو گئی ہیں، انبیاء کے معجزات ان کے سامنے حقیر معلوم ہوتے ہیں۔ یہ کرامات دراصل پیروں کی نہیں بلکہ مریدوں کی ہیں کہ انہوں نے اپنے پیر کی زندگی میں ہی اس کے نام سے وہ باتیں عام کر دیں کہ خود پیر صاحب بھی ان کا انکار کرنا چاہیں گے تو لوگ یقین نہ کریں گے۔

اس کا تعلق انسان کی نفسیات سے بھی ہے۔ انسان جس سے متاثر ہونا چاہتا ہے، اسے مافوق الفطرت انسان (super man) کے روپ میں دیکھنا چاہتا ہے۔ مغرب کی فلم انڈسٹری بھی اسی انسانی کمزوری کی بنیاد پر سپر مین، اسپائیڈر مین، بیٹ مین، آئرن مین اور معلوم نہیں کیسے کیسے مافوق الفطرت کرداروں کے ذریعے بلین ڈالرز کا کاروبار کر رہی ہے۔ اولیاء اللہ کی مافوق الفطرت قسم کی کرامات اور حکایات بھی دراصل مذہبی کاروبار ہی ہے جو کسی صالح شخص کی وفات کے بعد اس کی ناخلف اولاد اس کا مزار بنا کر اور اس کی گدی سنبھال کر کرتی ہے۔ اور اب اس ناخلف جانشین اور خلیفہ مجاز میں وہ اخلاق اور کردار تو ہوتا نہیں کہ جس کی وجہ سے کوئی نذر اور نذرانے آئیں تو پھر اس گدی سے

[1] عبد القیوم حقانی، مولانا، سوانح شیخ الاسلام حسین احمد مدنی، القاسم اکیڈمی، نوشہرہ، 2005ء، ص 45

متعلق اکابر اولیاء کے بارے ایسی حکایات گھڑی جاتی ہیں کہ جن سے ان کے سپر مین ہونے کے یقین میں اضافہ ہو اور سلسلے کے مریدوں زیادہ سے زیادہ ہوں تاکہ گدی نشین پیر صاحب کا کاروبار خوب ترقی کرے۔

پاکستان کی بڑی بڑی گدی نشین کون سے ہیں؟ سارے سیاست دان ہیں۔ ایک طرف مذہب کے نام پر لوگوں کو بے وقوف بنا کر اپنے پیچھے لگایا ہوا ہے کہ ان کا مذہبی استحصال کر رہے ہیں۔ اور دوسری طرف سیاست کے راستے ان کی دنیا بھی اپنے قدموں میں ہے۔ شاہ محمود قریشی، مخدوم امین فہیم، یوسف رضا گیلانی اور پیر پگاڑا وغیرہ کون لوگ ہیں؟ ان کا دینداری سے کیا اور کتنا تعلق ہے؟ لیکن جن درباروں کے یہ گدی نشین ہیں، ان سے وابستہ مریدوں کی تعداد لاکھوں میں ہے۔ یہی لوگ ہیں کہ عوام کی دنیا بھی خراب کر رہے ہیں اور ان کی آخرت بھی تباہ کر چکے ہیں۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُولُونَ يَا لَيْتَنَا أَطَعْنَا اللَّـهَ وَأَطَعْنَا الرَّسُولَا ﴿66﴾ وَقَالُوا رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَأَضَلُّونَا السَّبِيلَا ﴿67﴾ رَبَّنَا آتِهِمْ ضِعْفَيْنِ مِنَ الْعَذَابِ وَالْعَنْهُمْ لَعْنًا كَبِيرًا﴾ [الأحزاب: 68]

"اور اہل جہنم کہیں گے: اے رب ہمارے، ہم نے اپنے پیشواؤں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں سیدھے راستے سے ہٹا دیا۔ اے ہمارے رب، ان کو دوہرا عذاب دے اور ان پر سخت لعنت کر۔"

صوفیاء کی شطحیات

شطحیات (ecstatic utterance) سے مراد صوفیاء کی وہ گنجلک باتیں ہیں کہ جو ان سے بے خودی اور مدہوشی کے عالم میں صادر ہوں اور خود ان کی اپنی سمجھ سے بھی بالاتر ہوں۔ صوفیاء کی ان باتوں کا خود صوفیاء کے حلقوں میں اعتبار نہیں کیا جاتا اور ان باتوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مصدر شیطان ہوتا ہے یعنی یہ شیطان کی طرف سے صوفی کے دل میں اس وقت القاء کی جاتی ہیں جبکہ اسے اپنے نفس پر قابو حاصل نہیں ہوتا اور وہ وجد اور سکر کی کیفیت میں ہوتا ہے۔ صوفیاء کی ایسی باتوں کی ہر گز

تاویل نہیں کرنی چاہیے کہ ان کی تاویل کرنا بھی ایمان کے منافی ہے بلکہ ان باتوں پر شدید نکیر کرنی چاہیے کہ یہ نہی عن المنکر کا مقام ہے۔

شیخ ابن عربی نے اپنی کتاب فصوص الحکم میں "خاتم الاولیاء" کو "خاتم الانبیاء" سے افضل قرار دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ تمام انبیاء اور رسول خاتم الاولیاء سے استفادہ کرتے ہیں۔ شیخ کی عبارت ہے:

وليس هذا العلم [أي علم التوحيد الوجودي] إلا لخاتم الرسل وخاتم الأولياء، وما يراه أحد من الأنبياء والرسل إلا من مشكاة الرسول الخاتم، ولا يراه أحد من الأولياء إلا من مشكاة الولي الخاتم، حتى أن الرسل لا يرونه — متى رأوه — إلا من مشكاة خاتم الأولياء.[1]

"توحید وجودی کا علم صرف خاتم الرسل اور خاتم الاولیاء کے پاس ہے۔اور تمام انبیاء اور رسول یہ علم خاتم الرسل کے سینے سے حاصل کرتے ہیں اور تمام ولی یہ علم خاتم الاولیاء کے سینے سے حاصل کرتے ہیں۔ بلکہ رسول بھی جب اس توحید کا مشاہدہ کرتے ہیں تو خاتم الاولیاء کے سینے سے کرتے ہیں۔"

خاتم الاولیاء سے ابن عربی کی کیا مراد ہے۔ تو اس بارے ابن عربی کا ذہن تو واضح ہے کہ ان کی اس سے مراد وہ خود ہیں۔ وہ اپنی کتاب "فتوحات مکیہ" میں لکھتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ میں ہی خاتم الاولیاء ہوں۔[2]

البتہ ان کے شارحین نے یہ کہا ہے کہ اس سے ان کی مراد یہ ہے کہ نبی کی ولایت کی جہت، نبی کی رسالت کی جہت سے افضل ہے۔ اگرچہ یہ شیخ ابن عربی کی بات نہیں ہے، لیکن ایک مزعومہ علمی نکتے کے طور اس بات کا بھی تجزیہ کریں تو انتہائی سطحی بات معلوم ہوتی ہے۔ نبی اپنی ولایت کی جہت میں بھی رسول ہی ہوتا ہے۔ رسول کی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں ہوتا کہ جس میں اس کی رسالت منقطع ہو جائے یا وہ مانند پڑ جائے یا وہ

---

[1] ابن عربي، محي الدين محمد بن علي الأندلسي، فصوص الحكم، دار الكتاب العربي، بيروت، ص 62

[2] أنا ختم الولاية دون شك لورثي الهاشمي مع المسيح [ابن عربي، محي الدين محمد بن علي الأندلسي، الفتوحات المكية، الهيئة المصرية العامة، مصر، 1975ء، 71/4]

دیگر جہات سے مغلوب ہو جائے۔

رسول کی زندگی میں ہر لمحہ رسالت کی جہت ان کی دیگر تمام جہات پر غالب رہتی ہے، چاہے وہ بشریت کی جہت ہو یا ولایت کی یا کوئی اور۔ رسول جب مصلے پر کھڑا ہو کر خالق کی طرف یکسو ہوتے ہوئے تقرب الی اللہ کی منازل طے کر رہا ہو تو اس وقت بھی رسول ہوتا ہے اور جب وہ بازاروں میں لوگوں کو اللہ سے قریب کرنے کے لیے مخلوق کی طرف متوجہ ہو تو وہ اس وقت بھی رسول ہوتا ہے۔

رسول کی ولایت کا اس کی رسالت سے کیا تقابل؟ رسول کو یہ مقام اور مرتبہ رسالت کی وجہ سے ملا ہے نہ کہ ولایت کے سبب سے۔ اللہ عزوجل نے رسول ﷺ کو "یأیها الرسول" اور "یأیها النبي" کہہ کر کے قرآن مجید میں خطاب فرمایا ہے نہ "یأیها الولي"۔

صوفی اور سلفی

اکثر صوفیوں کو دیکھا ہے کہ بڑے بڑے دعوے کرتے ہیں، مثلاً ایک پیر طریقت مدظلہ تعالی نے سلفیوں کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ہم نے ہزاروں متقی اور پرہیزگار پیدا کیے تم نے کیا پیدا کیا ہے؟

اللہ معاف فرمائے! یہ اِس زعم کے ساتھ بات کرتے ہیں جیسے اللہ سے متقی اور صالح ہونے کا سرٹیفکیٹ جیب میں لیے بیٹھے ہوں۔ بھئی! ان معاملات میں اللہ سے ڈرنا چاہیے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی کا مطالعہ کریں تو وہ ایسے سپر مین نہیں تھے جیسے اولیاء اللہ کی حکایات میں دکھائے جاتے ہیں، وہ عام انسانوں جیسے معلوم ہوتے ہیں کہ جو تقویٰ اور اصلاح کا شوق رکھنے والے تھے۔

متقی کون ہے؟ کل حشر میں کس کا کیا مقام ہے؟ صوفی آگے ہو گا یا سلفی؟ تصوف کی تائید کرنے والے اللہ کے مقربین میں سے ہوں گے یا اس کی مخالفت کرنے والے۔ یہ اللہ بہتر جانتا ہے، اس بارے اس دنیا میں یقین سے بات کرنا مشکل ہے۔ بلکہ قیامت والے دن تو بڑے بڑے برج الٹ جائیں گے۔

تصوف کے پر نقد کرنے والے سلفی علماء بھی ایسے ہو سکتے ہیں کہ مجلس میں نقد کرنے کے بعد تنہائی میں اپنی نقد پر رونے والے ہیں اور اللہ سے اس بارے آہ وزاری کرنے والے ہیں کہ پروردگار! ہمیں کیا معلوم کہ جن پر ہم نقد کر رہے ہیں، وہ قیامت والے دن ہم سے زیادہ مقرب ہوں لیکن ہمیں تو بس جو منکر معلوم ہوتا ہے، ہم اس پر تنبیہ کرتے ہیں اور رد کرتے ہیں۔

صوفیوں کو اپنی نیکی اور تقوی کا زعم ہو سو ہو کہ یہ ان کا خاص میدان ہے لیکن کم از کم غیر صوفیوں کو تقوی اور نیکی میں حقیر تو نہ سمجھیں۔ حال ہی کے سلفیوں میں بھی ایسے علماء موجود ہیں کہ جن کی ساٹھ سال سے تہجد قضا نہیں ہوئی۔ وہ سلفی اہل علم بھی ہیں کہ جن سے پوچھا گیا کہ اللہ کے رسول ﷺ کی زیارت نصیب ہوئی ہے؟ تو انہوں نے جواب میں کہا کہ جس ہفتہ زیارت نہ ہو تو دل مضطرب اور بے چین ہو جاتا ہے۔ ان میں سے وہ سلفی اہل علم بھی ہیں کہ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے تھے تو پورے وجود پر لرزہ طاری ہو جاتا۔ اور وہ بھی سلفی اہل علم ہی تھے کہ جن کی نماز دیکھنے کے لیے خلق خدا سفر کرتی تھی۔ اور وہ بھی سلفی اہل علم میں سے ہیں کہ جنہوں نے مسجد کے صحن میں نماز کی نیت باندھی اور طوفانی بارش کی وجہ سے سوائے دو مقتدیوں کے سارے بھاگ گئے اور انہوں نے سلام پھیرنے کے بعد پہلا جملہ کہا کہ بارش ہوئی ہے اور عبداللہ کو پتہ بھی نہیں چلا۔ اگر صوفیاء میں غوث، قطب اور ابدال موجود ہیں تو سلفیہ میں بھی بہت سے لوگ ہیں کہ جنہیں قرآن مجید اور حدیث کی اصطلاح میں "عباد الرحمن" اور "اہل القرآن" کہا جا سکتا ہے۔

صوفیاء کو دنیا میں شیخ اکبر کے رتبے پر فخر کرنے سے کیا حاصل کہ قیامت کے دن اگر ایک مخلص سلفی ان سے آگے کھڑا ہو۔ اور اس کے برعکس سلفیوں کو شیخ الاسلام کے مقام پر اِترانے کا کیا فائدہ کہ اگر کوئی مخلص زاہد قیامت والے دن ان سے آگے ہوا۔

ہماری رائے میں صوفیوں اور سلفیوں میں نظریات پر بحث ہونی چاہیے کہ کیا درست ہے اور کیا غلط ہے؟ باقی رہے یہ دعوے کہ ہم نے تو تزکیہ کر لیا ہے، اور تم نے کیا ہے؟ اور

اپنے بارے سارے مبشرات اور دوسروں کے بارے ساری وعیدیں جمع کر لیں ہیں، تو یہ درست نہیں ہے۔ امید واثق تو یہی ہے کہ قیامت والے بہتے سادہ لوح، ان پڑھ، دیہاتی مرید کہ جنہیں کوئی نہیں جانتا تھا، پیر طریقت، قطب عالم اور خاتم الاولیاء سے زیادہ مقربین کی فہرست میں ہوں گے۔

قرآن مجید نے تزکیہ نفس کا حکم دیا ہے اور اللہ کے رسول ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تزکیہ فرمایا ہے لیکن معلوم نہیں لوگوں نے تزکیہ کو کیا پہاڑ سمجھ رکھا ہے کہ جب تک بندہ ہوا میں اڑنا نہ شروع کر دے، اس وقت تک اس کا تزکیہ مشکوک رہتا ہے۔ بھئی! اگر آپ فرائض پر عمل پیرا ہیں، حرام سے بچتے ہیں، نوافل کا اہتمام کرتے ہیں، اخلاق حسنہ سے متصف ہونے اور رذائل سے اجتناب کی کوشش کرتے ہیں تو اور آپ کو کیسا تزکیہ چاہیے؟ تزکیہ کا مقصود احسان کی کیفیات کے ساتھ کتاب وسنت پر عمل کرنا ہے۔ کسی کی احسان کی کیفیات ماپنے کے معیارات کیا بیعت، سماع، مراقبہ، لطائف اور وجد کی کیفیات ہیں یا فرائض اور نوافل پر عمل سے پیدا ہونے والے احوال؟

❁❁❁❁❁❁❁

باب یاز دہم

اخلاق اور رذائل

اس باب میں اخلاق اور رذائل کے ضمن میں تزکیہ وطہارت، اخلاص وریاء، تکبر وتواضع، حسد ومحبت، عجلت وقناعت، شکر وصبر، حیاء، شجاعت، خوش مزاجی اور اللہ سے محبت کے مضامین کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

تزکیہ نفس میں قلب کا کردار

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ تزکیہ نفس میں انسان کے دل کی بجائے اس کے دماغ کا کردار بہت اہم ہے۔ مولانا وحید الدین خان صاحب لکھتے ہیں:

"دوسرے لفظوں میں یہ کہ قرآن کا تزکیہ مبنی بر عقل تزکیہ ہے، نہ کہ مبنی بر قلب تزکیہ۔ اس سلسلے میں "قلب" کا لفظ قرآن اور حدیث میں لٹریری معنوں میں استعمال کیا گیا ہے، نہ کہ سائنسی معنوں میں۔ بعد کے زمانے میں، صوفیا کے اثر سے مسلمانوں میں مبنی بر قلب تزکیہ کا تصور رائج ہو گیا۔ اِس تصور کے تحت یہ سمجھ لیا گیا کہ انسان کا قلب تمام ربانی حقیقتوں کا خزانہ ہے۔ مراقبہ کے ذریعے اِس خزانہ تک پہنچو، اور پھر تم کو وہ چیز حاصل ہو جائے گی جس کو اسلام میں تزکیہ کہا گیا ہے۔ مگر مبنی بر قلب تزکیہ کا یہ تصور قرآن سے ماخوذ نہ تھا، بلکہ اس کا ماخذ تاریخ تھا۔ قدیم زمانے سے چوں کہ مبنی بر قلب روحانیت کا تصور لوگوں کے درمیان چلا آ رہا تھا، اِس کے زیر اثر مضاہات کے طور پر لوگوں نے اِس کو اسلام میں داخل کر دیا۔ جدید سائنس نے وہ علمی بنیاد فراہم کر دی ہے جس کے تحت اسلامی تزکیہ کو دوبارہ مبنی بر دماغ تزکیہ کے طور پر زندہ کیا جائے۔ جدید تحقیقات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ انسان کا قلب خون کی گردش کے لیے صرف ایک پمپ کا کام کرتا ہے، قلب کے اندر سوچنے کی صلاحیت موجود نہیں۔ سوچنے کی صلاحیت تمام تر صرف دماغ میں ہے۔ انسان کی زندگی کے تمام افعال سوچنے کے ذریعہ وجود میں آتے ہیں۔ تزکیہ کا معاملہ کوئی مستثنیٰ (exception) معاملہ نہیں۔ تزکیہ کا مقصد بھی دماغ کی سطح پر سوچنے کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، نہ کہ قلب پر مفروضہ توجہ دینے سے۔ قلب پر توجہ دینا، اتنا ہی زیادہ بے بنیاد ہے، جتنا کہ حصول تزکیہ کے لیے ناخن یا بال پر توجہ دینا۔"[1]

خان صاحب کا یہ دعویٰ کہ کتاب وسنت کے تزکیہ نفس کے تصور کی بنیاد قلب

---

[1] وحید الدین خان، مولانا، ماہنامہ الرسالہ، فروری 2011ء، اسلامی مرکز، نیو دہلی، ص 13

(Heart) نہیں ہے، خود کتاب وسنت کی صریح تعلیمات کے خلاف ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

((أَلَا وَإِنَّ فِي الْجَسَدِ مُضْغَةً، إِذَا صَلَحَتْ، صَلَحَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، وَإِذَا فَسَدَتْ، فَسَدَ الْجَسَدُ كُلُّهُ، أَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ))[1]

"خبردار! اور جسم انسانی میں ایک عضو ہے۔ جب وہ درست ہو جائے تو پورا جسم درست ہو جاتا ہے اور جب وہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے۔ جان رکھو! وہ عضو قلب ہے۔"

اللہ کے رسول ﷺ نے قلب انسانی کو انسان کے بناؤ وبگاڑ کی بنیاد قرار دیا ہے۔ آسان الفاظ میں اللہ کے رسول ﷺ کے فرمان کے مطابق صالح انسان وہ ہے کہ جس کا قلب صالح بن جائے اور فاسد انسان وہ ہے کہ جس کا قلب فاسد ہو جائے۔ پس اسلام میں تزکیہ نفس کی بنیاد قلب ہے۔ کتاب وسنت میں قلب کا لفظ اُسی معنی میں استعمال ہوا ہے جسے ہم سائنسی معنی میں دل (Heart) کہتے ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کی ایک روایت کے الفاظ ہیں:

((إِنَّ اللهَ لَا يَنْظُرُ إِلَى أَجْسَادِكُمْ، وَلَا إِلَى صُوَرِكُمْ، وَلَكِنْ يَنْظُرُ إِلَى قُلُوبِكُمْ وَأَشَارَ بِأَصَابِعِهِ إِلَى صَدْرِهِ))[2]

"اللہ تعالیٰ تمہارے اجسام اور شکلوں کو نہیں دیکھتے بلکہ تمہارے قلوب کو دیکھتے ہیں اور اللہ کے رسول ﷺ نے اس کے بعد اپنی انگلیوں سے اپنے سینے کی طرف اشارہ کیا۔"

پس اللہ کے رسول ﷺ نے جسم انسانی میں اُس قلب کا مقام بھی متعین کر دیا کہ جو اصلاح نفس کی بنیاد ہے۔ آپ نے اِس کے تعین کے لیے سینے کی طرف اشارہ کیا۔ اسی طرح ایک اور روایت کے الفاظ ہیں:

((الْمُسْلِمُ أَخُو الْمُسْلِمِ، لَا يَظْلِمُهُ وَلَا يَخْذُلُهُ، التَّقْوَى هَاهُنَا وَيُشِيرُ

---

[1] صحیح مسلم، کتاب المساقاۃ، باب أخذ الحلال وترک الشبہات، 1219/3

[2] صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب تحریم ظلم المسلم، 1986/4

إِلَى صَدْرِهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ))[1]

"مسلمان، مسلمان کا بھائی ہے۔ وہ نہ تو اُس پر ظلم کرتا ہے اور نہ ہی اسے رُسوا کرتا ہے اور نہ ہی اُسے حقیر خیال کرتا ہے۔ تقویٰ یہاں ہے اور اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے سینے کی طرف تین دفعہ اشارہ فرمایا۔"

روایت کا سیاق (context) بتا رہا ہے کہ رویوں (attitudes) کی اصلاح کی بات ہو رہی ہے اور آپ نے اس اصلاح کے لیے تقویٰ کو بنیاد بنایا ہے۔ اور رویوں کی اصلاح تقویٰ کے بغیر ممکن نہیں ہے اور تقویٰ کا مقام انسان کا قلب ہے اور اس کے لیے آپ نے سینے کی طرف تین مرتبہ اشارہ فرمایا۔

انسان کے بارے جدید علوم (Humanities) میں سے سائیکالوجی سے یہ اُمید کی گئی تھی کہ شاید وہ نفس انسانی کی اصلاح کے حوالہ سے کوئی بڑا کارنامہ سرانجام دے گا لیکن چونکہ جدید نفسیات بھی مغربی فلسفے (Western Philosophy) کی کوکھ سے برآمد ہوئی ہے کہ جس میں فرانسیسی فلسفی رینے ڈیکارٹ (Descartes 1596-1650) کے جملے "I think, therefor I am" سے شروع ہونے والی عقل پرستی (Rationalism) کو تقریباً خدا کا درجہ حاصل ہو چکا ہے لہٰذا جدید نفسیات کا یہ المیہ ہے کہ یہاں بھی اصلاح نفس کی کل بنیاد انسانی ذہن ہے۔

پس نفسیات میں رویوں کی اصلاح کا اصل موضوع بھی انسانی ذہن بن گیا بلکہ اس قدر غلو ہوا ہے کہ انسانی احساسات اور جذبات (Feelings and Emotions) کو بھی انسانی ذہن کی پیداوار مان لیا گیا اور وہ لوگ بیوقوف (idiot) قرار پانے لگے کہ جن کا یہ خیال ہو کہ اُن کے جذبات کا مخزن اُن کا دل ہے۔ إنا لله وإنا إليه رجعون۔

یہ تحقیق کچھ آگے بڑھی تو بعض مذہبی اسکالرز نے تو انسانی دماغ میں بھی ایک چھوٹا سا قلب تلاش کر لیا اور بعض کو قلبِ انسانی میں ایک چھوٹا سا دماغ نظر آنے لگا۔ اِن

[1] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة والآداب، باب تحریم ظلم المسلم، 1986/4

دونوں قسم کے اسالیب (approaches) میں اصل بنیاد عقل پرستی ہے۔ مغرب میں اِس وقت انسانی جسم میں عقل کا افضل اور اشرف ترین حصہ ہونا ایک ایسا مسلّمہ اَمر بن چکا ہے کہ اِس سے انکار کرنے والے بیوقوف کہلانے لگے ہیں۔

اسلامی علم النفس (Islamic Psychology) کا موضوع ہی بالکل اور ہے اور اِس کی ابتداء اور انتہاء قلب ہے۔ علم فلسفہ کی تاریخ پر ایک نظر دوڑا لیں اور سقراط (Socrates 469-399 BC) سے لے کر برٹرینڈ رسل (Bertrand Russell 1872-1970) تک دیکھ لیں کہ کتنے ہیں کہ جنہیں اُن کی عقل نے اِس یقین تک پہنچا دیا ہو کہ اِس دنیا کا ایک خالق (Creator) ہے۔ یہ تو اصحابِ عقل کا اختلاف ہے۔ دوسری طرف اصحابِ قلب کو دیکھیں یعنی انبیاء و رسل کی جماعت کو تو آدم علیہ السلام سے لے کر محمد ﷺ تک سب کے سب ایک ہی فکر یعنی عقیدہ توحید پر نہ صرف متفق نظر آتے ہے بلکہ اُس کے داعی بھی ہیں۔

وحی نبی کریم ﷺ کے قلب پر نازل ہوتی تھی نہ کہ عقل پر۔ اگر اللہ کی نظر میں عقل کی اہمیت زیادہ ہوتی تو وحی الٰہی کے نزول کا مقام عقل ہوتی۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَإِنَّهُ لَتَنزِيلُ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿192﴾ نَزَلَ بِهِ الرُّوحُ الْأَمِينُ ﴿193﴾ عَلَىٰ قَلْبِكَ لِتَكُونَ مِنَ الْمُنذِرِينَ﴾ [الشعراء: 194]

”اور یہ قرآن مجید رب العالمین کی طرف سے نازل کردہ ہے۔ اِس کو رُوح الامین نے نازل کیا ہے آپ ﷺ کے قلب پر تاکہ آپ ڈرانے والوں میں سے ہو جائیں۔“

انسانی عمل کا اصل محرک (motive) اُس کا وہ جذبہ ہے کہ جو اُس کے قلب میں پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا انسان کی کل حرکت کی وجہ اس کا قلب ہے۔ ایمان، یقین، اخلاص، تقوی، محبت، مودت، الفت، خوف، اُمید، شکر، رضا، ورع، انابت، خشوع، توکل، صبر، ارادہ، نفرت، بغض، کینہ، غصہ، غیظ، غضب، عداوت، کفر اور نفاق وغیرہ انسانی دل کے اعمال ہیں نہ کہ دماغ کے۔

کتاب و سنت کی نصوص میں اِن اعمال کی نسبت قلب انسانی کی طرف کی گئی ہے اور

کسی انسان کی اصلاح اور بگاڑ میں اِن اعمال کی اہمیت سے انکار کسی طور ممکن نہیں ہے۔ پس قلب کی اصلاح کے بغیر نفس انسانی کی اصلاح کا تصور سراسر ایک غیر اسلامی تصور ہے اور وہم سے زیادہ اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَتَكُونَ لَهُمْ قُلُوبٌ يَعْقِلُونَ بِهَا أَوْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا فَإِنَّهَا لَا تَعْمَى الْأَبْصَارُ وَلَٰكِن تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ﴾ [الحج: 46]

"کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں، کہ اُن کے دل ہوتے کہ جن سے وہ سمجھتے، اُن کے کان ہوتے کہ جن سے وہ سنتے۔ بلاشبہ آنکھیں اندھی نہیں ہوتیں بلکہ وہ دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں میں ہیں۔"

اِس آیت مبارکہ میں ﴿الَّتِي فِي الصُّدُورِ﴾ کے الفاظ نے قلوب کا معنی نص صریح کی طرح واضح کر دیا ہے کہ قلوب سے اللہ کی مراد وہ دل ہیں جو سینے میں ہوتے ہیں۔ اِسے اُصول فقہ کی اصطلاح میں کہتے ہیں کہ متکلم نے اپنے کلام کی خود ہی تفسیر کر دی ہے اور جب متکلم اپنے کلام کی تفسیر کر دے تو وہ کلام مفسر (explicit) بن جاتا ہے کہ جس میں مخاطب (addressee) کی طرف سے کسی بھی قسم کی تاویل کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے۔

دوسری اہم بات یہ ہے کہ اِس آیت مبارکہ میں تعقل[1] کی نسبت قلوب کی طرف کی گئی ہے جو کہ افعال قلوب میں سے ایک فعل ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا﴾ [محمد: 24]

"وہ قرآن مجید پر تدبر کیوں نہیں کرتے۔ کیا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہیں۔"

اِس آیت مبارکہ میں تدبر کی نسبت قلب کی طرف کی گئی ہے۔ اِسی طرح شیطان جو انسان کا ازلی دشمن ہے اور اس کا کام ہی انسان کی اصلاح میں رکاوٹ ڈالنا ہے، اُس کے طریقہ واردات کے بارے ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿الَّذِي يُوَسْوِسُ فِي صُدُورِ النَّاسِ﴾ [الناس: 5]

---

[1] quality to differentiate between right and wrong, good and evil

”جو لوگوں کے سینوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔“

اِس آیت میں شیطان کے انسانی قلب میں وسوسہ ڈالنے کا بیان ہے اور قلب بھی وہ جو سینے میں ہوتا ہے۔ پس اِس سے معلوم ہوا کہ انسان کی اصلاح و بگاڑ میں اصل کردار قلب کا ہے نہ کہ عقل کا۔ عقل کا کردار ثانوی اور تابع کی حیثیت سے ہے۔

شیخ محمد بن ابراہیم التویجری کی کتاب ”موسوعة فقه القلوب“ اعمال قلوب پر ایک عمدہ کتاب ہے۔ اس موضوع پر مزید مطالعہ کے لیے قرآنی مقامات میں سے درج ذیل ﴿الأنفال:24﴾، ﴿الحجرات:3﴾، ﴿التغابن:11﴾، ﴿ق:33﴾، ﴿البقرة:74﴾، ﴿الحج:54﴾، ﴿محمد:24﴾، ﴿الأعراف:179﴾ اور ﴿البقرة:283﴾ کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

طہارت اور صفائی

طہارت اور صفائی دو قسم کی ہے۔ ایک ظاہری اور دوسری باطنی۔ اسلام میں دونوں مطلوب ہیں۔ انسان اگر ظاہری طور صاف ستھرا رہے تو اُس کا ایک اچھا اثر اُس کے باطن پر پڑتا ہے اور اگر انسان کا باطن اچھا ہو تو اُس کا ایک اچھا اثر اُس کے ظاہر پر پڑتا ہے۔ اللہ عزوجل نے ظاہری طہارت کے لیے وضو کا حکم دیا لیکن اگر پانی میسر نہ ہو تو مٹی یا ریت سے تیمم کا حکم دیا ہے۔ وضو کی صورت میں ظاہری اعضاء کی طہارت ہے جبکہ تیمم کی صورت میں باطن کی طہارت ہے۔ اگر ایک شخص نجس ہے اور وہ مٹی یا ریت میں ہاتھ مار کر اپنے چہرے پر مل لیتا ہے تو اس سے اس کے دل سے تکبر جاتا رہے گا پس تیمم کی صورت میں اسے باطنی طہارت حاصل ہوئی یعنی دل کی طہارت۔

پس اسلام میں قلب اور اعضاء دونوں کی طہارت کے لیے احکام نازل کیے گئے ہیں۔ دل صاف نہ ہو تو ظاہری طہارت کا کچھ خاص فائدہ نہیں اور اگر ظاہر میں نجاست لگی ہو اور انسان اپنے دل کے صاف ہونے کا دعویدار ہو تو یہ بھی ایمان کے منافی نہیں ہے۔ طہارت اور صفائی کی اس قدر اہمیت ہے کہ اسے نصف ایمان قرار دیا گیا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي مَالِكٍ الْأَشْعَرِيِّ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «الطُّهُورُ شَطْرُ الْإِيمَانِ»[1]

”حضرت ابو مالک اشعری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: طہارت اور صفائی نصف ایمان ہے۔“

طہارت کو ایمان کی شاخ قرار دینے میں ایک نکتہ یہ بھی ہے کہ طہارت کا اصل تعلق انسان کے دل سے ہے کہ ایمان تو دل میں ہوتا ہے۔ پس پہلے دل پاک ہوتا ہے اور پھر جسم کی صفائی بھی ضروری ہے۔ اور دل کی طہارت یہ ہے کہ اسے کفر، شرک، شک، نفاق، سرکشی، ریاء، تکبر، حسد، بغض، کینہ، سختی، عداوت، بخل، لالچ، بے صبری، کم ہمتی، سستی، بزدلی، مایوسی، ناامیدی، جھوٹ، بے وفائی، بدگمانی، حماقت، جہالت، خیانت، غصہ، غضب، انتقام، ظلم، غفلت، غلو، بے حیائی، نجاست، وسوسہ اور وہم وغیرہ سے پاک رکھنے کے لیے مجاہدہ کرے۔ اور اس طہارت کے حاصل کرنے کے لیے اللہ کے رسول ﷺ سے منقول یہ دعا کرتا رہے:

«اللهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الْعَجْزِ، وَالْكَسَلِ، وَالْجُبْنِ، وَالْبُخْلِ، وَالْهَرَمِ، وَعَذَابِ، الْقَبْرِ اللهُمَّ آتِ نَفْسِي تَقْوَاهَا، وَزَكِّهَا أَنْتَ خَيْرُ مَنْ زَكَّاهَا، أَنْتَ وَلِيُّهَا وَمَوْلَاهَا، اللهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ، وَمِنْ قَلْبٍ لَا يَخْشَعُ، وَمِنْ نَفْسٍ لَا تَشْبَعُ، وَمِنْ دَعْوَةٍ لَا يُسْتَجَابُ لَهَا»[2]

”اے اللہ! میں کم ہمتی، سستی، بزدلی، کنجوسی، بہت زیادہ بڑھاپے اور قبر کے عذاب سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں۔ اے اللہ! میرے نفس کو متقی بنا دے اور اس کا تزکیہ کر دے کہ آپ سے بڑھ کر کون ہو سکتا ہے جو میرے نفس کا تزکیہ کر سکے۔ آپ ہی اس کے ذمہ دار اور آپ ہی اس کے مددگار ہیں۔ اے اللہ! میں آپ سے ایسے علم کی پناہ چاہتا ہوں کہ جو مجھے فائدہ نہ دے، اور ایسے

[1] صحیح مسلم، كِتَابِ الطَّهَارَةِ، بَابُ فَضْلِ الْوُضُوءِ، 203/1

[2] صحیح مسلم، کتاب الذِّكْرِ وَالدُّعَاءِ وَالتَّوْبَةِ وَالِاسْتِغْفَارِ، بَابُ التَّعَوُّذِ مِنْ شَرِّ مَا عُمِلَ وَمِنْ شَرِّ مَا لَمْ يُعْمَلْ، 2088/4

دل سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں کہ جس میں خشوع نہ ہو، اور ایسے نفس سے آپ کی پناہ چاہتا ہوں کہ جس کا پیٹ نہ بھرے، اور ایسی دعا سے آپ کی پناہ مانگتا ہوں کہ جو قبول نہ ہو۔"

اور جسم کی صفائی اور ستھرائی میں کئی ایک چیزیں شامل ہیں۔ کلی، مسواک اور ٹوتھ پیسٹ کے ذریعے اپنے منہ کی بدبو کو دور کرنا۔ منہ کی صفائی کا بہت سے لوگ دھیان نہیں کرتے لہذا جب کوئی ان سے بات چیت کر رہا ہوں تو ان کے منہ سے آنے والی بدبو سے اذیت محسوس کرتا ہے۔ منہ کی بدبو عموماً اس شخص کو نہیں محسوس ہوتی کہ جس کے منہ سے آرہی ہے جبکہ سامنے والے کو محسوس ہو رہی ہوتی ہے لہذا منہ کی صفائی کا خاص طور اہتمام کرنا چاہیے۔ منہ کی صفائی کا یہ معنی نہیں ہے کہ ایک دفعہ صبح برش کر لیا اور ایک دفعہ رات کو کر لیا۔ اس طرح کے برش کے باوجود منہ میں بدبو رہ جاتی ہے۔ منہ کی صفائی کا یہ معنی ہے کہ دن میں کم از کم پانچ مرتبہ ہر نماز کے وقت میں برش اور مسواک کا استعمال کرے۔ اور جب برش اور مسواک کرے تو خوب اچھی طرح دانتوں، زبان کے تالو اور حلق تک کو بھی صاف کرے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«يَسْتَنُّ بِسِوَاكٍ بِيَدِهِ يَقُولُ أُعْ أُعْ، وَالسِّوَاكُ فِي فِيهِ، كَأَنَّهُ يَتَهَوَّعُ»[1]

"نبی کریم ﷺ اپنے ہاتھ سے مسواک کرتے ہوئے "اع"، "اع" کی آوازیں نکالتے تھے جیسا کہ آپ ﷺ قے کر رہے ہوں اور مسواک آپ کے منہ میں ہوتی تھی۔"

احادیث میں ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ ہر نماز کے ساتھ مسواک فرماتے، جب بھی سو کر اٹھتے تو مسواک فرماتے اور جب بھی گھر میں داخل ہوتے تو مسواک فرماتے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ عَائِشَةَ أَنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «كَانَ إِذَا دَخَلَ بَيْتَهُ بَدَأَ بِالسِّوَاكِ»[2]

[1] صحيح البخاري، كِتَابُ الوُضُوءِ، بَابُ السِّوَاكِ، 58/1

[2] صحيح مسلم، كِتَابِ الطَّهَارَةِ، بَابُ السِّوَاكِ، 220/1

”حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم جب گھر میں داخل ہوتے تو سب سے پہلا کام مسواک کرتے تھے۔“

بعض اوقات اچھی طرح مسواک کرنے کے باوجود منہ میں بدبو رہ جاتی ہے تو یہ بدبو دراصل معدے کی ہوتی ہے۔ کچھ لوگوں کا ہاضمہ اچھا نہیں ہوتا کہ ان کا کھانا جلد ہضم نہیں ہوتا تو ان کے معدے سے بدبو آتی ہے۔ اور بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ ہاضمہ تو درست ہے لیکن کچھ ایسا کھا لیا ہے کہ جو جلد ہضم نہیں ہو رہا لہذا وہ کھانا منہ سے بدبو آنے کا باعث بن جاتا ہے۔ معدے کی بدبو کا آسان علاج تو یہی ہے کہ پانی زیادہ پیے اور کھانا ہضم کرنے کے لیے کھانے کے بعد اجوائن اور سونف وغیرہ استعمال کرے۔

زیر ناف کے بال مونڈنا کہ عموماً ایسے مقام پر بالوں کے بڑھ جانے سے پسینہ جمع ہو جانے کی وجہ سے بدبو پیدا ہو جاتی ہے۔ زیر بغل کے بال مونڈنا اور بدبو دور کرنا کہ عموماً یہاں بھی پسینہ زیادہ آنے کی وجہ سے بدبو پیدا ہوتی ہے۔ استنجا کرنا کہ انسان بول و براز کے بعد ان مقامات کو اچھی طرح پانی سے صاف کرے۔ اور استنجا کے بعد اگر صابن بھی استعمال کرے تو ایسے لوگوں کی اللہ نے قرآن مجید میں تعریف بیان کی ہے جو طہارت کا خوب اہتمام کرنے والے اور اس میں مبالغہ کرنے والے ہیں۔[1] ہاتھوں اور پاؤں کے ناخن کاٹنا۔ مونچھوں کے بال بڑے ہو جائیں تو انہیں کم کرنا۔ پسندیدہ یہ ہے کہ ہر جمعہ کے دن بالوں اور ناخنوں کی صفائی اور ستھرائی کا اہتمام کرے لیکن اگر کسی مصروفیت اور مجبوری کی وجہ سے وقت نہ مل سکا تو چالیس دن سے زیادہ موخر نہ کرے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

«وُقِّتَ لَنَا فِي قَصِّ الشَّارِبِ، وَتَقْلِيمِ الْأَظْفَارِ، وَنَتْفِ الْإِبِطِ، وَحَلْقِ الْعَانَةِ، أَنْ لَا نَتْرُكَ أَكْثَرَ مِنْ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً»[2]

”ہمارے لیے مونچھیں کم کرنے، ناخنوں کے کاٹنے، بغل کے بال اکھیڑنے اور زیرِ ناف بال مونڈنے میں چالیس دن کا انتہائی وقت مقرر کیا گیا۔“

---

[1] التوبة: 9: 108

[2] صحیح مسلم، كِتَابِ الطَّهَارَةِ، بَابُ خِصَالِ الْفِطْرَةِ، 222/1

اللہ کے رسول ﷺ نے ان مقامات کی صفائی اور ستھرائی کو سنن فطرت میں شمار کیا ہے کہ یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے اور دین کا حکم نہ بھی ہوتا تو لوگ اپنی صالح فطرت کے سبب ان مقامات کی صفائی اور ستھرائی کا لازماً دھیان رکھتے۔

طہارت کی معراج یہ ہے کہ انسان ہر وقت باوضو رہے اور وضو کرنے میں مبالغہ کرنے پر آخرت میں اجر وثواب رکھا گیا ہے۔ وضو میں مبالغہ یہ ہے کہ وضو کے اعضاء کو خوب اچھی طرح اور کچھ اوپر تک دھوئے کہ قیامت والے یہ اعضاء روشن ہوں گے اور نور سے خوب چمک رہے ہوں گے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«إِنَّ أُمَّتِي يُدْعَوْنَ يَوْمَ القِيَامَةِ غُرًّا مُحَجَّلِينَ مِنْ آثَارِ الوُضُوءِ، فَمَنِ اسْتَطَاعَ مِنْكُمْ أَنْ يُطِيلَ غُرَّتَهُ فَلْيَفْعَلْ»[1]

”میری امت کے لوگ قیامت والے دن میرے پاس اس حال میں لائے جائیں گے کہ ان کی پیشانیاں اور پاؤں وضو کے سبب سے خوب روشن ہوں گے۔ پس تم میں سے جو کوئی اپنے اس نور کو زیادہ کرنا چاہے تو وہ ضرور کرے۔“

جو لوگ طہارت کا اہتمام کرتے ہیں تو وہ اللہ کے محبوب بن جاتے ہیں اور اللہ ان سے محبت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید میں مسجد قبا کے نمازیوں کی تعریف کی گئی ہے اور آپ ﷺ کو یہ کہا گیا ہے کہ آپ اس مسجد میں جا کر نماز پڑھا کریں اور اس مسجد کے نمازیوں کے بارے کہا گیا ہے کہ اللہ اُن سے محبت رکھتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ طہارت کا خوب اہتمام رکھتے تھے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿لَّمَسْجِدٌ أُسِّسَ عَلَى التَّقْوَىٰ مِنْ أَوَّلِ يَوْمٍ أَحَقُّ أَن تَقُومَ فِيهِ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَن يَتَطَهَّرُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ﴾ [التوبة: 108]

”البتہ وہ مسجد کہ جس کی بنیاد پہلے دن سے تقوی پر رکھی گئی ہے اس بات کی حقدار ہے کہ آپ وہاں قیام کریں۔ اس مسجد میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں کہ جو طہارت کا خوب اہتمام رکھتے ہیں۔ اور اللہ تعالی طہارت کا اہتمام کرنے والوں

---

[1] صحيح بخاري، كِتَابُ الوُضُوءِ، بَابُ فَضْلِ الوُضُوءِ، وَالغُرُّ المُحَجَّلُونَ مِنْ آثَارِ الوُضُوءِ، 39/1

سے محبت رکھتے ہیں۔“

طہارت صرف استنجا اور وضو کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ اچھا لباس پہننا، اچھا جوتا پہننا اور خوشبو لگانا بھی اس میں شامل ہے۔ اللہ تعالی جب اپنے بندے کو نعمت سے نوازتے ہیں تو یہ پسند کرتے ہیں کہ بندہ اُس نعمت کو استعمال بھی کرے۔ پس اگر کسی کو اللہ تعالی نے مال و دولت کی نعمت سے نوازا ہو تو اسے اچھا پہننا اوڑھنا چاہے البتہ فضول خرچی سے اجتناب کرے کہ اسلام میں اس کی اجازت نہیں ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ عَبْدِ اللهِ بْنِ مَسْعُودٍ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ كَانَ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ مِنْ كِبْرٍ» قَالَ رَجُلٌ: إِنَّ الرَّجُلَ يُحِبُّ أَنْ يَكُونَ ثَوْبُهُ حَسَنًا وَنَعْلُهُ حَسَنَةً، قَالَ: «إِنَّ اللهَ جَمِيلٌ يُحِبُّ الْجَمَالَ، الْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ، وَغَمْطُ النَّاسِ»[1]

”حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہو گا تو وہ جنت میں داخل نہ ہو گا۔ ایک شخص نے پوچھا کہ بعض اوقات انسان کا دل کرتا ہے کہ وہ اچھے کپڑے پہنے یا اچھا جوتا پہنے تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالی جمیل ہے اور جمال کو پسند کرتا ہے۔ یہ تکبر نہیں ہے بلکہ تکبر تو یہ ہے کہ انسان حق بات کو جھٹلا دے اور لوگوں کو حقیر جانے۔“

اخلاص کا وزن

اخلاص کا معنی ہے کہ بندہ اپنے دل کو اپنے مالک کے لیے خالص کر لے۔ بندے کا ایمان اور عمل صالح، اللہ کو راضی اور خوش کرنے کی نیت سے ہو۔ انسان اپنا ایمان اور اپنی سوچ، اپنا عمل اور اپنی عبادت، اپنا جینا اور مرنا، اللہ کے لیے اس طرح خالص کر دے کہ اس میں کوئی نفسانی خواہش اور دنیاوی مفاد شامل نہ ہو۔

اخلاص کو ہم آسان الفاظ میں یکسوئی بھی کہہ سکتے ہیں یعنی ہر چیز سے منقطع ہو کر اپنے دل کو اللہ ہی کی طرف یکسو کر لینا جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں قرآن

---

[1] صحیح مسلم، كِتَابُ الْإِيمَانَ، بَابُ تَحْرِيمِ الْكِبْرِ وَبَيَانِهِ، 93/1

مجید میں کہا گیا ہے:

﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ﴾
[النحل: 120]

”ابراہیم علیہ السلام تو ایک امت تھے۔ اللہ کے فرمانبردار تھے۔ اور اللہ ہی کی طرف یکسو رہنے والے تھے۔ اور مشرکین میں سے نہ تھے۔“

دل کی توحید ”اخلاص“ ہے کہ ہر معاملے میں قلب کا تمام نفسانی خواہشات کو ترک کر کے اللہ کی طرف کامل طور یکسو ہو جانا۔ اور قلبی یکسوئی کا معنی یہ ہے کہ ہر لمحے اور ہر حال میں انسان کا دل اللہ کی طرف متوجہ رہے۔ مثال کے طور آزمائش سے پہلے اللہ سے دعا کرتے رہنا چاہیے کہ اللہ آزمائش سے بچا کر رکھے جیسا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اپنی دعا میں آزمائش سے پناہ مانگا کرتے تھے۔ اور اگر آزمائش آجائے جیسا کہ ہر انسان کی تقدیر میں اللہ نے کچھ نہ کچھ آزمائش تو رکھی ہے، تو صبر اختیار کرے۔ اور جب آزمائش گزر جائے تو اللہ کے فیصلے پر راضی ہو جائے۔ پس آزمائش سے پہلے قلب کا اللہ سے دعا کا تعلق ہو جبکہ آزمائش کی حالت میں صبر اور آزمائش کے بعد تسلیم ورضا کا حال ہو تو اسے قلبی یکسوئی کہتے ہیں۔

اخلاص کا تعلق انسان کی نیت اور ارادے سے ہے۔ اور نیت اور ارادے ہی کی درستگی پر اعمال کی قبولیت کا دارومدار ہے۔ اللہ کے ہاں وہی عمل مقبول ہے کہ جس میں نیت اللہ کو پالینے کی ہو۔ اگر جہاد جیسے افضل عمل میں بھی مطلوب اللہ کی ذات نہ ہو گی تو اس کا کچھ اجر وثواب نہ ہو گا۔ اگر جہاد سے مطلوب یہ ہو کہ لوگ مجھے مجاہد کہیں اور میدان جنگ میں میرے کارنامے زبان زد عام وخاص ہوں تو ایسا جہاد باعث وبال ہے۔ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

عَنْ أَبِي أُمَامَةَ الْبَاهِلِيِّ، قَالَ: جَاءَ رَجُلٌ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: أَرَأَيْتَ رَجُلًا غَزَا يَلْتَمِسُ الْأَجْرَ وَالذِّكْرَ، مَالَهُ؟ فَقَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «لَا شَيْءَ لَهُ» فَأَعَادَهَا ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، يَقُولُ لَهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «لَا شَيْءَ لَهُ» ثُمَّ قَالَ: «إِنَّ اللَّهَ لَا يَقْبَلُ مِنَ الْعَمَلِ إِلَّا مَا كَانَ لَهُ خَالِصًا، وَابْتُغِيَ بِهِ

وَجْهُهُ»[1]

”حضرت ابوامامہ الباہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ آپ کی اس شخص کے بارے کیا رائے ہے کہ جو اس لیے جنگ میں شریک ہوتا ہے کہ اسے آخرت میں اجر و ثواب بھی ملے اور دنیا میں بھی لوگ اس کو اچھے الفاظ میں یاد کریں۔ تو اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ایسے شخص کے لیے آخرت میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ الفاظ تین بار فرمائے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اللہ صرف اسی نیک عمل کو قبول کرتے ہیں جو خالصتاً اس کو راضی کرنے کے لیے کیا گیا ہو۔“

اور اللہ کو راضی اور خوش کرنے کے لیے چھوٹا سا عمل بھی کیا جائے گا تو اس کا اجر وثواب بے انتہا ہوگا۔ پس اعمال میں وزن اس سے نہیں آئے گا کہ وہ عمل اپنی مقدار میں کتنا زیادہ ہے اور لوگوں کی نظروں میں کتنا بڑا ہے بلکہ اس سے آئے گا کہ اس عمل میں اخلاص اور اللہ کی رضا کتنی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «مَا قَالَ عَبْدٌ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ قَطُّ مُخْلِصًا، إِلَّا فُتِحَتْ لَهُ أَبْوَابُ السَّمَاءِ، حَتَّى تُفْضِيَ إِلَى العَرْشِ، مَا اجْتَنَبَ الكَبَائِرَ»[2]

”حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جب بھی کسی شخص نے اخلاص کے ساتھ کبھی بھی لا الہ الا اللہ پڑھا ہے تو اُس کے اِس کلمے کے لیے آسمان کے دروازے کھول دیے گئے ہیں یہاں تک کہ وہ عرش الٰہی تک جا پہنچا لیکن شرط یہ ہے کہ پڑھنے والا کبیرہ گناہوں سے اجتناب کرنے والوں میں سے ہو۔“

عام طور مذہبی لوگ کثرت اعمال پر زور دیتے ہیں نہ کہ اعمال کے معیار (quality) پر۔ ہمارے پاس دوسروں کی نیکی ماپنے کا ایک ہی آلہ ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ کتنی زیادہ نیکی کرتا ہے؟ حالانکہ نیک ہونے کا اصل معیار یہ ہے کہ اس کی نیکی کا کیفیت

[1] سنن النسائي، كِتَابُ الْجِهَادِ، باب مَنْ غَزَا يَلْتَمِسُ الْأَجْرَ وَالذِّكْرَ، 25/6

[2] سنن الترمذي، أَبْوَابُ الدَّعَوَاتِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، بَابُ دُعَاءِ أُمِّ سَلَمَةَ، 575/5

کیسی ہے؟

لوگ لاکھوں کی تعداد میں کلمہ کا ورد کرتے ہیں جبکہ اللہ کے عرش تک پہنچنے کے لیے ایک دفعہ کا پڑھ لینا بھی کافی ہے لیکن یہ ایک دفعہ کا پڑھنا اخلاص کے ساتھ ہونا چاہیے۔ یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے رات کے کسی وقت میں کھلے میدان میں یا اپنے گھر کی چھت پر چہل قدمی کرتے ہوئے آپ کی اوپر کی طرف اٹھے، اور چاند اور ستاروں سے جگمگاتا آسمان اللہ کی عظمت کا ایک حال آپ کے وجود میں طاری کر دے اور ایسے میں آپ کی زبان سے یہ کلمہ جاری ہو جائے تو یہ کلمہ اخلاص ہے کہ جس کے عرش تک پہنچنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

اگر کوئی شخص اخلاص سے کوئی نیک کام کرتا ہے تو اسے لازماً اس کا اجر وثواب ملتا ہے، چاہے ظاہر میں اس کے نیک عمل کا نتیجہ اچھا نہ بھی نکلے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ ایک شخص نے اخلاص سے صدقہ کرنا چاہا تو سوچا کہ رات کے اندھیرے میں صدقہ کر دوں کہ صدقہ لینے والے کو بھی علم نہ ہو سکے کہ اسے کس نے دیا ہے؟ تو وہ صدقہ کی رقم لے کر گھر سے نکلا۔ روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُ: أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: قَالَ رَجُلٌ: : «لَأَتَصَدَّقَنَّ بِصَدَقَةٍ، فَخَرَجَ بِصَدَقَتِهِ، فَوَضَعَهَا فِي يَدِ سَارِقٍ، فَأَصْبَحُوا يَتَحَدَّثُونَ: تُصُدِّقَ عَلَى سَارِقٍ فَقَالَ: اللَّهُمَّ لَكَ الحَمْدُ، لَأَتَصَدَّقَنَّ بِصَدَقَةٍ، فَخَرَجَ بِصَدَقَتِهِ فَوَضَعَهَا فِي يَدَيْ زَانِيَةٍ، فَأَصْبَحُوا يَتَحَدَّثُونَ: تُصُدِّقَ اللَّيْلَةَ عَلَى زَانِيَةٍ، فَقَالَ: اللَّهُمَّ لَكَ الحَمْدُ، عَلَى زَانِيَةٍ؟ لَأَتَصَدَّقَنَّ بِصَدَقَةٍ، فَخَرَجَ بِصَدَقَتِهِ، فَوَضَعَهَا فِي يَدَيْ غَنِيٍّ، فَأَصْبَحُوا يَتَحَدَّثُونَ: تُصُدِّقَ عَلَى غَنِيٍّ، فَقَالَ: اللَّهُمَّ لَكَ الحَمْدُ، عَلَى سَارِقٍ وَعَلَى زَانِيَةٍ وَعَلَى غَنِيٍّ، فَأُتِيَ فَقِيلَ لَهُ: أَمَّا صَدَقَتُكَ عَلَى سَارِقٍ فَلَعَلَّهُ أَنْ يَسْتَعِفَّ عَنْ سَرِقَتِهِ، وَأَمَّا الزَّانِيَةُ فَلَعَلَّهَا أَنْ تَسْتَعِفَّ عَنْ زِنَاهَا، وَأَمَّا الغَنِيُّ فَلَعَلَّهُ يَعْتَبِرُ فَيُنْفِقُ مِمَّا أَعْطَاهُ اللَّهُ»[1]

---

[1] صحيح البخاري، كِتَابُ الزَّكَاةِ، بَابُ إِذَا تَصَدَّقَ عَلَى غَنِيٍّ وَهُوَ لاَ يَعْلَمُ، 2/110-111

> "حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک شخص نے کہا کہ میں آج لازماً صدقہ کروں گا۔ پس وہ گھر سے باہر نکلا اور اس نے وہ صدقہ چپکے سے ایک چور کے ہاتھ میں تھما دیا۔ اور صبح کے وقت شہر میں لوگ یہ باتیں کر رہے تھے کہ رات کسی نے چور کو صدقہ دیا ہے۔ اس شخص نے یہ باتیں سن کر اللہ کا شکر ادا کیا اور یہ کہا کہ میں آج دوبارہ صدقہ کروں گا۔ پس وہ گھر سے باہر نکلا اور اس نے صدقہ کی رقم ایک طوائف کے ہاتھ میں چپکے سے تھما دی۔ صبح کے وقت لوگ شہر میں یہ باتیں کر رہے تھے کہ رات کسی نے طوائف کو صدقہ دیا ہے۔ اس شخص نے یہ باتیں سن کر اللہ کا شکر ادا کیا اور یہ کہا کہ میں آج پھر صدقہ کروں گا۔ وہ گھر سے نکلا اور اس نے صدقہ کی رقم ایک امیر شخص کے ہاتھ میں تھما دی۔ صبح کو شہر میں لوگ یہ باتیں کر رہے تھے کہ رات کسی نے امیر پر صدقہ کیا ہے۔ اس شخص نے اس پر بھی اللہ کا شکر ادا کیا کہ اس کا صدقہ کسی چور، طوائف اور امیر شخص کو پہنچ گیا۔ اس پر اس شخص کو یہ کہا گیا کہ ممکن ہے کہ اللہ تعالی تیرے اس صدقے کی بدولت اس چور کو یہ توفیق عطا فرمائیں کہ وہ چوری سے رک جائے، اور طوائف اپنی بدکاری سے باز آ جائے اور امیر شخص اس سے شرمندہ ہو کر اللہ کے راستے میں خرچ کرنے والا بن جائے۔"

اس روایت سے معلوم ہوا کہ اگر انسان کے عمل میں اخلاص ہو تو اللہ تعالی اس کے نیک عمل کو دوسروں کی اصلاح کا ذریعہ بنا دیتے ہیں۔ لوگوں کی اصلاح کا ایک ذریعہ ان کو وعظ و نصیحت کرنا ہے اور دوسرا ذریعہ اپنے عمل کی اصلاح کرنا ہے کہ بہت سے لوگ آپ کی باتوں سے زیادہ آپ کے عمل سے ترغیب حاصل کرتے ہیں اور اپنی اصلاح کرتے ہیں۔ اور انسان کا وہی عمل دوسروں کی اصلاح کا ذریعہ بن جاتا ہے کہ جس میں اخلاص اور عاجزی ہو۔

قیامت والے دن جب بندوں کے اعمال کا وزن کرنے کے لیے میزان قائم کیا جائے گا تو سب سے زیادہ وزن ان اعمال میں ہو گا کہ جن میں اخلاص ہو گا۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَبْدَ اللَّهِ بْنَ عَمْرٍو، يَقُولُ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «يُصَاحُ بِرَجُلٍ مِنْ أُمَّتِي يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَى رُءُوسِ الْخَلَائِقِ، فَيُنْشَرُ لَهُ تِسْعَةٌ وَتِسْعُونَ سِجِلًّا، كُلُّ سِجِلٍّ مَدَّ الْبَصَرِ، ثُمَّ يَقُولُ اللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ: هَلْ تُنْكِرُ مِنْ هَذَا شَيْئًا؟ فَيَقُولُ: لَا، يَا رَبِّ، فَيَقُولُ: أَظَلَمَتْكَ كَتَبَتِي الْحَافِظُونَ؟ فَيَقُولُ: لَا، ثُمَّ يَقُولُ: أَلَكَ عُذْرٌ، أَلَكَ حَسَنَةٌ؟ فَيُهَابُ الرَّجُلُ، فَيَقُولُ: لَا، فَيَقُولُ: بَلَى، إِنَّ لَكَ عِنْدَنَا حَسَنَاتٍ، وَإِنَّهُ لَا ظُلْمَ عَلَيْكَ الْيَوْمَ، فَتُخْرَجُ لَهُ بِطَاقَةٌ فِيهَا: أَشْهَدُ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ، قَالَ: فَيَقُولُ: يَا رَبِّ مَا هَذِهِ الْبِطَاقَةُ، مَعَ هَذِهِ السِّجِلَّاتِ؟ فَيَقُولُ: إِنَّكَ لَا تُظْلَمُ، فَتُوضَعُ السِّجِلَّاتُ فِي كِفَّةٍ، وَالْبِطَاقَةُ فِي كِفَّةٍ، فَطَاشَتِ السِّجِلَّاتُ، وَثَقُلَتِ الْبِطَاقَةُ»[1]

”حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت والے دن میری امت کے ایک شخص کو سب کے سامنے حساب کے لیے بلوایا جائے گا۔ اس کے سامنے اس کے گناہوں کے دفاتر کھولے جائیں گے تو وہ ننانوے ہوں گے اور ہر دفتر اتنا بڑا ہو گا کہ جہاں تک نگاہ جاسکتی ہے، وہاں تک پھیلا ہوا ہو گا۔ پھر اللہ تعالی اس سے سوال کریں گے کہ اے میرے بندے! کیا تجھے ان گناہوں میں سے کسی گناہ سے انکار ہے؟ [کہ وہ تیرا نہیں ہے اور فرشتوں نے غلطی سے لکھ لیا ہے]۔ تو وہ شخص کہے گا: نہیں۔ پھر اللہ تعالی فرمائیں گے کہ کیا لکھنے والے فرشتوں نے تیرے ساتھ کوئی زیادتی کی ہے؟ تو وہ جواب میں کہے گا کہ نہیں۔ پھر اللہ تعالی اس سے پوچھیں گے کہ کیا تیرے پاس کوئی عذر ہے کہ تو نے اتنے گناہ کیوں کیے ہیں؟ یا تیرے پاس کوئی نیکی ہے؟ تو وہ شخص دہشت زدہ ہو جائے گا اور کہے گا کہ مجھے یاد نہیں ہے کہ میرے پاس کوئی نیکی یا عذر ہے۔ تو اللہ تعالی اسے فرمائیں گے کہ ہاں! ہمارے پاس تمہاری ایک نیکی ہے اور آج ہم تمہارے ساتھ ظلم نہیں کریں گے۔ اور اللہ تعالی کاغذ کا ایک ٹکڑا نکالیں گے کہ جس میں «أَشْهَدُ أَنْ لَا

[1] سنن ابن ماجة، كِتَابُ الزُّهْدِ، بَابُ مَا يُرْجَى مِنْ رَحْمَةِ اللَّهِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ، 1437/2

إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُه» لکھا ہوا ہو گا۔ تو وہ شخص کہے گا کہ اے میرے مالک! اتنے گناہ اور ان کے مقابلے میں یہ نیکی، تو اس کا ان گناہوں سے کیا مقابلہ؟ اللہ تعالی فرمائیں گے کہ اے میرے بندے! آج تیرے ساتھ ظلم نہیں ہو گا۔ اور اللہ تعالی اس کے گناہوں کے ننانوے دفاتر ترازو کے ایک پلڑے میں رکھیں گے اور اس کی وہ نیکی دوسرے پلڑے میں تو نیکی والا پلڑا جھک جائے گا جبکہ گناہوں والا پلڑا اس نیکی کے وزن کے سبب ہوا میں اڑنا شروع کر دے گا۔"

کلمے کا ورد تو کروڑوں لوگ کرتے ہیں لیکن اس کلمے کے پڑھنے کا ایسا اجر و ثواب صرف اسی شخص کے حصے میں آئے گا کہ جس نے اسے مکمل اخلاص سے پڑھا ہو گا۔ اسی طرح کا معاملہ بقیہ نیک اعمال کا بھی ہے کہ بعض اوقات ایک عام سا نیک عمل انسان کی نجات کا ذریعہ بن جاتا ہے کیونکہ اس میں اخلاص ہوتا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «أَنَّ امْرَأَةً بَغِيًّا رَأَتْ كَلْبًا فِي يَوْمٍ حَارٍّ يُطِيفُ بِبِئْرٍ، قَدْ أَدْلَعَ لِسَانَهُ مِنَ الْعَطَشِ، فَنَزَعَتْ لَهُ بِمُوقِهَا فَغُفِرَ لَهَا»[1]

"حضرت ابو ہریرۃ رضی اللہ عنہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ ایک طوائف عورت نے سخت گرمی والے دن میں ایک کتے کو ایک کنویں کے گرد چکر لگاتے دیکھا اور وہ پیاس کی وجہ سے اپنی زبان لٹکائے ہوا تھا۔ اس عورت نے اس پر رحم کھاتے ہوئے اپنے موزے سے کنویں سے اس کے لیے پانی نکالا۔ اس عمل کی وجہ سے اس عورت کو معاف کر دیا گیا۔"

پس جب کسی نیک عمل کے کرنے پر دل آمادہ ہو اور اس کے کرنے میں دل کا سکون، اطمینان اور خوشی محسوس ہو رہی ہو تو اسے ہلکا نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ لازم طور کر گزرنا چاہیے کہ یہ اخلاص والا عمل ہے جو میزان میں بہت بھاری ہو گا، چاہے دنیا میں یہ کتنا ہی حقیر سمجھا جاتا ہو۔

---

[1] صحیح مسلم، کتاب السَّلَامِ، بَابُ فَضْلِ سَاقِي الْبَهَائِمِ الْمُحْتَرَمَةِ وَإِطْعَامِهَا، 1761/4

تنہائی کی ریاکاری

قرآنی سلوک کے مطابق تزکیہ نفس کے لیے مجاہدہ کرنے والوں میں آخری رذیلہ اور نفس کا عیب یہی نظر آئے گا۔ امید ہے کہ جسے اللہ نے اس عیب سے پاک کر دیا، اسے اپنے صالحین بندوں میں شمار کر لیا۔

تنہائی کی ریاکاری یہ ہے کہ سالک[1] تنہائی کی عبادت کے دوران یہ سوچ رکھے کہ لوگ اُس کی اِس عبادت پر کسی طرح مطلع ہو جائیں۔ مثلاً اگر کسی کو تہجد میں روزانہ ایک دو پارے پڑھنے کی توفیق نصیب ہوتی ہو تو وہ مجلس میں اس بات کے مواقع تلاش کرتا رہتا ہو کہ لوگوں کو غیر محسوس انداز میں اپنی تنہائی کی نیکی کے بارے بتلائے۔ یا تنہائی میں اللہ کے حضور میں رونا نصیب ہو تو اب خواہش یہ ہو کہ کسی طرح دوسروں کے علم میں آجائے کہ میں تنہائی میں بہت گریہ وزاری کرنے والوں میں سے ہوں۔

تنہائی کی ریاکاری کی ابتداء تنہائی کی نیکی کے ظاہر ہونے کی خواہش سے ہوتی ہے اور انتہاء مجلس میں تنہائی کی نیکی کے اظہار سے۔ جب تنہائی میں نیکی کرتے ہوئے یہ سوچ بھی ہر معنی میں ختم ہو جائے کہ اللہ میری اِس نیکی کو کسی پر ظاہر کرے تو اب تنہائی کا خالص اخلاص حاصل ہو گا۔ اور سالک مخلصین میں سے ہونے کے قابل ہو جائے گا۔ اللہ عزوجل اس شخص کو قیامت والے دن اپنے عرش کا سایہ نصیب فرمائیں گے کہ جس نے اپنی تنہائی کو بھی ریاکاری سے پاک کر لیا۔

ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ قیامت والے دن جن سات اشخاص کو اللہ کے عرش کا سایہ نصیب ہو گا، ان میں ایک وہ شخص ہو گا کہ جس نے تنہائی میں اللہ کو یاد کیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ روایت کے الفاظ ہیں:

«وَرَجُلٌ ذَكَرَ اللَّهَ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ»[2]

"اور وہ شخص کہ جس نے اللہ کو یاد کیا، اس حال میں اس کا دل ہر چیز سے خالی

---

[1] پروردگار کا تقرب حاصل کرنے کے لیے اطاعت کے راستے پر چلنے والا اور تزکیہ نفس کے لیے مجاہدہ کرنے والا۔

[2] موطأ الإمام مالك، كتابُ الشَّعَرِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي الْمُتَحَابِّينَ فِي اللَّهِ، 952/2

تھا، اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔"

تکبر کی صورتیں

معاشرے میں تکبر کی کئی ایک صورتیں پائی جاتی ہیں کہ جن میں چند ایک یہ ہیں:

مال کے ذریعے تکبر:

مال کے ذریعے تکبر کرنا بادشاہوں، تاجروں، مالداروں اور امیروں میں ہوتا ہے۔ ایک مالدار شخص اپنے مال کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے۔ اگر مالدار شخص کسی غریب کو حقیر جانے یعنی اس کے پاس بیٹھنے، اس کے ساتھ کھانے پینے، اس کے ساتھ چلنے، اس سے گفتگو کرنے، اس کے گھر جانے، اس کے محلے میں جانے اور اس کے ساتھ دوستی کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس کرے تو بلاشبہ وہ اس تکبر میں مبتلا ہے۔ عموماً مالدار دین دار گھرانوں میں بھی یہ بات دیکھنے میں آئی ہے کہ وہ اس نوعیت کے تکبر میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اگر کسی دینی ادارے میں حفظ کی کلاس سے ایک مالدار دینی رجحان رکھنے والے خاندان نے اپنے بچے اس لیے اُٹھا لیے کہ اس ادارے میں ان کے ملازمین کے بچے بھی ساتھ ہی حفظ کر رہے تھے تو یہ تکبر کی ہی ایک علامت ہے۔ عام طور پر اس بارے بہانا یہ بنایا جاتا ہے کہ غریب کے بچوں میں تہذیب نہیں ہوتی لہذا ہمارے بچے ان سے غیر اخلاقی حرکات سیکھ سکتے ہیں حالانکہ اُمراء کے بچے جس قدر مہذب ہوتے ہیں، اس کا ایک جائزہ انگلش میڈیم اسکولوں سے فارغ ہونے والے بچوں کی چال چلن کی رپورٹوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ اصل میں یہ تکبر ہے جس کی وجہ سے اُمراء اپنے بچوں کے لیے اپنے ملازمین کے بچوں کے ساتھ کھیلنے، پڑھنے اور بیٹھنے میں حجاب محسوس کرتے ہیں ورنہ تو بچے سبھی فطرتِ سلیمہ پر ہوتے ہیں جسے دینی ماحول مل جائے، اس کی تربیت ہو جاتی ہے۔ اور جسے توجہ نہ ملے تو وہ بگڑ جاتا ہے، چاہے غریب کا بچہ ہو یا امیر کا۔

حسن و جمال کے ذریعے تکبر:

حسن و جمال کے ذریعے تکبر کرنا عموماً عورتوں میں پایا جاتا ہے۔ جب کوئی خاتون اللہ

کی طرف سے عطا کیے گئے حسن پر اترائے اور دوسری خواتین کو اپنے سے کم تر سمجھے تو وہ تکبر کی اس قسم میں بلاشبہ مبتلا ہو چکی ہے۔ مثال کے طور کوئی خاتون دوسری خواتین کے خدوخال، رنگت اور پہننے اوڑھنے کے سلیقہ پر منفی تبصرے کرتی نظر آتی ہے کہ فلاں کو تو پہننے کا ڈھنگ ہی نہیں ہے، یا فلاں اپنی شکل وصورت میں بہت ہی سادی ہے، یا فلاں کے چہرے پر تو مسکینی ہی چھائی رہتی ہے، یا فلاں سٹائلش نہیں ہے وغیرہ۔ ایسے تمام تبصروں سے اگر تو کسی عورت کا مقصود اپنے آپ کو دوسری خواتین سے برتر ثابت کرنا ہے تو یہی تکبر ہے۔ اور اگر اس کے دل میں ان تبصروں کے وقت اپنی بڑائی موجود نہ ہو تو یہ غیبت ہے جو تکبر ہی کی طرح ممنوع ہے، اگرچہ حرمت میں اس کا گناہ تکبر سے کم ہے۔

خواتین کے نفسانی مسائل بہت زیادہ ہوتے ہیں کہ جن کے سبب یہ دین سے دور ہو جاتی ہیں۔ اب ہر خاتون دوسری خاتون کو اپنا وزن اور عمر کم بتلائے گی اور وزن بتلانے کے معاملے میں تو جھوٹ ایسے بولے گی جیسے نیکی کا کام ہو۔ ایک بار اس پر غور کر رہا تھا کہ مذہبی خواتین بھی عموماً ایسے معاملات میں بڑے وثوق سے جھوٹ بول لیتی ہیں تو اس کی وجہ کیا ہے۔ پس وجہ یہی سمجھ آئی کہ اگر کسی خاتون کا وزن زیادہ ہے اور وہ اپنی کسی رشتہ دار خاتون کے پوچھنے پر اپنا اصل وزن بتلا دیتی ہیں تو انہیں معلوم ہے کہ خاندان کی عورتوں نے چسکے لے لے کر ان کے اس عیب کو موضوعِ بحث بنانا ہے لہذا بہتر ہے کہ ایک جھوٹ بول کر ان کی غیبتوں کے جان چھڑا لو۔ کسی خاتون کے لیے یہ بہت اہم ہے کہ دوسری خواتین اس کے بارے کیا سوچتی اور تبصرہ کرتی ہیں لہذا اس کی زندگی میں دین کب، کتنا اور کیسا ہونا چاہیے بلکہ اس کی دنیا بھی کب، کتنی اور کیسی ہونی چاہیے، تو یہ دوسری خواتین طے کر رہی ہوتی ہیں اور یہ بے وقوفی کی انتہاء ہے۔ اصل بات یہی ہے کہ جو آپ کے نزدیک اہم ہے، آپ اس کو اہمیت دیں گے۔ آپ کو جو پسند ہے، آپ وہ پہنیں اوڑھیں لیکن جب آپ دوسروں کے لیے پہننا اوڑھنا شروع کر دیں گے تو پھر یہ پریشانی تو ہو گی کہ دوسرے کیا تبصرہ کریں گے؟ اگر آپ کے نزدیک اپنی پسندیدگی سے

زیادہ اہم دوسروں کی پسندیدگی ہے تو آپ دوسروں کی زندگی گزار رہے ہیں نہ کہ اپنی۔

مریدوں کی کثرت پر تکبر:

اپنے پیروکاروں کی کثرت کے ذریعے تکبر کرنا جیسا کہ علماء، صوفیاء، گدی نشینوں، خطباء، واعظین، مذہبی، سیاسی اور انقلابی جماعتوں کے قائدین میں ہوتا ہے۔ تکبر کی اس صورت میں ایک شخص اپنے پیروکاروں (followers) کی کثرت کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا اور دوسروں کو حقیر سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ مثلاً جب کوئی خطیب کسی دوسرے خطیب پر یہ تبصرہ کرے کہ اُسے تو منبر پر کھڑا ہونا ہی نہیں آتا، اُسے تو پتہ ہی نہیں تقریر کیسے کرتے ہیں؟، وہ تو بس جمعہ ٹالنے کی کوشش کرتے ہیں وغیرہ تو یہ خطیب بھی بلاشبہ تکبر کے مرض میں مبتلا ہو چکا ہے۔

بعض اوقات کسی پیر، خطیب اور مذہبی رہنما کے پیروکار بھی اس تکبر میں مبتلا ہوتے ہیں۔ پس اگر کسی مذہبی جماعت سے وابستہ کارکنان اپنی جماعت کے ممبران کی کثرت پر اتراتے نظر آتے ہوں، یا کسی پیر کے مرید اپنے پیر دوسرے پیروں کے مقابلے میں آسمان پر چڑھانے میں مصروف نظر آتے ہوں، یا کسی عالم دین کے شاگرد اپنے شیخ کے مقابلے میں دوسرے علماء کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہوں، تو یہ سب بھی تکبر ہی کی صورتیں ہیں۔ گہری نظر سے جائزہ لیا جائے تو یہ پیروکار اپنے امام، پیر اور شیخ کو دوسروں سے بہتر قرار دیتے ہوئے دراصل یہ ثابت کرنا چاہ رہے ہوتے ہیں کہ جب ہمارے امام، پیر اور شیخ تمہارے امام، پیر اور شیخ سے بہتر ہیں تو ہم بھی تم سے بہتر ہوئے۔

علم پر تکبر کرنا:

اپنے علم پر تکبر کرنا جیسا کہ بعض علماء میں یہ مرض پایا جاتا ہے۔ یہ تکبر دوسرے علماء پر بھی ہو سکتا ہے اور عوام پر بھی۔ بعض علماء عوام الناس اور سائلین کے ساتھ بیٹھنا اپنے وقار کے منافی سمجھتے ہیں۔ اور بعض علماء، طالبانِ دین اور نوجوان علماء کے ساتھ علمی تبادلۂ خیال میں عار محسوس کرتے ہیں۔ اور بعض علماء کسی دیہاتی سائل کی رہنمائی کو اپنے وقت کا ضیاع سمجھتے ہیں۔ اور بعض علماء دوسرے علماء کے دلائل پر اس لیے توجہ نہیں

دیتے اور ان کی تحقیق سے اس لیے استفادہ نہیں کرتے کہ وہ علم میں ان کو اپنے سے کم تر سمجھتے ہیں۔ اسی طرح علوم اسلامیہ میں مفتیوں اور پروفیسروں کی بھی اپنی اپنی دنیا ہے۔ مفتی صاحب کے ہاتھ کسی پروفیسر کی کتاب لگے گی تو وہ دیکھتے ہی یہ تبصرہ کریں گے کہ پروفیسروں کو دین کا کیا پتہ؟، اور پروفیسر صاحب کے ہاتھ مفتی صاحب کی تحقیق آئے گی تو وہ دیکھتے ہی کہیں گے کہ ہمارے مفتی حضرات ہزار سالہ پرانے علم میں زندگی گزار رہے ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ علمی تکبر کے اس دریا میں فقہی مسالک کے پیروکاروں کی اکثریت سر تا پاؤں ڈوبی ہوئی ہے۔ ایک مسلک کے نمائندہ علماء دوسرے مسلک کے علماء کو حقیر جانتے ہیں اور انتہائی اخلاص سے یہ تکبر اپنے دل میں پالتے رہتے ہیں کہ علمی اعتبار سے اس جہاں میں ہمارا کوئی ثانی نہیں ہے۔ مثال کے طور اہل حدیث کا خیال ہے کہ دیوبند کے پاس حدیث کا علم کہاں، اور دیوبند یہ سمجھتے ہیں کہ اہل حدیث کو فقہ واجتہاد سے کیا نسبت؟

اگر کسی عالم دین، شیخ الحدیث، مفتی اور پروفیسر صاحب کو مذہبی جلسہ وتقریب کے دوران سٹیج پر جگہ نہ ملے اور وہ عوام الناس کے ساتھ نیچے فرش پر بیٹھنے میں حجاب محسوس کریں تو یہ عالم دین، شیخ الحدیث، مفتی اور پروفیسر صاحب علمی تکبر میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی عالم دین، شیخ الحدیث، مفتی اور پروفیسر صاحب کو مخاطب کرتے وقت اِلقابات کا لحاظ نہ کیا جائے اور براہِ راست ان کا نام لے لیا جائے اور وہ اس کو برا جانیں تو بلاشبہ یہ بھی تکبر ہی کی ایک قسم معلوم ہوتی ہے۔

ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے ذہنوں میں عام طور پر تکبر کی یہ صورتیں نہیں ہوتی ہیں۔ ہم میں سے ہر شخص کو اپنے ہر فعل کا محاسبہ اور ہر عمل کا تجزیہ کرتے رہنا چاہیے کہ میرا یہ فعل اور عمل کہیں میرے تزکیہ میں رکاوٹ تو نہیں بن رہا ہے؟ آپ ﷺ کا فرمان ہے:

«لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ كِبْرٍ، وَلَا يَدْخُلُ النَّارَ

مَنْ فِي قَلْبِهِ مِثْقَالُ حَبَّةٍ مِنْ خَرْدَلٍ مِنْ إِيمَانٍ»[1]

”وہ شخص جنت میں داخل نہیں ہو گا کہ جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی تکبر ہو۔ اور وہ شخص آگ میں داخل نہیں ہو گا کہ جس کے دل میں رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان موجود ہو۔“

اب رائی کے دانے کے برابر تکبر تو بہت تھوڑا ہوتا ہے۔ اور اتنے تھوڑے تکبر کے بارے تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ ہمارے اندر ہو گا لہذا اسے ختم کرنے کے لیے مجاہدہ کی ضرورت ہے۔

عاجزی کے اُحوال

نبی کریم ﷺ کے احوال میں سب سے غالب حال جو ہمیں ملتا ہے، وہ عاجزی کا حال ہے کہ بندگی کا جوہر عاجزی اور انکساری میں ہے۔ جس شخص کو عاجزی کا حال نصیب نہ ہوا، تو وہ بندگی کی لذت سے محروم رہا۔ اور بندہ جب تک عاجزی کے حال میں رہتا ہے، اس وقت تک بندگی کی مٹھاس چکھتا رہتا ہے۔ آپ ﷺ کے مقام کی کیا شان اور آپ کے رتبے کے کیا کہنے لیکن جب آپ اپنی دعاؤں میں اپنے رب سے مخاطب ہوتے ہیں تو عاجزی اور انکساری کا وہ حال دیکھنے کو ملتا ہے کہ انسان کانپ اٹھتا ہے کہ یہ اللہ کے رسول ﷺ فرما رہے ہیں، اور اپنے بارے فرما رہے ہیں، اور ایک ہم ہیں کہ معلوم نہیں اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہیں۔

آپ ﷺ کی ادعیہ ماثورۃ میں دراصل آپ کی عاجزی اور انکساری کے احوال منتقل ہوئے ہیں کہ جنہیں ہمارے ہاں فقہی تاویلات کی نذر کر دیا گیا حالانکہ وہ تو عین بندگی تھی۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ نماز میں قیام، رکوع، قومہ اور تشہد کی حالت میں آپ ﷺ یہ دعائیں مانگا کرتے تھے:

«اللَّهُمَّ أَنْتَ الْمَلِكُ لَا إِلَهَ لِي إِلَّا أَنْتَ، أَنْتَ رَبِّي وَأَنَا عَبْدُكَ، ظَلَمْتُ نَفْسِي وَاعْتَرَفْتُ بِذَنْبِي فَاغْفِرْ لِي ذُنُوبِي جَمِيعًا إِنَّهُ لَا يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا أَنْتَ، وَاهْدِنِي لِأَحْسَنِ الْأَخْلَاقِ لَا يَهْدِي لِأَحْسَنِهَا إِلَّا أَنْتَ،

[1] مسند الإمام أحمد بن حنبل: 30/7

وَاصْرِفْ عَنِّي سَيِّئَهَا لَا يَصْرِفُ سَيِّئَهَا إِلَّا أَنْتَ، لَبَّيْكَ وَسَعْدَيْكَ وَالْخَيْرُ كُلُّهُ فِي يَدَيْكَ، وَالشَّرُّ لَيْسَ إِلَيْكَ أَنَا بِكَ وَإِلَيْكَ، تَبَارَكْتَ وَتَعَالَيْتَ، أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوبُ إِلَيْكَ، وَإِذَا رَكَعَ، قَالَ: اللَّهُمَّ لَكَ رَكَعْتُ وَبِكَ آمَنْتُ وَلَكَ أَسْلَمْتُ خَشَعَ لَكَ سَمْعِي وَبَصَرِي وَمُخِّي وَعِظَامِي وَعَصَبِي، وَإِذَا رَفَعَ، قَالَ: سَمِعَ اللَّهُ لِمَنْ حَمِدَهُ رَبَّنَا وَلَكَ الْحَمْدُ مِلْءَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمِلْءَ مَا بَيْنَهُمَا وَمِلْءَ مَا شِئْتَ، مِنْ شَيْءٍ بَعْدُ، وَإِذَا سَجَدَ قَالَ: اللَّهُمَّ لَكَ سَجَدْتُ، وَبِكَ آمَنْتُ وَلَكَ أَسْلَمْتُ، سَجَدَ وَجْهِي لِلَّذِي خَلَقَهُ وَصَوَّرَهُ فَأَحْسَنَ صُورَتَهُ وَشَقَّ سَمْعَهُ وَبَصَرَهُ، وَتَبَارَكَ اللَّهُ أَحْسَنُ الْخَالِقِينَ، وَإِذَا سَلَّمَ مِنَ الصَّلَاةِ، قَالَ: اللَّهُمَّ اغْفِرْ لِي مَا قَدَّمْتُ وَمَا أَخَّرْتُ وَمَا أَسْرَرْتُ وَمَا أَعْلَنْتُ وَمَا أَسْرَفْتُ وَمَا أَنْتَ أَعْلَمُ بِهِ مِنِّي أَنْتَ الْمُقَدِّمُ وَالْمُؤَخِّرُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنْتَ»

”قیام کی حالت میں سورہ فاتحہ سے پہلے آپ یہ دعا پڑھتے: اے اللہ! آپ بادشاہ ہیں، آپ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ آپ مالک ہیں اور میں آپ کا غلام۔ میں نے اپنی جان پر ظلم کیا ہے اور مجھے اپنے گناہ کا اعتراف ہے۔ پس آپ میرے تمام گناہوں کو معاف فرمادیں کہ آپ کے سوا کوئی نہیں جو گناہوں کو معاف کر سکے۔ اور بہترین اخلاق کی طرف میری رہنمائی فرمادیں کہ آپ کے علاوہ کوئی نہیں ہے جو بہترین اخلاق کی طرف رہنمائی کر سکے۔ اور مجھے برے اخلاق سے دور رکھیں کہ آپ کے علاوہ کوئی نہیں ہے جو مجھ سے برے اخلاق کو دور کر دے۔ پروردگار، میں حاضر ہوں جب بھی آپ پکاریں اور یہ میری سعادت ہے کہ آپ مجھے بلائیں۔ اور تمام خیر آپ کے ہاتھ میں ہے اور جو بھی شر ہے، وہ آپ کی طرف سے نہیں ہے۔ میں آپ کی وجہ سے ہوں اور آپ ہی کی طرف متوجہ ہوں۔ آپ بہت بابرکت اور بہت بلند ہیں۔ میں آپ سے معافی چاہتا ہوں اور آپ کی جناب میں توبہ کرتا ہوں۔ اور جب آپ ﷺ رکوع میں جاتے تو یہ دعا مانگتے: اے اللہ! میں نے آپ کے لیے رکوع کیا، میں آپ پر ایمان لایا، میں نے اپنے وجود کو آپ کے سامنے جھکا دیا، میری سماعت، میری بصارت، میرا دماغ، میری ہڈیاں اور میرے اعصاب تک آپ کے

سامنے جھکے ہوئے ہیں۔ اور جب آپ ﷺ رکوع سے کھڑے ہوتے تو یہ دعا مانگتے: اللہ عزوجل نے ہر اس بندے کی آواز سن لی ہے کہ جس نے اس کی حمد وثنابیان کی ہے۔ اے اللہ! آپ کی حمد وثناء، اتنی کہ جس سے آسمان بھر جائیں، زمین بھر جائے، زمین اور آسمان کے مابین خلاء بھر جائے، اور ان کے علاوہ جو چیز آپ چاہتے ہوں، وہ بھر جائے۔۔ اور جب آپ ﷺ سجدے میں جاتے تو یہ دعا مانگتے: اے اللہ! میں نے آپ کے لیے سجدہ کیا، میں آپ پر ایمان لایا، میں نے اپنے وجود کو آپ کے سامنے جھکا دیا، میرے چہرے نے اس ذات کے سامنے اپنے آپ کو زمین پر ڈال دیا ہے کہ جس نے اسے پیدا کیا اور اس کی شکل وصورت نکالی اور اس چہرے کی کیا ہی خوب شکل وصورت نکالی ہے۔ اور اس چہرے سے سماعت اور بصارت نکالی ہے۔ اور اللہ تعالی بہت بابرکت ہے جو بنانے والوں میں سب سے بہترین بنانے والا ہے۔۔ اور جب آپ ﷺ تشہد میں ہوتے تو سلام پھیرنے سے پہلے یہ دعا مانگتے: اے اللہ! میرے اگلے گناہوں کو معاف فرمادے، میرے پچھلے گناہوں کو معاف فرمادے۔ میرے چھپے ہوئے گناہوں کو معاف فرمادے، میرے اعلانیہ گناہوں کو معاف فرما دے۔ اور میں نے جو اپنی جان پر زیادتی کی ہے، اس کو معاف فرمادے۔ اور میرے ان گناہوں کو معاف فرمادے جو آپ زیادہ بہتر طور جانتے ہیں۔ آپ ہی ہیں جو بندگی میں آگے لے کر جانے والے ہیں اور آپ ہی ہیں جو بندگی میں پیچھے کر دینے والے ہیں۔ آپ کے سواء کوئی معبود نہیں ہے۔"

پس ہمیں بھی چاہیے کہ نماز میں ان مسنون دعاؤں کے ذریعے عاجزی کے وہ احوال حاصل کرنے کے لیے مجاہدہ کریں کہ جو آپ ﷺ کی بندگی کا جوہر تھے۔ اور آپ کی عاجزی کے احوال جیسا کہ وہ نماز میں تھے، ویسے ہی میدان جنگ میں بھی تھے۔ یہ آپ ﷺ کا کمال تھا۔ نماز میں تو اللہ کے سامنے عاجزی کے احوال حاصل ہو ہی جائیں گے کہ اللہ کے سامنے کیا تکبر لیکن جانی دشمن کی گردن قدموں میں ہوں اور پھر بھی عاجزی کے احوال زندہ رہیں، تو یہ عاجزی کے احوال کا انتہائی درجہ ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ

نے فتح مکہ کے موقع پر جو خطبہ دیا تو اس کی ابتداء ان الفاظ سے فرمائی:

«لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَحْدَهُ، صَدَقَ وَعْدَهُ، وَنَصَرَ عَبْدَهُ، وَهَزَمَ الْأَحْزَابَ وَحْدَهُ»[1]

”اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے، وہ اکیلا ہے، اس نے اپنے بندوں سے کیا ہوا وعدہ سچ کر دکھایا، اسی نے اپنے بندے کی مدد کی، اور اسی نے اکیلے تمام لشکروں کو شکست دی۔“

اب بدر، احد اور خندق کے میدانوں میں تو نبی کریم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جا کر لڑے ہیں، احد میں ستر صحابہ اور آپ ﷺ کے دندان مبارک شہید ہوئے۔ خندق میں پیٹ پر پتھر باندھ کر مدینے کا دفاع کیا لیکن جب مکہ فتح ہوا تو اپنا نام کہیں نہیں ہے، سب اللہ کی طرف منسوب کر دیا کہ اسی اکیلے نے دشمنوں کو شکست دی ہے۔

اور نبی کریم ﷺ کی تواضع کے وہ احوال جو مخلوق کے ساتھ تھے، تو اس کی بھی کوئی مثال نہیں ملتی۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَنَسٍ، أَنَّ امْرَأَةً كَانَ فِي عَقْلِهَا شَيْءٌ، فَقَالَتْ: «يَا رَسُولَ اللهِ إِنَّ لِي إِلَيْكَ حَاجَةً، فَقَالَ: «يَا أُمَّ فُلَانٍ انْظُرِي أَيَّ السِّكَكِ شِئْتِ، حَتَّى أَقْضِيَ لَكِ حَاجَتَكِ» فَخَلَا مَعَهَا فِي بَعْضِ الطُّرُقِ، حَتَّى فَرَغَتْ مِنْ حَاجَتِهَا»[2]

”حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک عورت کہ جس کی عقل کم تھی، اس نے اللہ کے رسول ﷺ سے کہا کہ مجھے آپ سے ایک کام ہے۔ تو آپ ﷺ نے کہا: اے فلاں کی ماں! تم مجھے مدینہ کی جس گلی میں اپنا کوئی کام کرنے کے لیے کہو گی تو میں وہاں حاضر ہو جاؤں گا۔ پس آپ ﷺ اس عورت کے ساتھ گئے اور اس کا کام کر دیا۔“

اللہ کے رسول ﷺ تو فرض نماز مختصر کر دیں کہ بچے کی ماں کو اس کے رونے سے تکلیف نہ ہو اور یہاں خلیفہ مجاز صاحب سے ملنے کے لیے لوگ کئی کلو میٹر کا سفر طے کر

---

[1] سنن أبي داود، كِتَاب الدِّيَاتِ، بَابٌ فِي دِيَةِ الْخَطَإِ شِبْهِ الْعَمْدِ، 185/4

[2] صحيح مسلم، كتاب الْفَضَائِلِ، بَابُ قُرْبِ النَّبِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ مِنَ النَّاسِ وَتَبَرُّكِهِمْ بِهِ، 1812/4

کے آئے ہیں لیکن چونکہ وہ مراقبے میں مصروف ہیں لہذا آپ گھنٹوں انتظار کی قطار میں لگ جائیں۔ آج کسی عالم دین، مفتی زمان، خلیفہ مجاز اور پیر طریقت کے پاس غریب لوگوں کے مسائل سننے کے لیے وہ اتنا وقت ہے کہ جتنا نبی کریم ﷺ نکالا کرتے تھے؟

حسد کے مقامات

حسد (jealousy) کا معنی یہ ہے کہ کسی مسلمان بھائی پر اللہ کی کسی نعمت کی وجہ سے جلن اور کڑھن محسوس کرنا اور یہ خواہش رکھنا کہ وہ نعمت اس سے چھن جائے اور مجھے مل جائے۔ عموماً حسد نہ تو ان لوگوں سے پیدا ہوتا ہے کہ جنہیں انسان اپنے سے بہتر سمجھتا ہو اور نہ ان سے جو اس سے کمتر ہوں۔ حسد عام طور ہم مرتبہ، ہم مشرب، ہم مجلس اور ہم خیال لوگوں میں پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے عموماً یہ بہن بھائیوں، دوستوں اور رشتہ داروں میں زیادہ پایا جاتا ہے۔

حسد محض ایک منفی جذبہ ہی نہیں ہے بلکہ یہ محسود[1] کو نقصان پہنچانے کی عملی کوشش کا بیج بھی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حاسد اپنے محسود کو ہمیشہ نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ نقصان بعض اوقات محسود کے قتل تک بھی پہنچ جاتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حسد کی وجہ سے ہی اُنہیں اندھے کنویں میں پھینک دیا تھا۔ اور نہ صرف بھائی کو اندھے کنویں میں ڈالا بلکہ اپنے والد کے بارے بھی برا گمان کرنے لگے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِذْ قَالُوا لَيُوسُفُ وَأَخُوهُ أَحَبُّ إِلَىٰ أَبِينَا مِنَّا وَنَحْنُ عُصْبَةٌ إِنَّ أَبَانَا لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ﴿8﴾ اقْتُلُوا يُوسُفَ أَوِ اطْرَحُوهُ أَرْضًا يَخْلُ لَكُمْ وَجْهُ أَبِيكُمْ وَتَكُونُوا مِن بَعْدِهِ قَوْمًا صَالِحِينَ﴾ [يوسف: 9]

"جب یوسف کے بھائیوں نے آپس میں کہا کہ بے شک یوسف اور اس کا بھائی ہمارے والد کو ہم سے زیادہ محبوب ہے جبکہ ہم ایک مضبوط جماعت ہیں۔ بلاشبہ ہمارے والد ایک صریح بھول میں مبتلا ہیں۔ تم یوسف کو قتل کر دو یا کسی

[1] جس سے حسد کیا گیا ہو۔

جگہ چھینک دو تو تمہارے والد کی توجہ تمہارے لیے خالص ہو جائے گی۔ اور تم ایسا کرنے کے بعد نیک ہو جانا۔"

اولاد کے جوان ہونے کے بعد اولاد اور والدین میں جو شدید اختلافات (clashes) سامنے آتے ہیں، اُن کا ایک بڑا سبب اولاد کا آپس کا حسد بھی ہوتا ہے۔ جب والدین اپنی اولاد میں کسی ایک کو ترجیح دیتے ہیں تو دوسری اولاد ایک تو اپنے اُس بھائی اور بہن سے حسد محسوس کرتی ہے کہ جسے اُن پر ترجیح دی جا رہی ہوتی ہے۔ اور دوسرا اپنے والدین سے بھی شکوہ رکھ لیتی ہے کہ جس کا اگر بروقت علاج نہ کیا جائے تو وہ وقت کے ساتھ بڑھتا چلا جاتا ہے۔

انسان کا جذبات پر تو اختیار نہیں ہوتا لہذا اگر والدین کو اپنی بعض اولاد سے زیادہ پیار ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے لیکن اگر والدین عملاً بھی اولاد میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا شروع کر دیں تو اس سے اللہ کے رسول ﷺ نے ہمیں منع فرمایا ہے کیونکہ اس کا نتیجہ گھریلو فساد کی صورت میں نکلتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ کے ایک صحابی حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ اپنے ایک بیٹے کو لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کہا کہ اِس لڑکے کی ماں کی خواہش ہے کہ میں اپنا فلاں باغ اِسے ہبہ (gift) کر دوں اور وہ یہ بھی چاہتی ہیں کہ آپ ﷺ اِس ہبہ پر گواہ بن جائے تا کہ وفات کے بعد بقیہ رشتہ دار اس میں وراثت کا دعوی نہ کریں۔ آپ ﷺ نے ان سے پوچھا کہ ان کی اور بھی اولاد ہے تو انہوں نے بتلایا کہ ہاں اور بھی بچے ہیں۔ اس پر آپ ﷺ نے کہا:

«أَكُلَّ بَنِيكَ قَدْ نَحَلْتَ مِثْلَ مَا نَحَلْتَ النُّعْمَانَ؟» قَالَ: لَا، قَالَ: «فَأَشْهِدْ عَلَى هَذَا غَيْرِي»، ثُمَّ قَالَ: «أَيَسُرُّكَ أَنْ يَكُونُوا إِلَيْكَ فِي الْبِرِّ سَوَاءً؟» قَالَ: بَلَى، قَالَ: «فَلَا إِذًا»[1]

"کیا تم نے اپنی بقیہ اولاد کو بھی ایسا ہی باغ ہبہ کیا ہے۔ انہوں نے جواب دیا: نہیں۔ تو آپ ﷺ نے کہا: میں پھر اس پر گواہ نہیں بن سکتا۔ اور کیا تجھے یہ پسند نہیں ہے کہ تیری ساری اولاد تجھ سے اچھا سلوک کرے؟ انہوں نے

---

[1] صحیح مسلم، كِتَابُ الْهِبَاتِ، بَابُ كَرَاهَةِ تَفْضِيلِ بَعْضِ الْأَوْلَادِ فِي الْهِبَةِ، 1243/3

جواب دیا: کیوں نہیں؟ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے کہا: پھر ایسا نہ کرو کہ بعض اولاد کو کچھ ہبہ کرو اور بعض کو نہ کرو۔"

فرائیڈ خاندانی الجھاؤ کی نشاندہی کرنے میں تو درست ہے لیکن اس کی وجہ مخالف جنس کی خواہش (oedipus complex) قرار دیتے ہوئے قطعی طور غلط تجزیہ کرتا ہے۔ خاندان میں ماں کا جھکاؤ عام طور بیٹے کی طرف اس لیے زیادہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے خاوند کو اپنا حریف سمجھنے کے سبب سے اس کے مقابلے میں گھر ہی سے اپنے لیے ایک سہارا تلاش کرتی ہے اور یہ سہارا اسے بیٹے کی صورت میں میسر آتا ہے لہذا ماں کی توجہ بیٹوں کی طرف زیادہ ہو جاتی ہے۔ اب بیٹی جب والدہ کے بیٹوں کی طرف زیادہ میلان کو واضح طور محسوس کرتی ہے تو اسے یہ ماں کی زیادتی معلوم ہوتی ہے اور اس کے اور ماں کے مابین تعلقات میں ایک کھچاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کھچاؤ کے نتیجے میں بیٹی کا رجحان منطقی طور باپ کی طرف ہو جاتا ہے۔ اس طرح خاندان تقسیم ہو جاتا ہے اور باپ اپنے بیٹوں اور ان کی ماں کو ایک ایسی پارٹی سمجھنا شروع کر دیتا ہے جو خاندان میں اس کی حیثیت اور اختیار کو چیلنج کرتی ہے۔ خیر یہ تو خاندانی الجھاؤ کے بارے ایک عمومی بات ہے اور اس بارے کچھ اور بھی باتیں کہی جا سکتی ہیں کہ جن کے بیان کا یہ موقع نہیں ہے۔ کہنے کا مقصد یہی ہے کہ ہم جب تک خاندانی جھگڑوں کے صحیح اسباب تک نہ پہنچ پائیں گے تو ان کا حل بھی نہ کر سکیں گے۔

علماء اور صوفیاء کے مابین بغض بھی حسد کے نمایاں مقامات میں شامل ہے۔ علماء میں باہمی حسد کو اصطلاح میں "معاصرت" کہتے ہیں کہ عام طور علماء اپنے معاصر علماء کے علم و فضل کا اعتراف کرنے میں حد درجہ بخیل اور کنجوس ہوتے ہیں۔ اسی طرح افعال القلوب (actions of the heart) اگرچہ صوفیاء کا خاص موضوع رہا ہے لیکن وہ بھی اس بیماری سے الا ما شاء اللہ ہی محفوظ رہے ۔ صوفیاء کی سوانح (biographies) پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مریدین اپنے شیخ سے تعلق اور قرب کے حصول کی دوڑ میں آپس میں حسد کا شکار ہوتے رہے ہیں۔ مولانا روم کے شیخ شمس

تبریز کو تو ان کے مریدوں نے حسد کی وجہ سے قتل بھی کر دیا تھا۔[1] یہی وجہ ہے کہ صوفیاء میں تو یہ بھی معروف ہے کہ کاملین میں سے بھی سب سے آخر میں جو دو چیزیں نکلتی ہیں وہ حسد اور حب جاہ ہیں۔

جس طرح بہن بھائیوں میں باہمی حسد کا ایک بڑا سبب والدین کا ان میں سے کسی ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا ہوتا ہے اسی طرح کسی پیر کے مریدوں اور شیخ کے شاگردوں میں حسد کی بڑی وجہ بھی ان کا ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا ہوتا ہے۔ مرید عموماً یہ برداشت نہیں کرتا کہ شیخ کی محبت اور میلان اس کی نسبت کسی اور مرید کی طرف زیادہ ہو۔ اور یہ صورت اس وقت زیادہ گھمبیر (complex) ہو جاتی ہے جبکہ شیخ کا جھکاؤ کسی نئے مرید کی طرف پرانوں کی نسبت زیادہ ہو جائے۔

حاسد سے اور کچھ نہ ہو سکے تو کم از کم نظر بد ہی لگا دے گا اور یہ اس کا کم از کم شر ہے جو محسود کو پہنچتا ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے حاسد کے شر سے پناہ مانگنے کی باقاعدہ تعلیم دی ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَمِن شَرِّ حَاسِدٍ إِذَا حَسَدَ﴾ [الفلق: 5]

"اور میں پناہ مانگتا ہوں حاسد کے شر سے جبکہ وہ حسد کرے۔"

حسد سے بچنے کی بہترین تدبیر تو یہی ہے کہ انسان حاسدین کے شر سے اللہ کی پناہ طلب کرتا رہے۔ صبح وشام سورۃ الفلق اور سورۃ الناس کا تین بار ورد کرے اور دیگر اذکار مسنونہ کا بھی اہتمام کرے۔ اس کی ایک اور تدبیر یہ بھی ہے کہ جن رشتہ داروں، دوستوں اور ساتھیوں (colleagues) کے بارے شبہ ہو کہ وہ آپ سے حسد کریں گے تو ان کے سامنے اپنی کامیابیاں (achievements) بیان نہ کریں۔

یہ علاج تو محسود کے لیے ہے کہ وہ اپنے آپ کو حاسدین کے شر سے کس طرح بچائے لیکن حاسد اپنا علاج کس طرح کرے۔ یعنی اگر کسی کو کسی سے حسد محسوس ہو اور وہ اس سے نجات چاہتا ہو تو اسے کیا کرنا چاہیے؟ اس بارے حدیث میں ایک بہترین

[1] شبلی نعمانی، سوانح مولانا روم، نامی پریس، انڈیا، 1906ء، ص 18

تدبیر بتلائی گئی ہے کہ حاسد جس سے حسد محسوس کرے، اُسے تحفہ دینے کا اہتمام کرے کیونکہ تحفہ دینا انسان کے دل میں محبت کا بیج بو دیتا ہے۔ حسد کا جذبہ بغض سے پھوٹتا ہے اور بغض اور محبت دونوں کا ایک ساتھ جمع ہونا محال ہے۔ پس کسی سے حسد اور اس سے محبت ایک ہی دل میں ایک ساتھ قائم نہیں رہ سکتے۔ اگر تحفہ دینے کی استطاعت نہ ہو تو کم از کم محسود کو دھیان سے سلام کہنے کا اہتمام کرے تو اس سے بھی حسد جاتا رہے گا۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

دَبَّ إِلَيْكُمْ دَاءُ الأُمَمِ قَبْلَكُمْ: «الحَسَدُ وَالبَغْضَاءُ»، هِيَ الحَالِقَةُ، لَا أَقُولُ تَحْلِقُ الشَّعَرَ وَلَكِنْ تَحْلِقُ الدِّينَ، وَالَّذِي نَفْسِي بِيَدِهِ لَا تَدْخُلُوا الجَنَّةَ حَتَّى تُؤْمِنُوا، وَلَا تُؤْمِنُوا حَتَّى تَحَابُّوا، أَفَلَا أُنَبِّئُكُمْ بِمَا يُثَبِّتُ ذَلِكَ لَكُمْ؟ «أَفْشُوا السَّلَامَ بَيْنَكُمْ»[1]

"پہلی قوموں کی جو بیماریاں تمہاری طرف رینگتے ہوئے بڑھ رہی ہیں، ان میں حسد اور بغض شامل ہیں۔ اور یہ ایسی بیماریاں ہیں جو مونڈ دینے والی ہیں۔ اور میں یہ نہیں کہہ رہا کہ یہ بالوں کو مونڈ دینے والی ہیں بلکہ دین کو مونڈ دینے والی بیماریاں ہیں۔ پروردگار کی قسم! تم اس وقت تک جنت میں داخل نہیں ہو سکتے جب تک کہ مؤمن نہ کہلاؤ۔ اور اس وقت تک مؤمن نہیں کہلا سکتے جب تک کہ آپس میں محبت نہ رکھو۔ کیا میں تمہیں ایک ایسی بات نہ بتلا دوں کہ جو تمہارے مابین محبت قائم رکھے؟ اور وہ ہے آپس میں سلام کو رواج دینا۔"

حسد ایک ایسی عمومی بیماری ہے کہ شاذ و نادر ہی کوئی اس سے محفوظ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ شریعت اسلامیہ میں رشک کو جائز قرار دیا گیا ہے۔ رشک یہ ہے کہ کسی بھائی کی نعمت دیکھ کر یہ جذبہ پیدا ہو کہ اللہ عزوجل مجھے بھی ایسی نعمت عطا کرے۔ حسد میں تو اپنے بھائی کی نعمت چھن جانے کا بھی جذبہ ہوتا ہے جبکہ رشک میں یہ منفی جذبہ نہیں ہوتا۔ حسد سے بچنے کی ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ اس جذبے کو رشک کی طرف موڑ دیا جائے۔

[1] سنن الترمذي، أبواب صفة القيامة والرقائق والورع، 664/4

مسلمانوں سے محبت

اللہ عزوجل نے ہمیں مسلمانوں سے محبت کرنے کا حکم دیا ہے اور ان سے بغض رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ اور مسلمانوں سے جو محبت ہوتی ہے تو وہ بھی اللہ ہی کے لیے ہوتی ہے اور ایسی محبت ایمان کے کمال کی نشانی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«مَنْ أَحَبَّ لِلَّهِ، وَأَبْغَضَ لِلَّهِ، وَأَعْطَى لِلَّهِ، وَمَنَعَ لِلَّهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْإِيمَانَ»[1]

”جس نے اللہ کے لیے محبت رکھی اور اللہ کے لیے ہی نفرت رکھی۔ اور جس نے اللہ کے لیے ہی کسی کو کچھ دیا اور اللہ کے لیے ہی کسی سے کچھ روکا تو اس نے اپنا ایمان مکمل کر لیا۔“

اگر کسی کے دل میں کسی بھی مسلمان بھائی کے لیے بغض نہ ہو تو یہ جنتی ہونے کی علامت ہے لہذا یہ بھی ایک کرنے کا کام ہے کہ ہم مسلمانوں کے بارے بغض کو اپنے دل سے نکالیں اور ان سے محبت کو اپنے دل میں جگہ دیں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

أَنَسُ بْنُ مَالِكٍ قَالَ: كُنَّا جُلُوسًا مَعَ رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ: «يَطْلُعُ عَلَيْكُمُ الْآنَ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ، فَطَلَعَ رَجُلٌ مِنَ الْأَنْصَارِ، تَنْطِفُ لِحْيَتُهُ مِنْ وُضُوئِهِ، قَدْ تَعَلَّقَ نَعْلَيْهِ فِي يَدِهِ الشِّمَالِ، فَلَمَّا كَانَ الْغَدُ، قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، مِثْلَ ذَلِكَ، فَطَلَعَ ذَلِكَ الرَّجُلُ مِثْلَ الْمَرَّةِ الْأُولَى. فَلَمَّا كَانَ الْيَوْمُ الثَّالِثُ، قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، مِثْلَ مَقَالَتِهِ أَيْضًا، فَطَلَعَ ذَلِكَ الرَّجُلُ عَلَى مِثْلِ حَالِهِ الْأُولَى، فَلَمَّا قَامَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَبِعَهُ عَبْدُ اللهِ بْنُ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ فَقَالَ: إِنِّي لَاحَيْتُ أَبِي فَأَقْسَمْتُ أَنْ لَا أَدْخُلَ عَلَيْهِ ثَلَاثًا، فَإِنْ رَأَيْتَ أَنْ تُؤْوِيَنِي إِلَيْكَ حَتَّى تَمْضِيَ فَعَلْتَ؟ قَالَ: نَعَمْ. قَالَ أَنَسٌ: وَكَانَ عَبْدُ اللهِ يُحَدِّثُ أَنَّهُ بَاتَ مَعَهُ تِلْكَ اللَّيَالِي الثَّلَاثَ، فَلَمْ يَرَهُ يَقُومُ مِنَ اللَّيْلِ شَيْئًا، غَيْرَ أَنَّهُ إِذَا تَعَارَّ وَتَقَلَّبَ عَلَى فِرَاشِهِ ذَكَرَ اللهَ عَزَّ وَجَلَّ وَكَبَّرَ، حَتَّى يَقُومَ لِصَلَاةِ الْفَجْرِ. قَالَ عَبْدُ اللهِ: غَيْرَ أَنِّي لَمْ أَسْمَعْهُ يَقُولُ إِلَّا خَيْرًا، فَلَمَّا

[1] سنن أبي داود، كِتاب السُّنَّةِ، بَابُ الدَّلِيلِ عَلَى زِيَادَةِ الْإِيمَانِ وَنُقْصَانِهِ، 220/4

مَضَتِ الثَّلَاثُ لَيَالٍ وَكِدْتُ أَنْ أَحْقِرَ عَمَلَهُ، قُلْتُ: يَا عَبْدَ اللهِ إِنِّي لَمْ يَكُنْ بَيْنِي وَبَيْنَ أَبِي غَضَبٌ وَلَا هَجْرٌ ثَمَّ، وَلَكِنْ سَمِعْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ لَكَ ثَلَاثَ مِرَارٍ: يَطْلُعُ عَلَيْكُمُ الْآنَ رَجُلٌ مِنْ أَهْلِ الْجَنَّةِ، فَطَلَعْتَ أَنْتَ الثَّلَاثَ مِرَارٍ، فَأَرَدْتُ أَنْ آوِيَ إِلَيْكَ لِأَنْظُرَ مَا عَمَلُكَ، فَأَقْتَدِيَ بِهِ، فَلَمْ أَرَكَ تَعْمَلُ كَثِيرَ عَمَلٍ، فَمَا الَّذِي بَلَغَ بِكَ مَا قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ: مَا هُوَ إِلَّا مَا رَأَيْتَ. قَالَ: فَلَمَّا وَلَّيْتُ دَعَانِي، فَقَالَ: مَا هُوَ إِلَّا مَا رَأَيْتَ، غَيْرَ أَنِّي لَا أَجِدُ فِي نَفْسِي لِأَحَدٍ مِنَ الْمُسْلِمِينَ غِشًّا، وَلَا أَحْسُدُ أَحَدًا عَلَى خَيْرٍ أَعْطَاهُ اللهُ إِيَّاهُ. فَقَالَ عَبْدُ اللهِ هَذِهِ الَّتِي بَلَغَتْ بِكَ، وَهِيَ الَّتِي لَا نُطِيقُ»

”حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ہم ایک مرتبہ مسجد نبوی میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھے تھے کہ آپ نے فرمایا کہ ابھی ایک ایسا شخص مسجد میں داخل ہوگا کہ جو جنتی ہے۔ تو تھوڑی دیر بعد ایک انصاری صحابی مسجد میں داخل ہوئے کہ جو اپنی داڑھی سے وضو کا پانی جھاڑ رہے تھے اور انہوں نے اپنا جوتا اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔ دوسرے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دوبارہ یہی بات بیان فرمائی اور وہی صحابی مسجد میں اسی حالت میں داخل ہوئے۔ تیسرے دن آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پھر یہی بات بیان فرمائی تو تیسرے دن بھی وہی صحابی مسجد میں اسی حالت میں داخل ہوئے۔ پس مجلس ختم ہونے کے بعد حضرت عبد اللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے ان انصاری صحابی کا پیچھا کیا [کہ جن کو تین دن لگاتار اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی غیر موجودگی میں جنتی ہونے کی بشارت دی تھی اور ان کے گھر کے قریب پہنچ کر] حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میری اپنے والد صاحب سے لڑائی ہوئی ہے اور میں نے یہ قسم کھائی ہے کہ تین دن اپنے گھر نہیں جاؤں گا تو کیا میں یہ تین دن آپ کے گھر رہ سکتا ہوں؟ تو ان انصاری صحابی نے انہیں اپنے گھر ٹھہرا لیا۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ان انصاری صحابی کے گھر تین راتیں گزاریں لیکن انہوں نے رات تہجد کے لیے کوئی قیام نہیں کیا البتہ اتنا تھا

کہ جب رات کو بستر پر کروٹ بدلتے تو اللہ اکبر کہتے تھے اور پھر صبح کی آذان کے وقت بیدار ہوتے۔ اور میں نے ان تین دنوں میں ان سے کسی کی برائی نہیں سنی۔ جب تین راتیں گزر گئیں تو مجھے ان کا عمل حقیر معلوم ہونے لگا[1] تو میں نے ان انصاری صحابی سے کہا کہ میرے اور میرے والد صاحب کے مابین کوئی جھگڑا نہیں ہے، بس بات صرف اتنی تھی کہ اللہ کے رسول ﷺ نے آپ کے بارے تین مرتبہ جنت کی بشارت دی تھی تو میں آپ کا عمل دیکھنے کے لیے آپ کے گھر رکا تھا کہ میں بھی وہ عمل کروں جو آپ کرتے ہیں لیکن مجھے آپ کا کوئی خاص عمل نظر نہیں آیا۔ تو آپ ہی بتلائیں کہ آپ کا وہ کیا عمل ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے آپ کے بارے ایسی بات کہی ہے۔ تو ان انصاری صحابی نے کہا کہ بھائی میرا تو جو عمل ہے، وہ تمہارے سامنے ہی ہے۔ حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ان کی یہ بات سن کر اپنے گھر جانے کے لیے جب واپس مڑا تو انہوں نے مجھے بلوایا اور کہا کہ میرا عمل تو تم نے دیکھ ہی لیا البتہ ایک بات ہے کہ میرے دل میں کسی مسلمان کے لیے کینہ نہیں ہے۔ اور اللہ نے کسی مسلمان بھائی کو جو کچھ دیا ہے تو مجھے ان سے اس پر کوئی حسد نہیں ہوتا۔ تو حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے کہا: یہی وہ بات ہے کہ جس کے سبب آپ کو یہ مرتبہ ملا اور ہم اس کی طاقت نہیں رکھتے ہیں۔"

متقی اور دیندار لوگوں سے محبت رکھنا بھی نیکی کا عمل ہے اور نیک لوگوں سے محبت رکھنا ہی ایسا عمل ہے جو ہمارے ہر تعلق اور ہر عمل کو اللہ کی محبت پر کھڑا کر کے دکھا دے گا، ان شاء اللہ!

اللہ کی خاطر اللہ کی مخلوق سے محبت رکھنے کا کیا درجہ ہے تو اس بارے ایک روایت

---

[1] حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ خود بہت عبادت گزار تھے کہ دن کو روزہ رکھتے اور رات کو قیام کرتے تھے اور اتنی عبادت کیا کرتے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں اپنی عبادت کم کرنے کا حکم دیا تھا۔ تو ان کا خیال تھا کہ جنہیں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے تین دن لگاتار جنتی ہونے کی بشارت دی ہے تو ان کی کوئی خاص عبادت ہو گی اور وہی معلوم کرنے کی غرض سے انہوں نے ان انصاری صحابی کے ہاں تین راتیں گزاریں لیکن انہیں مایوسی ہوئی کہ وہ صحابی عشاء کی نماز پڑھ کے سوتے تھے اور پھر فجر کی آذان کے ساتھ بیدار ہوتے تھے۔

کے الفاظ ہیں:

«أَنَّ رَجُلًا زَارَ أَخًا لَهُ فِي قَرْيَةٍ أُخْرَى، فَأَرْصَدَ اللهُ لَهُ، عَلَى مَدْرَجَتِهِ، مَلَكًا فَلَمَّا أَتَى عَلَيْهِ، قَالَ: أَيْنَ تُرِيدُ؟ قَالَ: أُرِيدُ أَخًا لِي فِي هَذِهِ الْقَرْيَةِ، قَالَ: هَلْ لَكَ عَلَيْهِ مِنْ نِعْمَةٍ تَرُبُّهَا؟ قَالَ: لَا، غَيْرَ أَنِّي أَحْبَبْتُهُ فِي اللهِ عَزَّ وَجَلَّ، قَالَ: فَإِنِّي رَسُولُ اللهِ إِلَيْكَ، بِأَنَّ اللهَ قَدْ أَحَبَّكَ كَمَا أَحْبَبْتَهُ فِيهِ»[1]

"ایک شخص اپنے ایک دینی بھائی سے ملاقات کے لیے اپنی بستی سے دوسری بستی کی طرف نکلا کہ اللہ نے اس کے راستے میں ایک فرشتہ بھیجا کہ جس نے اس سے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ تو اس شخص نے جواب دیا کہ میں فلاں بستی میں فلاں سے ملنے جا رہا ہوں۔ تو فرشتے نے پوچھا کہ کیا اس شخص نے تم پر کوئی احسان کیا تھا کہ تم اس سے ملنے جا رہے ہو۔ تو اس شخص نے جواب دیا کہ نہیں، اس کا مجھ پر کوئی احسان نہیں ہے۔ بس اللہ کے لیے مجھے اس سے محبت ہے لہذا اللہ کی محبت میں اس سے ملنے جا رہا ہوں۔ تو اس فرشتے نے کہا کہ میرے رب نے مجھے تیری طرف بھیجا ہے اور یہ کہا ہے کہ جس طرح تو نے اس شخص سے اللہ کے لیے محبت رکھی، اسی طرح اللہ تجھ سے محبت رکھتا ہے۔"

پس کسی سے ہمارے ظاہری اور باطنی دونوں قسم کے تعلق کی بنیاد اللہ کی ذات ہونی چاہیے۔ اگر ظاہری تعلق یعنی لین دین اور دینا دلانا کسی کے ساتھ ہو تو اللہ کے لیے ہو کہ اللہ عزوجل نے رشتہ داروں اور مخلوقِ خدا سے حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ اور باطنی تعلق یعنی کسی سے محبت اور نفرت اگر ہو تو اس کا سبب بھی اپنی ذات نہ ہو بلکہ اللہ کا حکم ہو کہ جو اللہ کا زیادہ فرمانبردار ہو تو اس کی زیادہ محبت محسوس ہو۔

اور جو اللہ کا نافرمان ہو تو اس کی کم محبت محسوس ہو اور جو اللہ کا باغی اور سرکش (rebel) ہو تو اُس سے تو نفرت محسوس ہونا ایمان کا تقاضا (requirement) ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِي إِبْرَاهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُ إِذْ قَالُوا

[1] صحيح مسلم، كتاب الْبِرِّ وَالصِّلَةِ وَالْآدَابِ، بَابٌ فِي فَضْلِ الْحُبِّ فِي اللهِ، 4/1988

لِقَوْمِهِمْ إِنَّا بُرَآءُ مِنكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّـهِ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَاءُ أَبَدًا حَتَّىٰ تُؤْمِنُوا بِاللَّـهِ وَحْدَهُ إِلَّا قَوْلَ إِبْرَاهِيمَ لِأَبِيهِ لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَا أَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللَّـهِ مِن شَيْءٍ رَّبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَإِلَيْكَ أَنَبْنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ﴾ [الممتحنة: 4]

”مسلمانو! تمہارے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام میں اور ان کے ساتھیوں میں بہترین نمونہ ہے، جبکہ ان سب نے اپنی قوم سے برملا کہہ دیا کہ ہم تم سے اور جن جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو ان سب سے بالکل بیزار ہیں۔ ہم تمہارے (عقائد کے) منکر ہیں جب تک تم اللہ کی وحدانیت پر ایمان نہ لاؤ ہم میں تم میں ہمیشہ کے لیے بغض اور عداوت ظاہر ہو گئی۔“

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قول ہے کہ جو خلیل اللہ ہیں، ابو الانبیاء ہیں، جنہیں قرآن مجید نے انتہائی حلیم اور برد بار ہونے کا سرٹیفکیٹ دیا لیکن ان کے دل میں بھی ان کافروں کے لیے بغض موجود ہے کہ جو اللہ کے باغی اور سرکش ہیں۔ اور یہ وہ کافر ہیں جن پر اہل ایمان نے دعوت و تبلیغ کے راستے حد درجہ حجت قائم کر دی ہے لیکن وہ جواب میں اہل ایمان کو اذیتیں پہنچاتے ہیں۔ پس ظلم کرنے والے ایسے کافروں سے بغض رکھنا ایمان کی نشانی ہی نہیں، لازمی تقاضا بھی ہے۔

اور مسلمانوں سے جو دین کے نام پر بغض رکھا جاتا ہے تو اکثر و بیشتر اپنے نفس کے لیے ہوتا ہے، نہ کہ اللہ کے لیے۔ اس بارے اپنے احوال پر غور کرتے رہنا چاہیے تا کہ نفس کی اصلاح ہوتی رہے۔ جب کسی سے اللہ کے لیے اختلاف رکھا جاتا ہے یا کسی پر اللہ کے لیے نقد کی جاتی ہے تو ایسے رویے سامنے آتے ہیں جو ہمیں امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کی زندگی میں اپنے دشمنوں کے لیے ملتے ہیں۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے اکابر اصحاب یہ خواہش رکھتے تھے کہ کاش انہیں بھی اپنے دشمنوں کے بارے وہی اخلاق ملیں جو امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے حصے میں آئے ہیں۔ امام ابن قیم رحمہ اللہ اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

وَجِئْتُ يَوْمًا مُبَشِّرًا لَهُ بِمَوْتِ أَكْبَرِ أَعْدَائِهِ، وَأَشَدِّهِمْ عَدَاوَةً وَأَذًى لَهُ. فَنَهَرَنِي وَتَنَكَّرَ لِي وَاسْتَرْجَعَ. ثُمَّ قَامَ مِنْ فَوْرِهِ إِلَى بَيْتِ أَهْلِهِ

فَعَزَّاهُمْ، وَقَالَ: إِنِّي لَكُمْ مَكَانَهُ، وَلَا يَكُونُ لَكُمْ أَمْرٌ تَحْتَاجُونَ فِيهِ إِلَى مُسَاعَدَةٍ إِلَّا وَسَاعَدْتُكُمْ فِيهِ. وَنَحْوَ هَذَا مِنَ الْكَلَامِ. فَسُرُّوا بِهِ وَدَعَوْا لَهُ. وَعَظَّمُوا هَذِهِ الْحَالَ مِنْهُ.[1]

"ایک دن میں شیخ الاسلام امام ابن تیمیہ رحمہ اللہ کے پاس آیا اور ان کو ان کے ایک بہت بڑے دشمن کہ جو ان سے سخت عداوت رکھتا تھا اور انہیں بہت اذیت پہنچاتا تھا، کے بارے کہا کہ خوشخبری ہو کہ اس کی وفات ہو گئی ہے۔ تو شیخ نے مجھے ڈانٹ دیا، اور میری بات کو ناپسند جانا اور انا للہ وانا الیہ رجعون کہا۔ پھر فوراً اپنی جگہ سے اٹھے اور مرحوم کے گھر جا کر ان کے گھر والوں سے تعزیت کی اور انہیں کہا کہ مرحوم کی جو حیثیت آپ کے گھر میں تھی، آج سے میری وہی حیثیت سمجھیں لہذا آپ لوگوں کو کسی بھی چیز کی ضرورت ہو گی تو میں پوری کروں گا۔ اور اس قسم کی باتیں کہیں کہ جنہیں سن کے مرحوم کے گھر والے بہت خوش ہوئے اور انہوں نے شیخ کو دعائیں دیں۔ اور ان کی اس رویے سے بہت متاثر ہوئے۔"

عجلت کا فساد

اللہ تعالی نے انسان کی آزمائش کے لیے کچھ کمیاں اور کوتاہیاں پیدائشی طور اس میں رکھ چھوڑی ہیں تاکہ وہ اپنی تربیت وتزکیہ کے ذریعے ان پر قابو حاصل کرے اور اپنے امتحان میں کامیاب ٹھہرے۔ عجلت جسے ہم اپنی زبان میں جلد بازی کہتے ہیں، انسان کے ان عیوب میں داخل ہے جو پیدائشی ہیں۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿خُلِقَ الْإِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ﴾ [الأنبياء: 37]

"انسان کو عجلت کے خمیر سے پیدا کیا گیا ہے۔"

ہم یہ بات اس پہلے بھی کر چکے ہیں کہ جو اوصاف انسان میں پیدائشی ہوتے ہیں، انہیں ختم نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ پیدائشی اوصاف یا مزاج کا ختم کرنا ممکن نہیں ہے لیکن پھر بھی انسان سے تزکیہ نفس کا مطالبہ کیا گیا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے:

---

[1] مدارج السالكين: 329/2

﴿وَنَفْسٍ وَمَا سَوَّاهَا ﴿7﴾ فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا وَتَقْوَاهَا ﴿8﴾ قَدْ أَفْلَحَ مَن زَكَّاهَا ﴿9﴾ وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا﴾ [الشمس: 10]

"اور قسم ہے نفس کی اور اس کے سنوارنے کی۔ اللہ نے انسان کے نفس میں اس کا تقویٰ اور فسق و فجور دونوں رکھ دیے ہیں۔ پس کامیاب وہ ہے کہ جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا۔ اور ناکام وہ ہے کہ جس نے اپنے نفس کو دبا دیا۔"

اس آیت کریمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ تقویٰ اور فسق و فجور دونوں نفس انسانی میں پیدائشی طور رکھے گئے ہیں۔ اور اس شخص کو کامیاب قرار دیا گیا ہے کہ جس نے اپنے نفس کو فسق و فجور سے پاک کر لیا اور اسے ناکام کہا گیا ہے کہ جس نے اپنے نفس کو فسق و فجور کے ساتھ خاک میں ملا دیا۔

نفس انسانی میں موجود پیدائشی کمزوریوں کے ساتھ دو طرح سے معاملہ کیا جا سکتا ہے: ضبط اور امالہ۔ پہلی صورت یہ ہے کہ انہیں قابو میں لایا جائے اور دوسری یہ کہ انہیں نیکی کے رخ پر مائل کرنے کی کوشش کی جائے۔

عجلت انسانی مزاج کی ایک ایسی بیماری ہے جو نہ صرف نفس انسانی کے بگاڑ بلکہ معاشرے میں بھی فساد کا باعث بنتی ہے۔ یہ بیماری عموماً نوجوانوں میں زیادہ پائی جاتی ہے کیونکہ عمر کے ساتھ انسان کی زندگی میں ٹھہراؤ آ ہی جاتا ہے۔ اسی طرح یہ بیماری مردوں کی نسبت عورتوں میں زیادہ ہوتی ہے کیونکہ اس کا تعلق انسان کے مزاج سے ہے اور مزاج جذبات سے بنتا ہے اور جذبات کا پہلو عورتوں میں نسبتاً غالب ہوتا ہے۔

جدید دور کے انسان کا المیہ یہ ہے کہ کیپٹل ازم کے عالمی نظام میں مارکیٹنگ نے عجلت کی کمزوری کو اسی طرح بھڑکا دیا ہے کہ جیسے پٹرول کے چھڑکنے سے سلگتا ہوا کوئلہ بھڑک اٹھتا ہے۔ نیا موبائل، نیا آئی فون، نیا ٹیبلٹ، نیا لیپ ٹاپ، نئی گاڑی ان میں سے کیا کچھ انسان کی ضرورت میں داخل ہے؟ لیکن اس کے باوجود انسانوں کی اکثریت ٹیلی ویژن ایڈز، اخباری اشتہارات اور شاہراہوں پر لگے بل بورڈز سے متاثر ہو کر وہ سب کچھ خرید لینے میں عجلت سے کام لیتی ہیں کہ جو نہ تو ان کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی ان میں اس کی خرید کی استطاعت (purchasing power) ہوتی ہے۔

جن کے پاس نئے ماڈل کی قوت خرید ہوتی ہے لیکن وہ اُن کی ضرورت نہیں ہوتا تو ان کا معاملہ تو یہ ہوتا ہے کہ وہ جلد ہی اُس چیز سے اکتا جاتے ہیں اور اگلے ماڈل کا انتظار کرنے لگ جاتے ہیں۔ اور جن کی قوت خرید نہیں ہوتی، وہ مہینے کے شروع میں خرید تو لیتے ہیں لیکن مہینے کے آخر میں قرض ڈھونڈتے پھرتے ہیں۔

اللہ تعالی نے انسان کے اندر پیدائشی طور دنیاوی مال ومتاع کی محبت رکھی ہے، اس سے انکار نہیں ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْأَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذَلِكَ مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا وَاللَّهُ عِنْدَهُ حُسْنُ الْمَآبِ﴾ [آل عمران: 14]

"انسانوں کے لیے عورتوں، بیٹوں، سونے اور چاندی کے ڈھیروں، عمدہ گھوڑوں، مال مویشی اور کھیتی کی خواہش اور محبت خوبصورت بنادی گئی ہے۔ لیکن یہ سب دنیا کا حقیر ساز وسامان ہے اور اللہ کے پاس عمدہ ٹھکانہ ہے۔"

یہ خواہشات اور ان کی محبت اللہ نے انسان میں رکھی ہیں، ہم انہیں ختم نہیں کر سکتے۔ اگر یہ ختم ہو جائیں تو آزمائش ختم ہو جائے۔ اور ان خواہشات کا ختم کرنا شریعت اسلامیہ کا مقصود بھی نہیں ہے بلکہ مطلوب یہ ہے کہ ہم ان خواہشات کو کنٹرول اور مائل کریں۔ تو جلد بازی کی صفت کو قابو کرنا ایک مطالبہ ہے اور اس کو نیکی کی طرف مائل کرنا ایک دوسرا پہلو ہے۔

نیکی کے کاموں یا اللہ سبحانہ وتعالی کو راضی کرنے میں جلدی کرنا شریعت اسلامیہ میں مطلوب ہے۔ پس دنیا کے معاملے میں عجلت کو ممکن حد تک قابو میں رکھیں اور اللہ کو راضی کرنے کے معاملے میں عجلت سے کام لیں۔ تو ضبط اور امالہ ان دو طریقوں سے ہم اپنا تزکیہ نفس کر سکتے ہیں کہ دنیا کے معاملے میں عجلت کی صفت کو ضبط میں رکھنا سیکھیں اور دین کی طرف عجلت کی صفت کو مائل کرنے کے لیے مجاہدہ کریں۔

جلد بازی کا معاشرتی فساد کیا ہے؟ اس کے لیے ہمارے معاشرے کی ایک چھوٹی سی مثال ہی کافی ہے۔ اگر آپ بائیک اور گاڑی پر سوار ہو کر شاہراہ پر نکلیں اور اپنے دائیں

بائیں اور ٹریفک اشاروں کے مقامات پر خاص طور غور کریں تو آپ کو محسوس ہو گا جیسے ہر گاڑی اتنی جلدی میں ہے کہ جیسے فائر بریگیڈ کہیں آگ بجھانے کے لیے جا رہی ہو۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے ہر دوسرا شخص پریشان اور کشیدہ (tense) نظر آتا ہے۔ اِس نے اُس کو کٹ (cut) مار دیا، سگنل یہاں کا کھلا تھا اور ٹریفک دوسری طرف کی جاری ہو گئی، اِس کی بائیک اُس کے بمپر سے کچھ مس (touch) کر گئی وغیرہ۔ یہ عجلت اکثر اوقات ٹریفک حادثات کا باعث بھی بن جاتی ہے۔ کیا انسان اتنا کمزور ہے کہ وہ اپنے آپ کو یہ نہیں سمجھا سکتا کہ کیا ہوا اگر میں پانچ منٹ دیر سے پہنچ جاؤں۔ اگر کسی شخص کو دیر ہو رہی ہے اور اسے ضروری طور وقت پر پہنچنا ہے تو اسے اپنی تاخیر کے اسباب پر غور کرنا چاہیے تا کہ آئندہ دیر نہ ہو نہ کہ پریشانی میں بائیک یا گاڑی دوڑا کر خود کو بھی پریشان کرے اور دوسروں کو بھی اذیت دے۔ اور تو اور اب اگر ایک ایم بی اے (MBA) بھی تیز ڈرائیونگ پر ٹوکنے کے جواب میں یہ کہے کہ میں جلدی میں ہوں اور مجھے دیر ہو رہی ہے تو اس کی ڈگری کے بارے آپ کیا تبصرہ کر سکتے ہیں؟ اسے تو دوسروں کی اصلاح کرنی تھی، معاشرے کو انتظام (management) سکھانا تھا نہ کہ خود کو بھی اپنے علم سے محروم رکھنا تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

«التَّأَنِّي مِنَ اللَّهِ وَالْعَجَلَةُ مِنَ الشَّيْطَانِ»[1]

”ٹھہراؤ، اللہ کی طرف سے ہے اور عجلت، شیطان کی طرف سے ہے۔“

روایت کا معنی یہ ہے کہ شیطان، انسان کی کمزوریوں کا استحصال (exploit) کرتے ہوئے اسے خوب گمراہ کرتا ہے اور جن کمزوریوں کا وہ استحصال کرتا ہے، ان میں سے ایک عجلت بھی ہے۔

قناعت کی دولت

اللہ نے انسان کو جو کچھ اور جتنا دیا ہو، اس پر راضی رہنا انسان کی زندگی خوشحال بنا دیتا ہے۔ دنیا میں تمام انسان مال و دولت، حسن و جمال، صلاحیت و اہلیت اور مقام و مرتبے

[1] سلسلة الأحاديث الصحيحة: 404/4

کے اعتبار سے کبھی بھی ایک جیسے نہیں ہو سکتے ہیں۔ یہ فرق اس لیے بھی ضروری ہے کہ اسی فرق کی وجہ سے دنیا کا یہ نظام چل رہا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجَاتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُم بَعْضًا سُخْرِيًّا﴾ [الزخرف: 32]

"اور ہم نے اس دنیا میں بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے تاکہ لوگ ایک دوسرے سے کام لے سکیں۔"

اگر سب لوگ ایک ہی جیسے مال دار ہوتے تو ایک دوسرے کے کام کیسے آتے؟ یہ ضرورت اور مجبوری ہی ہے کہ جس کی وجہ سے لوگ ایک دوسرے کا کام کرتے ہیں۔

قناعت یہ نہیں ہے کہ انسان ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے اور آزمائش سے نکلنے اور دنیا کمانے کے لیے محنت نہ کرے بلکہ قناعت یہ ہے کہ انسان کی محنت اور کوشش کے باوجود اسے اللہ کی طرف سے جو رزق ملے تو اس پر اللہ کا شکر ادا کرے اور شکوہ نہ رکھے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ عَمْرٍو، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: «قَدْ أَفْلَحَ مَنْ أَسْلَمَ وَرُزِقَ كَفَافًا وَقَنَّعَهُ اللَّهُ»[1]

"حضرت عبد اللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے ﷺ نے فرمایا ہے کہ وہ شخص فلاح پا گیا کہ جو اسلام لایا اور جسے اتنا رزق دیا گیا کہ جو کفایت کرنے والا تھا۔ اور اسے اس بارے اللہ نے قناعت کی دولت سے نوازا۔"

اسی طرح اللہ نے انسان کی تقدیر میں جو کچھ حسن وجمال، وجاہت ومقام اور نعمت وآزمائش وغیرہ مقدر کر دیا ہے تو اُس پر راضی ہو جانے کا نام قناعت ہے۔ جن لوگوں میں قناعت نہیں ہوتی، وہ ذہنی اذیت کا شکار رہتے ہیں۔ انسان میں اگر قناعت کا وصف نہ ہو تو اُسے اپنی پیدائش اور اس دنیا میں آنے پر بھی اطمینان نہیں رہتا۔ یہ قناعت نہ ہونے کا ہی نتیجہ ہے کہ اب لڑکے کو لڑکی بننے کا شوق ہے تو لڑکی کو لڑکا بننے کا جنون۔ اور سرجری کے راستے تبدیلی جنس (gender reassignment) پر اپنا وقت اور

---

[1] سنن الترمذي، أَبْوَابُ الزُّهْدِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي الكَفَافِ وَالصَّبْرِ عَلَيْهِ، 575/4

پیسہ دونوں ضائع کرتا رہتا ہے

قناعت کرنے والا شخص اصلاً امیر ہوتا ہے یعنی اُس کا دل امیر ہوتا ہے۔ عموماً یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ جہاں مال زیادہ ہو، وہاں کنجوسی اور بخیلی بھی بڑھ جاتی ہے جبکہ جہاں مال کم ہو اور اللہ تعالی ساتھ ہی قناعت کی دولت بھی عطا فرمادیں تو ایسا شخص حقیقی معنوں میں غنی کہلائے جانے کے لائق ہے۔ پس قناعت ایسی چیز ہے جو غریب کو امیر بنا دیتی ہے اور کنجوسی اور بخیلی ایسی شیء ہے جو امیر کو غریب بنا دیتی ہے۔ اگر آپ میں قناعت ہے تو سوزوکی مہران میں بیٹھ کر بھی اللہ کے شکر گزار ہوں گے اور اگر قناعت نہیں ہے تو ہنڈا سٹی کو بھی انجوائے نہیں کر پائیں گے کہ دل ہر وقت مرسیڈیز اور بی ایم ڈبلیو وغیرہ کے بارے سوچے گا۔

اللہ کے رسول صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے اصل غنی اس کو قرار دیا ہے کہ جو دل کا غنی ہو یعنی جس کا دل بڑا ہو۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «لَيْسَ الْغِنَى عَنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ، وَلَكِنَّ الْغِنَى غِنَى النَّفْسِ»[1]

"حضرت ابو ہریرۃ رَضِيَ اللهُ عَنْهُ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ نے فرمایا کہ غنی مال ودولت کی کثرت کا نام نہیں ہے بلکہ غنی تو وہ ہے جو دل کا غنی ہے۔"

شکر کی نعمت

اللہ تعالی نے قرآن مجید میں اپنے بندوں کو شکر ادا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اللہ کا شکر ادا کرنے کے تین درجات ہیں۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ اللہ کی نعمتوں کے نعمت ہونے کا احساس دل میں پیدا ہو۔ دوسرا درجہ یہ ہے کہ اس احساس کے پیدا ہونے پر انسان اپنی زبان سے بھی اللہ کا شکر ادا کرے۔ اور تیسرا درجہ یہ ہے کہ زبان کے علاوہ اپنے عمل سے بھی شکر ادا کرے۔

کسی شاہراہ پر اگر آپ کسی بائیک یا گاڑی والے سے لفٹ مانگیں اور وہ آپ کو لفٹ

---

[1] سنن ابن ماجة، كِتَابُ الزُّهْدِ، بَابُ الْقَنَاعَةِ، دار إحياء الكتب العربي، بيروت، 1386/2

دے دے تو منزل مقصود پر پہنچنے کے بعد سب سے پہلے آپ کے دل میں اس شخص کے لیے شکر گزاری کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ دوسرے درجہ میں آپ جزاک اللہ، شکریہ، Thanks وغیرہ جیسے الفاظ ادا کر کے اپنے محسن کے شکر گزار ہوتے ہیں۔ اور بعض لوگ تو محض شکریہ ادا کرنے پر بھی اکتفا نہیں کرتے بلکہ بائیک یا کار والے کو ساتھ میں دعائیں بھی دیتے ہیں مثلاً اللہ تمہیں خوش رکھے وغیرہ۔ تیسرے درجے میں یہ ہے کہ آپ کسی وقت اپنے اس محسن کو کسی مشکل میں گھرا ہوا دیکھیں تو اس سے نکلنے میں اس کے ساتھ عملی تعاون کر دیں۔ اللہ تعالی کو ہمارے تعاون کی تو ہر گز ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی اس کی ذات کسی قسم کے تعاون کی محتاج ہے لیکن اللہ کے لیے عمل سے شکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے وجود کو اُس کے سامنے جھکا دیں اور اسے اُس کا غلام بن کر دکھا دیں۔

انسان ہمیشہ دو حالتوں میں سے کسی ایک حالت میں ہوتا ہے۔ یا تو نعمت اور آسائش میں ہے تو اللہ کا شکر ادا کرے، یا تکلیف اور آزمائش میں ہے تو صبر کرے۔ جہاں تک اللہ کی نعمتوں کی بات ہے تو ہمارے ارد گرد بے شمار ایسی نعمتیں موجود ہوتی ہیں کہ جن کے بارے ہم یہ غور ہی نہیں کرتے کہ یہ بھی اللہ کی نعمتیں ہیں لہذا ان نعمتوں پر اللہ کے لیے شکر کا جذبہ بھی دل میں بیدار نہیں ہوتا۔ پس اللہ کی نعمتوں کا شکر ادا کرنے کی عادت اسی وقت پختہ ہو گی جب ہمیں مالک کی نعمتوں کے نعمت ہونے کا شعور اور احساس حاصل ہو گا۔ کسی شیء کے بارے ذہن میں اللہ کی نعمت ہونے کا تصور ابھرے اور ساتھ ہی دل میں اس نعمت کے حوالے سے تشکر کے جذبات پیدا ہوں اور زبان پر کلمات شکر جاری ہو جائیں تو یہی مطلوب ہے۔ اللہ تعالی نے قرآن مجید میں انسانوں کو اپنی ذات اور ماحول میں بار بار غور کرنے کی جو دعوت دی ہے تو اس کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ انسان اپنے پروردگار کی نعمتوں کو پہچان کر ان کا شکر ادا کرے۔

اگر کبھی گورمے بیکری میں کچھ خریدنے کے لیے جانے کا اتفاق ہو تو فوراً یہ احساس پیدا ہو کہ کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو اس قسم کے سپر اسٹورز کو باہر سے دیکھ کر گزر جاتے

ہیں۔ وہ شیشوں کے پیچھے سجائی گئی ایسی رنگا رنگ چیزوں کو دیکھتے ہیں کہ جن کے خریدنے کی حسرت ان کے دلوں میں سالوں سے چھپی ہوتی ہے لیکن وہ ان کی خریداری کی استطاعت نہیں رکھتے۔ اور ایک ہم ہیں کہ پچھلے دس برسوں سے گورمے بیکری سے خریداری کر رہے ہیں یا ہر ماہ سپر اسٹور سے ٹرالی بھر سامان گھر لے جا رہے ہوں تو کبھی ایک بار بھی سپر اسٹور سے باہر نکلتے وقت اِس نعمت پر اللہ کا شکر ادا کیا ہے کہ اُسی نے ہمیں اتنی استطاعت دی کہ ہم اُس کی ان نعمتوں سے فائدہ اٹھا سکیں۔ اور عمل سے شکریوں ادا ہو گا کہ سپر اسٹور سے نکلتے ہوئے کسی غریب اور مسکین کے ہاتھ میں کچھ رقم اس نیت سے پکڑا دیں کہ وہ بھی کبھی کچھ ویسا کھا لے کہ جو آپ ہر دوسرے دن کھاتے ہوں۔

ہم دن میں کتنی مرتبہ بیت الخلاء جاتے ہیں۔ پچھلے دس برسوں میں بیت الخلاء میں بیٹھے ہوئے کتنی بار ہمیں یہ احساس پیدا ہوا کہ اگر یہ گندگی میرے جسم میں ہی رہ جاتی تو تکلیف اور اذیت سے میرا کیا حال ہوتا؟ اگر اس احساس کے ساتھ ہم بیت الخلاء میں وقت گزاریں گے تو پھر بیت الخلاء سے باہر نکلنے کی دعا پڑھنے میں جو کیفیت حاصل ہو گی، وہ بالکل ہی کسی اور نوعیت کی کیفیت ہو گی۔ بیت الخلاء سے نکلتے وقت کی دعا یہ ہے:

«الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي أَذْهَبَ عَنِّي الْأَذَى وَعَافَانِي»[1]

"تمام تعریفات اس اللہ کے لیے ہیں کہ جس نے مجھ سے اذیت کو دور کیا اور مجھے عافیت دی۔"

علامہ البانی رحمہ اللہ نے اس روایت کو "ضعیف" قرار دیا ہے۔[2] کسی شخص کو آپ

---

[1] سنن ابن ماجة، كِتَابُ الطَّهَارَةِ وَسُنَنِهَا، بَابُ مَا يَقُولُ إِذَا خَرَجَ مِنَ الْخَلَاءِ، 110/1

[2] علامہ ابن حجر رحمہ اللہ نے اس روایت کو حسن جبکہ امام شوکانی رحمہ اللہ نے صالح قرار دیا ہے۔ امام ذہبی رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ یہ روایت موقوفاً صحیح ہے۔ یہ واضح رہے کہ کسی۔ روایت کے ضعیف ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جو عمل اس روایت میں منقول ہے، اس کا کرنا حرام ہے۔ روایت کے ضعیف ہونے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس عمل کی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت ثابت نہیں ہو سکی۔ اور وہ عمل کہ جس کی نسبت اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہ ہو تو اس کا کرنا جائز بھی ہو سکتا ہے جبکہ اسے سنت سمجھ کر نہ کیا جائے۔ مثلاً ایک شخص اپنی زبان میں اللہ کی حمد وثناء اور اللہ سے دعا مانگ سکتا ہے، چاہے وہ حمد وثناء حدیث میں نہ ہو یا وہ دعا ان الفاظ میں حدیث میں منقول نہ ہے۔ پس مستحب تو یہی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں پر ہی اکتفا کیا جائے اور انہی کا التزام کیا

بائیک یا کار پر لفٹ دیں اور اترتے وقت وہ آپ کا شکریہ بھی ادا نہ کرے تو آپ اس کے بارے کیا خیال کریں گے؟ بالکل یہی حال اس شخص کا بھی ہے کہ جو اللہ کی نعمتوں کو تو خوب استعمال کرے لیکن ان پر اللہ کا شکر گزار نہ ہو۔ شکر کا تعلق ہماری زندگی سے صرف اتنا رہ گیا ہے کہ کھانے کے بعد بس کھانے کی دعا پڑھ لی جائے تو اللہ کا شکر ادا ہو گیا جبکہ مالک کا ارشاد ہے:

﴿وَإِن تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللَّـهِ لَا تُحْصُوهَا إِنَّ الْإِنسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ﴾
[النحل: 34]

"اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو انہیں شمار نہیں کر سکتے۔ بلاشبہ انسان لازماً بہت ہی ظالم اور بہت زیادہ ناشکری کرنے والا ہے۔"

تو اللہ کی نعمتیں بے شمار ہیں۔ ہر لمحے ہم اللہ کی نعمتوں میں زندگی گزار رہے ہوتے ہیں لیکن ہمیں ان نعمتوں کا شعور اور احساس نہیں ہوتا لہذا ہم ان پر شکر ادا کرنے کے عادی بھی نہیں ہوتے۔ آپ بچوں کی مثال ہی لے لیں۔ والدین ان کا کمرہ کھلونوں سے بھر بھی دیں تو بھی وہ نئے کھلونوں کے خواہشمند ہیں۔ چلیں! نئے کھلونے کی خواہش کر لیں لیکن یہ تو بداخلاقی ہیں کہ اُن بیسیوں کھلونوں پر کوئی شکر ادا نہیں کیا جو والدین نے بغیر مطالبے کے خرید دیے اور اس ایک پر ناراضگی کا اظہار کیے بیٹھے ہیں جو والدین نے کسی سبب یا حکمت سے لے کر نہیں دیا۔ یہی معاملہ انسان کا اپنے خالق کے ساتھ ہے۔

جائے لیکن اگر کسی موقع ومناسبت کے اعتبار سے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی دعا نہ ملے تو اپنے الفاظ میں دعا کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مختلف مقامات پر اپنے الفاظ میں بھی اللہ کی حمد وثناء کر لیتے تھے بلکہ اپنے الفاظ میں دعا بھی مانگ لیتے تھے جیسا کہ ایک صحابی نے جب رکوع سے اٹھنے پر اپنے الفاظ میں دعا مانگی تو آپ نے نماز مکمل ہونے کے بعد ان کی دعا کی تعریف بیان کی اور کہا کہ میں نے فرشتوں کو دیکھا ہے کہ وہ تمہارے ان کلمات کو اپنے رب تک پہنچانے کے لیے آپس میں لڑ رہے ہیں کہ ہر ایک کہ خواہش ہے کہ وہ ان کلمات کو سب سے پہلے اللہ عزوجل تک پہنچائے کہ آپ کے بندے نے کسی قدر خوبصورت کلمات میں آپ کی حمد بیان کی ہے۔ عَنْ أَنَسٍ، أَنَّ رَجُلًا جَاءَ فَدَخَلَ الصَّفَّ وَقَدْ حَفَزَهُ النَّفَسُ، فَقَالَ: الْحَمْدُ لِلَّهِ حَمْدًا كَثِيرًا طَيِّبًا مُبَارَكًا فِيهِ، فَلَمَّا قَضَى رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ صَلَاتَهُ قَالَ: «أَيُّكُمُ الْمُتَكَلِّمُ بِالْكَلِمَاتِ؟» فَأَرَمَّ الْقَوْمُ، فَقَالَ: «أَيُّكُمُ الْمُتَكَلِّمُ بِهَا؟ فَإِنَّهُ لَمْ يَقُلْ بَأْسًا» فَقَالَ رَجُلٌ: جِئْتُ وَقَدْ حَفَزَنِي النَّفَسُ فَقُلْتُهَا، فَقَالَ: «لَقَدْ رَأَيْتُ اثْنَيْ عَشَرَ مَلَكًا يَبْتَدِرُونَهَا، أَيُّهُمْ يَرْفَعُهَا» [صحیح مسلم، كِتَابُ الْمَسَاجِدِ وَمَوَاضِعِ الصَّلَاةَ، بَابُ مَا يُقَالُ بَيْنَ تَكْبِيرَةِ الْإِحْرَامِ وَالْقِرَاءَةِ 419/1]

ہم اللہ تعالی کی سینکڑوں نعمتوں کو انجوائے کر رہے ہوتے ہیں لیکن ہمیں نہ تو ان کی قدر ہوتی ہے اور نہ ہی اس پر مالک کے شکر گزار ہوتے ہیں لیکن ایک نعمت جو ہمارے پاس نہیں ہوتی اور جس کے ہم طلبگار ہوتے ہیں، اس کے نہ ہونے کی وجہ سے اپنے پروردگار سے شکایت ضرور کرتے رہتے ہیں۔ اور اگر وہ نعمت مل جائے تو پھر شکر تو دو چار دن کے لیے ہوتا ہے اور اس نعمت کا استعمال سالوں ہوتا رہتا ہے۔

مثال کے طور ہم میں کسی کے پاس گاڑی کی نعمت نہیں تھی۔ ہم نے اللہ سے دعا کی اور اللہ نے کچھ عرصے بعد دے دی۔ تو اب کیا ایسا ہوتا ہے کہ ہم جب بھی گاڑی میں بیٹھیں تو اللہ کے شکر گزار ہوں۔ ہم نے دین کی ہر عبادت کی طرح نعمت پر شکر کو بھی مشینی (mechanical) بنالیا ہے۔ بس گاڑی میں بیٹھنے کی دعا پڑھ لی تو شکر ادا ہو گیا۔ کیا کبھی گاڑی میں بیٹھے ہماری آنکھیں اللہ کی اس نعمت پر تشکر کے جذبے سے نم ہوئی ہیں؟ شکر تو وہ ہے جو پہلے دل میں پیدا ہو اور پھر زبان پر جاری ہو۔ صرف زبان پر جاری شکر تو ایک اخلاقی رسم (professional ethics) ہے اگرچہ کچھ نہ ہونے سے اس کا ہونا بھی بہتر ہے۔ ہم دراصل اللہ کا شکر اسی طرح ادا کرنے کے عادی ہو چکے ہیں کہ جس طرح سیلز مین اپنے گاہک کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

یہ واضح رہے کہ اللہ تعالی سے جب ہم کسی نعمت کی دعا کرتے ہیں تو اللہ تعالی اس نعمت کو دنیا کے معروف طریقوں کے مطابق ہمیں عطا کرتے ہیں۔ ایسا نہیں ہوتا کہ آپ نے رات گاڑی کی دعا کی اور صبح سویرے فرشتے آپ کے دروازے پر ایک نئی کرولا چھوڑ گئے۔ اللہ عزوجل آپ کے لیے دنیا میں ایسے حالات بناتے ہیں اور راستے کھولتے ہیں کہ وہ نعمت آپ کو حاصل ہو۔ اس لیے اس غلط فہمی میں نہیں رہنا چاہیے کہ جو نعمت مجھے حاصل ہوئی ہے، وہ میری محنت کا نتیجہ ہے۔ احمد جاوید صاحب کا کہنا ہے کہ کبھی کبھار نماز کے بعد اس بات پر سجدہ شکر ادا کر لینا چاہیے کہ اللہ عزوجل نے نماز پڑھنے کی توفیق دی۔ اور کبھی اس پر بھی سجدہ شکر ادا کر لینا چاہیے کہ اللہ نے شکر ادا کرنے کی توفیق دی ہے۔

صحت کی نعمت ہی کو لے لیں۔ کتنی بڑی نعمت ہے۔اس کی قدر اس وقت محسوس ہوتی ہے جبکہ ہم کسی ہسپتال کی زیارت (visit) کریں۔اللہ کے نبی ﷺ کے زمانے میں اگر ہسپتال ہوتے ہیں تو آپ قبرستان کی طرح ان کی زیارت کا بھی حکم دیتے۔اگر کسی دوست یا رشتہ دار کی عیادت کے لیے ہسپتال جائیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ساری دنیا بیمار ہو۔اسی طرح کہیں کسی مسئلہ میں کورٹ کچہری کا چکر پڑ جائے تو لگتا ہے کہ آدھی دنیا تو یہاں ہی پھنسی ہوئی ہے۔پس ہسپتال کے سامنے سے گزر جانا اور صحت کی نعمت کا شکر ادا نہ کرنا اور کورٹ کچہری کے سامنے سے گزرتے ہوئے سکون کی نعمت کا شکر ادا نہ کرنا، اگر ناشکری نہیں ہے تو اور کیا ہے؟ایک روایت کے الفاظ ہیں:

فعن أبي ذر رضي الله عنه ، عن النبي صلى الله عليه وسلم أنه قال: «يُصْبِحُ عَلَى كُلِّ سُلَامَى مِنْ أَحَدِكُمْ صَدَقَةٌ، فَكُلُّ تَسْبِيحَةٍ صَدَقَةٌ، وَكُلُّ تَحْمِيدَةٍ صَدَقَةٌ، وَكُلُّ تَهْلِيلَةٍ صَدَقَةٌ، وَكُلُّ تَكْبِيرَةٍ صَدَقَةٌ، وَأَمْرٌ بِالْمَعْرُوفِ صَدَقَةٌ، وَنَهْيٌ عَنْ الْمُنْكَرِ صَدَقَةٌ، وَيُجْزِئُ مِنْ ذَلِكَ رَكْعَتَانِ يَرْكَعُهُمَا مِنْ الضُّحَى»[1]

"حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب تم صبح کرتے ہو تو تم پر ایک ایک جوڑ کے بدلے [بطور شکر] صدقہ ادا کرنا واجب ہے۔اور دیکھو! سبحان اللہ کہنا صدقہ ہے۔الحمد للہ کہنا صدقہ ہے۔لا الہ الا اللہ کہنا صدقہ ہے۔اللہ اکبر کہنا صدقہ ہے۔نیکی کا حکم دینا صدقہ ہے۔برائی سے منع کرنا صدقہ ہے۔اور اگر کوئی شخص اس دن میں چاشت کی دو رکعت ادا کر لے تو اس نے اس دن کے ہر جوڑ کا شکر ادا کر دیا۔"

اللہ نے انسان میں اس قدر خیر رکھی ہے کہ اگر یہ اللہ کی نعمتوں کو سوچنا شروع کر دے تو اسے پروردگار کا شکر ادا کرنے کے لیے الفاظ نہ ملیں۔ایک صاحب کی صبح صبح کچن میں چائے بناتے ہوئے کچن، بیڈ روم، لاؤنج میں موجود اللہ کی نعمتوں پر نظر پڑی تو دل اس قدر تشکر کے جذبات سے بھر گیا کہ زبان سے شکر ادا کرنا مشکل ہو گیا۔کبھی سبحان

---

[1] صحيح مسلم، كِتَابُ صَلَاةِ الْمُسَافِرِينَ وَقَصْرِهَا، بَابُ اسْتِحْبَابِ صَلَاةِ الضُّحَى، 498/1

اللہ وبحمدہ کے کلمات پڑھے اور کبھی سبحان اللہ والحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر کے، لیکن دل کو اطمینان نہیں آیا۔ پھر اللہ کے رسول ﷺ سے منقول شکر گزاری کے یہ کلمات پڑھنا شروع کیے:

«سُبْحَانَ اللَّهِ وَبِحَمْدِهِ عَدَدَ خَلْقِهِ وَرِضَا نَفْسِهِ وَزِنَةَ عَرْشِهِ وَمِدَادَ كَلِمَاتِهِ»[1]

”مالک! آپ کی اتنی تسبیح اور اتنی حمد وثناء کہ جتنی آپ کی مخلوق ہے۔ اور آپ کی اتنی تسبیح اور اتنی حمد وثناء کہ جتنی آپ کو پسند ہے۔ اور آپ کی اتنی تسبیح اور اتنی حمد وثناء کہ جتنا آپ کے عرش کا وزن ہے۔ اور آپ کی اتنی تسبیح اور اتنی حمد وثناء کہ جتنی آپ کے کلمات کو لکھنے کے لیے سیاہی درکار ہے۔“

یہ کلمات ادا کرنے پر بھی دل کو تسلی نہیں ہوئی کہ شکر ادا ہو گیا اور ذہن میں یہ بات رہ گئی ہے کہ اس سے بہتر بھی کچھ کلمات آپ ﷺ سے منقول ہوں گے۔ خیر اس وقت تو ذہن میں وہ کلمات نہیں آئے لیکن بعد میں آپ ﷺ کی سجدے کی ایک دعاء میں وہ مطلوبہ کلمات مل گئے کہ جس کے الفاظ یہ ہیں:

«اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِرِضَاكَ مِنْ سَخَطِكَ وَبِمُعَافَاتِكَ مِنْ عُقُوبَتِكَ وَبِكَ مِنْكَ لاَ أُحْصِي ثَنَاءً عَلَيْكَ أَنْتَ كَمَا أَثْنَيْتَ عَلَى نَفْسِكَ»[2]

”پروردگار! آپ کے غضب سے پناہ چاہتا ہوں آپ کی رضا کی۔ اور آپ کی سزا سے پناہ چاہتا ہوں آپ کے درگزر کی۔ اور آپ سے پناہ چاہتا ہوں آپ کی۔ [میں آپ کی کیا ثناء بیان کروں]، میں آپ کی ثناء بیان نہیں کر سکتا، آپ کی ثناء تو وہ ہے جو آپ خود کریں۔“

انسان جو کہ ایک ٹشو پیپر مانگنے پر اس کے دینے والے کا شکر گزار ہو سکتا ہے، وہ اپنے خالق کا شکر گزار کیسے نہ ہو گا؟ ضرور ہو گا بشرطیکہ وہ خالق کے احسانات کے بارے بھی ایسے ہی سوچنا شروع کر دے جیسے کہ وہ انسانوں کے احسانات کے بارے غور کرتا ہے۔

---

[1] صحیح مسلم، كتاب الذِّكْرِ وَالدُّعَاءِ وَالتَّوْبَةِ وَالِاسْتِغْفَارِ، بَابُ التَّسْبِيحِ أَوَّلَ النَّهَارِ وَعِنْدَ النَّوْمِ، 2090/4

[2] صحیح مسلم، كِتَابُ الصَّلَاةِ، بَابُ مَا يُقَالُ فِي الرُّكُوعِ وَالسُّجُودِ، 352/1

انسانوں میں تو یہ ہے کہ اگر آپ کسی اچھے انسان سے چھوٹی سی بھلائی کر دیں تو ساری زندگی آپ کے احسان کے زیر بار رہتا ہے اور اسے یہ غم گھلائے رہتا ہے کہ کسی طرح اپنے محسن کے کام آ سکے، مگر یہ اچھے انسان بھی اچھے بندے نہیں ہیں کیونکہ یہ اپنے پروردگار کے بارے ایسے جذبات نہیں رکھتے۔ شاید اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ہم پروردگار کے احسانات کو اس کی ذمہ داری سمجھتے ہیں جیسا کہ بچے اپنے والدین کے احسانات کو ان کی ذمہ داری سمجھ لیتے ہیں اور عموماً اسی سوچ کے نتیجے میں والدین کے شکر گزار نہیں ہوتے۔ اور یہ کہتے ہیں کہ اگر والدین نے کیا ہے تو کیا ہے، سارے والدین کرتے ہیں، یا یہ تو ان کی ذمہ داری تھی وغیرہ۔

یقیناً شکر اللہ کی نعمت ہے۔ پس ہمیں چاہیے کہ ہم اللہ سے اُس کی اس نعمت کا سوال کریں کہ وہ ہمیں شکر گزار بنائے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ﴾ [إبراهيم: 7]

"اور یاد رکھو تمہارے رب نے یہ اعلان فرما دیا ہے کہ اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہیں [نعمتوں میں] بڑھا دوں گا۔"

اللہ سے شکر کی نعمت کی توفیق مانگنے کے لیے ہر نماز کے بعد وہ دعا کرنی چاہیے جو آپ ﷺ کرتے تھے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ مُعَاذِ بْنِ جَبَلٍ، أَنَّ رَسُولَ صَلَّى عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَخَذَ بِيَدِهِ، وَقَالَ: «يَا مُعَاذُ، وَاللَّهِ إِنِّي لَأُحِبُّكَ، وَاللهِ إِنِّي لَأُحِبُّكَ»، فَقَالَ: «أُوصِيكَ يَا مُعَاذُ لَا تَدَعَنَّ فِي دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ تَقُولُ: اللَّهُمَّ أَعِنِّي عَلَى ذِكْرِكَ، وَشُكْرِكَ، وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ»[1]

"معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ان کا ہاتھ پکڑا اور کہا: اے معاذ! اللہ کی قسم، مجھے اللہ کے لیے آپ سے محبت ہے۔ اللہ کی قسم، مجھے اللہ کے لیے آپ سے محبت ہے۔ اس کے بعد آپ نے کہا: اے معاذ! میں آپ کو وصیت کرتا ہوں کہ کسی بھی نماز کے بعد یہ کلمات کہنا ہر گز نہ چھوڑنا۔

[1] سنن أبي داود، بَابُ تَفْرِيعِ أَبْوَابِ الْوِتْرِ، بَابٌ فِي الِاسْتِغْفَارِ، 86/2

اے اللہ! اپنا ذکر، اپنا شکر اور اپنی اچھی عبادت کرنے پر میری مدد فرما۔“

صبر کا مقام

صبر اور شکر دو ایسے رویے ہیں جو مسلمان کی کل زندگی کو محیط ہیں۔ انسان دو حالتوں میں سے کسی حالت سے خالی نہیں ہوتا۔ یا تو وہ کسی نعمت یا آسائش میں ہوگا تو اس صورت میں اس پر اپنے رب کا شکر واجب ہے' یا پھر وہ کسی مصیبت یا آزمائش میں ہوگا تو اس صورت میں اس پر خالق کے فیصلے پر صبر لازم ہے۔ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ صُهَيْبٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ، إِنَّ أَمْرَهُ كُلَّهُ خَيْرٌ، وَلَيْسَ ذَاكَ لِأَحَدٍ إِلَّا لِلْمُؤْمِنِ، إِنْ أَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ، فَكَانَ خَيْرًا لَهُ، وَإِنْ أَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ، صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهُ»[1]

”حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بندہ مومن کا معاملہ عجیب ہے کہ اس کے ہر عمل میں خیر ہی خیر ہے۔اور یہ رتبہ مومن کے علاوہ کسی کو حاصل نہیں ہے۔ اگر بندہ مومن کو کوئی خوشی پہنچتی ہے تو وہ شکر ادا کرتا ہے تو یہ خوشی اس کے لیے خیر بن جاتی ہے اور اگر اس کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو وہ صبر کرتا ہے تو یہ تکلیف بھی اس کے لیے خیر بن جاتی ہے۔“

دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے کہ جس پر آزمائش نہ آتی ہو البتہ آزمائش کی نوعیت مختلف ہو سکتی ہے کیونکہ یہ دنیا جنت نہیں ہے بلکہ آزمائش کا گھر ہے۔ ممکن ہے کہ کسی کی آزمائش جسمانی ہے اور کسی کی ذہنی۔ غریب کی آزمائش مالی (financial) ہو اور امیر کی نفسی (psychological) ہو کہ اسے ڈیپریشن کے سبب نیند کی دوا لینی پڑتی ہو۔کوئی ذاتی آزمائش سے گزر رہا ہوتا ہے اور کسی کو اولاد کی آزمائش سہنی پڑ رہی ہوتی ہے۔اس لیے ایک بندہ مومن کے دل میں ایسا خیال نہیں آنا چاہیے کہ اللہ نے تمام

---

[1] صحيح مسلم، كِتَابُ الزُّهْدِ وَالرَّقَائِقِ، بَابُ الْمُؤْمِنُ أَمْرُهُ كُلُّهُ خَيْرٌ، 2295/4

آزمائش اسی کے لیے رکھ دی ہے کیونکہ یہ شیطان کا وسوسہ ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی کی آزمائش زیادہ ہے اور کسی کی کم لیکن یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ آزمائش صرف غریب کے لیے ہے جبکہ امیر اس میں مبتلا نہیں ہے۔

حقیقی فرق یہ ہے کہ دنیادار کے لیے آزمائش ایک مصیبت ہے جبکہ بندہ مومن کے لیے اجر وثواب کا باعث ہے۔ دنیادار آزمائش سے تنگ آکر خودکشی کا سوچے گا جو کہ حرام ہے جبکہ بندہ مومن آزمائش میں صبر کر کے اللہ کے ہاں درجات پالے گا۔ بندہ مومن کے لیے ادنی درجے کی تکلیف مثلاً راستے میں ٹھوکر لگ جانا بھی اس کے صبر کی وجہ سے اس کے گناہوں کی معافی کا سبب بن جاتی ہے۔ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«مَا يُصِيبُ الْمُسْلِمَ، مِنْ نَصَبٍ وَلاَ وَصَبٍ، وَلاَ هَمٍّ وَلاَ حُزْنٍ وَلاَ أَذًى وَلاَ غَمٍّ، حَتَّى الشَّوْكَةِ يُشَاكُهَا، إِلَّا كَفَّرَ اللَّهُ بِهَا مِنْ خَطَايَاهُ»[1]

"جب بندہ مومن کسی پریشانی، بیماری، رنج وملال، غم، دکھ اور تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے کہ اسے کانٹا بھی چبھے تو اس کے بدلے میں اللہ تعالی اس کے گناہ معاف کر دیتا ہے۔"

اور مومن کی جس قدر آزمائش بڑی ہو گی، اس قدر اس کا اجر وثواب اور درجہ بھی اللہ کے بڑا ہو گا۔ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«عِظَمُ الْجَزَاءِ مَعَ عِظَمِ الْبَلَاءِ»[2]

"بڑی آزمائش بڑے اجر وثواب کا باعث ہے۔"

اس دنیا میں رہتے ہوئے ہم آزمائش سے بچ نہیں سکتے لہذا دو قسم کے رویے سامنے آتے ہیں۔ یا تو انسان آزمائش کا مقابلہ کرے اور صبر کے ذریعے درجات پالے یا پھر بے صبری کا مظاہرہ کرے اور اپنے خالق کی ناشکری کرے تو اس صورت میں اس کی آزمائش تو ٹلنے والی نہیں لیکن وہ اپنی دنیا کے ساتھ اپنی آخرت کا بھی ضرور نقصان کر لیتا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں کہ اللہ کے رسول ﷺ کا ایک ایسی عورت سے گزر ہوا جو

[1] صحيح البخاري، كِتَابُ المَرْضَى، بَابُ مَا جَاءَ فِي كَفَّارَةِ المَرَضِ، 114/7
[2] سنن ابن ماجة، كِتَابُ الْفِتَنِ، بَابُ الصَّبْرِ عَلَى الْبَلَاءِ، 1338/2

اپنے فوت ہونے والے بیٹے کی قبر کے پاس بیٹھی آواز سے رو رہی تھی تو آپ نے کہا:

«اتَّقِي اللَّهَ وَاصْبِرِي» قَالَتْ: إِلَيْكَ عَنِّي، فَإِنَّكَ لَمْ تُصَبْ بِمُصِيبَتِي، وَلَمْ تَعْرِفْهُ، فَقِيلَ لَهَا: إِنَّهُ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَأَتَتْ بَابَ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَلَمْ تَجِدْ عِنْدَهُ بَوَّابِينَ، فَقَالَتْ: لَمْ أَعْرِفْكَ، فَقَالَ: «إِنَّمَا الصَّبْرُ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الأُولَى»[1]

"اللہ کا تقوی اختیار کرو اور صبر کرو۔ چونکہ وہ خاتون آپ کو جانتی نہیں تھی لہذا اس نے جواب میں کہا: آپ اپنے کام سے کام رکھیں کیونکہ جو تکلیف مجھے پہنچی ہے، آپ کو اس کے درد کا احساس نہیں ہے۔ پس اس خاتون کو بعد میں بتلایا گیا کہ یہ اللہ کے رسول ﷺ ہیں تو وہ آپ کے پیچھے آپ کے دروازے تک آئی اور اس نے آپ کے دروازے پر کوئی دربان نہیں دیکھا۔ پس اس خاتون نے آپ سے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ میں آپ کو جانتی نہیں تھی۔ آپ نے جواب میں صرف اتنا کہا کہ اصل صبر تو وہی ہے جس کا اظہار پہلی مرتبہ صدمہ پہنچنے پر ہوتا ہے [ورنہ بعد میں صبر تو سب کو آ ہی جاتا ہے کہ اس کے بغیر انسان کے پاس کوئی چارہ نہیں ہے]۔"

پس صبر میں یہ بات بہت اہم ہے کہ پہلی مرتبہ جب انسان کو کسی نقصان، آزمائش، بیماری، حادثے اور وفات وغیرہ کی کوئی خبر ملی ہے تو اس کے رد عمل میں اس کی زبان سے کیا الفاظ جاری ہوئے ہیں؟ ورنہ تو سال بعد تو ماں بھی اپنے بیٹے کی وفات پر رو پیٹ کر خاموش ہو ہی جاتی ہے کہ اس کے سوا کوئی چارہ بھی نہیں ہے اور انسان میں ایک خاص مقدار سے زیادہ دکھ کے اظہار کی استطاعت ہوتی بھی نہیں ہے۔

بعض اوقات ہم دنیاوی آزمائش پر تنگ آ کر ناشکری کا ارتکاب کرنے لگ جاتے ہیں اور اگر ہمارے ذہن میں وہ احادیث تازہ رہیں کہ جن میں آزمائش پر آخرت میں بے حساب اجر و ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے، تو یہ روایات انسان کے لیے صبر کا رویہ اختیار کرنے میں ترغیب (motivation) کا باعث بن سکتی ہیں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

[1] صحيح البخاري، كِتَابُ الجَنَائِزِ، بَابُ زِيَارَةِ القُبُورِ، 9/2

عَنْ جَابِرٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «يَوَدُّ أَهْلُ العَافِيَةِ يَوْمَ القِيَامَةِ حِينَ يُعْطَى أَهْلُ البَلَاءِ الثَّوَابَ لَوْ أَنَّ جُلُودَهُمْ كَانَتْ قُرِضَتْ فِي الدُّنْيَا بِالمَقَارِيضِ»[1]

”حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت والے دن جب آزمائش والوں کو ان کی آزمائش کے بدلے اجر دیا جائے گا تو اسے دیکھ کر دنیا میں عافیت میں رہنے والے یہ خواہش کریں گے کہ کاش دنیا میں ان پر اتنی آزمائش آتی کہ ان کے جسم لوہے کی قینچیوں سے چیر دیے جاتے۔“

قرآن مجید کے انداز سے تو معلوم ہوتا ہے کہ جنت تو محض صبر ہی کا بدلہ ہے اور آخرت میں جس نیکی پر سب سے زیادہ لوگوں کو جنت ملے گی، وہ صبر کی نیکی ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِنِّي جَزَيْتُهُمُ الْيَوْمَ بِمَا صَبَرُوا أَنَّهُمْ هُمُ الْفَائِزُونَ﴾ [المؤمنون: 111]

”بے شک آج کے دن میں نے انہیں ان کے صبر کے بدلے یہ جزا دی ہے کہ وہی ہیں، جو کامیاب ہونے والے ہیں۔“

ایک اور جگہ صبر کرنے والوں پر اللہ کی طرف سے سلام بھیجا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿سَلَامٌ عَلَيْكُم بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ﴾ [الرعد: 24]

”تم پر سلامتی ہو تمہارے صبر کی وجہ سے۔ پس کیا ہی خوب ہے آخرت کا گھر۔“

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے کہ جنت کے بالاخانے دنیا میں صبر کی وجہ سے ملیں گے:

﴿أُولَٰئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوا﴾ [الفرقان: 75]

”یہی لوگ ہیں جنہیں ان کے صبر کے بدلے جنت کے بالاخانے دیے جائیں

[1] سنن الترمذي، أَبْوَابُ الزُّهْدِ عَنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، 603/4

گے۔"

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالی ہے کہ جنت اور جنت کی نعمتیں صبر کا بدلہ ہیں:

﴿ وَجَزَاهُم بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيرًا ﴾ [الإنسان: 12]

"اور ان کے صبر کے سبب ان کا بدلہ جنت اور ریشم کا لباس ہو گا۔"

ایک اور جگہ ارشاد باری تعالی ہے کہ صبر والوں کو آخرت میں بے حساب نعمتیں ملیں گی:

﴿إِنَّمَا يُوَفَّى الصَّابِرُونَ أَجْرَهُم بِغَيْرِ حِسَابٍ﴾ [الزمر: 10]

محض صبر کرنے والوں کو ان کا بدلہ بے حساب دیا جائے گا۔"

ایک اور جگہ ارشاد ہے کہ اگر کسی کا ایمان ہو کہ اس پر آزمائش اللہ کی طرف سے ہی آئی ہے اور وہ اس پر صبر کرنا بھی چاہتا ہے تو اللہ عزوجل اس کے دل کو سکون عطا فرما دیتے ہیں۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿مَا أَصَابَ مِن مُّصِيبَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ وَمَن يُؤْمِن بِاللَّهِ يَهْدِ قَلْبَهُ وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ﴾ [التغابن: 11]

"کوئی مصیبت نازل نہیں ہوتی مگر اللہ کے حکم سے۔ اور جو شخص خدا پر ایمان لاتا ہے وہ اس کے دل کو ہدایت دے دیتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز سے باخبر ہے۔"

اگر کسی وقت صبر کی ضرورت ہو اور صبر نہ ہو رہا ہو تو ان آیات کا معنی و مفہوم ذہن میں رکھتے ہوئے ورد کرے تو اللہ عزوجل صبر کی توفیق عطا فرما دیں گے، ان شاء اللہ!۔

اسی طرح انسانوں میں دو قسم کے مزاج کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو لوگوں کے رویوں سے تنگ ہونے کے باوجود ان سے میل جول کو ترک نہیں کرتے بلکہ صبر کی روش اختیار کرتے ہیں اور یہ مجاہدانہ مزاج ہے۔ اور دوسرے وہ جو لوگوں کی اذیت کی بناء پر ان سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں اور یہ صوفیانہ مزاج ہے۔ اگرچہ اسلام میں ان دونوں قسم کے رد عمل کا جواز موجود ہے لیکن پہلی صورت کو پسند کیا گیا ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«الْمُؤْمِنُ الَّذِي يُخَالِطُ النَّاسَ، وَيَصْبِرُ عَلَى أَذَاهُمْ، أَعْظَمُ أَجْرًا مِنَ

الْمُؤْمِنِ الَّذِي لَا يُخَالِطُ النَّاسَ، وَلَا يَصْبِرُ عَلَى أَذَاهُمْ»[1]

"وہ مومن جو لوگوں سے میل جول رکھتا ہے اور ان کی طرف سے پہنچنے والی اذیت پر صبر کرتا ہے تو وہ اس مومن سے بہتر ہے جو لوگوں سے میل جول نہیں رکھتا اور ان سے پہنچنے والی اذیت پر صبر نہیں کرتا۔"

بعض روایات کا مفہوم یہ ہے کہ جس شخص پر زیادہ آزمائش ہو تو اس کی ایک وجہ اس کی دینداری بھی ہوتی ہے یعنی دیندار شخص پر آزمائش ضرور آتی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«يُبْتَلَى الْعَبْدُ عَلَى حَسَبِ دِينِهِ، فَإِنْ كَانَ فِي دِينِهِ صُلْبًا، اشْتَدَّ بَلَاؤُهُ، وَإِنْ كَانَ فِي دِينِهِ رِقَّةٌ، ابْتُلِيَ عَلَى حَسَبِ دِينِهِ، فَمَا يَبْرَحُ الْبَلَاءُ بِالْعَبْدِ، حَتَّى يَتْرُكَهُ يَمْشِي عَلَى الْأَرْضِ، وَمَا عَلَيْهِ مِنْ خَطِيئَةٍ»[2]

"انسان کی آزمائش اس کے دین کے حساب سے ہوتی ہے۔ پس اگر وہ دین میں مضبوط ہے تو اس کی آزمائش بھی سخت ہوتی ہے اور اگر اس کا دین نرم ہے تو اس کی آزمائش بھی نرم ہوتی ہے۔ بندہ مومن پر آزمائش آتی رہتی ہے یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اس کے کھاتے میں کوئی گناہ باقی نہیں رہتا۔"

ہمیں آزمائش سے اللہ کی پناہ مانگنی چاہیے لیکن اگر آجائے تو پھر ثابت قدمی اور صبر کا مظاہرہ کرے اور اس بارے اللہ سے مدد طلب کرے جیسا کہ اللہ کے رسول صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ آزمائش اور سختی میں یہ دعا مانگا کرتے تھے:

«اللَّهُمَّ لَا سَهْلَ إِلَّا مَا جَعَلْتَهُ سَهْلًا، وَأَنْتَ تَجْعَلُ الْحَزْنَ سَهْلًا إِذَا شِئْتَ»[3]

"یا اللہ! کچھ بھی آسان نہیں ہے سوائے اس کے کہ جسے آپ آسان بنا دیں۔ اے اللہ! آپ جس کو چاہتے ہیں آسان بنا دیتے ہیں۔"

حیاء کا وصف

---

[1] سنن ابن ماجة، كِتَابُ الْفِتَنِ، بَابُ الصَّبْرِ عَلَى الْبَلَاءِ، 1338/2

[2] سنن ابن ماجة، كِتَابُ الْفِتَنِ، بَابُ الصَّبْرِ عَلَى الْبَلَاءِ، 1334/2

[3] محمد بن حبان بن أحمد بن حبان البُستي، الإحسان في تقريب صحيح ابن حبان، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الأولى، 1408 هـ -1988 م، 255/3

انسانی اخلاق دو قسم پر ہیں۔ ایک فطری اور دوسرا دینی۔ حیاء ایک ایسا وصف ہے کہ جو فطری اور دینی دونوں قسم کے اخلاقیات کی بنیاد ہے۔ اگر انسان میں حیاء نہ ہو تو نہ اس میں فطرت باقی ہے اور نہ ہی دین موجود ہے۔ حیاء دار انسان میں لازماً ایمان ہو گا اور بے حیاء میں کبھی ایمان نہیں ہو سکتا۔ اسی لیے اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے:

«الْحَيَاءُ وَالْإِيمَانُ قُرِنَا جَمِيعًا، فَإِذَا رُفِعَ أَحَدُهُمَا رُفِعَ الْآخَرُ»[1]

"حیاء اور ایمان دونوں ایک ساتھ ملے ہوئے ہیں۔ پس اگر ان میں سے ایک اٹھ جائے تو دوسرا بھی اٹھ جاتا ہے۔"

ایک شخص کسی دوسرے شخص کو جو کہ اہل ایمان میں سے تھا، حیاء اختیار کرنے کی نصیحت کر رہا تھا تو اس نصیحت کرنے والے کو اللہ کے ﷺ نے فرمایا:

«دَعْهُ. فَإِنَّ الْحَيَاءَ مِنَ الْإِيمَانِ»[2]

"اسے چھوڑ دو کہ حیاء تو ایمان کا حصہ ہے۔"

یعنی اب اہل ایمان کو حیاء کی نصیحت کرو گے! حیاء تو خود ایمان کا ایک شعبہ ہے اور ایمان تو حیاء کے بغیر ہو ہی نہیں سکتا۔ پس یا تو اسے ایمان کی نصیحت کرو یا پھر حیاء کی نصیحت ترک کر دو کہ ایمان کے بعد حیاء کی نصیحت کے کیا معنی؟

حیاء تمام فطری اخلاق کا مادہ (substance) اور بنیاد ہے کہ اگر کسی میں حیاء نہیں ہے تو اس میں انسانیت (humanity) نہیں ہے بلکہ اس میں انسانی اخلاق کا مادہ ہی موجود نہیں ہے چہ جائیکہ اخلاق موجود ہوں۔ حیاء کے بغیر با اخلاق ہونے کا ہر تصور بے معنی اور لغو ہے۔ بے حیاء شخص کچھ بھی کر سکتا ہے اور آپ اس سے کچھ بھی کرنے کی توقع رکھ سکتے ہیں۔ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

أَبُو مَسْعُودٍ، قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «إِنَّ مِمَّا أَدْرَكَ النَّاسُ مِنْ كَلَامِ النُّبُوَّةِ الْأُولَى: إِذَا لَمْ تَسْتَحْيِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ»[3]

---

[1] الحاكم، أبو عبد الله محمد بن عبد الله النيسابوري، المستدرك على الصحيحين، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى، 1411 – 1990، 73/1

[2] الموطأ، كتاب حُسْنُ الْخُلُقِ، باب مَا جَاءَ فِي الْحَيَاءِ، 1331/5

[3] صحيح بخاري، كِتَابُ الأَدَبِ، بَابُ إِذَا لَمْ تَسْتَحْيِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ، 29/8

"حضرت ابو مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لوگوں کو پچھلے انبیاء پر نازل ہونے والی وحی میں سے جو باتیں ملی ہیں، ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ جب تجھ میں حیاء ختم ہو جائے تو جو چاہے مرضی کر لے۔"

حیاء دراصل دل کی حیات ہے۔ پس جس دل میں حیاء ہو تو اس میں زندگی ہے۔ اور جس قدر حیاء رخصت ہوتی جائے، اسی قدر دل میں ویرانی اور وحشت جگہ پکڑتی جاتی ہے۔ حیاء ایک ایسا وصف ہے کہ جس کے نتیجے میں ہمیشہ خیر پیدا ہوتی ہے اور خیر میں ہی خیریت ہے، ظاہر کی بھی اور باطن کی بھی۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عِمْرَانَ بْنَ حُصَيْنٍ قَالَ: قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «الْحَيَاءُ لَا يَأْتِي إِلَّا بِخَيْرٍ»[1]

"حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حیاء تو صرف خیر پیدا کرتا ہے۔"

حیاء صرف عورتوں سے مطلوب نہیں ہے بلکہ حیاء کا مطالبہ مردوں سے بھی ہے۔ اور حیاء کا تعلق صرف لباس سے نہیں ہے بلکہ حیاء کا تعلق انسان کی گفتگو اور عمل سے بھی ہے۔ بے حیائی صرف یہ نہیں ہے کہ انسان اپنا ستر کھلا رکھے بلکہ بے حیائی یہ بھی ہے کہ انسان اپنے جیسے انسانوں کو شرمندہ کرنے کا باعث بنے۔

اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں جب بعض صحابہ کی دعوت کی جاتی تھی تو دعوت کھانے کے بعد وہ کافی دیر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر میں بیٹھے باتیں کرتے رہتے تھے کہ جس سے آپ کی گھریلو زندگی متاثر ہوتی تھی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم حیاء کے سبب سے ان کو جانے کا نہیں کہتے تھے یہاں تک کہ اس بارے قرآن مجید کی آیات نازل ہوئیں۔[2]

بہر حال یہ تو حیاء کے اعلی مدارج ہیں لیکن کم از کم درجہ تو یہ ہے کہ اگر کسی بھائی سے

---

[1] الأدب المفرد: ص 444

[2] ﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَدْخُلُوا بُيُوتَ النَّبِيِّ إِلَّا أَن يُؤْذَنَ لَكُمْ إِلَىٰ طَعَامٍ غَيْرَ نَاظِرِينَ إِنَاهُ وَلَـٰكِنْ إِذَا دُعِيتُمْ فَادْخُلُوا فَإِذَا طَعِمْتُمْ فَانتَشِرُوا وَلَا مُسْتَأْنِسِينَ لِحَدِيثٍ إِنَّ ذَٰلِكُمْ كَانَ يُؤْذِي النَّبِيَّ فَيَسْتَحْيِي مِنكُمْ وَاللَّـهُ لَا يَسْتَحْيِي مِنَ الْحَقِّ﴾ [الأحزاب: 53]

کوئی غلطی ہو گئی ہے تو اب اس کے معذرت کرنے سے پہلے ہی اس کو معاف کر دیں۔
ہمارے محلے کی مسجد کے ایک نمازی جو کہ نیک انسان تھے، ایک مرتبہ فجر کے بعد مسجد کے ہال میں اگلی صف میں ذکر واذکار میں مصروف تھے کہ کچھ نمازی مسجد میں تاخیر سے آئے اور پچھلی صفوں میں نماز پڑھنے کے بعد انہی صاحب کی برائیوں میں مصروف ہو گئے لیکن اُن غیبت کرنے والے نمازیوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ جن کی وہ غیبت کر رہے ہیں، وہ اگلی صف میں بیٹھے ہیں اور ان کی آوازیں ان تک پہنچ رہی ہیں۔ اب ان صاحب کو زور کا پیشاب آیا ہوا تھا اور وہ شوگر کے مریض بھی تھے لیکن اس لیے اپنی جگہ نہیں چھوڑ رہے تھے کہ مجھے دیکھ کر وہ لوگ شرمندہ نہ ہو جائیں کہ اِسی کی تو برائیاں کر رہے تھے اور یہ اگلی صف میں بیٹھے سن رہے تھے۔ اِن صاحب نے اِسی تکلیف کی حالت میں کافی دیر گزار دی یہاں تک کہ وہ برائی کرنے والے مسجد سے چلے گئے اور یہ ان کے بعد مسجد سے باہر آئے۔

حیاء کو اللہ کے رسول ﷺ نے دین اسلام کا کل اخلاق قرار دیا ہے۔ اگر ہم ایک لفظ میں دینی اخلاق کو جمع کرنا چاہیں تو وہ حیاء کا لفظ ہے۔ آپ ﷺ کا ارشاد ہے:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «لِكُلِّ دِينٍ خُلُقٌ، وَإِنَّ خُلُقَ الْإِسْلَامِ الْحَيَاءُ»[1]

”حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا ہے کہ ہر دین کا ایک اخلاقی ضابطہ ہے اور اسلام کا اخلاقی ضابطہ حیاء ہے۔“

کسی کام میں حیاء شامل ہو جائے تو اس کی حیثیت خالق اور مخلوق دونوں کی نظروں میں بڑھ جاتی ہے اور اگر کسی کام میں بے حیائی داخل ہو جائے تو اس کی حیثیت خالق اور مخلوق دونوں کی نگاہوں میں گر جاتی ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَنَسٍ، أَنَّ رَسُولَ اللَّهِ - صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ - قَالَ: «مَا كَانَ الْفُحْشُ فِي شَيْءٍ قَطُّ إِلَّا شَانَهُ، وَلَا كَانَ الْحَيَاءُ فِي شَيْءٍ قَطُّ إِلَّا

---

[1] البيهقي، أبو بكر، أحمد بن الحسين بن علي الخراساني، شعب الإيمان، كتاب الحياء، مكتبة الرشد للنشر والتوزيع بالرياض، الطبعة الأولى، 1423هـ-2003ء، 155/10

زَانَهُ»[1]

”حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس کام میں بے حیائی داخل ہو جائے تو اس کی شان کم ہو جاتی ہے اور جس کام میں حیاء شامل ہو جائے تو اس کی شان بڑھ جاتی ہے۔“

شجاعت کی عظمت

شجاعت اور بہادری ایک ایسا وصف ہے جو طبعی طور انسانوں میں پسندیدہ شمار ہوتا ہے۔ کوئی بھی شخص بزدلی کو پسند نہیں کرتا اور نہ ہی کوئی اپنے آپ کو ڈرپوک کہلوانا چاہتا ہے۔ بہادری ایک ایسا وصف ہے کہ بہادر انسان کا دشمن بھی اس کے اس وصف کی قدر کرتا ہے۔ اور بزدل انسان کے قریب ترین رشتہ دار بھی اسے ناپسند کرتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں شجاعت کا وصف بدرجہ اتم موجود تھا۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ، قَالَ: «كَانَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَحْسَنَ النَّاسِ، وَكَانَ أَجْوَدَ النَّاسِ، وَكَانَ أَشْجَعَ النَّاسِ» وَلَقَدْ فَزِعَ أَهْلُ الْمَدِينَةِ ذَاتَ لَيْلَةٍ، فَانْطَلَقَ نَاسٌ قِبَلَ الصَّوْتِ، فَتَلَقَّاهُمْ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ رَاجِعًا، وَقَدْ سَبَقَهُمْ إِلَى الصَّوْتِ، وَهُوَ عَلَى فَرَسٍ لِأَبِي طَلْحَةَ عُرْيٍ، فِي عُنُقِهِ السَّيْفُ وَهُوَ يَقُولُ: «لَمْ تُرَاعُوا، لَمْ تُرَاعُوا» قَالَ: «وَجَدْنَاهُ بَحْرًا، أَوْ إِنَّهُ لَبَحْرٌ»[2]

”حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں میں سب سے زیادہ خوبصورت، سب سے زیادہ سخی اور سب سے زیادہ بہادر تھے۔ ایک رات اہل مدینہ آواز سن کر گھبرا اٹھے اور کچھ لوگ اس آواز کی سمت تحقیق کے لیے نکلے۔ تو انہیں راستے میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ملے جو کہ ان سے پہلے اس آواز کی طرف اٹھے تھے اور اب واپس آرہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ابو طلحہ رضی اللہ عنہ کے گھوڑے کی ننگی پشت پر سوار تھے اور آپ کی گردن میں تلوار لٹکی ہوئی تھی اور آپ لوگوں سے کہہ رہے تھے کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں

[1] سنن ابن ماجة، أَبْوَابُ الزُّهْدِ، بَابُ الْحِلْمِ، 280/5

[2] صحيح مسلم، كتاب الْفَضَائِلِ، بَابٌ فِي شَجَاعَةِ النَّبِيِّ عَلَيْهِ السَّلَامُ وَتَقَدُّمِهِ لِلْحَرْبِ، 1802/4

ہے، گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اور آپ نے اس گھوڑے کے بارے ارشاد فرمایا کہ یہ تو سمندر ہے سمندر۔"

اللہ کے رسول ﷺ نے بزدلی کو ناپسند جانا ہے بلکہ اس سے اللہ کی پناہ مانگی ہے۔ پس ہمیں بھی بزدلی سے اللہ کی پناہ مانگتے رہنا چاہیے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

أَنَسَ بْنَ مَالِكٍ، قَالَ: كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ: «اللَّهُمَّ إِنِّي أَعُوذُ بِكَ مِنَ الهَمِّ وَالحَزَنِ، وَالعَجْزِ وَالكَسَلِ، وَالجُبْنِ وَالبُخْلِ، وَضَلَعِ الدَّيْنِ، وَغَلَبَةِ الرِّجَالِ»[1]

"حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ یہ کہا کرتے تھے: اے اللہ! میں آپ کی پناہ مانگتا ہوں غم اور سختی سے، عاجزی اور سستی سے، بزدلی اور بخیلی سے، قرض کے بوجھ اور لوگوں کے دباؤ سے۔"

بعض اوقات شجاعت کی کمی کی وجہ سے ایک شخص کسی دینی فریضے کی ادائیگی میں کوتاہی کا مرتکب ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً زبان سے نیکی کا حکم دینا اور برائی سے منع کرنا ایک دینی فرض ہے لیکن انسان بہت سے مواقع پر کسی انجانے خوف اور اندیشے کے سبب یہ فرض ادا نہیں کرتا اور برائی اور شر اس کے سامنے پھیلتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اس شخص کی تعریف کی ہے کہ جو ہیبت اور خوف کے مقام پر بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض سرانجام دے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«سَيِّدُ الشُّهَدَاءِ حَمْزَةُ بْنُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ، وَرَجُلٌ قَالَ إِلَى إِمَامٍ جَائِرٍ فَأَمَرَهُ وَنَهَاهُ فَقَتَلَهُ»[2]

"شہداء کے امام حضرت حمزۃ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ ہیں اور وہ شخص بھی شہداء کا امام ہے کہ جس نے کسی ظالم حکمران کے سامنے کھڑے ہو کر زبان سے نیکی کا حکم دیا اور برائی سے منع کیا اور اُس حکمران نے اِس پر اُسے قتل کر دیا۔"

---

[1] صحيح البخاري، كِتَابُ الدَّعَوَاتِ، بَابُ الِاسْتِعَاذَةِ مِنَ الجُبْنِ، 79/8

[2] المستدرك على الصحيحين: 215/3

خوش مزاجی

یہ ایک ایسی سنت ہے کہ جسے ہم بھلا چکے ہیں۔ اسلام سنجیدگی سے منع نہیں کرتا لیکن خوش رہنا اور دوسروں کو خوش رکھنے کی کوشش کرنا، اللہ کے رسول ﷺ کے اخلاق میں سے ایک اہم وصف ہے۔ اگر کوئی شخص پریشان ہو تو اس کے ساتھ کوئی مزاح کی بات کر دینا کہ اس کا ذہن بٹ جائے تو یہ بھی ایک قسم کا صدقہ ہے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ أَبِي ذَرٍّ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «تَبَسُّمُكَ فِي وَجْهِ أَخِيكَ لَكَ صَدَقَةٌ»[1]

"حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: تیرا اپنے بھائی کو مسکرا کر دیکھنا بھی تیرے لیے صدقہ کرنے کے برابر ہے۔"

ہر وقت تیوری چڑھا کر رکھنا اور چہرے پر سرد مہری کا راج کرنا کوئی دینی حکم نہیں ہے۔ مجلس میں نبی کریم ﷺ کے چہرے پر اکثر مسکراہٹ رہتی تھی جبکہ تنہائی میں خاص طور تہجد کی نماز میں آپ ﷺ اکثر رویا کرتے تھے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ عَبْدِ اللَّهِ بْنِ الحَارِثِ بْنِ جَزْءٍ، قَالَ: «مَا رَأَيْتُ أَحَدًا أَكْثَرَ تَبَسُّمًا مِنْ رَسُولِ اللَّهِ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ»[2]

"حضرت عبد اللہ بن حارث رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ سے زیادہ کسی کو مسکرانے والا نہیں دیکھا۔"

نہ بہت زیادہ ہنسنے والے لوگ پسندیدہ ہوتے ہیں اور نہ ہی بہت رونے والوں کو پسند کیا جاتا ہے۔ اعتدال اور توازن میں ہی زندگی کا حسن اور خوبصورتی ہے۔ ہنسا اور رونا دونوں انسانی زندگی کا لازم جزو ہیں اور ان دونوں میں توازن کا ہونا ضروری ہے۔ تنہائی میں اللہ کے سامنے رونا چاہیے اور مجلس میں مخلوق کے سامنے مسکرانا چاہیے۔

بعض مذہبی لوگوں کے چہروں پر ہر وقت کی سنجیدگی دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ شاید

---

[1] سنن الترمذي، أَبْوَابُ البِرِّ وَالصِّلَةِ، بَابُ مَا جَاءَ فِي صَنَائِعِ المَعْرُوفِ، 339/4

[2] سنن الترمذي، أَبْوَابُ الْمَنَاقِبِ، بَابٌ فِي بَشَاشَةِ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، 601/5

اسلام ہنسنے ہنسانے سے منع کرنے اور رونے رولانے کا حکم دینے والا مذہب ہے حالانکہ اللہ کے رسول ﷺ چھوٹے بچوں سے بھی خوش طبعی فرما لیتے تھے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میرے ایک چھوٹے بھائی تھے کہ جن کا نام ابو عمیر تھا اور ان کے پاس ایک چڑیا تھی اور آپ ﷺ جب بھی ہمارے گھر تشریف لاتے تو ضرور پوچھتے:

«يَا أَبَا عُمَيْرٍ، مَا فَعَلَ النُّغَيْرُ»[1]

"اے ابو عمیر! آپ کی چڑیا کا کیا حال ہے؟"

اللہ کے رسول ﷺ کا یہ معمول تھا کہ آپ صبح کی نماز کے بعد طلوع آفتاب تک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ بیٹھ کر ان کے ماضی کے واقعات سنتے تھے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہنستے تھے جبکہ آپ ﷺ مسکراتے تھے۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ سِمَاكِ بْنِ حَرْبٍ، قَالَ: قُلْتُ لِجَابِرِ بْنِ سَمُرَةَ: أَكُنْتَ تُجَالِسُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ؟ قَالَ: نَعَمْ كَثِيرًا، «كَانَ لَا يَقُومُ مِنْ مُصَلَّاهُ الَّذِي يُصَلِّي فِيهِ الصُّبْحَ، أَوِ الْغَدَاةَ، حَتَّى تَطْلُعَ الشَّمْسُ، فَإِذَا طَلَعَتِ الشَّمْسُ قَامَ، وَكَانُوا يَتَحَدَّثُونَ فَيَأْخُذُونَ فِي أَمْرِ الْجَاهِلِيَّةِ، فَيَضْحَكُونَ وَيَتَبَسَّمُ»[2]

"حضرت سماک بن حرب رحمہ اللہ کہتے ہیں کہ میں نے جابر بن سمرۃ رضی اللہ عنہ سے کہا کہ کیا آپ کو اللہ کے رسول ﷺ کے ساتھ مجلس میں بیٹھنے کا موقع ملتا تھا تو انہوں نے کہا: بہت زیادہ۔ آپ ﷺ صبح کی نماز پڑھنے کے بعد سورج طلوع ہونے تک مصلے پر بیٹھے رہتے تھے اور سورج طلوع ہونے کے بعد گھر چلے جاتے۔ اور اس دوران صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اپنے دور جاہلیت کے واقعات سناتے تھے۔ پس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس پر ہنستے تھے اور آپ صرف مسکراتے تھے۔"

اللہ کی محبت

انسان کے عمل کا سبب اس کا ارادہ ہوتا ہے اور انسان کے ارادے کا باعث اس کے

---

[1] صحيح بخاري، كِتَابُ الأَدَبِ، بَابُ الكُنْيَةِ لِلصَّبِيِّ وَقَبْلَ أَنْ يُولَدَ لِلرَّجُلِ، 45/8

[2] صحيح مسلم، كِتَابُ الْمَسَاجِدِ وَمَوَاضِعِ الصَّلَاةَ، بَابُ فَضْلِ الْجُلُوسِ فِي مُصَلَّاهُ بَعْدَ الصُّبْحِ، 463/1

جذبات ہوتے ہیں۔ کوئی بھی نیک عمل ایسا نہیں ہے کہ جس کے کرنے کے لیے آپ کو پہلے ارادہ نہ کرنا پڑے اور کوئی گناہ ایسا نہیں ہے کہ جس سے انسان ارادہ کیے بغیر بچ پائے۔ پس نیکی کرنے اور گناہ سے بچنے کے لیے پہلا قدم ارادہ کرنا ہے۔

انسان بعض اوقات اپنے کسی ارادے پر عمل کر پاتا ہے اور بعض اوقات وہ ارادہ ہی رہ جاتا ہے اور اس پر عمل کی ہمت نہیں پڑتی۔ کسی ارادے پر عمل کی وجہ اس ارادے کی محبت ہوتی ہے۔ اگر کسی کام کی محبت انسان کے دل میں ہو گی تو وہ اسے کر گزرے گا اور اگر اس کے دل میں اس کے لیے محبت نہ ہو گی تو اس کا کرنا اس کے لیے بوجھ ہو گا لہذا اسے اس کے کرنے میں مشکل پیش آئے گی۔

انسان کو گناہ کرنا اسی وقت آسان لگتا ہے جبکہ گناہ کی محبت اس کے دل میں ہو۔ اور اگر گناہ کی نفرت اس کے دل میں ہو گی تو گناہ کرنا اس کے لیے بوجھ سے کم نہ ہو گا۔ اسی طرح انسان کو نیکی کرنا اسی وقت آسان لگتا ہے جبکہ نیکی کی محبت اس کے دل میں ہو۔ اور اگر نیکی کی محبت اس کے دل میں نہ ہو گی تو نیکی اس کے لیے بوجھ بن جائے گی۔ اگر نماز پڑھنا آپ کو آسان لگتا ہے تو نماز کی محبت آپ کے دل میں موجود ہے اور اگر نماز پڑھنا آپ کو بوجھ معلوم ہوتا ہے تو نماز کی محبت آپ کے دل میں نہیں ہے۔

پس نیکی کرنے اور گناہ سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ نیکی کی محبت اور گناہ سے نفرت دل میں ہو۔ اور نیکی کی محبت اور گناہ سے نفرت اسی وقت دل میں پیدا ہو گی جبکہ اللہ کی محبت دل میں پیدا ہو چکی ہو۔ پس اللہ کی محبت ہماری ہر نیکی کرنے کی اصل اور ہر گناہ سے بچنے کی بنیاد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے اللہ کی محبت میں شرکت کو شرک قرار دیا ہے۔ اللہ کے علاوہ مخلوق میں سے کسی سے بھی اتنی محبت رکھنی جائز نہیں ہے کہ جتنی اللہ سے ہونی چاہیے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِن دُونِ اللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِّلَّهِ﴾ [البقرة :165]

”اور لوگوں میں سے بعض وہ ہیں کہ جو اللہ کے غیر سے ایسے محبت رکھتے ہیں کہ جیسا اللہ سے محبت رکھنی چاہیے جبکہ اہل ایمان کا طرز عمل یہ ہے کہ وہ سب

سے زیادہ محبت اللہ ہی سے رکھتے ہیں۔"

پس اللہ کی محبت ہی وہ قوت محرکہ (driving force) ہے جو نیکی کو آپ کے لیے آسان بنا دیتی ہے اور گناہ کو مشکل۔ اور اللہ کی محبت کا پیدا کرنا تزکیہ کی طرف پہلا قدم ہے۔ اور یہی محبت ہے جو کہ اخلاق حسنہ کو محبوب بنا دیتی ہے اور رذائل نفس کو مبغوض۔ یہی محبت ہے جو آپ سے نیکی کروا لیتی ہے اور گناہ چھڑوا دیتی ہے۔ یہ محبت اگر سچی ہو تو بہت قیمتی متاع ہے، چاہے آپ کتنے ہی گناہ گار کیوں نہ ہوں۔ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

عَنْ عُمَرَ بْنِ الخَطَّابِ، أَنَّ رَجُلًا عَلَى عَهْدِ النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ اسْمُهُ عَبْدَ اللَّهِ، وَكَانَ يُلَقَّبُ حِمَارًا، وَكَانَ يُضْحِكُ رَسُولَ اللَّهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، وَكَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَدْ جَلَدَهُ فِي الشَّرَابِ، فَأُتِيَ بِهِ يَوْمًا فَأَمَرَ بِهِ فَجُلِدَ، فَقَالَ رَجُلٌ مِنَ القَوْمِ: اللَّهُمَّ العَنْهُ، مَا أَكْثَرَ مَا يُؤْتَى بِهِ؟ فَقَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: «لاَ تَلْعَنُوهُ، فَوَاللَّهِ مَا عَلِمْتُ إِنَّهُ يُحِبُّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ»[1]

"حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایک شخص تھا کہ جس کا نام عبد اللہ تھا لیکن لوگ مذاق میں اسے گدھا کہتے تھے۔ وہ شخص اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت ہنسایا کرتا تھا حالانکہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اس پر شراب کی حد بھی نافذ فرما چکے تھے۔ پس ایک دن اسے شراب کی حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں لایا گیا اور آپ نے اس پر حد جاری کرنے کا حکم دیا۔ تو صحابہ میں سے ایک شخص نے کہا کہ اللہ اس پر لعنت کرے کہ کتنی بار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں شراب پینے پر لایا گیا ہے۔ تو اس پر اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا کہ اس شخص پر لعنت نہ کرو۔ میں جانتا ہوں کہ اس کے دل میں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت ہے۔"

اب یہ کیسے معلوم ہو کہ میرے دل میں جو اللہ کی محبت ہے، وہ سچی ہے یا نہیں۔ اگر تنہائی میں اللہ کی یاد آئے تو آنکھیں اپنے رب کے دیدار کی پیاس میں نم ہو جائیں یا دل

[1] صحيح البخاري، كِتَابُ الحُدُودِ، بَابُ مَا يُكْرَهُ مِنْ لَعْنِ شَارِبِ الخَمْرِ، 158/8

اپنے مالک سے ملاقات کے لیے بے چین ہو جائے تو یہ محبت سچی ہے ورنہ تو ابھی ایک دعوی ہے کہ جسے حقیقت بنانے کی ضرورت ہے۔

تقوی کا لباس

تقوی کا مفہوم

تقوی کا لفظ وقایہ سے بنا ہے کہ جس کا معنی ڈھال ہے۔ڈھال میدان جنگ میں دشمن کے وار سے اپنے آپ کو بچانے کے لیے استعمال ہوتی ہے۔اور تقوی بھی دراصل اللہ کا وہ ڈر اور خوف ہے کہ جس کے ذریعے انسان شیطان کے مکروفریب اور چالوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اللہ کی معصیت اور نافرمانی سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔

اہل علم کا اس بارے اختلاف ہے کہ تقوی دل کا فعل ہے یا اعضاء کا۔ تقوی کوئی جذبہ ہے کہ جو دل میں ہوتا ہے یا یہ ایک رویہ ہے کہ جس کا اظہار انسان کے عمل سے ہوتا ہے؟ کتاب وسنت کی نصوص میں تقوی کو جذبہ اور رویہ دونوں طرح سے بیان کیا گیا ہے۔ تقوی دراصل دل کے افعال میں سے ایک فعل ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے:

«التَّقْوَى هَاهُنَا وَيُشِيرُ إِلَى صَدْرِهِ ثَلَاثَ مَرَّاتٍ»

”تقوی یہاں ہوتا ہے اور یہ کہتے ہوئے آپ ﷺ تین مرتبہ اپنے سینے کی طرف اشارہ فرمارہے تھے۔“

اور دل میں جب یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے تو اس کا اظہار لازماً انسان کے اعضاء سے ہوتا ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ مجھے سامنے موجود اپنے بچے پر پیار آئے اور میں اس کی طرف اپنے ہاتھ نہ بڑھاؤں۔جب بھی مجھے کسی سے محبت محسوس ہوتی ہے یا کسی سے ڈر لگتا ہے تو میرے اعضاء سے اس محبت اور ڈر کا اظہار ہو کر رہتا ہے۔پس یہی معاملہ تقوی کا بھی ہے کہ یہ ممکن نہیں ہے کہ دل میں اللہ کا ڈر اور خوف ہو اور اعضاء سے اس کا اظہار نہ ہو رہا ہو۔ جس کے دل میں تقوی ہو گا تو اس کے رویوں میں بھی لازماً تقوی ہو گا۔ پس تقوی کا تعلق دل کے علاوہ عمل سے بھی ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ﴾
[المائدۃ: 2]

"اور نیکی اور تقوی کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون کرو اور گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے سے تعاون نہ کرو۔"

اس آیت مبارکہ میں تقوی سے مراد تقوی والے اعمال ہیں یعنی وہ اعمال کہ جن کی بنیاد اللہ کا ڈر اور خوف ہو۔ اگر آپ کسی بری عادت کو اللہ کے ڈر کی وجہ سے ترک کر دیتے ہیں تو یہ تقوی ہے۔ کس بری عادت کو تو اللہ کی محبت میں بھی ترک کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے باوجود اللہ کی ذات سے اس لیے ڈرایا گیا ہے کہ انسان خوف کی کیفیت میں زیادہ مفید (productive) عمل کرتا ہے جیسا کہ ماہرین نفسیات کا کہنا بھی یہی ہے۔ انسان کے عمل اور رویے میں کتنا تقوی ہونا چاہیے، تو اس بارے قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ﴾ [آل عمران: 102]

"اے اہل ایمان! اللہ سے ڈرو جتنا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور تم ہر گز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ فرمانبردار ہو۔"

اب اس ڈرنے سے مراد صرف دل میں ڈرنا نہیں ہے بلکہ ایسا ڈرنا ہے کہ جس کا اثر انسان کے اعمال پر اس قدر ہو کہ وہ ہر حال میں اللہ کی فرمانبرداری کی حالت میں ہو۔ وہ حالت کہ جس میں انسان اللہ کی معصیت اور نافرمانی میں ہو، تقوی کی حالت نہیں ہوتی۔ اور اللہ عزوجل نے ہم سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ جب ہماری موت واقع ہو تو اس وقت ہمیں تقوی کے حال میں ہونا چاہیے۔ اور تقوی کا حال کیا ہے؟ کہ اللہ کی فرمانبرداری کی حالت میں ہو۔ انسان جب بھی اللہ کے کسی حکم کو پورا کر رہا ہو مثلاً نماز پڑھ رہا ہے، تلاوت کر رہا ہے، ذکر کر رہا ہے، حج و عمرہ کر رہا ہے، زکوۃ و صدقہ ادا کر رہا ہے، ویلفیئر کا کام کر رہا ہے، دعوت و تبلیغ کا حکم پورا کر رہا ہے، ظالم کافروں سے جہاد کر رہا ہے، تو وہ تقوی کے کسی نہ کسی حال میں ہوتا ہے۔

تقویٰ کی اہمیت

تقویٰ کا لفظ قرآن مجید میں نو مرتبہ نقل ہوا ہے جبکہ تیرہ مرتبہ ان کا بیان ہے کہ جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا ہے یا جنہیں تقویٰ اختیار کرنے کی ترغیب دی گئی۔ اور قرآن مجید میں 69 مرتبہ امر کے صیغہ میں تقویٰ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اور قرآن مجید میں 53 مقامات ایسے ہیں کہ جہاں متقین کی صفات یا ان کے مقام اور مرتبے کا بیان ہے۔ ان اعداد و شمار سے قرآن مجید کی نظر میں تقویٰ کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ قرآن مجید کے بیان کے مطابق ہر نبی نے اپنی قوم کو تقویٰ کی وصیت کی ہے۔ ہر نبی کی دعوت کے دو بڑے موضوع رہے ہیں: ایک اللہ کی عبادت کرنا کہ جسے ہم توحید بھی کہہ دیتے ہیں اور دوسرا اللہ ہی کا تقویٰ اختیار کرنا۔ اللہ عزوجل ہی کی عبادت کے بعد، تقویٰ اختیار کرنے کا حکم، قرآن مجید کے بڑے موضوعات میں سے ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَإِيَّاكُمْ أَنِ اتَّقُوا اللَّهَ﴾ [النساء: 131]

”اور ہم نے ان لوگوں کو بھی وصیت کی کہ جنہیں تم سے پہلے کتاب دی گئی اور تمہیں بھی یہ وصیت کر رہے ہیں کہ اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔“

اسی طرح انبیاء کی دعوت کا بنیادی نکتہ عبادت کے علاوہ تقویٰ بھی رہا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلَا تَتَّقُونَ﴾ [الشعراء: 106]

”جب ان سے ان کے بھائی نوح علیہ السلام نے کہا کہ تم تقویٰ اختیار کیوں نہیں کرتے ہو؟“

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ هُودٌ أَلَا تَتَّقُونَ﴾ [الشعراء: 124]

”جب ان سے ان کے بھائی ہود علیہ السلام نے کہا کہ تم تقویٰ اختیار کیوں نہیں کرتے ہو؟“

اسی طرح ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ صَالِحٌ أَلَا تَتَّقُونَ﴾ [الشعراء: 142]

”جب ان سے ان کے بھائی صالح علیہ السلام نے کہا کہ تم تقوی اختیار کیوں نہیں کرتے ہو؟“

اسی طرح ارشاد باری تعالی ہے:

﴿إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ لُوطٌ أَلَا تَتَّقُونَ﴾ [الشعراء: 161]

”جب ان سے ان کے بھائی لوط علیہ السلام نے کہا کہ تم تقوی اختیار کیوں نہیں کرتے ہو؟“

پس نبیوں کے تربیتی نظام اور قرآن مجید کے متعین کردہ راہ سلوک میں تقوی ہی ابتداء وانتہاء ہے۔ تقوی کی ابتداء یہ ہے کہ انسان فرائض کا اہتمام کرے اور حرام کاموں سے اجتناب کرے۔ اور اس کی انتہاء یہ ہے کہ شبہات سے بھی بچے اور دینی شعائر کی بھی تعظیم کرے۔ قرآن مجید کے بیان کردہ راہ سلوک کا یہ ابتدائی پتھر بھی ہے اور انتہائی منزل بھی۔ قرآن مجید کا کل راہ سلوک یہی تقوی ہے اور تقوی کا کل مقصود یہ ہے کہ متقی بن جاؤ۔ اب ہم لوگوں کو غوث، قطب، ابدال اور قلندر بنانے میں لگے ہیں کہ جن کا ذکر نہ تو قرآن مجید میں ہے اور نہ ہی احادیث میں۔ اور جن مقامات سلوک کا ذکر قرآن مجید میں ہے تو ان کی طرف بالکل بھی توجہ نہیں ہے۔ پس تصوف کے نام پر کچھ لوگوں نے قرآن مجید کے متوازی ایک نظام تربیت قائم کیا ہے کہ جس میں لوگ غوث، قطب، ابدال اور قلندر تو بنتے ہیں لیکن مریدوں کو مومن، محسن، متقی، عباد الرحمن وغیر بنانے کی فکر کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ قرآن مجید جہاں اپنے مقامات سلوک کا تذکرہ کرتا ہے، وہاں ان مقامات کو حاصل کرنے کے لیے رستے کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔ قرآن مجید نے جہاں تقوی اختیار کرنے کا حکم دیا ہے، وہاں کثرت سے متقین کی صفات بھی بیان فرمائی ہیں کہ ان صفات کے ساتھ متصف ہو کر تم اس مقام بندگی پر فائز ہو سکتے ہو، کہ جو بندگی کا سب سے پہلا مقام بھی ہے اور سب سے اعلی مقام بھی۔

قرآن مجید نے تقوی کا اس قدر کثرت سے حکم دیا ہے کہ اگر سفر کے لیے گھر سے نکلے تو زادِ راہ کے ساتھ ساتھ تقوی کی بھی وصیت کر دی۔ زادِ راہ سے مراد وہ ضروری

اشیاء ہیں کہ جن کی ایک مسافر کو رستے میں ضرورت پڑتی ہے۔ اگر آپ کو کہیں بھی سفر پر جانا ہے تو رستے کے لیے سامان تو باندھنا پڑتا ہے۔ اور رستے کے اس سامان میں اللہ عزوجل نے تقوی کو بھی شامل کرنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَتَزَوَّدُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوى﴾ [البقرة: 197]

"اور [حج کے سفر میں] زادِ راہ لے لیا کرو جبکہ بہترین زادِ راہ تقوی ہے۔"

اسی طرح اگر کہیں انسان کے لباس کا تذکرہ آیا کہ اللہ عزوجل کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت لباس بھی ہے کہ انسان اس نعمت کے ساتھ اپنی زندگی کو خوبصورت بناتا ہے تو ساتھ میں ہی بہترین لباس، تقوی کو قرار دے دیا۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿يَابَنِي آدَمَ قَدْ أَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُوَارِي سَوْآتِكُمْ وَرِيشًا وَلِبَاسُ التَّقْوَى ذَلِكَ خَيْرٌ﴾ [الأعراف: 26]

"اے اولا آدم! ہم نے تمہارے لیے لباس اتارا ہے کہ جس سے تم اپنی شرم گاہوں کو چھپاتے ہو اور زینت حاصل کرتے ہو لیکن تقوی کا لباس تو وہ تو بہت ہی بہتر ہے۔"

تقوی کو لباس سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح لباس تمہارے وجود کو ڈھانپ لیتا ہے اور انسان دن اور رات ہر دو اوقات میں لباس پہنے ہوتا ہے، اسی طرح تقوی کو بھی اپنا لباس بنالو کہ ہر حال میں تقوی کی چادر میں تمہارا نفس لپٹا ہوا ہو۔ جس طرح لباس تمہارے وجود سے جدا ہو تو تمہیں بے چینی شروع ہو جاتی ہے تو اسی طرح تقوی اگر تمہارے دل سے نکل جائے تو تم اضطراب کی کیفیت میں آ جاؤ۔

اللہ عزوجل کو ہم سے محض نیکی مطلوب نہیں ہے بلکہ ایسی نیکی مطلوب ہے کہ جو تقوی کے ساتھ ہو۔ تقوی کے بغیر نیکی محض ایک رسم رہ جاتی ہے کہ جس سے انسانی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کی نماز، روزہ، صدقہ، زکوۃ، حج، عمرہ، تلاوت، ذکر، دعوت اور تبلیغ وغیرہ جیسے نیک اعمال آپ کی شخصیت میں تبدیلی لے کر آئیں تو یہ اسی صورت ممکن ہے جبکہ آپ ہر نیک عمل کی بنیاد تقوی کو بنا لیں۔ تقوی کسی بھی نیک عمل کی روح ہے اور تقوی کے بغیر نیکی ایسے ہی ہے جیسا کہ

روح کے بغیر مردہ جسم۔ تقوی دراصل عبادت کا ایک ایسا حال ہے کہ اگر وہ حاصل ہو جائے تو انسان کی عبادت قبولیت کے درجے کو پہنچ جاتی ہے۔ اللہ کے لیے جانور ذبح کرنا کہ جسے ہم قربانی کہتے ہیں، ایک بہت بڑا نیک عمل ہے جو کہ عید الاضحی کے موقع پر پوری دنیا میں ذوق وشوق سے پورا کیا جاتا ہے۔ اور اس بارے ارشاد باری تعالی ہے:

﴿لَنْ يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَكِنْ يَنَالُهُ التَّقْوَى مِنْكُمْ﴾ [الحج: 37]

"اللہ عزوجل کو جانوروں کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا بلکہ وہ تقوی پہنچتا ہے جو تم میں ہوتا ہے۔"

جانور کی گردن پر چھری پھیرتے وقت انسان یہ عزم کرے کہ جس طرح اس جانور کو اللہ کے لیے قربان کر دیا، اسی طرح اپنی ان خواہشات کو بھی اللہ کے لیے قربان کر دوں گا جو اس سے دور کرنے کا سبب بنتی ہوں۔ اور آج اگر اس جانور کا خون اللہ عزوجل کی خاطر بہایا ہے تو کبھی اللہ عزوجل کے لیے اپنا خون دینے کی ضرورت بھی پڑی، مثلاً جہاد وغیرہ میں، تو اسی طرح پیش کر دوں گا کہ جیسے اس جانور کا خون پیش کیا۔ تو یہ وہ جذبات اور سوچیں ہیں جو نیکی میں تقوی کو شامل کر دیتے ہیں۔ اور اگر قربانی کے اس عظیم عمل میں یہ سوچ غالب ہو کہ اس کا گوشت اتنے دنوں تک گھر کے فریزر میں اسٹاک کیا جا سکتا ہے تو یہ صرف رسم قربانی ہے کہ جس کی روح غائب ہے۔ اور قرآن مجید کی یہ آیت مبارکہ تو ہلا دینے والی ہے کہ اللہ عزوجل تو نیک عمل قبول ہی اس سے کرتے ہیں کہ جو اس نیک عمل میں تقوی رکھتا ہو۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿إِنَّما يَتَقَبَّلُ اللَّهُ مِنَ الْمُتَّقِينَ﴾ [المائدة: 27]

"اللہ عزوجل تو محض متقین سے ہی [نیک اعمال] قبول کرتے ہیں۔"

اور اللہ عزوجل کے ہاں جو مقام اور مرتبہ طے ہوتا ہے تو اس کا واحد معیار تقوی ہے۔ اللہ عزوجل کے ہاں فضیلت اور مقام کا معیار نہ تو کسی کا پیر طریقت ہونا ہے اور نہ ہی کسی کا قطب عالم ہونا، بلکہ اس کا متقی ہونا ہے۔ ارشار باری تعالی ہے:

﴿إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ﴾ [الحجرات: 13]

"بے شک اللہ عزوجل کے ہاں تم میں سے سب سے زیادہ مقام اور مرتبے والا وہ ہے کہ جو تم میں سے سب سے زیادہ متقی ہے۔"

تقوی کے درجات

تقوی کے دو درجات ہیں۔ ایک بنیادی اور دوسرا انتہائی۔ بنیادی درجہ تو یہ ہے کہ انسان فرائض پر عمل پیرا ہو اور حرام سے اجتناب کرے۔ جو شخص بھی فرائض کو پورا کر رہا ہے اور حرام سے بچ رہا ہے تو وہ متقی ہے۔ اگر فرائض کی پابندی اور حرام سے اجتناب نہیں ہے تو پھر تقوی نہیں ہے، چاہے ساری رات سجدے کی حالت میں پڑا رہے اور سارا دن بھوکا پیاسا رہے۔ حضرت عمر بن عبد العزیز رحمہ اللہ کا قول ہے:

«لَيْسَ تَقْوَى اللَّهِ بِصِيَامِ النَّهَارِ، وَلَا بِقِيَامِ اللَّيْلِ، وَالتَّخْلِيطِ فِيمَا بَيْنَ ذَلِكَ، وَلَكِنَّ تَقْوَى اللَّهِ تَرْكُ مَا حَرَّمَ اللَّهُ، وَأَدَاءُ مَا افْتَرَضَ اللَّهُ، فَمَنْ رُزِقَ بَعْدَ ذَلِكَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ إِلَى خَيْرٍ»[1]

"تقوی یہ نہیں ہے کہ انسان دن میں روزے سے رہے یا رات بھر تہجد پڑھے یا دونوں کام کرے بلکہ اصل تقوی تو یہ ہے کہ حرام کو چھوڑ دے اور فرض کو ادا کرے۔ اور فرض کی ادائیگی اور حرام سے اجتناب کے بعد اگر کسی کو مزید نیکی کی توفیق ملے تو وہ نور علی نور ہے۔"

پس تقوی کا بنیادی اور لازمی درجہ تو فرائض پر عمل پیرا ہونا ہے اور حرام سے اجتناب کرنا ہے۔ جو شخص یہ دو کام نہ کرے تو بھلے وہ ہوا میں اڑ کر دکھا دے تو وہ اللہ کا ولی نہیں ہے بلکہ شیطان کا ولی ہے۔ ایک شخص نماز نہ پڑھے اور چرس پیے تو فاسق وفاجر تو ہو سکتا ہے لیکن متقی نہیں۔ متقی کہلوانے کے لیے ضروری ہے کہ ارکان اسلام نماز، روزہ، حج اور زکوۃ پر عمل پیرا ہو اور شرک، قتل، زنا، بے حیائی، چوری، ڈکیتی، سود، رشوت، کرپشن، جھوٹ، وعدہ خلافی، شراب نوشی اور منشیات وغیرہ کے استعمال کو ترک کرنے والا ہو۔

[1] البيهقي، أحمد بن الحسين بن علي، الزهد الكبير، مؤسسة الكتب الثقافية، بيروت، الطبعة الثالثة، 1996ء، ص 351

اور تقوی کا اعلی ترین درجہ یہ ہے کہ انسان شبہات سے بھی بچے یعنی جس کا حرام ہونا واضح نہ ہو لیکن اس کے حرام ہونے کا شبہ لاحق ہو جائے تو اس کو ترک کر دینا بھی تقوی ہے جیسا کہ ایک روایت کے الفاظ ہیں:

«الحَلاَلُ بَيِّنٌ، وَالحَرَامُ بَيِّنٌ، وَبَيْنَهُمَا مُشَبَّهَاتٌ لاَ يَعْلَمُهَا كَثِيرٌ مِنَ النَّاسِ، فَمَنِ اتَّقَى المُشَبَّهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ وَعِرْضِهِ، وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ: كَرَاعٍ يَرْعَى حَوْلَ الحِمَى، يُوشِكُ أَنْ يُوَاقِعَهُ، أَلاَ وَإِنَّ لِكُلِّ مَلِكٍ حِمًى، أَلاَ إِنَّ حِمَى اللَّهِ فِي أَرْضِهِ مَحَارِمُهُ، أَلاَ وَإِنَّ فِي الجَسَدِ مُضْغَةً: إِذَا صَلَحَتْ صَلَحَ الجَسَدُ كُلُّهُ، وَإِذَا فَسَدَتْ فَسَدَ الجَسَدُ كُلُّهُ، أَلاَ وَهِيَ القَلْبُ»[1]

"حلال واضح ہے اور حرام بھی واضح ہے۔ اور ان دونوں کے مابین کچھ اُمور مشتبہات میں سے ہیں کہ جنہیں اکثر لوگ نہیں جانتے ہیں۔ پس جس نے اپنے آپ کو مشتبہات سے بچا لیا تو اس نے اپنے دین کو بھی بچا لیا اور اپنی عزت کو بھی محفوظ کر لیا۔ اور جو مشتبہات میں پڑ گیا تو قریب ہے کہ وہ حرام میں بھی پڑ جائے جیسا کہ ایک چرواہا کسی چراہ گاہ کے گرد اپنی بکریاں چراتا ہے [تو اس کی بکریاں اس میں داخل ہو سکتی ہیں]۔ سن لو کہ ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ ہوتی ہے اور اللہ کی چراہ گاہ اس کی زمین میں وہ کام ہیں کہ جنہیں اس نے حرام قرار دیا ہے۔ خبردار! انسان کے جسم میں ایک لوتھڑا ہے کہ اگر وہ درست ہو جائے تو سارا جسم درست ہو جاتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائے تو سارا جسم بگڑ جاتا ہے۔ اور وہ انسان کا دل ہے۔"

پس مشتبہ امور سے بچنا تقوی کا اعلی تر درجہ ہے۔ اسی طرح اگر کسی حلال اور مباح کام کے بارے اندیشہ ہو کہ یہ حرام تک جانے کا ذریعہ بن جائے گا تو اس حلال اور مباح سے اجتناب کرنا بھی تقوی میں شامل ہے۔ اگر آپ کو اندیشہ ہے کہ آپ انٹرنیٹ پر بیٹھیں گے تو اللہ کی حدود میں داخل ہو جائیں گے یعنی کسی فحش ویب سائیٹ پر پہنچ جائیں گے تو آپ کے لیے انٹرنیٹ پر نہ بیٹھنا تقوی میں شامل ہے، چاہے انٹرنیٹ کے استعمال

[1] صحيح البخاري، كِتَابُ الإِيمَانِ، بَابُ فَضْلِ مَنِ اسْتَبْرَأَ لِدِينِهِ، 20/1

اور جائز ہونے کے فتاوی موجود ہوں۔ لیکن یہ سب تقوی وہ ہے جو اپنے لیے ہے نہ کہ دوسروں کے لیے۔ ہمارا المیہ یہ بھی ہے کہ ہم بہترین تقوی چاہتے ہیں لیکن دوسروں کی ذات میں، اپنی ذات میں نہیں۔ اور صالح بننے کے لیے ضروری ہے کہ تقوی کی آئیڈیل صورتیں، میں اپنی ذات میں پیدا کر کے دکھاؤں نہ کہ دوسروں میں تلاش کرتا رہوں اور نہ ملنے پر ان کو تنقید کا نشانہ بناتا رہوں۔

قرآن مجید نے بھی تقوی کے گھٹنے اور بڑھنے کا ذکر کیا ہے۔ جب شراب کو حرام قرار دیا گیا تو اس وقت بعض مسلمانوں کو یہ اندیشہ لاحق ہو کہ جو شراب ہم نے پی لی ہے تو وہ تو ہمارے خون کا حصہ بن چکی ہے لہذا اس کی نجاست اور گندگی سے ہمارے وجود کی صفائی کیسے ممکن ہے؟ تو اس بارے ارشاد باری تعالی نازل ہوا:

﴿لَيْسَ عَلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ جُنَاحٌ فِيمَا طَعِمُوا إِذَا مَا اتَّقَوْا وَآمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَآمَنُوا ثُمَّ اتَّقَوْا وَأَحْسَنُوا وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ﴾ [المائدة: 93]

”اہل ایمان اور صالح عمل کرنے والوں پر اس بارے کوئی گناہ نہیں ہے کہ جو وہ کھا پی چکے ہیں جبکہ وہ تقوی اختیار کریں اور ایمان اور عمل صالح میں بڑھ جائیں۔ اور پھر تقوی اور ایمان میں بڑھ جائیں۔ اور پھر مزید تقوی میں بڑھ جائیں اور درجہ احسان کو پہنچ جائیں۔ اور اللہ عزوجل درجہ احسان پر فائز ہونے والوں سے محبت کرتے ہیں۔“

تقوی جب اپنے اعلی درجے کو پہنچ جاتا ہے تو اس کے مظاہر میں سے ایک اہم مظہر، اللہ کے شعائر کی تعظیم ہے۔ شعائر کا لفظ شعور سے بنا ہے اور اس سے مراد وہ اشیاء ہیں کہ جنہیں دیکھتے ہی اللہ عزوجل کی ذات کا شعور حاصل ہو۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ﴾ [الحج: 32]

”اور جو کوئی اللہ کے شعائر کی تعظیم کرے گا تو یہ دلوں کے تقوی میں سے ہے۔“

پس شعائر سے مراد وہ اشیاء ہیں کہ جن پر نظر پڑتے ہی اللہ یاد آ جائے جیسا کہ بیت

اللہ، مسجد اور قرآن مجید وغیرہ ہیں۔ پس ان کی تعظیم کرنا بھی تقویٰ میں شامل ہے۔ اگرچہ یہ کوئی شرعی مسئلہ تو نہیں ہے کہ انسان اپنے گھر میں موجود شیلف میں جب کتابیں رکھے تو سب سے پہلے قرآن مجید رکھے، پھر حدیث کی کتابیں اور پھر دیگر کتب رکھے لیکن یہ ان آداب میں ضرور شامل ہے جو کہ تقویٰ کے اعلیٰ درجے کے ثمرات میں سے ہیں۔ پس بیت اللہ کی طرف اپنے پاؤں نہ پھیلانا، میز پر پڑی کتابوں میں قرآن مجید کو سب سے اوپر رکھنا، اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے لکھے ہوئے نام کو زمین پر سے اٹھا لینا اور سنبھال کر اونچی جگہ پر رکھ دینا، مسجد میں اونچی آواز سے بات نہ کرنا وغیرہ، اللہ کے شعائر کی تعظیم کرنے میں شامل ہے۔

تقویٰ کے ثمرات

قرآن مجید نے تقویٰ کے جو ثمرات بیان کیے ہیں تو وہ دنیاوی بھی ہیں اور اخروی بھی۔ متقی شخص کو ایک تو اس دنیا میں ہی کچھ انعامات کی صورت میں اس کے تقویٰ کا بدلہ دے دیا جاتا ہے اور دوسرا آخرت میں تو اس کے لیے خاص طور انعام و اکرام کا اہتمام کیا گیا ہے۔ تقویٰ کے دنیاوی ثمرات میں سے یہ ہے کہ اللہ عزوجل انسان کے لیے اس کی آزمائش سے نکلنے کا رستہ اور آسانی پیدا فرما دیتے ہیں۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا (2) وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ﴾ [الطلاق: 3]

"اور جو کوئی اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا تو اللہ عزوجل اس کے لیے [آزمائش سے] نکلنے کا کوئی رستہ پیدا فرما دیں گے اور اس کو وہاں سے رزق دیں گے جہاں سے کہ اس کو گمان بھی نہ ہو گا۔"

اسی طرح ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يَجْعَلْ لَهُ مِنْ أَمْرِهِ يُسْرًا﴾ [الطلاق: 4]

"اور جو کوئی اللہ کا تقویٰ اختیار کرے گا تو اللہ عزوجل اس کے معاملے میں آسانی پیدا فرما دیں گے۔"

یہ آیات میاں بیوی میں جدائی اور طلاق کے سیاق میں بیان ہوئی ہیں۔ عموماً میاں

بیوی میں جدائی کے وقت ایک دوسرے کے حق میں صریح زیادتی ہو جاتی ہے لہذا نبھا نہ ہونے کی صورت میں بہترین انداز میں علیحدہ ہو جانا تقوی میں شامل ہے۔ عموماً علیحدگی کی صورت میں شوہر کے گھر والے لڑکی کے جہیز کا سامان واپس نہ کریں یا شادی کی موقع پر جو تحفے تحائف لڑکی کو لڑکے والوں کے خاندان کی طرف سے دیے گئے تھے، انہیں واپس لینے کی کوشش کریں یا لڑکی والے علیحدگی کے بعد عدالت کے ذریعے بچے حاصل کر لیں اور باپ کو اپنے بچوں سے ملنے نہ دیں، تو یہ سب وہ کام ہیں جو تقوی کے منافی ہیں۔ اور جو شریک کار (partners) تقوی کے ساتھ علیحدہ ہوتے ہیں کہ لڑائی اور جھگڑے میں بھی ایک دوسرے پر زیادتی نہ کریں تو یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے لیے اللہ عزوجل آزمائش سے نکلنے کے رستے پیدا فرما دیتے ہیں اور ان کے دنیاوی معاملات کو ان کے حق میں آسان فرما دیتے ہیں۔

تقوی کے دنیاوی فوائد میں سے یہ بھی ہے کہ جب کوئی قوم تقوی اختیار کرتی ہے تو اللہ عزوجل اس کے لیے زمین اور آسمان کی برکات کھول دیتے ہیں اور اس کی معیشت پھلنے پھولنے لگتی ہے۔ کسی قوم کی معیشت کے بہتر ہونے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ اللہ عزوجل اس کے لیے زمین اور آسمان کی برکات کھول دیں کہ زمین تیل، گیس اور دیگر معدنی ذخائر کی صورت میں اپنے خزانے اگل دے اور آسمان بارشوں کے ذریعے اس قوم کی نہروں اور دریاؤں کو جاری کر دے اور فصلوں اور باغات کو سونا بنا دے۔ اور دوسری صورت یہ ہے کہ ایک قوم دوسری اقوام کے وسائل اور ذرائع پر قبضہ کر کے اپنی معیشت کو تو بہتر بنا لے لیکن دوسروں کی معیشت کا بیڑا غرق کر دے جیسا کہ کیپٹلزم میں دنیا کی کل دولت میں سے ایک بڑے حصے کا ارتکاز چند اقوام تو کجا، چند خاندانوں بلکہ چند افراد کے ہاتھوں میں ہو جاتا ہے کہ جس سے دنیا کے بڑے خطوں اور اقوام میں بدترین غربت جنم لیتی ہے۔ تقوی اختیار کرنے کی صورت میں اللہ عزوجل قدرتی وسائل اور ذرائع آمدن میں اضافہ فرما دیتے ہیں جو کہ معاشی خوشحالی کی حقیقی صورت ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَى آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَرَكَاتٍ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ وَلَكِنْ كَذَّبُوا فَأَخَذْنَاهُمْ بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ﴾ [الأعراف: 96]

”اور اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور تقوی اختیار کرتے تو ہم لازماً ان پر آسمان اور زمین کی برکات کھول دیتے لیکن انہوں نے جھٹلایا تو ہم نے انہیں اُس کے بدلے میں پکڑا جو کہ وہ کرتے تھے۔“

جہاں تک تقوی کے اخروی اور دینی فوائد کا تعلق ہے تو اللہ عزوجل دنیاوی اور دینی معاملات میں تقوی اختیار کرنے سے گناہ معاف فرمادیتے ہیں اور اجر و ثواب بڑھادیتے ہیں۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وَمَنْ يَتَّقِ اللَّهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّئَاتِهِ وَيُعْظِمْ لَهُ أَجْرًا﴾ [الطلاق: 5]

”اور جو کوئی اللہ کا تقوی اختیار کرے گا تو اللہ عزوجل اس کے گناہ دور کردیں گے اور اس کے اجر کو بڑھادیں گے۔“

اس کے علاوہ قرآن مجید میں کئی ایک آیات ہیں کہ جن میں متقین کو صراحت کے ساتھ جنت کا وارث قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي نُورِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا﴾ [مريم: 63]

”اس جنت کا وارث ہم اپنے بندوں میں سے ان کو بنائیں گے کہ جو متقی ہیں۔“

اسی طرح قرآن مجید میں کئی ایک مقامات پر آخرت میں متقین کو جنت میں ملنے والے انعامات واکرامات بیان کیے گئے ہیں۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ (45) ادْخُلُوهَا بِسَلَامٍ آمِنِينَ (46) وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ إِخْوَانًا عَلَى سُرُرٍ مُتَقَابِلِينَ (47) لَا يَمَسُّهُمْ فِيهَا نَصَبٌ وَمَا هُمْ مِنْهَا بِمُخْرَجِينَ﴾ [الحجر: 48]

”بے شک متقین باغات میں اور چشموں میں ہوں گے۔ اور ان سے کہا جائے گا کہ تم جنت میں سلامتی اور امن کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔ اور انکے دلوں میں جو کینہ ہو گا، اسے ہم کھینچ لیں گے اور وہ بھائی بھائی بن کر تختوں پر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ انہیں اس جنت میں نہ تو کوئی تھکاوٹ طاری ہو گی اور نہ ہی وہ اس سے کبھی نکالے جائیں گے۔“

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي مَقَامٍ أَمِينٍ (51) فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ (52) يَلْبَسُونَ مِنْ سُنْدُسٍ وَإِسْتَبْرَقٍ مُتَقَابِلِينَ (53) كَذَلِكَ وَزَوَّجْنَاهُمْ بِحُورٍ عِينٍ (54) يَدْعُونَ فِيهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ آمِنِينَ (55) لَا يَذُوقُونَ فِيهَا الْمَوْتَ إِلَّا الْمَوْتَةَ الْأُولَى وَوَقَاهُمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ (56) فَضْلًا مِنْ رَبِّكَ ذَلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾ [الدخان: 57]

"بے شک متقین باعزت مقام میں ہوں گے۔ باغات اور چشموں میں۔ وہ باریک اور موٹا ریشم پہن کر آمنے سامنے بیٹھے ہوں گے۔ اسی طرح ہم موٹی آنکھوں والی حوریں ان کے نکاح میں دے دیں گے۔ وہ ان جنتوں میں ہر قسم کے پھل مانگے گے امن کے ساتھ۔ اور وہ ان جنتوں میں کبھی موت کا ذائقہ نہیں چکھیں گے سوائے اس موت کے کہ جو پہلے ان پر آچکی اور ان کا رب انہیں جہنم کے عذاب سے بچالے گا۔ اور یہ سب آپ کے رب کا فضل ہے اور یہ بہت ہی بڑی کامیابی ہے۔"

ایک اور مقام پر متقین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿الْأَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ (67) يَاعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ (68) الَّذِينَ آمَنُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا مُسْلِمِينَ (69) ادْخُلُوا الْجَنَّةَ أَنْتُمْ وَأَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُونَ (70) يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِصِحَافٍ مِنْ ذَهَبٍ وَأَكْوَابٍ وَفِيهَا مَا تَشْتَهِيهِ الْأَنْفُسُ وَتَلَذُّ الْأَعْيُنُ وَأَنْتُمْ فِيهَا خَالِدُونَ (71) وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِي أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (72) لَكُمْ فِيهَا فَاكِهَةٌ كَثِيرَةٌ مِنْهَا تَأْكُلُونَ﴾ [الزخرف: 73]

"قیامت والے دن قریبی ترین دوست بھی ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوائے متقین کے۔ اے میرے متقی بندو! آج کے دن تم پر نہ تو کوئی خوف ہو گا اور نہ ہی تم غمگیں ہو گے۔ اور یہ وہی لوگ ہیں جو ہماری آیات پر ایمان لائے اور فرمانبردار رہے۔ [ان سے کہا جائے گا] تم اور تمہاری بیویاں جنت میں داخل ہو جاؤ کہ تم خوش کیے جاؤ گے۔ ان پر سونے کی رکابیاں اور پیالے

کھمائے جائیں گے اور ان رکابیوں اور پیالوں میں وہ ہو گا کہ جو ان کے جی چاہیں گے اور آنکھوں کی ٹھنڈک ہو گی اور تم ان جنتوں میں ہمیشہ رہو گے۔اور یہ وہ جنت ہے کہ جس کے تم وارث بنائے گئے ہو،اس کے بدلے میں کہ جو تم عمل کرتے تھے۔تمہارے لیے اس میں کثرت سے میوے ہوں گے کہ جن میں سے تم کھاؤ گے۔"

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ (15) آخِذِينَ مَا آتَاهُمْ رَبُّهُمْ﴾ [الذاریات: 16]

"بے شک متقین باغات اور چشموں میں ہوں گے۔اور جو ان کو ان کا رب دے رہا ہو گا تو وہ اسے لے رہیں ہوں گے۔"

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَعِيمٍ (17) فَاكِهِينَ بِمَا آتَاهُمْ رَبُّهُمْ وَوَقَاهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيمِ (18) كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (19) مُتَّكِئِينَ عَلَى سُرُرٍ مَصْفُوفَةٍ وَزَوَّجْنَاهُمْ بِحُورٍ عِينٍ﴾ [الطور: 20]

"بے شک متقین باغات اور نعمتوں میں ہوں گے۔ان کا رب انہیں جو دے رہا ہو گا وہ اس پر خوش ہو رہے ہوں گے۔اور ان کا رب انہیں جہنم کے عذاب سے بچا لے گا۔[اور ان سے کہا جائے گا کہ] تم کھاؤ اور پیو، جی بھر کر،اس کے بدلے میں کہ جو تم نیک عمل کرتے تھے۔وہ بچھائے گئے تختوں پر تکیہ لگائے بیٹھے ہوں گے اور ہم ان کے نکاح میں موٹی آنکھوں والی حوریں دیں گے۔"

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَنَهَرٍ (54) فِي مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيكٍ مُقْتَدِرٍ﴾ [القمر: 55]

"بے شک متقین باغات اور چشموں میں ہوں گے۔باعزت مقام میں،اپنے رب کے پاس،جو بادشاہ اور اقتدار والا ہے۔"

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي ظِلَالٍ وَعُيُونٍ (41) وَفَوَاكِهَ مِمَّا يَشْتَهُونَ (42) كُلُوا وَاشْرَبُوا هَنِيئًا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ (43) إِنَّا كَذَلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ﴾ [المرسلات: 44]

"بے شک متقین سایوں اور چشموں میں ہوں گے۔ اور جو پھل وہ چاہیں گے، ملیں گے۔ [اور ان سے کہا جائے گا کہ] تم کھاؤ اور پیو، جی بھر کر، اس کے بدلے میں کہ جو تم نیک عمل کرتے تھے۔ ہم اسی طرح بدلہ دیتے ہیں ان لوگوں کو کہ جو نیک اعمال کو خوبصورتی کے ساتھ کرتے ہیں۔"

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ أُكُلُهَا دَائِمٌ وَظِلُّهَا تِلْكَ عُقْبَى الَّذِينَ اتَّقَوْا وَعُقْبَى الْكَافِرِينَ النَّارُ﴾ [الرعد: 35]

"اس جنت کی مثال کہ جس کا وعدہ متقین سے کیا گیا ہے، ایسی ہے کہ اس کے دامن میں نہریں جاری ہیں، اس کے پھل اور سایے دائمی ہیں، یہ متقین کا انجام ہے۔ اور کافروں کا انجام آگ ہے۔"

ایک اور مقام پر ارشاد ہے:

﴿مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِي وُعِدَ الْمُتَّقُونَ فِيهَا أَنْهَارٌ مِنْ مَاءٍ غَيْرِ آسِنٍ وَأَنْهَارٌ مِنْ لَبَنٍ لَمْ يَتَغَيَّرْ طَعْمُهُ وَأَنْهَارٌ مِنْ خَمْرٍ لَذَّةٍ لِلشَّارِبِينَ وَأَنْهَارٌ مِنْ عَسَلٍ مُصَفًّى وَلَهُمْ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَمَغْفِرَةٌ مِنْ رَبِّهِمْ﴾ [محمد: 15]

"اس جنت کی مثال کہ جس کا وعدہ متقین سے کیا گیا ہے، ایسی ہے کہ اس میں ایسے پانی کی نہریں ہیں جو کبھی بدبودار نہ ہو گا، اور اس میں ایسے دودھ کی نہریں ہیں کہ جس کا ذائقہ تبدیل نہ ہو گا، اور اس میں ایسی شراب کی نہریں ہیں کہ جو پینے والوں کے لیے لذت بخش ہے، اور اس میں صاف ستھرے شہد کی نہریں ہیں، اور ان کے لیے اس میں ہر قسم کے پھل اور اپنے رب کی مغفرت ہے۔"

تقوی کے دینی ثمرات میں سے جنت کے علاوہ یہ بھی ہے کہ انسان اللہ کا محبوب بن

جاتا ہے یعنی متقین وہ ہیں کہ جن سے اللہ محبت رکھتے ہیں اور جن سے اللہ محبت رکھے، ان کا کیا مقام ہو گا؟ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿بَلَى مَنْ أَوْفَى بِعَهْدِهِ وَاتَّقَى فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ﴾ [آل عمران: 76]

"کیوں نہیں، جس نے اپنے وعدے کو پورا کیا اور تقوی اختیار کیا تو اللہ عزوجل ایسے متقین سے محبت رکھتے ہیں۔"

اہم بات یہ ہے کہ قرآن مجید میں تین مقامات پر اس بات کا بیان ہے کہ اللہ عزوجل متقین سے محبت رکھتے ہیں اور ہر مقام پر یہ بیان ایفائے عہد کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ ایک اور مقام پر ارشاد باری تعالی ہے:

﴿فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَى مُدَّتِهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ﴾ [التوبة: 4]

"پس تم ان [یعنی وعدہ نہ توڑنے والے مشرکین] سے کیے جانے والے وعدوں کو ان کی مدت تک پورا کرو۔ بے شک اللہ عزوجل متقین سے محبت رکھتے ہیں۔"

ویسے تو اللہ کے ہر حکم میں تقوی کو ملحوظ رکھنا چاہیے لیکن قرآن مجید کی نص سے اشارتاً معلوم ہو رہا ہے کہ جو لوگ اپنے عہد (commitment) کو پورا کرنے میں اللہ سے ڈرتے رہتے ہیں اور ہر حال میں وعدہ پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہی صفت انہیں اللہ کا محبوب بنا دیتی ہے۔ یہی مضمون سورۃ توبہ، آیت 7 میں بھی ہے۔

اسی طرح قرآن مجید میں تقوی کے دینی ثمرات میں اللہ کی معیت کا بھی ذکر ہے یعنی متقین کو اللہ کا ساتھ نصیب ہو جاتا ہے۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے انسان اکیلے کوئی کام کرتے ہوئے گھبراہٹ یا وحشت محسوس کرتا ہے کہ تنہائی بعض اوقات کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے اور اگر اسے کوئی اچھا ساتھی اور دوست میسر آ جائے تو اس کی گھبراہٹ یا وحشت جاتی رہتی ہے۔ تو متقین وہ ہیں کہ جنہیں ہر لمحے اللہ کے ساتھ ہونے کی نعمت میسر رہتی ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿فَمَنِ اعْتَدَى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدَى عَلَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ﴾ [البقرة: 194]

"جو [مشرک] تم پر زیادتی کرے تو تم بھی اس پر زیادتی کرو لیکن اتنی کہ جتنی اس نے تم پر زیادتی کی۔ اور اللہ سے ڈر جاؤ، بلاشبہ اللہ عزوجل متقین کے ساتھ ہے۔"

قرآن مجید میں اللہ عزوجل کے متقین کے ساتھ ہونے کا بیان بھی تین مقامات پر ہے اور تینوں مقامات پر یہ بیان کفار اور مشرکین کے ساتھ لڑائی کے بعد ہے۔ لڑائی میں انسان کو ساتھیوں کی ضرورت ہوتی ہے اور بندہ مومن کی لڑائی بھی کسی سے نہیں ہوتی سوائے ان کافر اور مشرکین کے کہ جو مسلمانوں پر ظلم کرتے ہیں اور لڑائی میں پہل کرتے ہیں لہذا ایسے ظالموں کے مقابلے میں اللہ عزوجل اپنے نیک بندوں کا ساتھ دیتے ہیں۔ سورۃ توبہ میں آیت 36 اور 123 میں یہی مضمون بیان ہوا ہے۔

متقین کی صفات

قرآن مجید میں بہت سے مقامات پر متقین کی صفات بیان کی گئی ہیں۔ یہ اسی لیے ہے کہ معلوم ہو کہ جس نے سلوک قرآنی میں متقین کے مقام کو پہنچنا ہے تو اسے کن مراحل سے گزر کر یہ مقام حاصل ہو گا؟ قرآن مجید کے سلوک اور تربیتی نظام میں مقام متقین ہی ابتدائی اور انتہائی مقام ہے، جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں کہ یہ تقوی ہی ہے کہ جو اللہ عزوجل کی طرف سفر کا پہلا قدم بھی ہے اور آخری بھی۔ پس جس حال میں ایک سالک اللہ کی قرب کی منازل طے کرتا ہے، وہ تقوی کا حال ہے۔ سالک جس لمحے میں اس حال میں نہیں ہوتا، اس لمحے میں اللہ عزوجل کی طرف اس کا سفر رک جاتا ہے۔ قرآن مجید میں متقین کا مقام بیان کرنے کے بعد ان کی صفات کے بارے اللہ عزوجل فرماتے ہیں:

﴿وَسَارِعُوا إِلَى مَغْفِرَةٍ مِنْ رَبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ أُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ (133) الَّذِينَ يُنْفِقُونَ فِي السَّرَّاءِ وَالضَّرَّاءِ وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ

(134) وَالَّذِينَ إِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً أَوْ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللَّهَ فَاسْتَغْفَرُوا لِذُنُوبِهِمْ وَمَنْ يَغْفِرُ الذُّنُوبَ إِلَّا اللَّهُ وَلَمْ يُصِرُّوا عَلَى مَا فَعَلُوا وَهُمْ يَعْلَمُونَ (135) أُولَئِكَ جَزَاؤُهُمْ مَغْفِرَةٌ مِنْ رَبِّهِمْ وَجَنَّاتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَنِعْمَ أَجْرُ الْعَامِلِينَ﴾ [آل عمران: 136]

"اور تم اپنے پروردگار کی مغفرت اور اس جنت کی طرف دوڑ لگادو کہ جس کی چوڑائی زمین اور آسمانوں جتنی ہے جو کہ متقین کے لیے تیار کی گئی ہے۔ وہ متقین جو کہ خرچ کرتے ہیں، تنگی میں بھی اور خوشحالی میں بھی، اور غصے کو پی جانے والے، اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں، اور اللہ عزوجل ایسے خوبصورت عمل کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔ اور متقین وہ ہیں کہ جن سے اگر کوئی بے حیائی کا کام ہو جائے یا وہ اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھیں تو فوراً اللہ کو یاد کرتے ہیں، اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں اور اللہ کے علاوہ کون ہے جو گناہوں کو معاف کرے، اور وہ اپنے گناہوں پر اصرار نہیں کرتے جبکہ وہ جانتے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں کہ ان کا بدلہ ان کے رب کی طرف سے مغفرت ہے اور ایسی جنت ہے کہ جس کے دامن میں نہریں بہتی ہوں گی اور عمل کرنے والوں کا اجر کیا ہی خوب ہے۔"

مذکورہ بالا آیات میں متقین کی چار صفات بیان ہوئی ہیں کہ جن میں یہ چار صفات ہوں تو قرآن مجید کے بیان کے مطابق نہ صرف وہ متقی ہیں بلکہ جنت کے وارث بھی ہیں۔ ان میں سے پہلی صفت تو اللہ عزوجل کی راہ میں خرچ کرنا ہے۔ متقین وہ ہیں، جو اللہ کے رستے میں ہر حال میں خرچ کرتے رہتے ہیں، خوشحالی میں بھی اور تنگی میں بھی۔ ہمارے ہاں عام طور یہ غلطی فہمی ہے کہ خرچ کرنے کا حکم امراء کو ہے حالانکہ خرچ کرنے کا حکم امیر اور غریب دونوں کو ہے، البتہ فرق صرف اتنا ہے کہ امیر اپنی استطاعت کے مطابق صدقہ کرے اور غریب اپنی استطاعت کے مطابق۔ جس کو ایک لاکھ کی استطاعت ہے، وہ ایک لاکھ کرے اور جسے ایک ہزار کی ہے، وہ ایک ہزار کرے اور جسے دس روپے کی ہے، وہ دس روپے کرے لیکن کرے ضرور۔ قرآن مجید اصلاح نفس کا جو

منہج تجویز کرتا ہے،اس میں خرچ کرنے کو بنیادی اہمیت حاصل ہے کہ انسان کے نفس میں موجود تمام کمیوں اور کوتاہیوں کی جڑ دنیا کی محبت ہے۔اور دنیا کی محبت کا خلاصہ مال کی محبت ہے۔اور مال کی محبت پر جب اپنے پروردگار کی محبت کو ترجیح دے گا تو اس کے رستے میں مال خرچ کرے گا اور یہاں ہی سے اس کا تزکیہ شروع ہو جائے گا کہ تزکیہ دنیا اور مال کی محبت ختم کرنے کا نام نہیں ہے کہ وہ تو رہبانیت ہے کہ جو اسلام میں ممنوع ہے بلکہ تزکیہ تو اللہ عزوجل کی محبت کو دنیا اور مال کی محبت پر غالب کرنے کا نام ہے۔

اور متقین کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ انتہائی غصے کو بھی پی جانے والے ہیں۔ انتہائی غصے کی صورت میں بھی تحمل اور برداشت سے کام لیتے ہیں اور اس کا اظہار نہیں کرتے۔ جب انسان شدید غصے میں ہوتا ہے تو عموماً اس کے اظہار میں معتدل نہیں رہ پاتا۔ بعض اوقات شدید غصے کی حالت میں یا تو آواز بہت اونچی ہو جاتی ہے یا آواز کانپنا شروع ہو جاتی ہے یا انسان کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے یا انسان اپنے حواس کھو بیٹھتا ہے اور ان تمام حالات میں اس سے کسی معتدل رویے کی توقع نہیں کی جاسکتی ہے لہذا شدید غصے کو پی جانے سے مراد یہی ہے کہ اس حالت میں بالکل خاموش ہو جائے،ایک لفظ بھی نہ بولے۔اور تیسری صفت یہ بیان فرمائی کہ وہ لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں۔اب یہ ممکن ہے کہ کسی پر شدید غصہ آئے اور انسان وقتی طور تو اسے دبا جائے لیکن اس شخص کو دل سے معاف نہ کرے تو اس سے انسان کے اندر ہی اندر اس شخص سے نفرت اور اس سے انتقام کی سوچ پروان چڑھتی رہے گی کہ جسے شیطان پھونکیں مار مار کر بڑھاتا رہے گا۔اس طرح سے اپنا خون جلانے سے بہتر ہے کہ انسان اس شخص کو اس امید پر معاف کر دے کہ اللہ عزوجل اسے بھی معاف کرے گا یا اس کی کسی آزمائش کو دور کر دے گا یا اس کے درجات بلند کرے گا وغیرہ۔تو شدید غصے کو پی جانا اور اس کا اظہار نہ کرنا ایک صفت ہے کہ جو نارمل رویے کے لیے ضروری ہے اور دل سے معاف کر دینا یہ ایک دوسری صفت ہے کہ جو انسان کی ذہنی صحت کے لیے ضروری ہے۔

اور چوتھی صفت یہ بیان فرمائی کہ اگر ان سے کوئی بے حیائی یا گناہ کا کام ہو جائے تو وہ

فوراً توبہ کر لیتے ہیں۔ قرآن مجید کا متقی کا تصور یہ نہیں ہے کہ ان سے گناہ نہیں ہو گا۔ گناہ تو فرشتوں سے نہیں ہوتا یا انبیاء سے نہیں ہوتا۔ ہم سب تو انسان ہیں کہ جو گناہ گار بھی ہے کہ خود اللہ کے رسول ﷺ کا فرمان ہے کہ تمام کے تمام بنو آدم بہت زیادہ گناہ کرنے والے ہیں لیکن بہترین گناہ گار وہی ہیں کہ جو بہت زیادہ توبہ کرنے والے ہیں۔[1] پس گناہ کا ہو جانا تقوی کے منافی نہیں ہے لیکن گناہ کر کے توبہ نہ کرنا یہ تقوی کے منافی ہے۔ اگر کسی شخص کو گناہ کرنے کے بعد گناہ پر شرمندگی اور ندامت نہیں ہوتی اور گناہ پر اصرار (insist) کیے چلا جاتا ہے تو یہ متقی نہیں ہے اور اگر کسی شخص کو گناہ کے ہوتے ہی ندامت اور شرمندگی کا احساس غالب ہو جائے اور وہ حالت استغفار میں چلا جائے تو یہ شخص متقی ہے۔ یہ اللہ عزوجل کی کتنی بڑی نعمت ہے کہ اس نے ہم سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ ہم سے گناہ ہی نہیں ہونا چاہیے بلکہ یہ مطالبہ کیا ہے کہ گناہ کے فوراً بعد ہمیں توبہ کرنی چاہیے۔ تو توبہ اور استغفار کے حال میں رہنا یہ متقین کی صفات میں سے ایک اہم صفت ہے۔

ایک اور مقام پر متقین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَى وَالْيَتَامَى وَالْمَسَاكِينَ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ﴾ [البقرة: 177]

”نیکی یہ نہیں ہے کہ تم مشرق اور مغرب کی طرف اپنے چہرے کر لو بلکہ نیکی تو اس کی ہے کہ جو اللہ پر ایمان لائے، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر، کتابوں پر اور نبیوں پر۔ اور مال کی محبت کے باوجود اسے اپنے رشتہ داروں، یتیموں،

[1] «كُلُّ بَنِي آدَمَ خَطَّاءٌ، وَخَيْرُ الْخَطَّائِينَ التَّوَّابُونَ» [سنن ابن ماجة، كِتَابُ الزُّهْدِ، بَابُ ذِكْرِ التَّوْبَةِ، 1420/2]

مسکینوں، مسافروں، سوال کرنے والوں اور غلاموں کے آزاد کروانے میں خرچ کرے۔ اور نماز قائم کرے اور زکوۃ ادا کرے۔ اور اپنے وعدوں کو پورا کرنے والے جبکہ وہ وعدہ کریں، اور تنگ دستی میں اور بیماری میں اور جنگ کے حالات میں صبر کرنے، یہی لوگ ہیں کہ جو سچے ہیں اور یہی لوگ ہیں جو کہ متقین ہیں۔"

ایک اور مقام پر متقین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿إِنَّ الْمُتَّقِينَ فِي جَنَّاتٍ وَعُيُونٍ (15) آخِذِينَ مَا آتَاهُمْ رَبُّهُمْ إِنَّهُمْ كَانُوا قَبْلَ ذَلِكَ مُحْسِنِينَ (16) كَانُوا قَلِيلًا مِنَ اللَّيْلِ مَا يَهْجَعُونَ (17) وَبِالْأَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُونَ (18) وَفِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ﴾ [الذاريات: 19]

"بے شک متقین باغات اور چشموں میں ہوں گے۔ اور جو ان کو ان کا رب دے رہا ہو گا تو وہ اسے لے رہیں ہوں گے کہ وہ اس سے پہلے نیک اعمال کو خوبصورتی سے کرنے والے تھے۔ اور وہ رات میں کم ہی سونے والے تھے۔ اور وہ سحری کے وقت میں استغفار کرنے والوں میں سے تھے۔ اور وہ کہ ان کے مال میں سوال کرنے والوں اور محروم لوگوں کا حصہ تھا۔"

ایک اور مقام پر متقین کی صفات بیان کرتے ہوئے فرمایا ہے:

﴿الْأَخِلَّاءُ يَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ إِلَّا الْمُتَّقِينَ (67) يَاعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَا أَنْتُمْ تَحْزَنُونَ (68) الَّذِينَ آمَنُوا بِآيَاتِنَا وَكَانُوا مُسْلِمِينَ﴾ [الزخرف: 69]

"قیامت والے دن قریبی ترین دوست بھی ایک دوسرے کے دشمن ہوں گے سوائے متقین کے۔ اے میرے متقی بندو! آج کے دن تم پر نہ تو کوئی خوف ہو گا اور نہ ہی تم غمگیں ہو گے۔ اور یہ وہی لوگ ہیں جو ہماری آیات پر ایمان لائے اور فرمانبر دار رہے۔"

ان آیات مبارکہ میں ایک تو یہ بات کہی گئی ہے کہ جنت والے دن تمام رشتے ناطے ایک دوسرے سے دور بھاگیں گے لیکن جو تعلق اور رشتہ تقوی کی بنیاد پر قائم ہو گا تو وہ

قیامت والے دن میں بھی ایک دوسرے کے نہ صرف قریب ہوں گے بلکہ ایک دوسرے کے حق میں سفارش کریں گے۔ پس اگر دوستی کی بنیاد اللہ کا ڈر اور خوف ہو گا تو ایسی دوستی قیامت والے دن بھی قائم رہے گی۔ اور دوسری بات یہ بیان کی کہ متقین وہ ہیں کہ جو قرآن مجید کی آیات پر ایمان رکھتے ہوں اور فرمانبرداری کی زندگی گزارتے ہوں۔ ایمان کے ساتھ ایک اور وصف جمع ہو جائے تو انسان متقی بن جاتا ہے اور وہ فرمانبرداری کی زندگی ہے کہ انسان اللہ کا فرمانبردار بن کر زندگی گزارے۔ فرمانبرداری سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے ہر حکم کو پورا کرنے کی کوشش کرے، چاہے چھوٹا ہو یا بڑا۔ پس جب انسان کی زندگی اس حال میں گزرے کہ وہ ہر لمحے میں اللہ کے کسی نہ کسی حکم کو پورا کر رہا ہو تو اس کو فرمانبرداری کی زندگی کہتے ہیں۔ اور پھر اگلی آیات میں ان متقین کو جنت کا وارث کہا گیا ہے۔

یہاں پھر توجہ کرنے کی ضرورت ہے کہ قرآن مجید میں کتنی آیات ہیں کہ جن میں غوث، قطب، ابدال اور قلندر وغیرہ کو جنت کا وارث یا حقدار کہا گیا ہے، ایک بھی نہیں لیکن کیا یہ المیہ نہیں ہے کہ ہم نے ان اصطلاحات کی بنیاد پر ایک پورا نظام تربیت کھڑا کر دیا ہے کہ جن کا تذکرہ تک قرآن مجید یا احادیث نبویہ میں نہیں ملتا ہے۔ اور جن اصطلاحات اور مقامات سلوک سے قرآن مجید اور احادیث نبویہ بھرے پڑے ہیں، ان کا تذکرہ بھی ہمیں اس پورے نظام میں نہیں ملتا ہے مثلاً عباد الرحمن کا تذکرہ تصوف کی کس کتاب میں ہے یا کس سلسلے میں قرآن مجید کے بیان کردہ اس مقام سلوک کو بنیادی اہمیت حاصل رہی ہے یا ہے۔ اس لیے ہم اپنی اس کتاب میں بار بار یہ توجہ دلا رہے ہیں کہ ہمیں اصلاح نفس کے جس پروگرام اور تربیت کے جس نظام کی ضرورت ہے، وہ جب تک قرآنی بنیادوں پر قائم نہ ہو گا، اس وقت تک معاشرے میں حقیقی تبدیلی نہیں آئے گی۔ تصوف کے نظام تربیت میں آپ کو قطب عالم تو بہت مل جائیں گے کہ جنہیں شاید کشف قبور بھی ہوتا ہو، وہ عالم برزخ کی سیر بھی کرا دیتے ہوں، وہ قلب بھی جاری کر دیتے ہوں لیکن دوسری شدید غصے کی کیفیت میں، وہ وجد میں آجاتے ہوں، وہ اپنے آپ

کو قطب عالم کہلوانے پر عجیب خوشی محسوس کرتے ہوں، دل ان کے تکبر سے بھرے ہوں اور مصنوعی عاجزی کا اظہار کرتے نہ تھکتے ہوں، وہ اپنے مریدوں کو نیکی اور تقوی میں اپنے کمتر اور حقیر سمجھتے ہوں، تو یہ سب کیا قطبیت ہے بھائی، ایسے قطب صاحب سے وہ ان پڑھ دیہاتی بھلا ہے کہ جو اللہ عزوجل سے حقوق اللہ اور حقوق العباد کے معاملے میں ڈرنے والا ہے وغیر ذلک کثیر۔ بھلے اسے اپنا لکھا ہوا نام بھی پڑھنا نہ آتا ہو لیکن یہی وہ متقین ہیں کہ جنہیں اللہ عزوجل نے اپنا اولیاء قرار دیا ہے۔ تصوف کی پیدا کی ہوئی سب سے بڑی غلط فہمی یہی ہے کہ انہوں نے اولیاء اللہ کا تصور غوث، قطب، ابدال، اور قلندر جیسی غیر شرعی اصطلاحات کے رستے مسخ کر دیا ہے کہ جن کے حصول کے لیے آپ کو مراقبہ کرنا ہے، پاس انفاس میں وقت گزارنا ہے، سماع سے حال طاری کرنا ہے، وجد میں آنا ہے، قلب کو جاری کرنا ہے، کشف قبر کی مشق کرنی ہے اور اسی طرح کے اور بہت سے کرتب سیکھنے ہیں۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (62) الَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ﴾ [يونس: 63]

”خبردار! بلاشبہ اولیاء اللہ پر نہ تو کوئی خوف ہوگا اور نہ ہی وہ غمگیں ہوں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ایمان لائے اور اللہ سے ڈرتے رہے۔“

امر واقعہ یہ ہے کہ اگر قرآن مجید کے مقامات سلوک کو بیان کر دیا جائے تو آج کل کے پیر طریقت اور قطب عالم سے زیادہ نیک ان کے مرید دکھائی دیں کہ پیر طریقت، قطب عالم اور قلندر بننے کے جتنے رستے، مجاہدے اور صفات ہیں، وہ سب کے سب ایک فن ہیں کہ جس کا حاصل یہ ہے کہ کس طرح اپنے آپ کو دوسروں سے برتر ثابت کرنا ہے اور کسی طرح دوسروں کو اپنے نیچے لگانا ہے اور جو اس فن میں ماہر ہوں، وہ اس میدان کے فنکار ہیں۔

قرآنی سلوک کے مطابق اپنی تربیت کرنے والا کبھی اس درجہ بندی میں مبتلا نہیں ہوگا کہ جو تصوف کے حلقوں میں نظر آتی ہے کہ کوئی پہلے آسمان پر ہے تو کوئی ساتویں آسمان پر ہے بلکہ یہاں سب اللہ کے بندے ہونے کے اعتبار سے برابر ہیں، رہنمائی

کرنے والا بھی اتنا ہی محتاج ہے کہ جتنا کہ رہنمائی لینے والا کہ دونوں انسان ہیں اور دونوں گناہ گار ہیں تو ایک گناہ گار کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ دوسرے گناہ گار سے بیعت لے کر اس کے تزکیہ کی ذمہ داری لے جبکہ یہ بھی معلوم نہ ہو کہ تزکیہ کرنے والا زیادہ گناہ گار ہے یا کروانے والا کیونکہ یہ تو قیامت کے دن ہی معلوم ہو گا۔ امکان کیا بلکہ غالب گمان ہے کہ دنیا میں بہت سے تزکیہ کرنے والے قیامت والے دن معلوم ہو کہ انہیں اپنے بعض مریدوں سے تزکیہ کروانے کی ضرورت تھی۔ اب تو عجب تماشہ ہے کہ ایک پیر کے مرید دوسرے پیر کے مریدوں کی بیعت تڑواتے ہیں تا کہ ان کے حلق ارادت میں اضافہ ہو، پیروں کی مریدوں کی تربیت سے زیادہ ان کی تعداد بڑھانے پر توجہ ہے، چند مرید کرنے کی خاطر بیرون ملک تک کے طویل سفر کیے جاتے ہیں، مرید اپنے پیروں کے فضائل میں تقابل ایسے کرتے ہیں جیسا کہ ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنی پراڈکٹس کی ایڈورٹزمنٹ کرتی ہیں وغیرہ۔ ہماری رائے میں تزکیہ کی بیعت صرف معصوم لے سکتا ہے جبکہ سلوک قرآنی میں غیر معصوم سالکین ایک دوسرے کی صحبت سے برابر استفادہ کرتے ہیں، کچھ تھوڑا اور کچھ زیادہ، چھوٹا بڑے سے سیکھتا ہے اور بڑا چھوٹے سے، شاگرد اپنے استاذ سے سیکھتا ہے اور استاذ اپنے شاگرد سے، جیسا کہ سورۃ العصر میں ہے:

﴿وَالْعَصْرِ (1) إِنَّ الْإِنْسَانَ لَفِي خُسْرٍ (2) إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ﴾ [العصر: 3]

"قسم ہے زمانے کی، بلاشبہ سب انسان خسارے میں ہیں، مگر وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے اور انہوں نے باہم ایک دوسرے کو حق بات کی وصیت کی اور باہم ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔"

تقوی کا حصول

اس سلسلے کی آخری مبحث یہ ہے کہ تقوی جب سلوک قرآنی کا ابتدائی اور انتہائی مقام ہے تو اس کے پیدا کرنے اور حاصل کرنے کے ذرائع اور وسائل کیا ہیں؟ قرآن مجید نے تقوی کی دو قسموں کو بیان کیا ہے: ایک وہ جو انسان میں پیدائشی طور موجود ہے اور دوسری وہ جسے انسان محنت اور مجاہدے سے حاصل کرتا ہے۔ تقوی کی جو صورت انسان

میں پیدائشی طور موجود ہے، وہ اس کا وہ شعور ہے جو اسے خیر اور شر میں تمیز عطا کرتا ہے۔ ہر انسان میں اللہ عزوجل نے ایک ترازو قائم کر دیا ہے جو اچھے اور برے میں تمیز قائم کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَنَفْسٍ وَما سَوَّاها (7) فَأَلْهَمَها فُجُورَها وَتَقْواها (8) قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاها (9) وَقَدْ خابَ مَنْ دَسَّاها﴾ [الشمس: 10]

"اور قسم ہے نفس کی اور اس کو سنوارنے کی۔ پس اللہ عزوجل نے ہر نفس میں اس کا فسق وفجور اور اس کا تقویٰ الہام کر دیا ہے۔ پس جس نے اپنے نفس کا تزکیہ کر لیا تو اس نے فلاح پالی اور جس نے اسے مٹی میں دبا دیا تو وہ نامراد ہو گیا۔"

ہر انسان میں ضمیر کی ایک عدالت قائم ہے جو اسے بتلاتی ہے کہ تم نے جھوٹ بول کر، وعدہ خلافی کر کے، دھوکا دے کر، ظلم کر کے اچھا نہیں کیا۔ اب بعض انسان تو ضمیر کی آواز کو سن لیتے ہیں اور اپنی اصلاح کی کوشش کرتے ہیں تو یہی نفس کے تزکیے کا عمل ہے اور بعض انسان ضمیر کی اس آواز کو اپنے اندر ہی دبا دیتے ہیں اور بعض تو ضمیر ہی کو سلا دیتے ہیں تو یہ اپنے نفس کو مٹی میں دبانے کے مترادف ہے۔

تقویٰ کی دوسری صورت جو کہ کسبی ہے، وہ بعض اعمال کے اختیار کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور بعض اعمال سے بڑھ جاتی ہے۔ جن اعمال سے تقویٰ حاصل ہوتا ہے، ان میں سے ایک عمل ہدایت کے رستے کو اختیار کرنا اور اس پر چلنے کے لیے مجاہدہ کرنا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ﴾ [محمد: 17]

"اور جن لوگوں نے ہدایت کے رستے کو اختیار کیا، اللہ عزوجل انہیں ہدایت میں بڑھا دیتے ہیں اور انہیں ان کے حصے کا تقویٰ عطا کرتے ہیں۔"

اسی طرح قرآن مجید کی آیات، خاص طور پر وعید والی آیات کہ جن میں اللہ عزوجل کی طرف سے اپنے بندوں کو ڈرایا گیا ہے، میں غور وفکر بھی تقویٰ کے حصول کے لیے ایک اہم ذریعہ ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ﴾ [البقرة: 187]

"اسی طرح ہم قرآن مجید کی آیات کو کھول کھول کر بیان کرتے ہیں تا کہ وہ تقوی اختیار کریں۔"

ایک اور مقام پر اسی بارے ارشاد ہے:

﴿وَكَذَٰلِكَ أَنزَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا وَصَرَّفْنَا فِيهِ مِنَ الْوَعِيدِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ أَوْ يُحْدِثُ لَهُمْ ذِكْرًا﴾ [طه: 113]

"اور اسی طرح ہم نے اس کو عربی قرآن بنا کر نازل کیا اور اس میں ڈراوے کو طرح طرح سے بیان کیا کہ وہ متقی بن جائیں یا ان کے لیے نصیحت پیدا ہو۔"

اسی طرح ایک اور مقام پر روزے کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ اس سے تقوی حاصل ہو۔ پس روزہ بھی تقوی حاصل کرنے کے ذرائع میں ایک اہم ذریعہ ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ [البقرة: 183]

"اے اہل ایمان! تم پر روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا تا کہ تم متقی بن جاؤ۔"

بلکہ عبادت کی کوئی بھی صورت ہو، اس پر عمل انسان میں تقوی پیدا کرتا ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ﴾ [البقرة: 21]

"اے لوگو! اپنے رب کی عبادت کرو کہ جس نے تم کو پیدا کیا اور ان کو بھی کہ جو تم سے پہلے تھے تا کہ تم متقی بن جاؤ۔"

اسی طرح اللہ کے رسول ﷺ کی تعظیم بھی ان امور میں شامل ہے کہ جن سے تقوی حاصل ہوتا ہے۔ ارشاد باری تعالی ہے:

﴿إِنَّ الَّذِينَ يَغُضُّونَ أَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُولِ اللَّهِ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ امْتَحَنَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ لِلتَّقْوَىٰ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ وَأَجْرٌ عَظِيمٌ﴾ [الحجرات: 3]

"بے شک جو لوگ اللہ کے رسول ﷺ کے پاس اپنی آوازوں کو دبا کر رکھتے

ہیں تو یہ وہی لوگ ہیں کہ جن کے دلوں کو اللہ عزوجل نے تقوی کے لیے منتخب کر لیا ہے۔ اور ان کے لیے مغفرت اور بڑا اجر ہے۔"

ضرورت اس امر کی ہے کہ جس طرح ہم نے تقوی کے مقام کو قرآن مجید سے تفصیل سے واضح کیا ہے، اسی طرح قرآن مجید کے دیگر مقامات سلوک کو بھی تفصیل سے بیان کیا جائے تاکہ سلوک قرآنی کے مطابق لوگ اپنی شخصیت کی تعمیر اور نفس کی اصلاح کر سکیں اور یہی وہ شخصیت کی تعمیر اور نفس کی اصلاح ہے کہ جس پر آخرت میں انعام واکرام اور کامیابی کی بشارتیں بھی دنیا میں ہی اللہ کی کتاب میں دے دی گئی ہیں۔

۞۞۞۞۞۞۞

مصادر ومراجع

ابن أبي شيبة، عبد الله بن محمد بن إبراهيم بن عثمان العبسي، الكتاب المصنف في الأحاديث والآثار، مكتبة الرشد، الرياض، 1409ھ

ابن القيم الجوزية، محمد بن أبي بكر بن أيوب، الوابل الصيب ورافع الكلم الطيب، دار عالم الفوائد، مكة المكرمة

ابن تيمية، تقي الدين أبو العباس أحمد بن عبد الحليم الحراني، مجموع الفتاوى، مجمع الملك فهد، المملكة العربية السعودية، 1416ھ/1995ء

ابن جوزی، عبد الرحمن علامه، منہاج القاصدین، تلخیص ابن قدامه مقدسی احمد بن محمد بن عبد الرحمن، مترجم محمد سلیمان کیلانی، اداره معارف اسلامی، لاہور، 1985ء

ابن حجر، أحمد بن علي أبو الفضل العسقلاني الشافعي، فتح الباري شرح صحيح البخاري، دار المعرفة، بيروت، 1379ھ

ابن عربي، محي الدين محمد بن علي الأندلسي، الفتوحات المكية، الهيئة المصرية العامة، مصر، 1975ء

ابن عربي، محي الدين محمد بن علي الأندلسي، فصوص الحكم، دار الكتاب العربي، بيروت

ابن قدامة المقدسي، أبو محمد موفق الدين عبد الله بن أحمد بن محمد بن قدامة الحنبلي، المغني لابن قدامة، مكتبة القاهرة، القاهرة، 1388ھ-1968ء

ابن قيم الجوزية، محمد بن أبي بكر بن أيوب، زاد المعاد في هدي خير العباد، مؤسسة الرسالة، بيروت، 1994ء

ابن قيم الجوزية، محمد بن أبي بكر بن أيوب، مختصر الصواعق المرسلة على الجهمية والمعطلة، دار الحديث، القاهرة

ابن كثير، أبو الفداء إسماعيل بن عمر القرشي، تفسير القرآن العظيم، دار طيبة للنشر والتوزيع، الطبعة الثانية، 1420ھ-1999ء

ابن ماجة، أبو عبد الله محمد بن يزيد القزويني، سنن ابن ماجة، دار إحياء الكتب العربية، فيصل عيسى البابي الحلبي، مصر

ابن نجيم المصري، البحر الرائق شرح كنز الدقائق، دار الكتاب الإسلامي، بيروت

ابو الحسن علوی ندوی سید، سیرت سید احمد شہید، مجلس تحقیقات ونشریات اسلام، لکھنو، نواں ایڈیشن، 2011ء

أبو بكر بن أبي داود، كتاب المصاحف، الفاروق الحديثة، مصر، الطبعة الأولى، 2002ء

أبو داود، سليمان بن الأشعث السِّجِسْتاني (المتوفى: 275ھ)، سنن أبي داؤد، المكتبة العصرية، بيروت

ابوبکر غزنوی سید، داود غزنوی، فاران اکیڈمی، لاہور، 1994ء

أحمد بن علي بن ثابت الرفاعي، البرهان المؤيد، دار الكتاب النفيس، بيروت، 1408ھ

أحمد بن محمد بن حنبل بن هلال بن أسد الشيباني، الزهد، دار الكتب العلمية، بيروت، لبنان، 1999ء

احمد حسن، ڈاکٹر، جامع الأصول ترجمه واضافه الوجيز فی أصول الفقه، مطبع مجتبائی، لاہور

احمد رضا خان بریلوی، احکام شریعت، مطبوعه آگره، ہندوستان

احمد رضا خان بریلوی، فتاویٰ رضویه شریف، مطبوعه جامعه نظامیه، لاہور

اسرار احمد، ڈاکٹر، دعوت رجوع الی القرآن کا منظر وپس منظر، مرکزی انجمن خدام القرآن، لاہور، 1990ء

اشرف علی تھانوی، مولانا، شریعت وطریقت، مرتب مولانا محمد دین چشتی، ادار ہ اسلامیات، لاہور

الألباني، محمد ناصر الدين، بن الحاج نوح بن نجاتي بن آدم الأشقودري، سلسلة الأحاديث الصحيحة وشيء من فقهها وفوائدها،

مكتبة المعارف للنشر والتوزيع، الرياض، 1995ء

الألباني، محمد ناصر الدين، تحريم آلات الطرب، مؤسسة الريان، بيروت، الطبعة الثالثة، 1426ھ/2005ء

الألباني، محمد ناصر الدين، صحيح الجامع الصغير وزياداته، المكتب الإسلامي، مصر

الألوسي، شهاب الدين محمود بن عبد الله الحسيني، روح المعاني في تفسير القرآن العظيم والسبع المثاني، دار الكتب العلمية، بيروت، 1415ھ

الآجُرِّيُّ، أبو بكر محمد بن الحسين بن عبد الله البغدادي، أخلاق العلماء، رئاسة إدارات البحوث العلمية والإفتاء والدعوة والإرشاد، السعودية

البخاري، محمد بن إسماعيل بن إبراهيم بن المغيرة الجعفي (المتوفى: 256ھ)، صحيح البخاري، دار طوق النجاة، مصر، 1422ھ

البخاري، محمد بن إسماعيل بن إبراهيم بن المغيرة الجعفي، الأدب المفرد، دار البشائر الإسلامية، بيروت، الطبعة الثالثة، 1409ھ – 1989ء

البيهقي، أبو بكر، أحمد بن الحسين بن علي الخراساني، شعب الإيمان، مكتبة الرشد للنشر والتوزيع بالرياض، الطبعة الأولى، 1423ھ-2003ء

البيهقي، أحمد بن الحسين بن علي الخراساني، الاعتقاد والهداية إلى سبيل الرشاد على مذهب السلف وأصحاب الحديث، دار الآفاق، بيروت، الطبعة الأولى، 1401ھ

الترمذي، محمد بن عيسى، سنن الترمذي، مطبعة مصطفى البابي الحلبي، مصر، 1975ء

الجاحظ، عمرو بن بحر الليثي، البيان والتبيين، دار ومكتبة الهلال، بيروت، 1423ھ

الحاكم، أبو عبد الله محمد بن عبد الله النيسابوري، المستدرك على الصحيحين، دار الكتب العلمية، بيروت، الطبعة الأولى، 1411ھ –

1990ء

خواجه محمد قاسم، کراچی کا عثمانی مذہب اور اس کی حقیقت، اداره اشاعت القرآن والحدیث، پاکستان

الذهبي، شمس الدين أبو عبد الله محمد بن أحمد بن عثمان بن قَايْماز، سير أعلام النبلاء، مؤسسة الرسالة، 1985ء

الزَّبيدي، محمّد بن محمّد بن عبد الرزّاق الحسيني، تاج العروس من جواهر القاموس، دار الهداية، بيروت

سیّد نذیر حسین محدث دہلوی رحمة الله علیه، مشعر باصطلاح صوفیه ومعارج ومدارج اہل سلوک، ترجمه: مولانا عبد العزیز صمدن فرخ آبادی، جریده الواقعة کراچی، شماره (5 / 6) شوال، ذیقعد 1433ھ/ ستمبر، اکتوبر 2012ء

سید وقار علی شاه، افکار وعقائد وفتاوی جماعت المسلمین رجسٹرڈ کراچی، ضیاء سنز پرنٹرز، پشاور، 2002ء

الطبري، حمد بن جرير بن يزيد الآملي، أبو جعفر، تاريخ الطبري = تاريخ الرسل والملوك، وصلة تاريخ الطبري، دار التراث، بيروت، الطبعة الثانية، 1387 هـ

الطبري، محمد بن جرير بن يزيد، جامع البيان في تأويل القرآن، مؤسسة الرسالة، 2000 ء

عبد الرحمن بن ناصر البراك، شرح العقيدة الطحاوية، دار التدمرية، 2008ء

عبد العزيز بن عبد الله بن باز، فتاوى نور على الدرب، المكتبة الشاملة، المكة المكرمة

عبد القیوم حقانی، مولانا، سوانح شیخ الاسلام حسین احمد مدنی، القاسم اکیڈمی، نوشہره، 2005ء

عبد الله بن المبارك الحنظلي، الزهد والرقائق لابن المبارك، دار الكتب العلمية، بيروت

على بن عثمان بن ابى على الجلابى الغزنوى الہجویری، کشف المحجوب، مترجم فضل دین گوہر، مزدور پرنٹنگ پریس، لاہور، 1972ء

علي بن محمد، الملا القاري، مرقاة المفاتيح شرح مشكاة المصابيح، دار الفكر، بيروت، 2002ء

الغزالي، أبو حامد محمد بن محمد، إحياء علوم الدين، دار المعرفة، بيروت

القاسم بن سلاّم بن عبد الله الهروي البغدادي، أبو عُبيد، فضائل القرآن، دار ابن كثير، بيروت، الطبعة الأولى، 1415ھ-1995ء

کتاب مقدس، بائبل سوسائٹی، انار کلی، لاہور

محمد بن حبان بن أحمد بن حبان البُستي، صحيح ابن حبان بترتيب ابن بلبان، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الثانية، 1414ھ – 1993ء

محمد بن حبان بن أحمد بن حبان البُستي، الإحسان في تقريب صحيح ابن حبان، مؤسسة الرسالة، بيروت، الطبعة الأولى، 1408ھ-1988ء

المرغيناني، أبو الحسن برهان الدين علي بن أبي بكر بن عبد الجليل الفرغاني، الهداية في شرح بداية المبتدي، دار احياء التراث العربي، بيروت

مسلم بن الحجاج النيسابوري، صحيح مسلم، دار إحياء التراث العربي، بيروت

أحمد سرهندي، مكتوبات حضرت مجدد ألف ثانى، مترجم مولانا سيد زوار حسين شاه، مکتبه مجددیه، کراچی

موسى بھٹو، محمد، مراقبه، سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ، حیدر آباد

النووي، أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف، المجموع شرح المهذب، دار الفكر، بيروت

النووي، أبو زكريا محيي الدين يحيى بن شرف، المنهاج شرح صحيح مسلم بن الحجاج، دار إحياء التراث العربي، بيروت، 1392ھ

Stephen Hawking, A Brief History of Time from Big Bang to Black Holes, USA: Bantam Books, 1998

Alexander Berzin, Meditation Methods, Moscow: The Berzinarchives, 2005

